چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
نومبر 2013

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔
خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

☆ اور اللہ کی خوشنودی کے لئے حج اور عمرے کو پورا کرو۔ اور اگر رستے میں روک لئے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو کر دو اور جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے سر نہ منڈاؤ اور اگر کوئی تم میں بیمار ہو یا اس کے سر میں کسی طرح کی تکلیف ہو تو اگر وہ سر منڈا لے تو اس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے پھر جب تکلیف دور ہو کر تم مطمئن ہو جاؤ تو جو تم میں حج کے وقت تک عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے۔ اور جس کو قربانی نہ ملے وہ تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات جب واپس ہو یہ پورے دس ہوئے یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جس کے اہل وعیال مکے میں نہ رہتے ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 196)

☆ مومنو! اللہ کے نام کی چیزوں کی بے حرمتی نہ کرنا اور نہ ادب کے مہینے کی اور نہ قربانی کے جانوروں کی نہ ان جانوروں کی جو اللہ کی نذر کر دیئے گئے ہوں اور جن کے گلوں میں پٹے بندھے ہوں اور نہ ان لوگوں کی جو عزت کے گھر یعنی بیت اللہ کو جا رہے ہوں اور اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب گار ہوں۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 2)

☆ اور ہم نے ہر ایک امت کے لئے قربانی کا طریق مقرر کر دیا ہے۔ تاکہ جو مویشی چارپائے اللہ نے ان کو دیئے ہیں ان کے ذبح کرنے کے وقت ان پر اللہ کا نام لیں سو تمہارا معبود ایک ہی ہے تو اسی کے فرمانبردار ہو جاؤ۔ (سورۃ حج 22 آیت 34)

☆ اور جس روز ہم ہر امت میں سے اس گروہ کو جمع کریں گے جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے تھے تو ان کی جماعت بندی کی جائے گی۔ یہاں تک کہ جب (سب) آ جائیں گے تو اللہ فرمائے گا کہ کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلا دیا تھا اور تم نے اپنے علم سے ان پر احاطہ تو کیا ہی نہ تھا۔ بھلا تم کیا کرتے تھے۔ (سورۃ نمل 27 آیت 83 سے 84)

☆ ہم نے تم کو حق کے ساتھ خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بھیجا ہے اور کوئی امت نہیں مگر اس میں ہدایت کرنے والا گزر چکا ہے۔ (سورۃ فاطر 35 آیت 24)

☆ پھر ان کے پیچھے انہی کے قدموں پر اور پیغمبر بھیجے اور ان کے پیچھے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا اور ان کو انجیل عنایت کی اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ان کے دلوں میں شفقت اور مہربانی ڈال دی اور لذت سے کنارہ کشی کی تو انہوں نے خود ایک نئی بات نکال لی ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا مگر انہوں نے اپنے خیال میں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آپ ہی ایسا کر لیا تھا۔ پھر جیسا اس کو نباہنا چاہئے تھا نباہ بھی نہ سکے۔ پس جو لوگ ان میں سے ایمان لائے ان کو ہم نے ان کا اجر دیا۔ اور ان میں بہت سے نافرمان ہیں۔ (سورۃ حدید 57 آیت 27)

☆ اور جو دوسرے مرد تم میں سے بدکاری کریں تو ان کو ایذا دو پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نیکوکار ہو جائیں تو ان کا پیچھا چھوڑ دو۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 16)

☆ اور اسی طرح جب ہم نے لوطؑ کو (پیغمبر بنا کر بھیجا تو) اس وقت انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایسی بے حیائی کا کام کیوں کرتے ہو کہ تم سے پہلے اہل عالم میں سے کسی نے اس طرح کا کام نہیں کیا۔ یعنی خواہش نفسانی پورا کرنے کے لئے عورتوں کو چھوڑ کر لونڈوں پر گرتے ہو حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ حد سے نکل جانے والے ہو۔ (سورۃ اعراف 7 آیت 80 سے 81)

☆ (اے پیغمبرؐ) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوا۔ اور جو صدق وخلوص ان کے دلوں میں تھا، وہ اس نے معلوم کر لیا۔ تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی اور بہت سی غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (سورۃ فتح 48 آیت 18 سے 19)

☆ الف لام میم، یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اسیں سے خرچ کرتے ہیں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 1 سے 2)

☆ اور اگر تم کو اس کتاب میں جو ہم نے اپنے بندے محمدؐ عربی پر نازل فرمائی ہے کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں، ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو لیکن اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے اور جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 23 سے 24)

☆ اور جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے پناہ مانگ لیا کرو۔ (سورۃ نحل 16 آیت 98)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شیخ بک ایجنسی کراچی)

خطوط

ایس حبیب خان کراچی سے۔السلام علیکم! گزارش یہ ہے کہ ڈر کے سالگرہ نمبر میں اپنی تحریر شامل اشاعت دیکھ کر ازحد خوشی ہوئی۔ جس کے لئے ادارے کی مشکور ہوں۔ مگر یہ پڑھ کر کہ آصف حسن اور خالد علی صاحب کے بڑے بھائی خالق حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بخشش اور مغفرت فرمائے، ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے اہل خانہ کو صبر عطا فرمائے۔ (آمین) بہت دنوں سے آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہ رہی ہوں کہ ڈر کے ٹائٹل میں تھوڑی تبدیلی کی جائے۔ ڈر ایک ہارر ڈائجسٹ ہے تو اس کا ٹائٹل بھی اس کے فارمیٹ کے شایان شان ہونا چاہئے اور جو ڈر کی تحریروں کا عکاس مظہر ہو۔ باقی تحریروں میں۔ ایس امتیاز احمد، ناصر محمود، احسان سحر اور ساحل دعا بخاری کی تحریریں پسند آئیں۔ ڈر کے لئے ہمیشہ دعا گو۔

☆☆ ایس صاحبہ: آپ کی تجویز ٹائٹل کے لئے نوٹ کرلی گئی ہے، لگتا ہے آج کل آپ کچھ زیادہ ہی مصروف ہوگئی ہیں، جس کا ثبوت کہانی..... امید ہے آپ ضرور غور فرمائیں گی۔ Thanks۔

صبا محمد اسلم گوجرانوالہ سے، امید ہے کہ ڈر کا تمام اسٹاف بخیر وعافیت ہوگا۔ ڈر ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر اکتوبر کا شمارہ ملا۔ ملتے ہی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ بات سچ ہے کہ ڈر ڈائجسٹ جب بھی آتا ہے دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ قرآن کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ حقیقت بات ہے کہ جہاں قرآن کا ذکر آئے دل کو قلبی سکون ملتا ہے۔ اس کے بعد انتقال پرملال پڑھا۔ آصف حسن کے بھائی کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ غزلوں کی محفل میں آصفہ سراج، محمد اسلم جاوید، بلقیس خان، مسز آسیہ اسلم، عائشہ عادل کی غزل پسند آئی اور سیف الرحمٰن کی غزل نے تو دل خوش کردیا اور پھر کہانیوں میں بے گناہ، آصفہ سراج کی کہانی زبردست، دل دہلا دینے والی سبق آموز کہانی تھی۔ ایک سوگیارہ، آئینے کا راز، حاصل محبت، بے چین روح، قاتل زلفیں بھی زبردست تھیں اور باقی تمام رائٹرز نے بھی بہت اچھا لکھا ہے۔ دعا ہے ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کرے۔ آمین۔ ڈر ڈائجسٹ سے قلبی لگاؤ ہوگیا ہے جب تک اس کو پڑھ نہیں لوں سکون نہیں ملتا۔ اور جب پھر ڈائجسٹ پورا پڑھ لیے ہیں تو اگلے ماہ کا شدت سے انتظار ہوتا ہے اور ہر دن بہت بے چینی سے گزرتا ہے۔ جب تک اگلے ماہ کا ڈائجسٹ نہیں آجاتا۔ پچھلا ڈائجسٹ ہی بار بار پڑھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ میں مزید اور نکھار پیدا ہو۔ (آمین)

☆☆ صبا صاحبہ: قلبی لگاؤ کا تجزیہ پڑھ کر خوشی ہوئی، دراصل خطوط کے لئے صفحات مخصوص ہیں اس لئے سب کی خواہشوں کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ خیر آئندہ کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔

ثوبیہ صدف پشاور سے، معزز ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! اسلام کے بعد عرض ہے کہ ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ مجھے بہت پسند ہے اور میں ہر ماہ بہت شوق سے اسے پڑھتی ہوں۔ اس شمارے میں کہانیاں ڈریکولا کا مہمان، آئینے کا راز اور جنون انتقام بہت پسند آئیں۔ جناب مجھے بھی کہانیاں لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ میں اس خط کے ساتھ اپنی لکھی ہوئی کہانی بھیج رہی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ میری ہمت بڑھانے کے لئے اس کو ضرور شائع کریں گے۔ بے شک میں منجھی ہوئی رائٹر نہیں ہوں اور شاید اس میں بے شمار غلطیاں ہوں پھر بھی آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ اس کی غلطیوں کو دور فرما کر اس کو شائع فرمادیں۔ فون پر میری بات ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں کہانی بھیج رہی ہوں اور قوی امید ہے کہ میری محنت ضائع نہیں ہوگی۔ ایک بار پھر التماس ہے کہ میری کہانی پر غور ضرور فرمایئے گا۔ اس کے لئے میں آپ کی شکرگزار ہوں۔

☆☆ ثوبیہ صاحبہ: ہمت مرداں مدد خدا، ہمت والے ہی کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بن جاتا ہے۔ کہانی کا موضوع اچھا ہوتا ہے تو حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ خیر آئندہ ماہ بھی آپ کے خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔

آصفہ سراج لاہور سے، محترم ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم! خیریت کے بعد عافیت کی طالب، اکتوبر کا شمارہ ملا، بے گناہ شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ اس مرتبہ کہانیوں میں جنون انتقام، تحفۂ اجل، آدم خور، حاصل محبت زبردست رہیں، باقی کہانیاں بھی یقیناً اچھی ہوں گی ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ اکتوبر کا شمارہ سالگرہ نمبر واقعی زبردست ہے۔ اگلے ماہ کے لئے بھی شکریہ قبول کیجئے۔ میری نئی کہانی

بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ضرور لگایئے گا۔ اب اجازت چاہوں گی۔ نیک تمناؤں کے ساتھ۔

☆☆ آصفہ صاحبہ: نئی کہانی بھیجنے کا شکریہ۔ آپ کی کہانی زیادہ بلکہ بہت زیادہ لیٹ موصول ہوئی ہے۔ اگلے شمارے میں آپ کی کہانی ضرور شامل اشاعت ہوگی۔

سنبل ماھین طلہ پنڈدادن خان سے، آداب عرض ہے، میری شاعری اور کٹ پیس کو آپ بہت کم شائع کرتے ہیں۔ پلیز میری تحریروں کو ردی کی ٹوکری میں نہ پھینکیں۔ اب تو اس ٹوکری نے بھی انکار کردینا ہے۔ غلام نبی نوری اور بلقیس آپ کے کٹ پیس کی تو میں فین ہوتی جارہی ہوں۔ ایس امتیاز آپ ہمیشہ کی طرح اول۔ ایڈیٹر صاحب آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔ اگر ہم e-mail کے ذریعے خط بھیجیں تو کیا شائع ہوجائیں گے؟ اگر ہاں تو پلیز e-mail بتادیں مہربانی ہوگی۔ سب قارئین کو سلام اور میرے لئے دعا کیجئے گا تاکہ میں 13th میں اچھے نمبروں سے پاس ہوجاؤں۔

☆☆ سنبل صاحبہ: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھے نمبروں سے کامیاب کرے، کامیابی کے بعد مٹھائی کھلانا بھولئے گا نہیں۔ e-mail ایڈریس ڈائجسٹ کے صفحے پر موجود ہے۔ مگر آپ ڈاک سے تحریر بھیجیں تو زیادہ اچھا رہے گا۔ Thanks۔

ایس بی بسمل ایبٹ آباد سے، محترم ایڈیٹر صاحب اور تمام ڈر کی ٹیم اور ڈر پڑھنے والوں کو سلام عقیدت۔ جناب یہ ڈر میں میرا دوسرا خط ہے۔ میں ڈر ڈائجسٹ کو تھوڑے عرصے سے پڑھ رہی ہوں۔ یہ ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس کی تمام کہانیاں نہایت اچھی اور معیاری ہوتی ہیں۔ میں نے آپ کو پہلے بھی ایک نعت، حمد اور ایک غزل بھیجی تھی جو شاید ابھی تک نہیں پہنچی۔ میں نے کال کرکے آپ سے پوچھا تھا تو ہمت کرکے ایک بار پھر لکھ دی۔ آپ کے معیار پر پوری اتریں تو یہ حمد و نعت اور غزل رسالہ میں ضرور شائع کردیں۔ میں آپ کی مشکور رہوں گی۔ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو پھر لکھنے کی جسارت کروں گی۔

☆☆ ایس بی صاحبہ: چلئے حوصلہ افزائی ہوگئی اور اب امید ہے کہ آپ ڈر ڈائجسٹ کی محفل میں شریک ہونا بھولیں گی نہیں۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

عروج ماھین پنڈدادن خان سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب آپ نے اعلان کر ہی دیا کہ آپ ٹاپ اسٹوریز کو گفٹ دیں گے۔ ویسے ہماری اسٹوریز تو بہت اچھی ہوتی ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں۔ اچھا آپ سب سے میری ریکویسٹ ہے کہ میرا رزلٹ آنے والا ہے۔ پلیز! دعا کرنا۔ اچھا میں اپنی اسٹوری ارسال کروں گی۔ اسے جلدی جلدی ڈر میں جگہ دیں۔ ایک بار پھر سے فاریہ، بلقیس، سنبل، عاصمہ، ایمان، غلام نبی نوری، ماہین اور عامر ملک کو سلام۔ اچھا اب میں اجازت چاہتی ہوں۔ ارے ہاں اپنی انوری آپی کو تو بھول ہی گئی۔ انوری آپی کو نئی جاب کی بہت بہت مبارکباد۔ اپنی مصروفیات میں سے ٹائم نکال کر پلیز! کہانی لکھیں۔

☆☆ عروج صاحبہ: ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپ کو اچھے نمبروں سے کامیاب کرے اور زندگی کی تمام جائز خوشیاں آپ کے دامن میں بھر دے۔ آپ بصد شوق اسٹوری ارسال کریں مگر پلیز! کہانی میں تسلسل کا زیادہ خیال رکھئے گا۔ آپ کی انوری آپی ناراض لگتی ہیں، انہیں منانے کی کوشش ضرور کیجئے گا۔ Thanks۔

عمرانہ زکریا گوجرانوالہ سے، السلام علیکم! میں دوسری بار ڈر ڈائجسٹ میں خط لکھ رہی ہوں، ڈر کے تمام عملے کو میری طرف سے بہت بہت سلام، میں ڈر ڈائجسٹ کو کافی عرصے سے پڑھ رہی ہوں اور کالج لائف میں میرے علاوہ میری تمام سہیلیاں بھی ڈر ڈائجسٹ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ تمام سہیلیوں کو ڈر سے متعارف میرے شوق نے کروایا تھا۔ ڈر ڈائجسٹ ہماری مصروفیات میں رچ بس گیا ہے کوئی کام ہو یا نہ ہو ڈر حاضر ہے۔ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ، ڈر ڈائجسٹ کا جتنا ٹائٹل زبردست ہو، اتنا ہی سارے رائٹروں کی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں۔ ڈر ڈائجسٹ تمام ڈائجسٹوں میں نمبرون ہے۔ خیر ڈر ڈائجسٹ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ نئے پرانے رائٹروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ نئے لکھاریوں کو بھی نہیں بھولتا۔ میں بہت بہت پرامید ہوں کہ اپنی کہانی "غیبی سفر" لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ جو یقیناً پسند آئے گی اور اس کی اصلاح کرکے شکریہ کا موقع دیں گے۔ میں شب و روز ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ عمرانہ صاحبہ: آپ کی دونوں کہانیاں موجود ہیں لیکن اصلاح طلب زیادہ ہیں جیسے ہی وقت ملا تو اصلاح کرکے شائع کردی جائیں گی۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی اپنا قلبی کا تجزیہ نامہ بھیجنا بھولیں گی نہیں۔ Thanks۔

بلقیس خان پشاور سے، ہاؤ آر یو؟ اینڈ آئی ایم فائن، ڈر کا برتھ ڈے بھی گزر گیا۔ ٹائٹل گرل، یقیناً کسی غم میں ڈوبی ہوئی تصویر لگ رہی تھی۔ ڈر کا شمارہ 22 تاریخ کو قصہ خوانی سے مل گیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بے چینی سے اپنی اسٹوری یقین کو تلاش کیا۔ مگر ندارد! جی جناب ہم نے قرآن کی باتوں سے ڈر ڈائجسٹ کا آغاز کیا۔ مگر ارے یہ کیا...... انتقال پرملال نے صدمے سے دوچار کردیا۔ مرحوم عارف علی، کی رحلت کی خبر سن کر بے ساختہ دل گھبرے دکھ سے بھر گیا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے۔ اور ہونٹوں پر انا للہ وانا الیہ راجعون کی دعا جاری ہوگئی۔ "ہم عارف علی صاحب کے لئے اللہ سے ان کی مغفرت اور گناہوں کی بخشش کی دعائیں مانگیں۔ اس خبر کے بعد ڈر کی کسی بھی کہانی پر تبصرہ کرنا ناگزیر ہے۔ البتہ میں نے نئی کہانی کفن ایک مہینے کی شدید محنت سے لکھی ہے۔ سو پلیز! اب تو میں بھی محنت کرنے لگی ہوں اور آپ میری محنت ضائع بھی نہیں کرتے تو امید ہے کہ وجود جنات کے بعد کفن بھی بہت جلد ڈر میں جگہ بنالے گی۔ پھر نئی کہانی بھیجوں گی۔ تب تک اللہ حافظ۔

☆☆ بلقیس صاحبہ: آپ کی کہانی وجود جنات اگلے ماہ ضرور شائع ہوگی۔ پلیز! ڈونٹ مائنڈ۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! بڑی انتظار کے بعد "سالگرہ نمبر" ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ پہلے تو ہماری طرف سے آپ اور تمام اسٹاف کو اتنا خوب صورت "سالگرہ نمبر" پر دلی مبارکباد۔ آتے ہیں۔ خوب صورت اور دلفریب "سالگرہ نمبر" کے دلچسپ تجزیے کی طرف۔ "سالگرہ نمبر" کا خوب صورت اور بینظیر شمارہ اکتوبر 2013ء ہمارے سامنے ہے۔ ٹائٹل پر حسینہ سوچ میں ڈوبی ہوئی ہیں کہ "سالگرہ" میری ہے یا "ڈر" کی...... "قرآن کی باتیں" ایک پرنور سلسلہ ہے جس سے ہم سب مسلمان استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔ "عارف علی" صاحب ہم میں نہ رہے جس کے لئے آنکھیں پرنم رہیں...... اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین اور تمام لواحقین کو صبر وجمیل عطا فرمائے۔ خطوط اچھے لگے۔ دو یورز خوب تجزیے کرتے ہیں۔ "اندھیرا اجالا" محمد حنیف قادری حافظ آباد سے لے کر آئے اسٹوری کیا ایک خوب صورت سبق ہم سب کے لئے جو ہمارے دلوں میں ایمان کی شمع روشن کرتی ہے۔ "گڈ۔" "حاصل محبت" بصیر پور سے ساحل دعا بخاری ایک خوب صورت اسٹوری لائیں جو حقیقت سی لگی۔ اچھی کوشش۔ "بے گناہ" لاہور سے آصفہ سراج لائیں اپنی اسٹوری میں ظلم وستم کے خلاف سینہ سپر نظر آئیں۔ آصفہ جی اچھا لکھتی ہیں آپ۔ "جنون انتقام" صبا محمد اسلم گوجرانوالہ سے لکھتی ہیں۔ بالکل صحیح لکھا کہ بعض دفعہ ہم جس پر اعتماد کرتے ہیں وہی دھوکا دیتے ہیں۔ ایک سبق آموز اسٹوری ہم سب کے لئے۔ "ایک سو گیارہ" راشد نذیر طاہر "سسپنس سے بھرپور کہانی لائے مگر راشد جی تھوڑی محنت کی ضرورت ہے۔ "ردلوکا" اے وحید کی خوب صورت تخلیق ناول اپنے 101 چیپٹر میں داخل ہوگئی ہے۔ اسٹوری کا خوب صورت سفر جاری ہے اور ہم سب "ردلوکا" کے ساتھ شامل سفر ہیں۔ اے وحید خوب صورت رائٹر ہیں اور ہم سب کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا وحید جی! "ڈریکولا کا مہمان" ناصر محمود فرہاد فیصل آباد سے ہمیں ڈرانے کے لئے آئے، اسٹوری اچھی مگر "فلمی" رہی۔ کوششیں جاری رکھیں۔ "لقمہ اجل" ہماری اسٹوری جس کے بارے میں آپ جیسے خوب صورت دو یورز ہی بتاسکتے ہیں۔ سو ہم بھی منتظر ہیں۔ آپ کی رائے کے...... تھینکس! "آئینے کا راز" ایس حبیب خان کراچی کی خوب صورت تحریر خود غرضی اور مطلب پرستی کو خوب بے نقاب کیا۔ حبیب صاحب اتنی اچھی کہانی لکھنے پر مبارکباد۔ "بے چین روح" شائستہ سحر راولپنڈی سے لے کر آئیں، شائستہ جی! روحیں تو ہوتی بے چین ہیں۔ مگر آپ نے اپنے خوب صورت انداز میں اسے ہم تک پہنچایا۔ گڈ...... "سنہری تابوت" M-A راحت کی سحر انگیز تحریر اپنے 17 ویں مدار میں داخل ہوئی۔ جو لوگ خوب صورت اور اچھی کہانی پڑھنا چاہتے ہیں ان کے لئے بیسٹ اسٹوری۔ اور M-A راحت کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ M-A راحت جیسے خوب صورت رائٹرز سے ہم جیسے لوگ اصلاح لیتے ہیں۔ "آدم خور" ساجدہ راجا" ہندواں سرگودھا کی خونی تحریر۔ خاکیت کی انتہا کو چھوتی ہوئی دلچسپ اسٹوری...... مگر "ساجدہ جی!" ہم ڈرے بالکل نہیں۔ ہا، ہا، ہا...... "تلاش" محمد عثمان علی "میاں چنوں" سے خوفناک تحریر لائے۔ سسپنس اور تحیر سے بھرپور اسٹوری۔ عثمان جی! خوب لکھنے لگے آپ بھی۔ زبردست۔ "قاتل زلفیں" اسلام آباد سے شعیب شیرازی دلگداز تحریر لائے۔ شعیب جی! زلفیں تو ہوتی ہیں قاتل جس میں ہم سب گرفتار ہوجاتے ہیں۔ خوب صورت تحریر کو تاریخی پیراہن خوب پہنایا۔ آپ نے۔ خوب بہت خوب! "ہارر اسٹوری" احسان سحر، میاں والی سے لکھ رہے ہیں اسٹوری خوب اور اچھی ہے اور یقیناً ہارر ہی ہے۔ مگر احسان سحر صاحب آپ اس سے بھی اچھی اسٹوری لکھ سکتے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں میں اپنے کسی بھی

خوب صورت رائٹر اور دو یورز کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔ آپ سے یہی کہوں گا آپ اچھے ہیں...... مگر اپنی محنت کریں! "عشق ناگن" M الیاس کے نئے ناولٹ کی خوب صورت اور پہلی قسط محبت کا خوب صورت انداز ویلڈن الیاس جی! کہانی میں دم ہے۔ "بسکتی رات" راولپنڈی سے عامر ملک لائے...... بالکل صحیح بلکہ آپ نے "ہوس پرستی" حرص، لالچ انسان کو D گریڈ کردیتی ہیں۔ آپ نے اپنے خوب صورت انداز میں اسے خوب لکھا۔ گڈ عامر جی! "قوس قزح" کے زیادہ تر اشعار پرانے تھے۔ "غزلیں" اچھی اور خوب صورت رہیں...... خدا کرے یہ شاعر حضرات کے زور قلم اور ہو زیادہ...... "مددگار ہمزاد" شہزادہ جاندزیب عباسی کراچی سے ایک پرتحیر اور خوب صورت اسٹوری لے کر آئے۔ جس نے دل ودماغ پر ایک خوب صورت نقش چھوڑا۔ زبردست عباسی صاحب خوب لکھتے ہیں آپ...... تو جناب یہ تھا "ڈر ڈائجسٹ" کے خوب صورت اسٹوری پر دلچسپ تجزیہ۔ حاضر ہوں گے Next Month۔ شکریہ۔

☆☆ امتیاز صاحب: آپ کا پرخلوص اور قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا تجزیہ پڑھ کر دل خوش ہوا اور اب امید ہے کہ آئندہ بھی آپ اسی طرح اپنے قلم کا جادو برائے تجزیہ جگاتے رہیں گے۔ شکریہ۔

غلام نبی نوری کھڈیاں خاص سے، سب سے پہلے ڈر کے تمام قارئین ورائٹرز اسٹاف ودیگر عملہ کو میری طرف سے کروڑوں سلام قبول۔ سالگرہ نمبر اکتوبر 2013ء ملا۔ ٹائٹل سحر انگیز تھا۔ قرآن کی باتیں زبردست تھیں۔ لیکن بھائی عارف علی مرحوم کے انتقال کا سن کر نہایت دکھ ہوا۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ خطوط کی محفل میں پہلا تو کھٹے میٹھے خطوط پڑھنے کو ملے۔ میرا خط لگانے کا ازحد شکریہ۔ کہانیوں کا محاصرہ بڑی مشکل سے ہوا۔ ردلوکا میں کہانی کا نیا رخ اچھا لگا۔ گڈ۔ سنہری تابوت فارغ کردینی چاہئے۔ عشق ناگن زبردست تھی۔ گڈ۔ اندھیرا اجالا بڑی منفرد انداز میں پیش تھی گڈ۔ بے گناہ واقعی خوفناک تھی۔ حاصل محبت، انداز تھوڑا کم لیول تھا۔ مگر بڑی اچھی تھی۔ جنون کا انتقام بیسٹ انداز میں لکھی گئی تھی۔ لقمہ اجل گڈ تھی۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔

☆☆ غلام نبی صاحب: بہت بہت شکریہ، کہ آپ مصروفیات کے باوجود وقت نکال کر خلوص نامہ ارسال کرتے ہیں۔ آپ کی چاہت قابل توجہ ہے، اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔

ساجد جاوید نارووال سے، السلام علیکم! اس بار ڈر ڈائجسٹ 23 اکتوبر کو ملا، بہت ہی بے چینی سے خطوط کی محفل میں پہنچا، سارے خطوط پانچ مرتبہ دیکھے مگر اپنا خط نہ پاکر بہت دکھ ہوا، میں ہر مہینے کی 23 تاریخ کو ڈائجسٹ لے کر آتا ہوں اور صرف ایک کہانی پڑھ کر 24 تاریخ کو وقت پر خط لکھتا ہوں۔ اس امید پر کہ اگر ذرہ سی بھی دیر ہوگئی تو شاید میرا خط نہ چھپے میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ میں نے 10 سال بعد ڈر ڈائجسٹ میں انٹری دی ہے خیر آپ کے پاس شاید خط ہی اتنے آجاتے ہیں کہ آپ کچھ خط ضائع کردیتے ہیں، اب آخری کوشش کرکے میں نے خط لکھا ہے اور ساتھ ایک غزل بھی بھیج رہا ہوں اگر اب کی بار خط اور غزل شائع نہیں ہوئے تو میں ڈر ڈائجسٹ پڑھنا ہی چھوڑ دوں گا۔

☆☆ ساجد صاحب: ناراضگی ٹھیک نہیں میرے بھائی اگر کسی کا خط موصول نہ ہو، اس کا کیا علاج ہے۔ آئندہ بھی آپ کے قلبی لگاؤ کا انتظار رہے گا۔

محمد ابراہیم کھوکھر جمبرہ ٹی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیریت ہوں گے۔ نیا شمارہ 23 تاریخ کو شام میں ملا۔ ٹائٹل پر حسینہ کا دلکش سراپا دیکھ کر اس کے خیالوں میں کھو گیا۔ قرآن کی باتیں بلاشبہ دل کو لگیں۔ کہانیوں میں حاصل محبت، ردلوکا، بے چین روح اور مددگار ہمزاد اچھی لگیں۔ غزلوں میں فریدہ خانم، سنبل ماہین طاؤ، شگفتہ حسین کی غزلیں دل کو لگیں۔ ایک غزل حاضر خدمت ہے۔ جس میں عوام کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ برائے مہربانی شائع کرکے شکریہ کا موقع دیں۔

☆☆ ابراہیم صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے شکریہ۔ تحریر شامل اشاعت ہے اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

بشیر احمد بھٹی بہاولپور سے، السلام علیکم! اکتوبر 2013ء کا ڈر اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ مارکیٹ کی زینت بنا۔ شمارہ خریدا۔ سب سے پہلے اپنے فیورٹ مصنف ایس امتیاز صاحب کی کہانی صفحہ نمبر 117 پر لقمہ اجل پڑھی۔ پہلی اور آخری کہانی زبردست رہی۔ ویسے بھی تمام کہانیاں اپنی جگہ لاجواب ہوتی ہیں۔ دسمبر 2010ء کے ڈر میں جناب ایس امتیاز صاحب کی کہانی

ہساپو کا بلیدان پڑھی تھی۔ تب سے میں ان کی کہانیوں کو پسند کرتا ہوں۔ ہساپو کا بلیدان عمدہ کہانی تھی۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہر ماہ کم از کم ایس امتیاز صاحب کی دو کہانیاں شائع کیا کریں۔ ایسے ہر دلعزیز مصنف سے آپ کو سلسلہ وار کہانی بھی ضرور لکھوائیں۔ امتیاز صاحب کا انداز تحریر بہت عمدہ ہوتا ہے۔

☆☆ بشیر صاحب: قلبی لگاؤ سے کہانی کا تجزیہ پسند آیا۔ آئندہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم! ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ سالگرہ نمبر 22 تاریخ کو موصول ہوا۔ امید تھی کہ اپنی کہانی ضرور شامل ہوگی۔ مگر...... چلو جی دل کو بہلا وہ دیدیا کہ اگلے ماہ صحیح، ارے یہ کیا...... (اناللہ وانا الیہ راجعون) آصف حسن صاحب! اللہ آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو صبر عطا فرمائے۔ اور آپ کے بڑے بھائی مرحوم عارف علی صاحب کو خدا جنت کے اونچے درجات دے، اور ان کی مغفرت فرمائے۔ ماہ اکتوبر کا ڈر ڈائجسٹ 2013ء بہترین تھا۔ کہانی جو بھی تھی جو کہ سالگرہ نمبر کا خاص حصہ تھی۔ اچھی تھی اور جو غزلیں و نظمیں شائع کی گئی تھیں وہ بھی بہترین تھی۔ ہمارے پاس تو الفاظ نہیں کہ کس طرح سے شکریہ ادا کریں کہ سب کی محبتوں کی وجہ سے ڈر آج ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ہمارا ہاتھ بہت زخمی ہوگیا ہے۔ بائیک سے گر گئے تھے۔ پھر بھی ڈر میں محبت کا یہ عالم ہے کہ زخمی ہاتھ سے کہانی موت کا خط لکھی ہے۔ پلیز! مہربانی فرما کر جلد سے جلد شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

☆☆ عثمان صاحب: ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد از جلد کلی صحت عطا کرے۔ امید ہے آئندہ آپ ذرا دیکھ بھال کر بائیک چلائیں گے۔ آپ کی کہانی اگلے ماہ شامل اشاعت ہوگی۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی کراچی سے، ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کا شمارہ اکتوبر 2013ء عوام اور قارئین کے ہاتھوں کی زینت بن چکا ہے اس کے تمام رائٹرز Writers کی کاوشیں اپنے کمال عروج پر ہیں۔ اس میں شائع شدہ تمام مواد لاجواب بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ میری رائے اور غزلیں شائع کرنے پر میں ادارے کا بہت بہت ممنون ہوں، سرورق یعنی ٹائٹل پر شائع ہونے والی تصویر رسالے ڈائجسٹ کو خریدنے پر شائقین کو مجبور کر دیتی ہے۔

☆☆ واجد صاحب: ویری ویری تھینکس آپ کی رائے پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ امید ہے آپ آئندہ ماہ بھی اپنی رائے ضرور ارسال کریں گے۔

سید اسد علی بخاری نور پور سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ سب احباب خیریت سے ہوں گے۔ بفضل تعالیٰ میں بڑی مدت کے بعد حاضر ہوا ہوں۔ آج سے 7 سال پہلے ایک مرتبہ لکھنے کی جسارت کی تھی۔ اب دوبارہ حاضر ہوا ہوں، امید ہے کہ اس مرتبہ بھی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ ڈر کا سالگرہ نمبر جلد ہی مل گیا۔ عارف بھائی کے انتقال کا افسوس ہوا۔ اللہ انہیں اجر عظیم عطا فرمائے اور بروز قیامت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نصیب فرمائے۔ آمین۔ خطوط میں کچھ دوست پرانے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ غلام نبی نوری صاحب کو سلام، تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ امید ہے کہ آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔

☆☆ اسد صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، خط لکھنے، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی نوازش بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔

راجہ باسط مظہر حاجی جھنگی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر ڈائجسٹ کی پوری فیملی خیر و عافیت سے ہوگی۔ میں بھی کبھی ڈر ڈائجسٹ کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتا تھا مگر پھر کچھ اتنا زیادہ مصروف ہوگیا کہ ٹائم نہ دے پایا۔ پورے ایک سال بعد ڈر کا اکتوبر 2013ء کا شمارہ ہاتھ لگا پڑھ کر ڈر کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ ایڈیٹر صاحب ایک کہانی ''ایجنٹ راجہ'' بھیج رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں پہلے کی طرح اس بار بھی آپ میری پوری حوصلہ افزائی کریں گے جیسے ایک سال پہلے کرتے تھے۔

☆☆ باسط صاحب: چلئے حوصلہ افزائی ہوگئی۔ کہانی شامل اشاعت ہے، اور اب ہمیں بھی امید ہے کہ آپ بھی ہر ماہ خط بھیج کر شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈو الہ یار سے، سلامت باشد قوی امید ہے کہ تمام اسٹاف بمع قارئین بخیریت ہوں گے۔ مگر میں خیریت سے نہیں ہوں ایک دوست کو تفریح کرانے کی خاطر روانہ ہوئے، راستے میں چھوٹے بڑے شہروں ملتان، لاہور، اسلام آباد، مری، پشاور، سوات، مالاکنڈ وغیرہ آخر کار معلم جبہ کی آخری چوٹی پر پہنچے وہاں پر قدرتی آبشار کے پانی سے ہاتھ منہ دھوتے ہوئے پیر

سلپ ہو جانے کی وجہ سے گھٹنے کے بل نیچے گر پڑا جس سے گھٹنا نکل گیا، نیچے والی ہڈی کریک ہوگئی دوستوں نے بہت انجوائے کیا کہ جیلانی صاحب خودکشی کرنی تھی تو کھائی میں چھلانگ آپ نے میدان میں گھٹنا کریک کر لیا، پشاور میں چار دن قیام کے دوران فرق نہ آنے پر ہنگامی حالت میں واپس آنا پڑا، مجھے یقین ہے کہ میں قارئین اور احباب کی دعاؤں کے زیر اثر تھا کہ جان بچی سو لاکھوں پائے، ٹانگ پر ڈاکٹر نے پٹہ چڑھا دیا ہے۔ دوستوں عزیزوں کے لائے گئے فروٹ سے خوب جان بنائی جا رہی ہے، جلد صحت یابی کے لئے قارئین سے دعاؤں کی اپیل ہے۔ بہت بہت شکریہ...... بہت افسوس ہوا آصف حسن کے بھائی کی وفات کا پڑھ کر جو دنیا میں آیا اسے ایک دن دنیا سے جانا ہوتا ہے یہ قانون خدا ہے آپ کے والد اور بھائی کے لئے دعائیں کر رہے ہیں اور ان کی مغفرت کے لئے مرکز میں بھی دعا کی اپیل کی ہے اس طرح ہم ڈر کے رائٹر کو بھی نہیں بھولے جو 2012ء میں دریائے جہلم میں ڈوب گئے تھے، 2013ء میں ایک سال ہونے پر ان کی مغفرت کے لئے دعائیں کی۔

☆☆ شرف الدین صاحب: آپ کا پاؤں پھسلا اور ٹانگ پر ڈاکٹر نے پٹہ چڑھا دیا، یہ پڑھ کر دلی دکھ ہوا ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد از جلد آپ کو کلی صحت عطا کرے۔ آپ صدقہ خیرات کریں، اس سے پہلے بھی آپ کے ساتھ کچھ ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو حفظ و امان میں رکھے۔

ناصر محمود فرہاد فیصل آباد سے، السلام علیکم! اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آج کل جس طرح کے حالات چل رہے ہیں ہمیں ہر دم اللہ سے اچھے کی دعا مانگنی چاہئے۔ اکتوبر 2013ء کا شمارہ وقت پر مل گیا تھا۔ اس سے دو اہم خبریں ملیں۔ ایک اچھی اور ایک غمناک۔ آصف حسن صاحب کی تحریر سے عارف علی صاحب کے انتقال کی خبر ملی اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جنت الفردوس کے مکینوں میں شامل کرے۔ یقین جانیے یہ خبر پڑھ کر دلی افسوس اور غم ہوا کیونکہ بھائی اور پھر ایسے بھائی جو ہر دم دوسرے بھائیوں کے لئے سایہ شفقت بنے ہیں، ان کو زمانے کے سرد و گرم سے بچا کر رکھنے کی کوشش کریں، آج کل کے زمانے میں خال خال ہی ملتے ہیں اور جو ہیں وہ عطیہ خداوندی ہیں۔ ایسی اطلاع، سننے والے کے اپنے کئی زخم ہرے کر دیتی ہے۔ خدا ہر کسی کو اپنی امان میں رکھے اور مرحوم کے درجات بلند کرے۔ دوسری خبر ڈائجسٹ کی سالگرہ کی تھی۔ اس پر مبارکباد وصول کیجئے۔ ''ڈر'' نے اپنی عمر کی چودہ بہاریں دیکھ لی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے دن دگنی رات چوگنی ترقی دے اور آپ سب لوگوں کی محنت اور لگن کو قبول کرے۔ میری طرف سے آپ کو، ڈر کے سارے اسٹاف، مصنفین اور قارئین کو ڈر کی سالگرہ مبارک ہو۔ پہلے بھی یہ تجویز دی تھی اور شاید ابھی تک آپ کے زیر غور ہو کہ رائٹرز (جو ایسا چاہتے ہیں) کا E-Mail ایڈریس یا پھر FB-page شمارے میں ان کے نام کے ساتھ یا پھر کہیں سے علیحدہ شائع کر دیا جائے اس طرح اس پوری ''ڈر'' فیملی کو ایک دوسرے کے ساتھ براہ راست رابطے کا موقع مل سکتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی تحاریر میں مزید نکھار پیدا کر سکتے ہیں اور دوسروں کو مفید مشورے دے سکتے ہیں۔ اس پر نظر ثانی فرمایئے گا۔

☆☆ فرہاد صاحب: آپ کی تجویز بہت بہتر ہے، مگر افسوس دل ناداں کا کیا کریں۔ اکثر دل و دماغ کے بے چین لوگ ایڈریس سے غلط سوچ نکال کر شریفوں کو ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ بہت پہلے ہم یہ قدم ماہنامہ فکشن اور ڈر میں اٹھا چکے ہیں۔ Thanks۔

اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں، ماہ اکتوبر کا سالگرہ نمبر بہت اچھا تھا، سرورق پہلے سے خوب صورت تھا۔ بھائی عارف علی کی وفات کا سن کر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ خدا اہل خانہ کو صبر و جمیل کی دولت عطا فرمائے، ہم آپ کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہیں، ہر شخص نے ایک نہ ایک دن ضرور جانا ہے۔ خطوط اور قوس قزح اور غزلوں کے صفحے پر یاد کرنے کا بہت بہت شکریہ، آپ کی محبت اور خلوص ہی ہمارے لئے کافی ہے۔ پرچے کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بہترین ہیں۔ مثلاً قرآن کی باتیں، اداریہ، قوس قزح، غزلیں اور کہانیوں میں اندھیرا اجالا، بے گناہ، آئینے کا راز، تلاش، قاتل زلفیں، عشق ناگن، سسکتی رات وغیرہ سے بے حد متاثر ہوا ہوں، ان رائٹروں کو میری طرف سے ایسی عمدہ تحریروں پر مبارک ہو۔ ڈر ڈائجسٹ کا اپنا ایک الگ معیار ہے۔ خدا ڈر ڈائجسٹ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

☆☆ جاوید صاحب: خلوص نامہ بھیجنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، آئندہ ماہ بھی آپ کے خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

☆☆☆

جگنی

محمد حنیف قادری۔ بھٹیاں حافظ آباد

پراسرار جنگل گھٹا ٹوپ اندھیرا مہلک اور جان لیوا سناٹا جسم و جاں پر دہشت طاری کر رہا تھا، ایک دلہن بے یار و مددگار ڈولی میں بیٹھی تھی کہ اچانک طوفانی ہوائیں چلنے لگیں اور پھر بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھڑنے لگے کہ اتنے میں......

ایک نادیدہ قوت کی دل کش دل نشیں دل فریفتہ دل گیر اور انوکھی دہشت ناک کہانی

بیلے میں اس وقت ہر سو، ہو کا عالم تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور آدھی رات کے اس وقت سردی بھی عروج پر تھی۔ بعض اوقات میرے اپنے ہی گھوڑے کے قدموں کی بازگشت میرے دل کو دہلائے دے رہی تھی۔ ڈر اور خوف کی اس صورت حال میں مجھے ابھی دریا کے پار ایک انتہائی خطرناک جنگل سے بھی گزرنا تھا جس کا تصور ہی میرے دل کی دھڑکنوں کو تیز کرنے کے لیے کافی تھا۔ بیلے میں دور دور تک نہ تو کوئی آبادی تھی اور نہ ہی کوئی ڈیرا۔ اسلحہ کے نام پر میرے ہاتھوں میں ایک سندھی کلہاڑی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ بیری، پہاڑی کیکر اور خود رو جھاڑیوں کے درمیان اگے سرکنڈے ماحول کو اور بھی خوفناک اور سنسنی خیز بنا رہے تھے۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکن کی حالت انتہائی ابتر اور دگرگوں تھی۔ کبھی کبھی سناٹے کو چیرتی ہوئی گیدڑوں کی آواز بھی دور و نزدیک سے سنائی دے رہی تھی۔ بیلے میں بھیڑیوں کی موجودگی کے بارے میں نہ صرف میں نے لوگوں سے سن رکھا تھا بلکہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے کئی بار انہیں دیکھا بھی تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس بیلے سے کئی خطرناک اور سنسنی خیز کہانیاں وابستہ تھیں بلکہ حال ہی میں یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ دریا پار بیلے کے خطرناک جنگل سے کچھ چرواہے مویشیوں سمیت غائب ہو گئے تھے اور ابھی تک ان کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔

میرے عقب میں میرے اپنے گاؤں راج پور کے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ آوازیں بھی دور ہوتی ہوئی ہوا میں کہیں تحلیل ہو کر گم ہو رہی تھیں۔ اس بیلے میں دن میں تو میں نے کئی بار سفر کیا تھا مگر رات میں یہ سفر میری زندگی کا پہلا اور شاید آخری سفر تھا کیونکہ میں نے سوچ لیا تھا کہ آئندہ اگر مجھے چوہدری صاحب نے ایسا کبھی کہا بھی تو میں ان کی بات نہیں مانوں گا اور میں سوچ رہا تھا کہ ایسی نوکری سے تو بہتر تھا کہ میں بھیک مانگ کر گزارہ کر لیتا۔ کم از کم زندہ تو رہتا۔ مگر......

خیر آج تو مجھے ہر حال میں یہ سفر طے کرنا ہی تھا کیونکہ بڑے چوہدری صاحب کے بیٹے کی طبیعت کافی خراب اور تشویشناک تھی۔ ان دنوں ہمارے گاؤں میں نہ تو کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ ہی کوئی ڈسپنسری۔ لوگ جب بیمار ہوتے تو قریبی شہر کا رخ کرتے جو کہ ہمارے گاؤں سے بیس کلومیٹر کی دوری پر تھا اور اس کے لیے کوئی مناسب سواری بھی ناپید تھی۔ اکثر ماجھی کمہار کی گدھا

گاڑی ہی گاؤں کے مریضوں کے لیے بیک وقت ایمبولینس اور دوسرے لوگوں کے سامان کی ترسیل کے لیے کام آتی تھی۔

رات کے اس وقت چوہدری امتیاز سے اپنے بچے کی حالت دیکھی نہیں گئی تو اس نے مجھے سندیسہ بھیج کر بلوایا اور اس خطرناک سفر پر روانہ کرتے ہوئے کہا۔

”شہر میں جاتے ہی ڈاکٹر اشرف سے ملنا اور اسے میری طرف سے کہنا کہ صبح ہوتے ہی وہ گاؤں کے لیے چل پڑے۔ گھوڑا اسے دے دینا اور تم پیدل گاؤں میں واپس آجانا۔“

اس وقت میرے دل نے ایک بار تو کہا کہ چوہدری کو جواب دے دوں مگر بچے کی حالت دیکھتے ہوئے میں انہیں جواب نہیں دے پایا اور پھر گاؤں کے ایک معمولی چوکیدار کی اوقات ہی کیا تھی کہ وہ گاؤں کے نمبردار چوہدری امتیاز کو جواب دے سکتا۔

جلد ہی گھنی جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور دریا کا قریبی ریتلا علاقہ شروع ہوگیا۔ گھوڑا انتہائی سمجھدار اور اس پورے علاقے سے واقف تھا اور کئی بار میں اس پر سواری کرچکا تھا۔ یہاں سے مجھے دریا عبور کرکے ایک انتہائی خطرناک جنگل سے گزرتے ہوئے شہر تک پہنچنا تھا۔ سردیوں کے موسم میں اکثر دریا کا پانی نہ ہونے کے برابر رہ جاتا تھا۔

یکدم کسی خیال کے تحت میں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں۔ گھوڑا چلتے چلتے رک گیا اور سر کو ہلاتے ہوئے منہ موڑ کر پیچھے میری طرف دیکھا۔ گویا مجھ سے پوچھ رہا ہو کہ میں نے اسے کیوں روکا ہے۔ میں نے پیار سے اس کی گردن سہلائی اور دریا کے ساتھ ساتھ اسے ایک مخصوص سمت میں موڑ دیا۔ رات کے اس وقت میں نے سوچا کہ جب خطرات نے مجھے ہر طرف سے گھیر ہی لیا ہے اور میرے ساتھ اس سفر میں کچھ بھی ہو سکتا ہے تو کیوں نہ رسک لیتے ہوئے شارٹ کٹ استعمال کیا جائے۔ ہوسکتا ہے کچے مستعمل راستے کا استعمال اس وقت زیادہ خطرناک ہو اور اس راستے پر کوئی گھات لگائے بیٹھا ہو اور پھر اس وقت جنگل کے انتہائی خطرناک حصے میں کون ہوگا جو کسی کی آمد کی امید میں اپنی رات کی نیند خراب کررہا ہو۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں نے اصل راستے کو ترک کرتے ہوئے شارٹ کٹ کا استعمال ضروری سمجھا۔ اس راستے کا استعمال کرکے ایک تو میں جلدی شہر پہنچ جاتا اور دوسرا کم از کم خطرناک جانوروں سے بھی بچ جاتا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت انسان ہی اس دنیا کا واحد خطرناک درندہ ہے جو کہ اگر اپنی درندگی پر اتر آئے تو دنیا کی کوئی مخلوق اس درندے کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

شارٹ کٹ راستے پر چلتے ہوئے مجھے کچھ مافوق الفطرت بلاؤں کا ڈر بھی تھا جس کی وجہ سے میں نے اپنی جیب سے اپنے مرشد کی دی ہوئی تسبیح نکال لی اور زیرلب کچھ ورد کرنے لگا۔ دریا کے ایک تنگ سے پاٹ سے وفادار گھوڑے نے مجھے باآسانی دریا عبور کروا دیا۔ ویسے بھی ان دنوں دریا میں پانی کی سطح انتہائی کم تھی۔ دریا پار کرتے ہی ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ کر میں نے خدا کو یاد کرتے ہوئے گھوڑے کا رخ گھنی جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی طرف کردیا۔ جھاڑ جھنکار اور کانٹوں سے بچنے کے لیے میں نے اپنا سر گھوڑے کی گردن سے لگالیا۔ گھوڑا اس وقت اپنی مستی میں اردگرد دیکھ کر جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

اس وقت میں جنگل کے جس حصے سے گزر رہا تھا اس کے حوالے سے لوگوں میں کئی مافوق الفطرت کہانیاں گردش کررہی تھیں کوئی اسے جنات کی آماجگاہ قرار دیتا تھا تو کوئی اسے خوبصورت پریوں کا مسکن کہتا تھا۔ بہرحال میرے نزدیک تو یہ سب جھوٹی اور من گھڑت کہانیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا کیونکہ میں دن کے وقت اس انتہائی خطرناک جنگل سے کئی بار گزرا تھا اور بغور کئی بار میں نے کئی جگہوں کا جائزہ بھی لیا تھا مگر مجھے تو یہاں کبھی کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دی تھی اور یہی وجہ تھی کہ میں نے آج رات یہاں سے گزرنے کا فیصلہ کیا تھا اور میں نے اس راستے کو اس کچے راستے پر ترجیح دی تھی جس پر اکثر رات کو ڈاکوؤں اور لٹیروں کا خطرہ رہتا تھا۔

اچانک آسمان پر شروع راتوں کا چاند غروب ہوتا دکھائی دیا اور فضا میں آسمان پر چمکتے تاروں کی ہلکی مدھم سی لودیتی اندھیروں میں مدغم ہوتی روشنی اپنے وجود پہ ماتم کناں نظر آئی۔ رات نے مکمل طور پر اپنی سیاہ زلفوں کو زمین کی بساط پر بچھا دیا۔ اندھیرے کی مہیب اور گہری ہوتی سیاہ چادر نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جانے کیوں گھوڑے نے اپنے نتھنوں کو پھلایا اور رک گیا۔ فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی باگیں کھینچیں اور اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور پیار سے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اسے آگے بڑھانے کے لیے ایک مرتبہ پھر سے باگیں کھینچیں مگر گھوڑے نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا اور پھر اچانک جانے اسے کیا ہوا کہ اس نے آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنا شروع کردیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی اسے زبردستی پیچھے ہٹانے کی کوشش کررہا ہے۔

گھوڑے کی اس حرکت نے مجھے انتہائی حیرانی میں مبتلا کردیا۔ اس وقت جہاں میں گھوڑا سمیت موجود تھا وہاں چاروں طرف سرکنڈوں، پہاڑی کیکروں اور بیری کے درختوں کی بہتات تھی۔ یہاں گھوڑے سے نیچے اترنے میں بھی خطرہ تھا۔ مگر میں نے تمام خطروں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے گھوڑے سے نیچے اترنے کا فیصلہ کرلیا اور جونہی میں گھوڑے سے اترا تو گھوڑے نے زبردستی اچھلنا شروع کردیا۔ انتہائی ڈر اور خوف کی صورت حال تو جو تھی سو تھی یہ ایک نئی مصیبت تھی جس کا مجھے سامنا تھا۔

تسبیح ہاتھ میں پکڑے اور دل میں قرآنی آیات کا ورد کرتے میں گھوڑے پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا مگر مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے میں اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکوں گا کیونکہ گھوڑا میری ہزار کوششوں کے باوجود یوں پیچھے ہٹ رہا تھا کہ جیسے کوئی نادیدہ طاقت اسے زبردستی پیچھے دھکیل رہی ہو۔ گھوڑا انتہائی ترحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا جیسے وہ بہ زبان خموشی مجھ سے کہہ رہا ہو کہ مالک! مجھے معاف کردینا کیونکہ میں آپ کی مرضی کے خلاف کررہا ہوں۔

مگر سوال تو یہ تھا کہ جب بظاہر کوئی بھی چیز سامنے نہیں تھی تو پھر وہ کس چیز سے خوف زدہ ہوکر پیچھے بھاگنے کی کوشش کررہا تھا۔ گھوڑے کو انتہائی تکلیف میں دیکھتے ہوئے میں نے اس کی لگامیں چھوڑ دیں۔ آزاد ہوتے ہی گھوڑا پیچھے مڑا اور سرپٹ بھاگا۔ آن کی آن میں وہ درختوں اور جھاڑ جھنکار میں کہیں غائب ہوتا چلا گیا۔

گھوڑے کو قابو کرنے کے چکر میں کہیں کہیں سے میرے ہاتھ کی جلد درختوں اور جھاڑیوں سے رگڑ کھا کر چھل گئی تھی مگر مجموعی طور پر میں کسی بڑی چوٹ سے محفوظ رہا تھا۔ اب جبکہ اس ساری صورتحال میں میرا واحد بہترین ظاہری سہارا بھی چھن گیا تو میرے لیے پیدل سفر کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور سمت کا تعین کرتے ہوئے پیدل سفر کا آغاز کیا۔ ابھی میں تھوڑی دور ہی چلا ہوں گا کہ میرے نتھنوں سے عجب ناگوار سی بو ٹکرائی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ بو تو کافی دیر سے ہلکی ہلکی میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی مگر شاید اب اس میں کافی تیزی آگئی تھی۔ اس بو میں عجیب کراہیت سی تھی۔ ابھی میں اس بو کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ایک انتہائی عجیب وغریب صورت حال نے مجھے اندر سے دہلا کر رکھ دیا۔

میرے بالکل سامنے ایک بہت بڑا عجیب وغریب کیبن پڑا نظر آرہا تھا اور اس کیبن میں سے سفید دودھیا قسم کی روشنی پھوٹتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ انتہائی عجیب صورت حال یہ تھی کہ وہ کیبن موتیا اور گلاب کے پھولوں سے سجا ہوا اس جگہ پر عجیب ہی نظارہ دے رہا تھا۔ اس کیبن کو دیکھنے سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی بہت بڑی اور آرام دہ ڈولی مختلف قسم کے پھولوں سے سجی ہوئی کہاروں کے انتظار میں یہاں رکھ دی گئی ہو۔ مگر اس سنسان جنگل میں رات کے اس لمحے اس جگہ پر کسی سجی سجائی ڈولی کا یوں پایا جانا تو ناممکنات میں سے ہے۔ تو پھر

یہ سب کیا تھا؟ شاید اس جگہ کے بارے میں لوگ سچ ہی کہتے تھے اور میں ہی اس حقیقت کو آج تک سمجھ نہیں پایا۔

میرے سارے وجود میں سنسنی کی لہر پھیلتی چلی گئی۔ بے انتہا تجسس سے مجبور ہو کر میں نے ایک ہاتھ میں کلہاڑی کو مضبوطی سے تھاما اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح پر مختلف قسم کی اسم الٰہی کا ورد کرتے ہوئے میں کیبن نما اس ڈولی میں داخل ہوا اور پھر یہاں جو میری نظر نے دیکھا۔ اس نے تو مجھے سر سے لے کر پاؤں تک ہلا کر رکھ دیا۔ کیبن میں دلہن کے مکمل لباس میں زیورات سے لدی پھندی ایک ایسی حسین و جمیل نوخیز کلی ایک رنگین پلنگ پر موجود تھی جسے یہ دنیا والے ایک نظر دیکھ لیتے تو اس کے حصول میں اس دنیا میں یقینی طور پر چوتھی عالمی جنگ چھڑ جاتی اور اس کا انجام بھی جانے کیا ہوتا۔

میں نے زندگی میں حسینوں کے بہت سے قصے اور کہانیاں سن رکھی تھیں مگر یہ ان سب سے بڑھ کر اور مختلف تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے حسین سراپا کو بیان کرنے کے لیے میرے سامنے الفاظ ہاتھ باندھے ادب سے کھڑے نظر آئے مگر مجھے کوئی لفظ بھی اس قابل نظر نہیں آیا جو اس کے حسن کے شایان شان ہو۔

اسے دیکھتے ہی مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے اندر سے ڈر اور خوف بذات خود ڈر کے مارے کہیں بھاگ گیا تھا۔ ابھی اس خوابیدہ، معصوم اور دل کے راستے روح میں اتر جانے والے حسن سے مجھے ہمکلامی کا شرف بھی حاصل نہیں ہوا تھا کہ میرے وجود کا رواں رواں اس پر قربان ہوا جا رہا تھا۔ جانے آگے میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

اس کیبن میں مدھم سی دودھیا رنگ کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ اس کی ایک ٹانگ سے لہو بہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں شاید رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

اچانک اس حسین و جمیل ہستی نے میری طرف حیرت اور مسرت سے دیکھتے ہوئے کسی اجنبی سی زبان میں کچھ کہا جو میرے پلے نہیں پڑا۔

جانے اس نے کیا کہا تھا اور پھر شاید وہ سمجھ گئی کہ میں اس کی زبان سے نابلد ہوں اور پھر اس نے ایک ایسی زبان میں مجھ سے بات کی جسے سن کر تو گویا مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ اہل زبان کی طرح انگریزی میں کہہ رہی تھی۔

پلیز ہیلپ می۔'' آئی ایم ان ٹرابل۔ (برائے مہربانی میری مدد کریں، میں مصیبت میں ہوں۔)

اف خدا کی پناہ۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ لڑکی انگریز ہے؟ اگر یہ انگریز ہے تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ اور پہلے اس نے جو نامانوس زبان بولی تھی وہ کون سی زبان تھی؟ اتنی خوبصورت اور حسین لڑکی کا انسانوں میں پایا جانا ناممکنات میں سے ہے اور اگر یہ انسان ہے تو رات کے اس پہر اس خوفناک جنگل میں کیا کر رہی ہے؟ یہ پرانے زمانے کے شادی بیاہ کے انداز کی یہ ڈولی؟ مکمل دلہن کا گیٹ اپ؟ بھاری بھرکم زیورات پہنے، خطرناک ترین جنگل کے ایسے حصے میں جہاں دن میں بھی لوگ داخل ہونے سے کتراتے ہیں، یہاں پر اس کا پایا جانا اور اوپر سے انگریزی زبان میں بات چیت۔ سب سے بڑی بات۔ خطرناک حدوں کو بے دردی سے کراس کرتا ہوا اس کے حسن بیکراں؟ اور رات کا یہ ماحول۔ مجھے لگا کہ یہ سب کچھ سوچ سوچ کر کہیں میں پاگل ہی نہ ہو جاؤں۔

کئی سوال میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور ان سوالوں نے صحیح معنوں میں مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا مگر اس کا وجود روز روشن کی طرح رنگین پلنگ پر براجمان میری طرف شکوہ کناں انداز میں دیکھ رہا تھا۔ میری پاگل پن کی حدوں کو چھوتی محویت دیکھتے ہوئے اس نے مجھے ایک بار پھر سے پکارتے ہوئے انگلش میں وہی عبارت دہرائی۔ اب کی بار اس نے اشارے سے بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

خیر میں تو اس کی انگلش بھی سمجھ چکا تھا۔ میں یہ بتا تا چلوں کہ چوکیداری کے ساتھ ساتھ میں ان دنوں بی اے کا امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا اور ایل ایل بی کر کے میں ایک کامیاب وکیل بننے کی تگ و دو میں مصروف

تھا۔ میں انگلش بہت اچھی طرح جانتا تھا اور میں اس کی بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا مگر موجودہ صورت حال نے مجھے گونگ سا کر کے رکھ دیا تھا جس کی وجہ سے مجھ سے شاید بولا بھی نہیں جا رہا تھا مگر آخرکار میں نے ہمت کرتے ہوئے اسے انگلش میں ہی جواب دیا مگر میں اسے اردو میں بیان کر رہا ہوں۔

کیوں نہیں۔ میں آپ کی بھرپور مدد کرنے کا خواہاں ہوں مگر موجودہ صورت حال میں کیا آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گی کہ آپ ہیں کون اور اس خطرناک، سنسان جنگل میں رات کے اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں جبکہ میرے یقین کے مطابق اس وقت آپ کا ایسی جگہ پہ پایا جانا ناممکنات میں سے ہے اور پھر یہ تو ایسی جگہ ہے کہ یہاں تو لوگ دن کے وقت بھی آنا گوارا نہیں کرتے اور آپ رات کو مکمل دلہن کے روپ میں؟ اور پھر آپ زخمی بھی ہیں اور آپ کی آنکھوں کی لالی اور سوجن بتاتی ہے کہ کافی دیر تک روتی بھی رہی ہیں شاید۔ یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر ہے اگر اس بارے میں آپ کچھ بتانا گوارا کریں تو؟'' میں نے انتہائی حیرت سے اس سے استفسار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر یہ وقت اس کہانی میں الجھنے کا نہیں ہے۔ میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گی مگر فی الحال مجھے ان بے رحم لوگوں کے چنگل سے تو نکالو۔ جن کو دیکھ کر ہی بندے کی آدھی جان نکل جائے۔ بجائے کہ میں ان کی قید میں ہوں...... یہ پھولوں کی سیج نہ دیکھو۔ اس سیج میں گڑے ہوئے وہ ظالم کانٹے بھی دیکھو جو کہ میرے انتہائی نرم و ملائم وجود میں گھس کر میرے اعصاب کو ایک ان دیکھے عذاب میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے منت ریز لہجے میں کہا۔

اب میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کے مہندی لگے ہاتھ اور پاؤں کی صورت حال کچھ عجیب سی نظر آئی۔ اس کے پاؤں لوہے کی ایک باریک سی زنجیر سے رنگین پلنگ کے پایوں سے بندھے نظر آئے۔ یہ سب دیکھ کر میرے دماغ نے ایک دفعہ تو بالکل ہی کام کرنا چھوڑ دیا۔ انتہائی الجھی ہوئی اس صورت حال میں، میں نے اپنے بال نوچ لینا چاہے مگر جلد ہی اس کی مدد کے لیے پکارتی ہوئی مدھر اور سریلی آواز مجھے ہوش کی دنیا میں واپس لے آئی۔

ایک بار تو میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں میں اس کی مدد کر کے کسی مشکل میں ہی نہ پڑ جاؤں مگر جلد ہی میرے اندر کا غیرت مند انسان جاگ اٹھا اور میں نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے کچھ اور تو نہ سوجھا میں نے اللہ پاک کا نام لیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کلہاڑی کا وار کر کے رنگین چارپائی کے پائے کاٹ کر باریک زنجیروں کو چارپائی سے علیحدہ کر دیا مگر اس حالت میں اس کے لیے میرے ساتھ چلنا مشکل تھا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچتا میرے ایک ہاتھ میں موجود تسبیح ایک تالے سے ٹکرائی تو ٹرچ کی آواز آئی اور غیر متوقع طور پر تالا کھل کر نیچے جا گرا۔ پہلے پہل تو مجھے بھی کچھ سمجھ نہ آئی کہ کیا ہوا ہے مگر جب مجھ پر حقیقت کھلی تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی مگر اس کا میں نے اس مرقع حسن کو علم نہیں ہونے دیا اور خاموشی سے دیگر تالوں کے ساتھ بھی یہی کیا۔ تمام تالے جونہی کھلے تو اس نے انتہائی حیرانی اور احسان مند نظروں سے میری سمت دیکھا۔

''آفرین ہے بھئی تم! تو مجھے بہت کمال کے بندے لگتے ہو۔ بغیر چابی کے تالا کھولنے کا فن تم نے کہاں سے سیکھا؟''

''کیا تالے کھل گئے ہیں؟'' میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو اب جھوٹ بھی بولو گے تم؟ اچھا۔ خیر ...... یہ میں تم سے بعد میں پوچھوں گی کہ تم نے یہ سب کیسے کیا۔ ابھی تو وقت انتہائی کم ہے آؤ! اس سے پہلے کہ وہ بے غیرت حرام زادے یہاں تک پہنچیں، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' اس نے سراسیمگی کے عالم میں مجھ سے کہا۔

ہم دونوں اس جگہ سے نکلے اور خطرناک ترین جنگل میں گم ہوتے چلے گئے۔ مگر گم ہونے سے پہلے اس

نے قریبی سفیدے کے درخت سے چند پتے توڑے اور ان کو ہاتھوں سے مسل کر تھوڑا سا حصہ اپنے نتھنوں کے درمیان پھنسا لیا۔ اس کے بعد اس نے یہی عمل میرے ساتھ بھی دہرا لیا، میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو اس نے انتہائی نرمی اور آہستگی سے میرے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا دی ۔اس کے ہاتھوں کے نرم و ملائم لمس نے میرے سارے وجود میں ایک ناقابل بیان لذت کی لہر دوڑا دی۔

حیران کن طور پر اس کی تیز رفتاری کو دیکھتے ہوئے بارہا مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ زمین پر پیدل نہ چل رہی ہو بلکہ تیر رہی ہو۔ حالانکہ وہ ایک ٹانگ سے زخمی بھی تھی اور میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی ٹانگ سے لہو بہتے دیکھا تھا۔ جبکہ اس کے آرام سے چلنے کے مقابلے میں مجھے دوڑنا پڑ رہا تھا اور میں کئی بار جھاڑیوں میں الجھ کر گرتے گرتے بچا تھا اور پھر آخر کار اس نے مجھے ایک ہاتھ سے پکڑ لیا۔ ایک بار پھر مجھے ایک انتہائی عجیب اور انوکھا سا تجربہ ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اتنی نرمی اور ملائمت تھی کہ جسے شاید لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہ ہو۔

راستے میں ایک جگہ اچانک وہ رکی اور اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے افراتفری اور انتہائی خوف زدگی کی کیفیت میں قریبی سرکنڈوں میں دھکا دیا اور خود بھی اسی طرف لپکی اور تقریباً میرے اوپر آن گری اور ایک بار پھر سے میری کیفیت ناقابل بیان ہوتی چلی گئی۔ یہ سرکنڈوں کا بہت بڑا جھنڈ تھا اور اس نے چاروں طرف سے ہمیں اپنی پناہ میں لے لیا ۔جہاں ہم گرے تھے وہاں ہمارے نیچے بھربھری مٹی پڑی ہوئی تھی وہ سنبھلتے ہی آہستگی سے اس مٹی پر گری اور پھر اس نے ایک انتہائی عجیب و غریب حرکت شروع کر دی۔ اس نے شور زدہ مٹی اپنے اوپر ملنا شروع کر دی۔ وہ مٹی اس نے اس حد تک اپنے اوپر ملی کہ اس کا چہرہ اور تمام کپڑے اس مٹی کی وجہ سے خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے مگر وہ پاگلوں کی طرح آہستگی سے کوئی بھی آواز پیدا کیے بغیر یہ عمل دہراتی ہی رہی۔ اس عمل میں وہ اس قدر منہمک ہوئی کہ اسے اردگرد کا بھی ہوش نہ رہا اور

پھر جیسے اچانک ہی اس کی مجھ پر نظر پڑی تو اس نے مجھے بھی ایسا ہی کرنے پر مجبور کیا اور اس کے کہنے پر مجبوراً مجھے یہ سب کرنا پڑا۔ سرد رات کی اوس میں بھیگی ہوئی مٹی کثرت سے جسم پر ملنے کی وجہ سے ہماری شکلیں بھی بدل گئیں۔ اس حالت میں اور اس جنگل میں رات کے اس وقت اگر کوئی ہمیں دیکھ لیتا تو یقیناً بھوت بھوت کا راگ الاپتا ہوا بھاگ جاتا۔

اس کی اس بے اختیارانہ حرکت کی وجہ سے میں سوچ رہا تھا کہ ”اس نے آخر ایسا کیوں کیا؟ پہلے تو اس نے مجھے اور خود کو سرکنڈوں کے جھنڈ میں چھپانے کی کوشش کی اور بعد میں اس نے جسم پہ مٹی ملنے والا ڈرامہ شروع کر دیا اور پھر مجھے بھی اس میں زبردستی شامل کر لیا۔ یہ سب کرنے سے اس کا مقصد کیا تھا آخر؟ اس کے چہرے کے تاثرات سے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کسی سے بہت زیادہ خوف زدہ تھی اور اپنے آپ کو چھپانے کے لیے ہی اس نے سرکنڈوں کے جھنڈ میں مجھے اور خود کو کیموفلاج کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے مٹی کیوں ملنا شروع کی؟“

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اردگرد کی زمین ہلنے لگی ہو۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے کوئی بھاری بھرکم طاقت اس جنگل میں داخل ہو گئی ہو اور وہ طاقت اس پورے جنگل کو تہس نہس کرنے کے درپے ہو۔ وقفے وقفے سے درختوں کے اچانک ٹوٹ کر زمین بوس ہونے کی آواز سنائی دینے لگی اور کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے ہمارے آس پاس کے سرکنڈوں پر کوئی بہت بڑا رولر پھیر اجا رہا ہو، جیسے ہی کوئی درخت ٹوٹ کر زمین بوس ہوتا اس پر آشیانہ بنا کر رہنے والے پرندے اس اچانک افتاد سے گھبرا کے رات کے اندھیرے میں اپنی اپنی بولیوں میں واویلا کرتے ہوئے اڑتے اور کسی پناہ گاہ کی تلاش میں کہیں قریب ہی گر کے خاموش ہو جاتے۔ رات کے پرسکون ماحول میں یہ آفت جانے کہاں سے در آئی تھی۔

رات کے اس پہر جنگل میں یہ کیا شروع ہو گیا تھا

۔نہ کوئی آندھی نہ طوفان۔ اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس سارے فساد کی جڑ کہیں نظر بھی نہیں آ رہی تھی۔ یہ سارا شور شرابہ اور واویلا کافی دیر تک جاری رہا اور پھر اچانک جنگل ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور یہ خاموشی اتنی گہری اور بھیانک تھی کہ مجھے اس میں اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔

جانے آج میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ ۔میرے ساتھ موجود وہ حسینہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی ؟ جنگل میں یہ بھاری بھرکم دھمک اور درختوں کا اپنے آپ جڑ سے اکھڑ کے گر جانا۔ یہ سب کیا تھا؟! انتہائی تجسس اور پے در پے حیرتوں نے میرا دماغ گھما کے رکھ دیا۔

اگر کسی ماورائی اور مافوق الفطرت مخلوق کی کارروائی ہے تو پھر میرے ساتھ موجود حسینہ بھی اسی مخلوق سے تعلق رکھتی ہے اور اگر یہ اسی قبائل سے ہے تو پھر انگلش میں بات کیسے کر رہی تھی؟ اس کی بات چیت کے انداز سے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ خود انگریز ہے اور اگر انگریز نہیں تو انگریزوں کی زبان ان ہی کی طرح بولنے پر بھرپور دسترس ضرور رکھتی ہے اور ایک مافوق الفطرت مخلوق کا اہل زبان کی طرح انگلش بولنا چہ معنی دارد؟

جنگل کو مکمل طور پر خاموشی کا لبادہ اوڑھے جب کافی دیر ہو گئی تو سرکنڈوں کی جڑ میں گھسی اور مکمل طور پر کیموفلاج کی تصویر بنی وہ حسینہ اپنی جگہ سے آہستگی سے اٹھی۔ کھڑے ہوتے ہی اس نے ایک بار پھر سے آسمان کی وسعتوں میں دیکھا۔ اوپر آسمان کی طرف اس کا دیکھنا بھی مجھے عجیب سا لگا۔ وہ کچھ دیر یونہی اردگرد چاروں طرف دیکھتی رہی۔ اسی دوران میں بھی کھڑا ہو گیا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ ہر سو اندھیرے کی مہیب اور گہری چادر کے پھیلاؤ نے میری آنکھوں کو جلد ہی ناکامی سے دوچار کر دیا مگر اتنا میری نظروں نے ضرور دیکھ لیا کہ قریب ہی ایک درخت جڑ سے یوں اکھڑا پڑا تھا جیسے کسی بڑی کرین سے اسے اکھاڑ اگیا ہو اور اس درخت کی تباہ کاری سے اندازہ ہوتا تھا کہ باقی جنگل کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔

اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا اور خدا کا شکر ہے کہ ہم کسی نئی مصیبت کا شکار ہوئے بغیر صبح کی پہلی کرن سے کچھ پہلے ہی شہر پہنچ گئے ۔کلینک کے ساتھ ہی ڈاکٹر بشیر کا گھر تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے آنکھیں ملتا ہوا ایک بچہ نکلا۔ میں نے اس سے اپنا تعارف کروایا اور اپنی آمد کا مقصد بیان کیا اور یہ بھی کہا کہ ”میری دور پرے کی ایک رشتہ دار بھی میرے ساتھ ہے اور اس کی ایک ٹانگ زخمی ہے...... ابھی میں یہ بات کر ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر بشیر بذات خود باہر چلا آیا اس نے مجھے دیکھا تو ہماری شکلیں دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا مگر چونکہ وہ مجھے پہچان چکا تھا اس لیے خاموش ہو گیا۔ شاید وہ عجلت میں تھا اس لیے بیٹھک کا دروازہ کھولنے کے بعد وہ ایک بار پھر گھر میں چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ واپس آیا تو اس نے میری سچ اور جھوٹ پر مبنی داستان الم سننے کے بعد حسینہ کی مرہم پٹی کر دی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس نے میری بات پر یقین کیا یا نہیں۔ بہرحال اس نے اسی وقت اپنے بیٹے سے کہہ کر گھوڑا منگوایا اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد بیٹھک میں ہی اس کا بیٹا مجھے ناشتہ دے کر اسکول روانہ ہو گیا اور میرے ساتھ موجود حسینہ کو اندر بلا لیا گیا۔ بے انتہا تھکن کی وجہ سے جلد ہی میں دنیا و مافیہا سے بے خبر سو گیا ۔شام سے کچھ دیر پہلے کسی کے جھنجھوڑ کر جگانے سے میری آنکھ کھلی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ رات والی حسینہ کو ایک مختلف روپ میں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس نے نہا دھو کر کپڑے بھی بدل لیے تھے اور ان سادہ سے کپڑوں میں بھی وہ انتہائی غضب ڈھا رہی تھی۔

مجھے بھی اس نے ایک سادہ سا استعمال شدہ سوٹ دیا اور کہا کہ میں اسے نہا دھو کر پہن لوں اور اتنے میں وہ میرے لیے چائے لے کر آتی ہے۔ بیٹھک کے ساتھ ہی بنے باتھ روم میں نہا دھو کر اور اس کا دیا ہوا سادہ سا سوٹ پہن کر جب میں باہر نکلا تو میری طبیعت کافی زیادہ فریش ہو گئی تھی۔ ابھی میں چارپائی پہ بیٹھا ہی تھا

کہ وہ چائے لے کر آ گئی۔ چائے پینے کے دوران حال احوال پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس نے بڑی مشکل سے ڈاکٹر کی گھر والی کو سمجھایا ہے کہ وہ کون ہے اور میرا اور تمھارا رشتہ کیا ہے وہ تو خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر کی بیوی لکھی پڑھی تھی جس نے مجھ سے انگلش میں بات کی اگر وہ ان پڑھ ہوتی تو جانے کیا ہوتا۔ میں نے اس کی پریشانی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"ویسے بائی داوے! تو پھر تم نے کیا بتایا کہ ہمارا آپس میں کیا رشتہ ہے۔"

"ویری سمپل! میں نے کہہ دیا کہ تم میرے بوائے فرینڈ ہو اور میں تمہارے ساتھ جنگل میں پکنک منانے گئی ہوئی تھی اور اسی پکنک کے دوران رات ہو گئی اور ہم نے خوب انجوائے کیا اور پھر صبح ہوتے ہی اس سے پہلے کہ ہم گھر کا رخ کرتے۔ ہم یہاں چلے آئے کیونکہ مجھے پکنک کے دوران ٹانگ پر ایک گہرا زخم آ گیا تھا اور بس۔" اس نے میری طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ویری گڈ، ویری گڈ۔ اور میرا خیال ہے کہ بیگم صاحبہ نے اس پر یقین بھی کر لیا ہو گا۔ بہت بھولی اور معصوم ہیں بے چاری۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ یقین تو انہیں کرنا ہی تھا۔ اور پھر میری کہانی پر یقین کرنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا ناں۔" اس نے ایک بار پھر سے مجھے کچھ عجیب ادا سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کیا مطلب؟" میں نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" وہ اچانک اٹھی اور اس نے مجھے زبردستی بازو سے پکڑتے ہوئے ایک بار پھر کہا۔ "آؤ ناں۔"

ہم گھر کے اندر اس کمرے تک پہنچ چکے تھے جہاں اس وقت ایک عورت اور ایک بچہ چارپائیوں پر رسیوں سے بندھے پڑے تھے اور ان کے منہ پر میڈیکو ٹیپ لگی ہوئی تھی۔ ایک لمحے میں مجھے ساری صورت حال کی سمجھ آ گئی۔

جونہی ہم اندر داخل ہوئے تو عورت نے مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھا اور آنکھوں کے اشارے سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ میں نے جلدی سے اپنے دل میں ایک فیصلہ کیا اور عورت کے منہ سے میڈیکو ٹیپ اتارتے ہوئے اردو میں کہا۔

"شور مت کرنا خالہ جی۔ یہ سب کچھ ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہو گیا ہے۔ یہ دراصل میری بیوی ہے اور میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں خود اس کی وجہ سے کتنا پریشان ہوں۔ اللہ جانے کیا بیماری ہے اسے؟ رات کے دو بجے اسے پھر سے دورہ پڑا۔ دورے کے دوران میں نے کئی اور لوگوں کے ساتھ مل کر اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر جانے کیا ہوا کہ یہ جنگل کی طرف بھاگ اٹھی۔ ساری رات میں جنگل میں اس کے پیچھے خوار ہوتا رہا۔ صبح کہیں جا کر یہ ملی تو زخمی حالت میں تھی۔ میں اسے یہاں ڈاکٹر صاحب کو دکھانے کے لیے لے آیا۔ انہوں نے اس کی مرہم پٹی کی اور خود گاؤں میں نمبردار صاحب کے بیٹے کو دیکھنے چلے گئے۔ نمبردار کے بیٹے کا مجھے اتفاقی طور پر معلوم ہوا تھا۔ میں نے سوچا جب میں آپ کے پاس آ ہی گیا ہوں تو کیوں نہ نمبردار کے بیٹے کے بارے میں بھی بتا ہی دوں کیونکہ وہ بے چارے اپنے بیٹے کی وجہ سے کافی پریشان تھے۔ ڈاکٹر صاحب یہ سنتے ہی گاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد جب مجھے آپ لوگوں نے ناشتہ دیا تو اسے اندر بلا لیا۔ اس سے میں یہی سمجھا کہ شاید ڈاکٹر صاحب نے اس کے بارے میں بتا دیا ہو گا۔ میں اپنی بیوی کی حالت کے پیش نظر اسے بیٹھک میں بلانا ہی چاہتا تھا کہ اسی دوران مجھے نیند آ گئی اور میں چونکہ رات بھر کا تھکا ہوا تھا اس لیے ایسے گھوڑے بیچ کے سویا کہ اب اٹھا ہوں۔

آپ یقین کریں آپ کو ایسی حالت میں دیکھ کر مجھے انتہائی دکھ ہو رہا ہے۔ میں اس کی طرف سے آپ

سے انتہائی معذرت خواہ ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ڈاکٹر بشیر کی بیوی کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"بھلے آدمی! تمہیں جب اپنی بیوی کی حالت کے بارے میں اچھی طرح معلوم تھا تو تمہیں مجھے بتانا تو چاہیے تھا کم از کم۔ میں صبح ہی سے یہاں بندھی پڑی ہوں۔ اسکول سے میرا بچہ آیا ہے تو اس نے اسے بھی باندھ کر ڈال دیا ہے وہ تو شکر ہے کہ آج کلینک سے کوئی نہیں آیا، ڈاکٹر صاحب کا پوچھنے۔ شاید وہ ڈاکٹر نعمان کو بتا کر گئے تھے۔ اسی لیے تمھاری بچت ہو گئی ورنہ اب تک جانے کیا ہو چکا ہوتا اور ایک تمہاری یہ میم صاحبہ ہیں کہ انہیں انگلش کے سوا کسی اور زبان کی شاید سمجھ ہی نہیں آتی۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ اتنی انتہائی حسین و جمیل اور پڑھی لکھی لڑکی اور وہ بھی گاؤں میں؟ اور یہی سوال جب میں نے اس سے کیا تو یہ محترمہ مجھے مطمئن نہیں کر سکیں اور پھر اچانک جانے اسے کیا ہوا کہ یہ اوٹ پٹانگ سی باتیں کرنے لگی اور اس کے ساتھ ہی اس نے غصے میں مجھے چارپائی سے باندھ کر میڈیکو ٹیپ سے میرا منہ بند کر دیا اور اسکول سے جب میرا بچہ آیا تو اس نے بچے کے ساتھ بھی یہی کیا۔ واٹ نان سینس۔ آخر ہے کیا؟ اس نے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس وقت تک میں نے بیگم صاحبہ اور اس کے بچے کی رسیاں کھول دی تھیں۔ لہٰذہ آزاد ہوتے ہی اس کا بچہ منہ بسورتے اور روتے ہوئے اس کی گود میں منہ گھسیڑ کر بیٹھ گیا۔ میڈم کی خود اعتمادی لوٹ آئی اور اس نے مجھ سے وہ چبھتا ہوا سوال کیا اور اس کے سوال کرنے کے انداز سے مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے میری سنائی ہوئی کہانی پہ کچھ نہ کچھ اعتبار کر لیا ہے۔

میڈم اس کی مرض کے بارے میں تو کوئی ڈاکٹر ہی بہتر طور پر بتا سکتا ہے مجھے کیا معلوم۔ میں نے میڈم کی طرف بے پرواہ سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے غصہ تو اس پر بہت ہے مگر تمھاری بات سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ مجھے کم از کم ڈاکٹر صاحب کے آنے سے پہلے تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہیے۔ اب ان کے آنے تک تمہیں یہیں رہنا ہو گا۔ اور اب تم دونوں جا کے بیٹھک میں بیٹھو۔ میں اتنی دیر میں کھانا وغیرہ تیار کر لوں۔"

بیٹھک میں پہنچتے ہی ہم نے آہستگی سے آپس میں گفتگو کی اور فوری طور پر یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ رات والا زیور اس نے صبح ڈاکٹر بشیر کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی اتار کر ایک پوٹلی میں باندھ لیا تھا اور یہ پوٹلی اس وقت بیٹھک میں ہی ہمارے پاس موجود تھی۔ اتنی دیر میں ہر سو شام کا دھندلکا پھیلتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دوپٹے کے پلو کو نقاب کے طور پر استعمال کیا اور جلد ہی ہم شہر سے باہر ایک سنسان سے قبرستان تک پہنچے اور یہیں سے جنگل کے ایک سرے سے ہوتے ہوئے ایک طویل فاصلہ طے کر کے دریا کو پار کرتے ہوئے مجھے اپنے گاؤں تک پہنچنا تھا مگر جونہی ہم قبرستان کے وسط میں پہنچے تو اس نے مجھے بازو سے پکڑ کے روک لیا۔

پہلی راتوں کا چاند اپنی ہلکی اور مدھم سی روشنی لیے آسمان کی وسعتوں کے درمیان جلوہ گر ہو رہا تھا۔ قبرستان سے جھینگروں اور حشرات الارض کی مختلف آوازیں ماحول کو انتہائی عجیب خوفناک بنائے دے رہی تھیں۔ قریبی درخت کی شاخ پر بیٹھے الو نے ہمیں دیکھ کر اپنی زبان سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ شاید اسے ہماری بے وقت قبرستان میں آمد ناگوار گزری تھی۔ اتنے میں ہمارے قریب سے تین چار کتے ایک دوسرے پر غراتے ہوئے گزرے۔ مگر خیریت گزری کہ کسی نے ہم پر غرانے کی کوشش نہیں کی ورنہ اس وقت شاید ہم اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ ان کی کسی بھی جارحانہ کارروائی کا جواب دے سکتے۔ قبرستان سے کچھ ہی دور کچی مٹی سے بنی ایک کٹیا نظر آ رہی تھی۔ خدا جانے وہ گورکن کا مسکن تھا یا پھر کسی اور کی جھونپڑی۔

اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور قریبی درخت کے نیچے لے گئی۔ یہاں دو قبروں کے درمیان خالی جگہ پر اس نے مجھے زبردستی بٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے ہم دونوں کے راستے الگ ہو

رہے ہیں کیونکہ میں تمہارے ساتھ تمہارے گاؤں نہیں جانا چاہتی۔ اس لیے مجھے آپ یہیں سے الوداع کہہ دیں۔ رات آپ نے جو مہربانی اور احسان مجھ پر کیا میں اسے زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ میں چاہتی تو آج دن ہی میں کسی بھی وقت اس گھر سے نکل کر جاسکتی تھی مگر میں نہیں گئی صرف اس لیے کہ میں آپ کا بھرپور انداز میں شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی اور میں آپ کی خدمت میں ایک حقیر سا نذرانہ بھی پیش کرنا چاہتی تھی۔ یہ اس احسان کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں جو کہ آپ نے مجھ پر کیا مگر پھر بھی یہ میری دلی خواہش ہے کہ آپ اسے دل سے قبول کرلیں۔"

"اچھا مذاق ہے بھئی! یہ کیا بات ہوئی؟ یہ کیسی باتیں کررہی ہو تم؟ اور کس احسان کی بات کرتی ہو؟ پہلی بات تو یہ کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا اس لیے شکریہ ادا کرکے تم مجھے شرمندہ کررہی ہیں۔ دوسری یہ نذرانے والی بات کیا ہوئی؟ آپ کا ہمارا تعلق اس مقام تک کب سے پہنچ گیا کہ بات نذرانوں تک جا پہنچی۔ بھئی ایک رات دو مجبور مسافر اپنی اپنی ضرورتوں کے تحت ہمسفر رہے۔ اب اگر وہ مسافر اس دوراہے پر آن پہنچے ہیں جو ان دونوں کو جدا کردیتا ہے تو میرے خیال میں انہیں خوشی سے جدا ہوجانا چاہیے۔ دیٹس آل۔ اس میں اتنا سیریس ہونے والی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے دکھتے ہوئے دل، مگر بظاہر بے پرواہی سے کہا۔

"میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ یہ سب باتیں کس دل سے کہہ رہے ہیں مگر میں داد دیتی ہوں آپ کے حوصلے اور تحمل کی ورنہ آج تک میں نے کبھی کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو ایک بار مجھ سے ملا ہو اور پھر......... خیر یہ وہ موضوع ہے جو اس وقت کے لحاظ سے قطعاً موزوں نہیں اور پھر مجھے ایسی باتیں کرنے کی عادت بھی نہیں۔ بہرحال مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میرا دل تمہیں ایک خاص مقام دے چکا ہے اور میری زندگی میں یہ پہلی بار ہوا ہے اور یہ ایک انوکھا اور عجیب تجربہ ہے مگر کیا کروں۔ میں وہ غلطی نہیں کرنا چاہتی جو میری زندگی کو شاید زندگی نہیں کسی اور ہی رنگ میں رنگ دے اور پھر موجودہ حالات میں میں اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔"

سچ تو یہ ہے کہ اس کی جدائی والی باتیں سن کر میرا دل خون کے آنسو رورہا تھا جانے کیوں وہ مجھ سے جدا ہونے پر بضد تھی اور اس ویران قبرستان سے وہ کہاں جانا چاہتی تھی۔ شاید اس کا گاؤں کوئی اور تھا اور وہ مجھے اپنے گاؤں تک اپنے ساتھ لے کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے ملی بھی تو انتہائی عجیب وغریب اور حیران کن حالات میں تھی۔ پھر وہ اگر کہیں جانا بھی چاہتی ہے تو میں اس کی منزل تک ساتھ چلتا ہوں اور اسے گھر چھوڑ کر واپس لوٹ آؤں گا مگر شاید وہ مجھے اپنے گھر نہیں لے جانا چاہتی۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ ہوگی اس کی کوئی مجبوری۔ میں نے دل میں سوچا۔

"کہاں گم ہوگئے .... یہ پوٹلی پکڑو اور مجھ غریب کی طرف سے یہ ایک حقیر سا تحفہ سمجھ کے لے جاؤ اور ہاں جب تمہاری شادی ہو تو ہمیں بلانا ضرور۔ ہم اس خوش نصیب سے ملنے ضرور آئیں گے جو آپ کی زندگی میں بہاریں لے کر آئے گی۔" اس نے مجھے اپنے خیالات سے چونکاتے ہوئے کہا۔

اس وقت اس کی جدائی کے خیال نے مجھے اردگرد کے ماحول سے یکسر بے نیاز کرکے رکھ دیا تھا اور میں اپنے خیالوں میں مگن جانے کیا سے کیا سوچے جارہا تھا۔ مگر اس کی پوٹلی پکڑانے والی بات نے مجھے انتہائی حیرت زدہ کرکے رکھ دیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس پوٹلی میں کیا تھا۔ اس پوٹلی میں اتنا سونا تھا جو کہ میری معاشی حالت کو یکسر بدل کے رکھ دیتا اور میں جھونپڑی سے نکل کے شہر میں آرام سے ایک آسودہ زندگی بسر کرسکتا تھا۔ مگر جانے کیوں میرا دل یہ سب کرنے کو منع کررہا تھا۔ سونے کی پوٹلی کے حوالے سے اس کا اصرار بڑھتا چلا گیا مگر نے بھی ایک بار نہ کی تو پھر ہاں نہیں کی۔ آخرکار جانے کب بے اختیاری میں میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور میرے اندر کا دکھ الفاظ کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔

"اس فانی اور چند روزہ دنیا میں ابھی میں نے آنکھ بھی نہیں کھولی تھی کہ میرے چچازاد بھائیوں نے میرے ماں باپ کو قتل کردیا۔ وجہ قتل وہ پانچ مربع اراضی تھی جو کہ میری پیدائش کی صورت میں ان کے ہاتھ سے نکلتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ ہوا یوں کہ میرے والدین کے ہاں کافی عرصہ اولاد نہیں ہوئی مگر جب میرے ماں باپ مایوس ہوگئے تو اللہ پاک نے کرم کردیا۔ جمعرات کو ایک روز جب میری ماں کئی بھوکوں کو کھانا کھلا کر گھر میں داخل ہورہی تھیں تو ایک عجب سا بھکاری انہیں اپنے دروازے پہ کھڑا نظر آیا۔ مگر جسے وہ بھکاری سمجھ رہی تھیں وہ بھکاری نہیں کوئی اور تھا۔ اس نے میری ماں کو دیکھتے ہی کمال شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے جلالی سے لہجے میں فرمایا۔

"بی بی! جھولی آگے کرو۔"

میری ماں اس بھکاری کی آواز سن کر گھبرا گئیں۔ آج تک وہ بھکاریوں کی جھولی بھرتی آئی تھیں۔ یہ عجب بھکاری تھا جو اسے جھولی پھیلانے کو کہہ رہا تھا اور پھر جانے ان کے من میں بھی کیا آئی کہ انہوں نے اس بھکاری کے سامنے دامن پھیلا دیا۔

اس فقیر نے میری ماں کی جھولی کی طرف ہاتھ یوں بڑھایا کہ جیسے ان کی جھولی میں کچھ ڈالنا چاہتا ہو اور پھر واقعی اس نے میری ماں کی جھولی میں ایک تسبیح ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"جاؤ بی بی اللہ پاک نے تمہیں بیٹے سے نواز دیا ہے۔ مگر وہ جونہی پیدا ہو اس کے گلے میں یہ تسبیح ڈال دینا اور اس سے کہنا کہ وہ کبھی اور کسی بھی حال میں یہ تسبیح اپنے وجود سے جدا نہ کرے اگر وہ یہ تسبیح گلے میں نہ ڈال سکے تو اپنی جیب میں ضرور ڈال کر رکھے۔ اللہ پاک اس کی مدد فرمائے گا۔"

"ٹھیک ہے بابا جی۔" میری ماں نے عقیدت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ اگلے لمحے انہوں نے آنکھیں کھولیں تو ان کے سامنے کچھ بھی نہ تھا مگر ان کی جھولی میں تسبیح ضرور تھی۔

پچاس سال کی عمر میں جب میرے والدین کو اللہ پاک نے اولاد جیسی نعمت سے نوازا تو ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ غریب غرباء اور حقداروں کی جھولیاں بھردی گئیں اور انہوں نے اپنی اوقات سے بھی بڑھ کر صدقہ اور خیرات کیا مگر میری صورت میں پانچ مربعوں کا وارث دیکھ کر میرے تایا جان اور چچازاد بھائیوں کو آگ سی لگ گئی۔ وہ جو میری پیدائش سے پہلے میرے والد کی ہر چیز کو اپنا تصور کیے بیٹھے تھے انہیں جب اپنے ہاتھ سے پانچ مربع اراضی نکلتی نظر آئی تو انہوں نے میرے والدین کو رات کے اندھیرے میں بے دردی سے قتل کردیا مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھے بھی قتل کر دیتے مجھے میرے والدین کے ایک وفادار نوکر نے پنگھوڑے سے نکالا اور ان کی نظروں سے چھپتا چھپاتا دریائے راوی کے کنارے راج نگر میں آگیا۔ یہ علاقہ ہمارے آبائی گاؤں سے کافی دور تھا۔ یہیں پر ہمارے اس وفادار نے مجھے پالا۔ اس بے چارے کا بھی آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ میری صورت میں اسے زندگی کا مقصد مل گیا۔ اس نے گاؤں کی چوکیداری اپنے ذمے لی اور میری کفالت کرنے لگا۔

جیسے تیسے کرکے اس نے مجھے پڑھایا۔ اور پھر ایک دن وہ سایہ دار درخت بھی مجھے زمانے کی تپتی سلگتی دھوپ کے حوالے کرکے روتا بلکتا چھوڑ کر سفر ابدی پر روانہ ہوگیا......... اور میں اس کے جنازے کو کندھا دیے اپنے من میں جانے کیا کیا سوچتا رہا مگر کچھ بھی نہ کرسکا مگر مجھے اس دنیا اور اس کے باسیوں سے الجھن سی ہونے لگی۔ میرے دل میں نفرت کا غبار سا جمع ہونے لگا۔ کراہیت سی آنے لگی مجھے اس دنیا کے پیچھے کتوں کی طرح بھاگتے ہوئے لوگوں سے۔ کبھی کبھی میرے دل میں نفرتوں کا زہر جمع ہونے لگتا اور میں چاہتا کہ ابھی ابھی اپنے آبائی گاؤں جاؤں اور قتل کردوں ان پیارے قاتلوں کو جنہوں نے مجھ سے میری ماں کا پیار اور باپ کی شفقت چھین لی۔ ایسے میں مجھے چاچا برکت علی (وفادار نوکر) کی آواز دور کہیں سے آتی ہوئی سنائی دیتی۔

"تو پھر تم میں اور ان ظالموں میں فرق کیا ہوا بیٹا۔ یہ دنیا چند روزہ ہے پتر۔ اپنے من کے اندر جھانک۔ اپنے ضمیر کی آواز سن۔ ظالموں کی صف میں شامل نہ ہو۔ مخلوق سے امیدیں وابستہ نہ کر۔ خالق کی تلاش میں نکل اور اس سے پہلے کہ تیرا حشر بھی یہ ہو کہ قبر میں تجھے کیڑے کھا جائیں تو ان کیڑوں کو تباہ کردے جو تیرے ضمیر کو مردہ سمجھ کے روز ہی اپنے پاپی پیٹ کی پیاس بجھانے پر تلے رہتے ہیں۔"

اور میں چاچا برکت علی کی سمجھ میں نہ آنے والی باتوں میں کھوسا جاتا.........اور پھر یونہی دربدری میں ایک رات تم مجھ سے آن ملیں تو مجھے یوں لگا کہ جیسے مجھے میری منزل مل گئی ہو۔ میرے اندر نفرت کا زہر اچانک ہی تریاق میں بدلتا نظر آیا۔ تمھاری صورت میں مجھے اپنے جیون کی آس کا پودا پھلتا پھولتا نظر آیا مگر شاید جسے میں صحرا کی تپتی سلگتی ریت میں نخلستان سمجھا وہ سراب کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

دکھ اس بات کا نہیں کہ تم نے میرے پیار کی قدر نہیں کی بلکہ دکھ اس بات کا ہے کہ تم نے بھی مجھے وہی عام سا بھکاری سمجھا جو زندگی بھر در در کا بھکاری بن کے ذلیل وخوار ہوتا رہا اور کبھی ایک در کا بھکاری بن کے نہ بیٹھا اور اگر وہ ایسا کر لیتا تو مجھے قسم ہے رب ذوالجلال کی کہ ایک دن ایسا آتا کہ اللہ پاک اسے ہر چیز سے بے نیاز کر کے وہ بھی عطا کر دیتا جو کہ بادشاہ وقت اور سلاطین کے خزانوں میں بھی نہیں پایا جاتا۔"

میری درد بھری روداد سن کر وہ حیران سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ اپنے دل میں میرے لیے جانے کیا کیا سوچ رہی ہوگی مگر مجھے اس سے کیا۔ اسے جانا تھا تو بے شک جائے مگر میں اس سے کسی بھی صورت وہ سونے کی پوٹلی نہیں لینا چاہتا تھا جسے وہ جانے کس مقصد کے تحت مجھے دینا چاہ رہی تھی۔ یہ دولت ہی تو تھی جس نے مجھ سے میرے والدین کو چھین لیا تھا۔ مجھے نفرت ہے ایسی دولت سے جو رشتوں اور ناتوں کی تمیز تو کیا انسان کو انسانیت ہی بھلا دے۔

"یہ سونا مبارک ہو تمہیں، میرے دل کے نہاں خانوں میں اتر جانے والی خوبصورت دلنشین ودلنواز حسینہ۔ میرے پاس تمہارے سنگ بیتے ہوئے چند پیار بھرے لمحوں کی یاد......اس سونے سے کہیں زیادہ قیمتی اور انمول ہے...... تمہیں جانا ہے تو جاؤ مگر میرے پیار کو اس فانی دنیا کے پیمانوں میں مت تولو......ورنہ میرے دل کے اندر ایک ایسا سوگ، بھرا دھواں بھر جائے گا جو ساری زندگی مجھے بے چین و بے قرار رکھے گا......

اور پھر جانے کب تک وہ مجھے حیران نظروں سے تکتی رہی۔ اچانک وہ اٹھی اور میرے گلے سے آ لگی۔ میری روح کے اندر ایک گہرا اور بے کراں سکوت اترتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ قبرستان میں ہر سو پر ہول سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی دور کہیں جنگل سے گیدڑوں کے چلانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار بھری باتیں کرنے میں یوں محو تھے کہ ہمیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اسی دوران میں نے اس سے پوچھا۔

"اب جب ہم میں کچھ باتیں طے ہو چکی ہیں اور میں تم کو اپنے بارے میں مکمل آگاہی دے چکا ہوں تو کیا تم اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند فرماؤ۔"

"کیوں نہیں! اب آپ کو نہیں بتاؤں گی تو اور کسے بتاؤں گی۔ میرا نام جگنی ہے اور آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیسا نام ہے مگر یہ میرا اصل نام نہیں ہے۔ میرے والدین نے میرا یہ نام کیوں رکھا شاید اس لیے کہ ملک پاکستان کے لوگوں سے ان کے گہرے مراسم ہیں اور یہاں وہ کافی عرصے رہائش پذیر بھی رہے اور یقیناً میرا نام وہ یہیں سے لے کر گئے ہوں گے۔

میرا تعلق پریوں کے کانجوی قبائل سے ہے اور میرا آبائی دیس تبت کی بلند وبالا اور پر اسرار پہاڑیاں ہیں۔ یہیں پر میرا جنم ہوا اور یہیں سے میں نے بالکل انسانوں کی طرح تعلیم حاصل کی کیونکہ میرے والد بھی

آپ کی طرح ایک انسان ہیں مگر مجھ میں انسانوں کے ساتھ ساتھ پریوں کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں مگر اس چیز کا میں نے کبھی انسانوں کے سامنے اظہار نہیں کیا۔ دوران تعلیم میں اپنی اصل شکل میں کبھی سکول نہیں گئی۔ اب بھی میرے تعلیمی سرٹیفکیٹس پر جو تصویر ہے وہ بالکل ایک نارمل چینی لڑکی کی ہے۔ میری والدہ کا تعلق پریوں کے کانجوی قبائل سے ہونے کی وجہ سے ہمارا کافی وقت اپنے قبائل ہی میں گزرا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے قبائل کی بدستور ملکہ ہیں اور قبیلے کے تمام انتظامات انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ میرے والد صاحب ملازمت کی وجہ سے زیادہ تر وقت پاکستان میں ہی رہتے رہے۔

والدہ اور مجھ سے میل ملاپ کا انہیں زیادہ تر مسئلہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ امی مجھے اکثر رات کے اندھیرے میں ان سے ملانے کے لیے اپنے ساتھ لے آیا کرتی تھیں۔ پری ہونے کی وجہ سے ہمیں ٹرانسپورٹ کی محتاجی تو تھی نہیں البتہ اس سلسلے میں ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا مگر یہ احتیاط تو ہماری مجبوری تھی۔

ایم اے انگلش کے دوران میری ایک ہندو لڑکے سے ملاقات ہوئی۔ یہ لڑکا ہماری یونیورسٹی میں نیا نیا آیا تھا۔ جانے کیوں وہ مجھ میں حد سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ اس نے مجھ سے میری رہائش گاہ پوچھی تو میں نے اسے اس بارے میں بتانے کی بجائے جھاڑ دیا۔ شاید اس وجہ سے اسے میری ذات پر اور بھی شک ہوگیا۔ ایک دن اس بدبخت نے میرے سامنے میری حقیقت کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ میں دل میں تو اس کی یہ بات بتانے کی وجہ سے انتہائی حیران ہوئی مگر میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اب شاید وہ وقت آ گیا تھا کہ مجھے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ کر اپنے اصل میں لوٹ جانا چاہیے تھا مگر تعلیم میرا شوق تھا اور میں یہ شوق ہر حال میں پورا کرنا چاہتی تھی۔

اسی شام میں نے اپنی ماں کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ دوسرے دن وہ بھی بھیس بدل کر میرے ساتھ کالج تک جا پہنچیں مگر اس دن وہ ہندو لڑکا رام داس کہیں نظر نہ آیا۔ یونیورسٹی کے ریکارڈ سے اس کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ انڈیا کی ریاست مدھیہ پردیش کا رہنے والا ہے۔ رات کو ہمارے چند جاسوس اس کی کھوج میں نکلے مگر وہ تبت میں کہیں ہوتا تو ملتا۔

دوسری رات مدھیہ پردیش میں اس کے پتے پر اس کو تلاش کیا گیا تو وہ وہاں موجود تھا مگر ہمارے جاسوس اسے پکڑنے میں ناکام رہے کیونکہ وہ ایک مہا گیانی ہندو کا بیٹا تھا اور اس کے پتا اور خود اس کے پاس بھی کئی مافوق الفطرت شکتیاں موجود تھیں۔ جن میں دیووں کا ایک پورا قبیلہ بھی شامل تھا اور اسی قبیلے کے لوگ ان کے حفاظتی دستے میں موجود تھے۔ جاسوسوں نے جب واپس آ کر ہمیں یہ سب کچھ بتایا تو میری والدہ بہت پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے میرے گرد ایک حفاظتی حصار کھینچا اور مجھے گھر تک محدود کر دیا۔ مگر میں اس کی عادی نہیں تھی۔ کچھ عرصہ تو میں نے یہ سب برداشت کیا مگر آہستہ آہستہ اس قید نما حفاظت میں میرا دم گھٹنے لگا۔

ایک رات میں چپکے سے گھر سے نکلی اور آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرتے ہوئے اپنے کالج کی عمارت کی سمت بڑھی مگر ابھی میں راستے میں ہی تھی کہ ظالم دیووں کے جال میں پھنس گئی۔

وہیں انہوں نے اپنی ایک ساتھی سے میرا میک اپ کروایا اور قیمتی زیورات اور لباس عروسی پہنا کر مجھے مکمل طور پر دلہن کا روپ دے دیا۔ پھر انہوں نے مجھے سجی ہوئی ایک سنہری ڈولی میں ڈالا اور مدھیہ پردیش کے لیے روانہ ہوئے مگر اس دوران شاید میرے قبائل کے جاسوسوں کو خبر ہو گئی تھی اور انہوں نے اپنے ایک ہمدرد، دیووں کے قبائل سے میری بازیابی کے لیے مدد حاصل کر لی تھی مگر ان کی امداد پہنچنے تک ہندو رام داس کے غلام مجھے کافی دور لے آئے تھے۔

میرے حمایتی بھی کچھ کم نہ تھے انہوں نے تبت سے مدھیہ پردیش کے راستے میں موجود اپنے ایک

حمایتی قبیلے کو اس سارے معاملے سے آگاہ کیا اور ان سے مدد مانگی۔

میں بتاتی چلوں کہ ان کے ہاں پیغام رسانی کا ایک صدیوں پرانا طریقہ رائج ہے جو کہ انتہائی تیز ترین ہے۔ میں اس کی تفصیلات میں پڑ کر آپ کا قیمتی وقت برباد نہیں کرنا چاہتی۔

بہرحال رام داس کی حمایتی شیطانی قوتیں جونہی وہاں پہنچیں تو انہوں نے ان پر زبردست حملہ کر دیا۔ اس حملے کے دوران ہی کچھ شیطانی قوتوں نے میری ڈولی اٹھائی اور ان سے بچتے بچاتے پاکستان کی طرف بھاگے اور ان شیطانی قوتوں نے اپنے دشمنوں کو چکر دینے کے لیے ایک طویل فاصلہ طے کیا اور جب وہ دریائے راوی کے اس خطرناک جنگل کے اوپر سے گزرے تو انہوں نے اپنے دوستوں کو پیغام دینے اور کچھ دیر ستانے کے لیے یہاں کچھ دیر قیام کرنا چاہا۔ اسی دوران جانے کہاں سے گھوڑے پر سوار تم آ نکلے۔

تمہارا گھوڑا جو کہ انہیں اپنی آنکھوں سے جانور ہونے کی وجہ سے دیکھ رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی پیچھے کی طرف ہٹنا شروع ہوا اور ایک وقت آیا کہ تم اسے آزاد کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جونہی تم نے گھوڑا آزاد کیا اور پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا تو ایک عجیب سی بو تمہارے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہ بو انہی حرامزادوں کے جسموں سے ہر سو پھیل رہی تھی۔ اصل حقائق سے بے خبر تم ایک اندھی کھائی میں کودنے جا رہے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ میں اس وقت چاہتے ہوئے بھی تمہاری مدد نہیں کر سکتی تھی کیونکہ تمہاری نظر نہ تو ان شیطانی قوتوں کو دیکھ پا رہی تھی اور نہ ہی مجھے۔ اس صورت حال میں آخر کار مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ یہ عمل میں نے اپنی ماں سے سیکھا تھا۔

جلد ہی میری ڈولی اور میرا وجود تمہاری نظروں کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ مگر اس بات کا ان شیطانی قوتوں کو علم نہ ہو سکا کہ میں نے کیا کیا ہے۔ میری سوچ تو یہ تھی کہ تم مجھے دیکھ کر وہاں سے بھاگ جاؤ گے اور اس طرح سے اپنی جان بچا لو گے۔ مگر جب تم بہادری اور بے خوفی سے میری ڈولی کی طرف بڑھے تو مجھے اپنے کیے پر انتہائی پشیمانی ہوئی کیونکہ اب تمہاری موت یقینی تھی مگر اس کے بعد جو صورت حال پیش آئی اس کا تو مجھے گمان بھی نہیں تھا۔

جب ایک شیطان کا چیلا دیو تمہاری طرف بڑھا تو وہ اپنی ہزار کوششوں کے باوجود تمہیں چھو نہیں پایا۔ تمہارے وجود سے کچھ فاصلے پر ہی اس کا ہاتھ ہوا میں رک جاتا اور وہ کچھ بھی نہ کر پاتا۔ اس بات نے جہاں مجھے حیرت میں مبتلا کیا وہیں پر وہ شیطانی قوتیں بھی تم سے خوف زدہ ہو گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے کئی مختلف ہتھیاروں سے حملہ آور ہونا چاہا مگر وہ اس کوشش میں بھی بری طرح ناکام ہو گئے۔ اسی دوران تم ڈولی میں داخل ہوئے اور مجھے وہاں سے آزاد کروا دیا۔

میں تمہارے ساتھ جونہی ڈولی سے باہر نکلی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بھی شیطانی قوتیں مجھے اوپر آسمان میں کہیں معلق نظر آئیں۔ اس وقت ہماری طرف کسی کا بھی دھیان نہیں تھا۔ میں جلد ہی وہاں سے نکل کر کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچ جانا چاہتی تھی کیونکہ میں اس مخلوق کی تباہ کاریوں سے بخوبی واقف تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ جس معصوم شخص نے میری مدد کی ہے وہ ان شیطانی قوتوں کی بھینٹ چڑھ جائے۔ مگر شاید میں غلط سوچ رہی تھی کیونکہ جس شخص کی وجہ سے مجھے آزادی نصیب ہوئی تھی وہ کوئی معمولی شخصیت تو نہیں تھی۔

بہرحال ہم آگے بڑھتے رہے۔ مگر جلد ہی جنگل میں میرے حمایتی بھی پہنچ گئے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ میری اور تمہاری طرف کوئی بھی توجہ نہیں دے رہا تھا شاید کسی روحانی طاقت نے ان سب کی نظروں سے ہمیں اوجھل کر دیا تھا۔ اسی دوران میں نے دیکھا کہ آسمان میں معلق وہ مخلوق نیچے آ رہی تھیں اور مجھے محسوس ہو گیا کہ عنقریب دونوں گروہوں میں بھرپور تصادم ہونے والا ہے۔ حالات انتہائی خرابی کی طرف جا رہے تھے۔ گو کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں اپنے حمایتی اور دشمن دونوں قوتوں کو نظر نہیں آ رہی مگر پھر بھی میں نے اپنی تسلی کے لیے تمہیں سرکنڈوں میں دھکا دیا اور خود بھی وہیں پر جا چھپی اور پھر تم شاید وہاں دیکھ تو نہیں سکے کہ وہاں کیا ہو رہا تھا مگر درختوں اور جنگل کی تباہ کاری سے تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ کسی مافوق الفطرت قوت کی ہی کارروائی ہے۔ اس کے آگے کے حالات بھی تمہارے علم میں ہیں۔"

☆......☆......☆

کئی گتھیاں سلجھ چکی تھیں۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ قبرستان کی دل کو دہلا دینے والی خاموشی ہماری محبت بھری محویت کو توڑنے میں پوری طرح ناکام اور بے اثر ہو چکی تھی۔ ہم دونوں گفتگو میں یوں محو تھے کہ ہمیں اردگرد کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اسی دوران وہ واقعہ رونما ہوا کہ جس کا میں نے شاید تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔

پورے قبرستان میں ایک ناگوار بدبو پھیلی۔ پہلے پہل تو ہمیں اس کا احساس ہی نہیں ہوا اور جب ہمیں احساس ہوا تب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ ہمارے اردگرد نادیدہ قوتوں نے ایسا ناقابل شکست جال بن دیا کہ جس نے ہمارے لیے راہ فرار کے تمام راستے مسدود کر دیے۔ سب سے پہلے ان کے حملے کا شکار جگنی ہی ہوئی۔ کسی نادیدہ قوت نے اسے بالوں سے پکڑ کر آسمان کی بلندیوں کی طرف کھینچا۔ میں نے اس کا وجود آسمان کی بلندیوں کی طرف اچھلتے دیکھا تو مبہوت ہو کے رہ گیا۔ جگنی نے چلاتے ہوئے مجھے خبردار کرنے کی کوشش کی۔ سیکنڈ کے بھی ہزارویں حصے میں میں نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کیا اور آسمان کی طرف پرواز کرتے اس کے وجود کو پاؤں کی طرف سے مضبوطی سے تھام لیا۔ میرے وجود کو ایک زبردست جھٹکا لگا مگر جلد ہی میں سنبھل گیا اور جگنی کے آسمان کی طرف پرواز کرتے وجود کا ایک حصہ بن کے رہ گیا۔ جونہی ہمارے وجود آسمان کی وسعتوں میں پہنچے تو کسی نادیدہ طاقت نے بے دردی سے جگنی کے وجود کو ایک طویل چکر میں گھمانا شروع کر دیا۔ ان کا واضح مقصد یہی تھا کہ وہ مجھے جگنی کے وجود سے علیحدہ کرنا چاہتے تھے۔ بے انتہا خوف، حیرانی اور سنسنی کی اس کیفیت میں آسمان کو چھوتی بلندیوں کے درمیان ایک چکر میں جگنی کے پیروں سے لپٹا میرا وجود آج شاید پرزہ پرزہ ہونے والا تھا۔ جو آج میرے ساتھ ہو رہا تھا، میں نے زندگی بھر نہ تو کسی سے سنا تھا اور نہ کبھی دیکھا تھا۔ میں تو زندگی میں کبھی میلوں ٹھیلوں میں ڈر کی وجہ سے کبھی جھولے پر بھی سوار نہیں ہوا تھا کجا یہ کہ بغیر کسی ظاہری سہارے کے جگنی کے پاؤں سے لپٹا میرا وجود ہواؤں کی زد پر تھا اور اوپر سے کوئی ظالم اور بے رحم طاقت بے دردی اور بے رحمی سے جگنی اور میرے وجود کو گھمائے جا رہی تھی۔

اک انتہائی عجب، حیرتناک اور سنسنی خیز صورت حال نے میرا دماغ مفلوج کر کے رکھ دیا۔ میں نے اپنی ساری قوتیں اپنے بازوؤں میں سمو کر انتہائی مضبوطی سے جگنی کا پاؤں تھام رکھا تھا مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ تادیر یہ صورت حال برقرار رکھنا میرے لیے ممکن نہیں ہو گا۔ جلد ہی اس کے اثرات بھی مجھ پر واضح ہونے لگے۔ اس انتہائی سرد موسم اور تیز ہواؤں میں چکر کھاتا میرا وجود پسینے میں نہاتا چلا گیا۔ جگنی کے پاؤں کو تھامے رکھنا میرے لیے زندگی کی واحد امید بن کے رہ گیا۔ یہاں سے نیچے گرنے کا تصور ہی میرے لیے سوہان روح سے کم نہیں تھا۔ کسی نہ کسی طریقے سے میں نے جگنی کو تھامے رکھا مگر چکروں میں تیزی پہلے سے کہیں بڑھتی جا رہی تھی۔

اس ساری صورت حال میں ایک نکتے پر میرا ذہن آ کے رک گیا اور وہ نکتہ تھا زندگی سے موت کے سفر کا نکتہ۔

کیا آج یہیں آسمان کی وسعتوں میں چکر کھاتا میرا وجود پرزہ پرزہ ہو کے ہواؤں میں ہی کہیں بکھر جائے گا؟ کیا اسے ہی زندگی کہتے ہیں؟ موت کے پنجوں میں پھڑ پھڑاتی، خوف سے لرزتی، آسمان سے ٹکراتی بے رحم ہواؤں کی زد میں جلتے ایک بے نام دیے کی مانند۔

انتہائی تیز چکروں کی وجہ سے میرا وجود سن اور بے حس ہوتا چلا گیا اور شاید بے حس اور سن ہوتے وجود کے ساتھ میرا دماغ اور میری سوچ بھی سن ہوتی جا رہی تھی۔ اس دوران جگنی مجھے برابر پکارے جارہی تھی۔ شاید نہیں یقیناً اس بے رحم طاقت نے اسے بالوں سے پکڑ رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ بھی انتہائی تکلیف اور دکھ میں مبتلا تھی مگر وہ اپنی تکلیف اور دکھ کے اظہار کے ساتھ ساتھ مجھے برابر تسلی دینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت گو کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے مگر ایک واضح فرق اس صورت میں موجود تھا کہ اگر مجھ سے جگنی کے پاؤں چھوٹ جاتے تو میں یہیں ہواؤں میں ہی کہیں تحلیل ہو کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا مگر یہ صورت حال جگنی کے ساتھ نہیں تھی کیونکہ وہ ایک ایسی مخلوق سے تعلق رکھتی تھی جو کہ خود ہواؤں میں پرواز کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔

اچانک مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا اور میرے پسینہ زدہ اور بے جان ہوتے ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ اچانک جگنی کے پاؤں سے علیحدہ ہوگیا۔ جگنی خوف کی شدت سے چلائی اور اس نے مجھے کچھ کہنے کی کوشش کی جو میں کچھ نہیں پایا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ ہوا جس کا مجھے کافی دیر سے ڈر تھا۔ میرا دوسرا ہاتھ بھی جگنی کے پاؤں سے علیحدہ ہوا اور میرا وجود ہواؤں میں کہیں تیرتا ہوا نیچے زمین کی جانب لپکا۔

خوف کی انتہائی شدت سے جگنی بے اختیاری سے کسی پر غصے سے چلائی اور اس کے ساتھ ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کی چیخ کے ساتھ ہی ایک بھیانک اور دل کو لرزا دینے والی چیخ بھی شامل ہوئی ہو، مگر انہی لمحوں میں میرا وجود ان سے بہت دور نیچے لڑھک گیا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں کلمہ طیبہ کا ذکر کیا اور مرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ اب شاید دنیا کی کوئی بھی طاقت مجھے نہیں بچا سکتی تھی۔ شاید میری موت اسی طریقے سے لکھی گئی تھی اور آج میرے لیے وہ لمحہ آگیا تھا جس سے میں بچ نہیں سکتا۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن میں کئی سوچیں کئی یادیں گڈمڈ ہوئیں۔ پھر جانے مجھے کیا ہوا کہ میرے ذہن کے آگے ایک کالی دبیز چادر سی تنی اور میرے وجود کو ایک انتہائی زبردست جھٹکا لگا۔ آخری خیال جو میرے ذہن میں تھا وہ یہ کہ شاید میرا وجود زمین کو چھوتے ہی ریزہ ریزہ ہو کر زمین پر ہی کہیں بکھر گیا ہوگا۔

مگر شاید نہیں یقیناً یہاں مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ میں ایک انمٹ صداقت کو بھول گیا تھا کہ زندگی اور موت تو اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہے تو کسی کو موت کے منہ سے نکال کے زندگی بخش دے اور چاہے تو کسی کو زندگی کی سیج پر رنگ رلیاں مناتے ہوئے موت کے منہ میں دھکیل دے۔ مگر انسان بے چارہ کرے بھی تو کیا؟ جب وہ ظاہری شواہد کو دیکھتا ہے تو انہی پر یقین کر کے بیٹھ جاتا ہے اور ان شواہد کے پیچھے چھپی ہوئی صداقتوں کو بھول جاتا ہے اور کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔

میں جو اپنی موت کو یقینی سمجھتے ہوئے ہر طرف سے مایوس ہو کر زمین سے ٹکرانے ہی والا تھا کہ کسی بہت ہی پیاری ہستی نے مجھے اپنی بانہوں میں مضبوطی سے تھام لیا اور اس وجہ سے میرا وجود زمین سے ٹکرانے سے بچ گیا۔ ابھی میرا وجود زمین سے کافی فاصلے پر تھا کہ جگنی جانے کیسے اس ظالم شیطانی قوت کے پنجے سے آزاد ہوئی اور انتہائی تیز رفتاری سے میرے پیچھے لپکی اور اس نے مجھے زمین سے ٹکرانے سے پہلے ہی اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے فضا میں دو تین قلابازیاں کھائیں اور نیچے جاتے ہوئے میرے وجود کی تیزی کو قابو میں کرتے ہوئے آہستگی سے نیچے اتری۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ اس دوران میں مکمل طور پر چند منٹوں کے لیے بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس شیطانی طاقت کے پنجے سے آزاد ہونے کے لیے اس نے اپنی آستین میں پڑا ایک تیز دھار زہر آلود خنجر انتہائی سرعت اور تیزی سے نکالتے ہوئے اس شیطانی قوت کے پیٹ میں جھونک دیا۔ اس خنجر میں اتنا زہر بھرا تھا کہ اس نے لمحے کے بھی ہزارویں حصے میں شیطانی قوت کا خاتمہ کردیا۔

چند منٹوں کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ میں زندہ بچ گیا ہوں مگر آہستہ آہستہ جب مجھے مکمل طور پر ہوش آیا تو مجھے پتہ چلا کہ اس وقت ہم ایک بار پھر سے اسی کریہہ اور بدبو کے بھبکے چھوڑتی ہوئی مخلوق کے نرغے میں تھے۔ جگنی میرا سر گود میں لیے مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ہی بے اختیاری میں ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو میرا چہرہ بھگوتے جارہے تھے۔

ہوش آتے ہی جب میں نے آنکھیں کھولیں تو جگنی کی جان میں جان آئی۔ اور ایک انجان سی زبان میں اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہا۔ شاید اس نے اس ذات کا شکریہ ادا کیا تھا جس نے مجھے موت کے منہ سے نکال کے زندگی بخشی تھی۔

میں نے غور سے جگنی کی سمت دیکھا اس وقت اس کی چھاتی کے اطراف خوبصورت اور حسین پر نظر آرہے تھے۔ اس کا مطلب ہے اس وقت وہ اپنے مکمل پریوں کے روپ میں میرے روبرو تھی۔ شیطانی مخلوق جو مجھے پہلے نظر نہیں آئی۔ جانے کیسے وہ بھی اب میری نظروں کے سامنے عیاں تھی۔

میں نے دیکھا ان کی شکلیں جو کہ چاند کی مدھم ہوتی روشنی میں بہت ہلکی اور غیر واضح سی نظر آرہی تھیں مگر جگنی بھی نظر آرہی تھیں وہ انتہائی حیران کن اور خوفناک حد تک بھیانک اور ڈراؤنی تھیں۔ ان کی ٹانگیں اتنی بھاری، بھدی، موٹی اور لمبائی میں اتنی بڑی تھیں کہ ان کی دنیا میں کوئی مثال ملنا ناممکن ہے۔ پاؤں کے ساتھ جڑے بھاری پنجے جو کہ کافی جگہ گھیر رہے تھے ان کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے کسی ٹریکٹر کے ہل ہوں۔ ان کے بازو جو کہ زمین سے کافی دوری پر ان کے کندھوں سے جڑے ہوئے اک عجب ہی خوفناک اور ڈراؤنا منظر پیش کر رہے تھے۔ ان کا چہرہ اور سر۔ الف خدا کی پناہ۔ بڑے بڑے پتھروں جیسی، انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں۔ سر کے دونوں اطراف لٹکے ہوئے بھدے بدنما سے کان۔ سر کی چوٹی سے نیچے موٹے موٹے رسوں کی طرح لٹکے ہوئے آپس میں گڈمڈ الجھے ہوئے بال۔ پیشانی پہ سفید بدنما اور سمجھ میں نہ آنے والی لکیروں کا الجھا ہوا جال۔ جانے یہ کسی زبان میں لکھی ہوئی عبارت تھی یا کچھ اور۔ مجموعی طور پر ان کا جسم اتنا بڑا موٹا اور پھیلاؤ میں تھا کہ جس کی بھرپور وضاحت کرنا تو شاید میرے بس میں نہیں مگر اتنا مجھے معلوم ہے کہ اگر کوئی انسان ان کو ظاہری حالت میں ان کے برابر کھڑا ہو کے اوپر ان کے چہرے کی طرف دیکھے تو اس کے سر کی پگڑی زمین بوس ہوجائے۔

یہ انتہائی خوفناک، ڈراؤنی، سنسنی خیز اور دلوں کو لرزا دینے والی صورت حال تھی۔ اگر جگنی کی زبانی مجھے ان کے بارے میں تھوڑا بہت معلوم نہ ہو چکا ہوتا تو شاید اس وقت میں ان کو دیکھتے ہی خوف اور دہشت کی وجہ سے آدھا مر چکا ہوتا۔ اس ساری ڈراؤنی اور خوفناک صورت حال میں جگنی کی ذات میرے لیے بہت ہی اہم نہیں تھی۔ جگنی اور ان شیطانی قوتوں میں شاید کچھ مذاکرات ہو رہے تھے اور شاید یہ مذاکرات میرے ہی حوالے سے تھے کیونکہ تھوڑی دیر بعد جگنی نے مجھے بتایا۔

”پیارے صائم! میرے ان سے مذاکرات کامیاب ہوگئے ہیں۔ وہ تمہیں یہیں پر زندہ سلامت چھوڑنے پر راضی ہوگئے ہیں۔ میری طرف سے تم کو یہ نئی زندگی مبارک ہو۔ آج تو اوپر والے نے تمہیں بچا کر مجھ پر احسان عظیم کیا ہے ورنہ میں تو تمہارے بن شاید جی بھی نہ پاتی اور یہیں اس جگہ پر اپنی جان دے دیتی۔ اب تم ایسا کرو کہ یہاں سے سیدھا اپنے گھر چلے جاؤ اور میرے لیے دعا کرو کہ میں بخیر و عافیت ان کے چنگل سے نکل سکوں۔ میں وعدہ کرتی ہو کہ میں جب بھی ان سے آزاد ہوئی تو میں سیدھا تمہارے پاس آؤں گی اور پھر میں تمہیں اپنے ہمراہ خود تبت میں اپنی آبائی سلطنت لے کر جاؤں گی۔“

جگنی! تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تمہارے

بن گھر چلا جاؤں گا۔ ان کتوں سے کہہ دو کہ ہم دونوں کا جینا مرنا اکٹھا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔" میں نے جگنی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم صائم۔ کیا تم ہوش میں تو ہو؟ تم ان بلاؤں کو نہیں جانتے۔ یہ کتنی بے رحم اور ظالم ہیں تمہیں اس کا احساس بھی نہیں ہے۔ تم شاید گزشتہ رات کے واقعے کی وجہ سے شیر ہو رہے کہ رات یہ بلائیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں تو اب بھی کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ بلکہ بھول نہیں بہت بڑی غلطی ہے جو تم بلا سوچے سمجھے کرنے جا رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ رات جو کچھ ہوا اس کی وجہ میری کوئی حمایتی طاقت ہے اور اس کا پتہ بھی جلد ہی لگ جائے گا۔ تمہارا وجود ان کے سامنے ایک تنکے سے بھی کمتر ہے تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میرے لیے تو یہ خیال بھی انتہائی پریشان کن ہے کہ تم ان بلاؤں کے نرغے میں جانا چاہتے ہو۔" جگنی نے انتہائی پریشانی اور حیرت سے مجھے تکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

"جگنی ڈیئر! جو کچھ بھی ہو۔ میرا جینا مرنا تمہارے سنگ ہے۔ اب پھول ملیں یا کانٹے۔ زندگی ملے یا موت۔ یا جو بھی میرے مقدر میں ہو، ملے مگر یہ سوچنا بھی نہیں کہ میں تمہیں اکیلے ان حرامزادوں کے ہمراہ روانہ کر دوں گا۔" میں نے پرجوش مگر دھیمے اور پراثر لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔

"تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو صائم۔ رات جو تم بچ گئے اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ اگر رات والے واقعے میں ذرہ برابر بھی تمہاری کسی طاقت کا ہاتھ ہوتا تو اب یہ سب کچھ جو تمہارے ساتھ ہوا ہے یہ کبھی نہ ہوتا۔ تمہارے ساتھ ہونے والے اس واقعے نے میری آنکھوں سے بندھی پٹی کھول دی ہے۔ تمہارے ساتھ اگر کوئی روحانی طاقت ہوتی تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ شیطانی طاقتیں تمہارے ساتھ ایسا کر سکتیں۔ تم ایک ایسے اندھے کنویں میں بلا سوچے سمجھے چھلانگ مارنے جا رہے ہو جس میں تمہاری موت یقینی ہے اور کم از کم میں تمہیں یہ ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔" جگنی نے مجھے پیار بھرے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں مرد ہوں جگنی اور تم میرا پیار ہو۔ کل کی بات اور تھی مگر آج کی بات اور ہے۔ کل تم میں اور مجھ میں ایسا کوئی تعلق نہیں تھا مگر کل بھی میں نے تمہارا ساتھ دیتے ہوئے کچھ نہیں سوچا تھا اور میں آج بھی تمہارے سنگ چلتے ہوئے کچھ نہیں سوچوں گا۔ تمہیں ان مصیبت کے حالات میں اکیلا چھوڑ کر، نامردوں کی طرح گھر چلا جاؤں اور پھر تمہاری واپسی کا بزدلوں کی مانند انتظار کروں۔ نہیں یہ ناممکن ہے جگنی۔ میری غیرت یہ کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ میں تمہارے ساتھ ایسا صرف اس لیے کروں کہ میں اپنے آپ میں تمہارے دشمنوں کے خلاف کوئی طاقت نہیں پاتا۔ میرے ایمان اور یقین کے مطابق کل کائنات کی سبھی طاقتیں اس ازلی اور ابدی طاقت کے سامنے ہیچ اور بے نام ونشاں ہیں جس طاقت کا میں پجاری ہوں۔ اور مجھے یقین کامل ہے کہ وہ ذات کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑے گی۔" میں نے اس کو یقین دلاتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔

"صائم! میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ تم......"

مگر ابھی یہ الفاظ اس کی زبان پر ہی تھے کہ شیطانی طاقتوں کی نمائندگی کرنے والی اس انتہائی خوفناک طاقت نے جگنی سے کچھ کہا جس کا میں مطلب سمجھ نہیں پایا۔ جگنی اور دیو میں تھوڑی دیر بات چیت جاری رہی۔

اچانک جگنی ان پر چلائی اور عجب نامانوس سی زبان میں انہیں کچھ کہا۔ یہ کہتے ہی وہ تقریباً میرے اوپر گر گئی اور مجھے اپنی گداز اور مخملیں بانہوں کے شکنجے میں یوں کس لیا کہ جیسے اسے خطرہ ہو کہ وہ بلائیں مجھ پر حملہ ہی نہ کر دیں۔ اب اس نے روتے ہوئے انتہائی منت ریز لہجے میں مجھ سے کہا۔

"میری بات مان لو صائم۔ اس میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔ بے جا ضد نہ کرو۔ یہاں سے چلے جاؤ

صائم پلیز۔ پلیز صائم کیونکہ میں تجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور پھر مجھے یقین ہے کہ میں کسی نہ کسی طریقے سے ان کے چنگل سے نکل ہی آؤں گی اور میرے ساتھ کافی ایسی طاقتیں ہیں جو میرا ساتھ دیں گی۔ تم کیوں خود بھی بے موت مرنا چاہتے ہو اور مجھے بھی مروانا چاہتے ہو۔" اس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"زندگی اور موت اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے۔ ان بے نام شیطانی طاقتوں کے بس میں اگر کچھ ہوتا تو کمزور اور لاچار لوگوں کا اس دنیا سے کبھی کا وجود مٹ گیا ہوتا۔ تم مجھے ساتھ کیوں نہیں لے جانا چاہتیں آخر؟" میں نے خفگی بھرے انداز میں اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"چلے جاؤ صائم!" اس نے مجھ سے لپٹے لپٹے میری ٹھوڑی کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"جگنی! صائم مر تو سکتا ہے مگر اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنی جگنی کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہیں اکیلے موت کے منہ میں دھکیل کر گھر جا کر سکون سے جی پاؤں گا۔ میں لمحہ لمحہ مروں گا تمہارے بن اور میں تمہیں بتا دوں کہ میں تمہارے بن لمحہ لمحہ مرنے سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں کہ تمہاری بانہوں میں عزت اور غیرت سے جیتا ہوا مر جاؤں تا کہ مجھے قبر میں کم از کم یہ راحت تو نصیب ہو کہ میں نے زندگی کی آخری سانس تک اپنی محبت کا......"

مگر اس سے پہلے کہ میری بات مکمل ہوتی کہ رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک خوفناک اور دلوں پہ لرزہ طاری کر دینے والی دھاڑ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ہمارے اوپر ایک سفید باریک سا ریشمی دھاگوں سے بنا ایک جال پھینکا گیا۔ یکلخت ہی کسی طاقت نے ہم دونوں کو اس جال میں ایک زبردست دھکا دیا۔ ایک دوجے سے لپٹے ہم دونوں اس جال میں تھوڑی دور تک گھسٹتے چلے گئے۔ لمحے کے بھی ہزارویں حصے میں یہ جال چاروں طرف سے بند ہو گیا اور اس سے پہلے کہ جگنی یا میں کچھ سمجھ پاتے ایک جھٹکے کے ساتھ جال کے اندر مقید ہمارے وجود جال سمیت آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرنے لگے۔

جگنی نے انتہائی مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت میں مجھے دیکھا اور اپنی نرم و نازک بانہوں میں یوں بھینچ لیا کہ اگر میں کہیں اس کی بانہوں سے ایک لمحے کے لیے بھی نکل گیا تو پھر اس کے ہاتھ نہ آسکوں گا۔

☆......☆......☆

مدھیہ پردیش کے ایک انتہائی خطرناک اور سنسان جنگل میں موجود پرانے اور خستہ حال مگر انتہائی ڈراؤنے اور خوفناک شکل کے شیش ناگ مندر میں ہمیں لے جا کر ایک عجیب وغریب سے تہہ خانے میں قید کر دیا گیا۔ اس تہہ خانے میں قید کرنے کے باوجود جانے کیوں ہمیں ان طاقتوں نے ریشمی دھاگوں سے بنے اس جال سے نہیں نکالا۔ ایک دوسرے سے لپٹے باتیں کرتے کرتے جانے کب ہمیں نیند آگئی اور ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کے سو گئے۔

دوسرے دن جانے کس وقت کھٹ پٹ کی آوازوں سے ہماری آنکھ کھلی۔ میں نے آنکھیں پٹپٹائیں اور ادھر ادھر دیکھا۔ اس دوران جگنی بھی جاگ چکی تھی اور پریشان سی نظروں سے اندر داخل ہونے والے ان انسانوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو ہمیں جال سمیت گھسیٹنے کی کوشش کر رہے تھے، وہ شاید ہمیں تہہ خانے سے باہر لے جانا چاہتے تھے۔ اگر وہ ہمیں باہر لے جانا چاہتے تھے تو جانے کس لیے ہمیں جال سمیت گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ وہ ہمیں جال سے باہر نکال کر بھی تو لے جا سکتے تھے مگر شاید انہیں جگنی کی ذات سے کوئی خطرہ تھا کیونکہ وہ ایک پری تھی اور کسی بھی وقت اڑان بھر کے ان کی نظروں سے اوجھل ہو سکتی تھی اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ اس میں اتنی طاق تھی کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر اڑنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

بہر حال جلد ہی ہمیں باہر لے جایا گیا۔ رات جب ہمیں یہاں لایا گیا تھا تو تاریکی اور ویرانی کی وجہ سے یہ عمارت انتہائی ڈراؤنی اور خوفناک لگ رہی تھی

۔دن میں بھی یہ تاثر زائل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔مندر کے اندر چاروں طرف بنے کمروں کے درمیان ایک وسیع صحن میں ہمیں لے جایا گیا۔ہمیں یہاں لانے والے دکھائی تو انسان ہی دے رہے تھے مگر پتہ نہیں اب یہ انسانوں کا بھیس بدلے کوئی ماورائی اور مافوق الفطرت مخلوق تھی یا پھر واقعی انسان۔مگر ایک خوش آئند بات یہ تھی کہ جگنی جو کہ رات کو میرے حوالے سے کافی پریشان تھی۔اب وہ کچھ مطمئن سی نظر آرہی تھی شاید اس نے دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کرلیا تھا اور اپنے تئیں مطمئن ہو گئی تھی مگر اس کے حوالے سے میری پریشانیوں میں اضافہ ہوگیا تھا اور میں انتہائی پریشانی کے عالم میں موجودہ صورت حال سے نکلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر مجھے کوئی بھی ترکیب سمجھ نہیں آرہی تھی۔

ہر طرف سے مایوس ہوکر میرا دھیان اس ذات رحیم کریم کی طرف ہوگیا کہ اب تو اسی کا کرم مجھے اس مشکل سے نجات دلاسکتا ہے اور کوئی چارہ نہیں۔یہ بات ذہن میں آتے ہی میرا دھیان اس کے ذکر کی طرف بھی گیا تو بے اختیار میرا ذہن اپنے مرشد کی دی ہوئی انمول اور نایاب تسبیح کی طرف گیا۔میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر تسبیح موجود نہیں تھی۔

''اوہ میرے خدایا۔'' وہ تسبیح کہاں چلی گئی جس کے بارے میں میرے مرشد نے میری والدہ سے فرمایا تھا کہ کیسی بھی صورت حال ہو تسبیح کو مجھ سے جدا نہیں ہونا چاہیے۔مجھے اچھی طرح یاد ہے بچپن سے لے کر آج تک مجھ پر جتنی بھی مشکلیں آئیں وہ کسی نہ کسی طریقے سے حل ہوگئیں اور بعض اوقات تو ناقابل یقین حد تک میرے مسائل حل ہوتے رہے ہیں۔میں نے جب بھی اس تسبیح کے دانوں پر ذکر خداوندی کا ورد جاری کیا تو خدا نے مجھے اپنے بے انتہا رحم وفضل کی پناہوں میں لے کر مجھے آنے والی تمام مشکلوں سے بے نیاز کر کے سرخرو کیا اور پھر مجھے بیتی ہوئی دونوں راتوں کے واقعات یاد آئے۔ایک رات جب تسبیح میرے ہاتھوں میں ذکر خداوندی کے ساتھ موجود تھی تو شیطانی قوتیں مجھ سے دور بھاگنے پر مجبور ہوگئی تھیں مگر دوسری رات میں جگنی کی باتوں میں محو یاد الٰہی کی تسبیح سے غافل تھا تو وہ شیطانی قوتیں مجھ پر حاوی ہوگئی تھیں۔

وہ تو شکر ہے اس ذات رحیم وکریم کا جس نے جگنی کو اتنی ہمت وطاقت عطا کی کہ اس نے لمحے کے بھی ہزارویں حصے میں اپنے سے کئی گنا بڑی قوت کا خاتمہ کر کے مجھے زمین پر گرنے سے بچالیا ورنہ اگر میرا وجود اسی تیزی سے نیچے زمین پر آگرتا تو میرے وجود کے شاید پرزے بھی ذروں میں تبدیل ہوکر ہواؤں میں کہیں بکھر جاتے۔

ابھی ہم جال میں موجود ہی تھے کہ ہمیں باہر لانے والوں نے مجھ سے تھوڑی دوری پر جال میں موجود جگنی پر کالے رنگ کی رقیق نما کوئی چیز پھینکی۔جونہی یہ رقیق جگنی کے وجود سے وہ ٹکرایا اس کی دہشت اور خوف میں ڈوبی ہوئی چیخ نکلی اور اس کے ساتھ ہی اس کے باہر نکلے ہوئے پر اس کے وجود میں کہیں غائب ہوتے چلے گئے اور وہ مکمل طور پر انسانی شکل کا روپ دھارتی چلی گئی۔مگر اس رقیق مادے کے اچانک اس کے وجود پر گرنے سے اس کی جو حالت ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔اس کے وجود پر کپکپی طاری ہوگئی اور اس کی مسلسل چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔اس کی حالت زار دیکھتے ہوئے کب سے میں اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کررہا تھا مگر جونہی میں نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تھی تو وہاں موجود کئی جانور نما آدمی مجھ سے لپٹ گئے تھے اور انہوں نے مزید ستم یہ کیا کہ جال کو ایک جگہ سے کاٹ کر مجھے اس میں سے نکالا اور زنجیر سے جکڑ کر عمارت کے قریبی ستون سے باندھ دیا۔

میں ان لوگوں پر چیخنے چلانے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا اور ظاہر ہے کہ ان پر میری چیخ وپکار کا کیا اثر ہونے والا تھا۔آہستہ آہستہ جگنی کی چیخیں سسکیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئیں اور جلد ہی شاید درد کی شدت کو نہ سہتے ہوئے وہ بے ہوش ہوگئی۔

بے ہوش ہوتے ہی جگنی کو جال سے نکال کر انہوں نے اسٹریچر پر ڈالا اور کالے رنگ کی چادر سے ڈھانپ دیا۔جلد ہی جانے کہاں سے ایک ایمبولینس آئی۔انسان نما جانوروں نے اسے ایمبولینس میں سوار کروادیا۔میں جو اس دوران زنجیروں میں بندھا ان سے چیخ چیخ کے جگنی کو نہ لے جانے کے بارے میں کہہ رہا تھا مگر کوئی بھی شخص میری طرف دھیان نہیں دے رہا تھا

جگنی کو ایمبولینس میں سوار کرواتے ہی ایک شخص انتہائی غصے اور نفرت سے دیکھتے ہوئے میری طرف بڑھا۔آتے ہی اس نے میرے منہ پر ایک زبردست طمانچہ مارا اور خاموش ہونے کے لیے کہا۔اس وقت وہ شخص فرعونیت کے نشے میں چور میرے قریب ہی کھڑا تھا۔گردن سے نیچے میرا سارا جسم لوہے کی زنجیر سے ستون کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔اس صورت حال میں میں چاہتا تو سر کو تھوڑی بہت حرکت دے سکتا تھا اور میں نے اپنے سر کو وہ حرکت دی جو میں دینا چاہتا تھا۔میرا سر ہتھوڑے کی مانند سامنے کھڑے فرعون کی ناک سے ٹکرایا اور نتیجہ میری توقع سے بھی کچھ زیادہ ہی نکلا۔وہ شخص بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹا اور نیچے گر گیا۔میں نے دیکھا اس کے ناک سے خون کا فوارہ بہہ نکلا تھا۔

اتنے میں اس کے ساتھی میری طرف بڑھے۔ان میں سے کسی نے کہا۔

''لگتا ہے بہوت (بہت) گرمی ہے سالے کے سر پہ ماں۔اوئے کالیا۔بہوت دن ہوئی گوا کوئی کسرت مسرت نہیں کی۔جرا کھولو ناں اس کے سر پہ سے لوہے کی رسی۔ہم بھی دیکھیں کتنے پانی ماں ہے یہ مسلا۔دیکھو ناں لوہے کی جنجیروں (زنجیروں) میں بندھا ہونے کے باوجود ناک پھوڑ دی ہے جالم نے رامو پہلوان کی۔جرا کھولو ناں اسے۔''

شاید یہ شخص ان سب کا لیڈر تھا۔اس کے بولنے کے انداز سے یہ بھی ثابت ہوگیا تھا کہ میں اس وقت انڈیا میں ہی ہوں۔جونہی ان کا لیڈر خاموش ہوا تو اس کے کسی ساتھی نے اسے شاید سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''چھوڑو ناں استاد۔کاہے کو اتنا تکلیف کرتے ہو۔ہمیں ٹپکا دیتے ہیں سالے کو۔''

''ناہیں کالیا ناہیں۔جو منے (میں نے) تیرے سے کہا ہے وہ کرو۔جیادہ (زیادہ) بھاشن دینے کی جرورت ناہیں مجھے۔بدرو اچھی طرح جانت ہے کہ کس سے کیا کرنا ہے اور کیا ناہیں۔اس کی جنجیریں کھولو پھورا (فوراً)'' یہ کہتے ہی بدرو نے اپنی جیکٹ کھول کر دور پھینک دی اور ایک زبردست انگڑائی لی۔

اتنے میں کالیا نامی شخص آگے بڑھا اور اس نے میری زنجیریں کھول دیں اور یہی ان لوگوں کی سب سے بڑی غلطی تھی۔انہوں نے اس وقت مجھے زنجیروں سے آزاد کر کے اپنے پاؤں پہ خود کلہاڑی مارلی تھی۔وہ نہیں جانتے تھے کہ میں کبڈی کا زبردست کھلاڑی اور ایک اچھا اسٹریٹ فائٹر بھی تھا۔آزاد ہوتے ہی میں نے جسم کو ایک خاص انداز میں موڑا اور یوں ظاہر کیا کہ جیسے میرے پیٹ میں شدید درد اٹھا ہو اور اسی درد کی شدت کی وجہ سے میں نیچے گرتا چلا گیا۔نیچے گرتے ہی میں نے بے ہوش ہونے کا زبردست ڈرامہ کیا جو کہ انتہائی کامیاب رہا۔حیرت سے سبھی لوگ میری طرف بڑھے۔ان میں سے کسی نے کہا۔

لو کرلو بات۔میں نہ کہتا تھا استاد۔مجھے تو یہ کوئی بھنگ......ی......'' مگر اس کی بات مکمل نہ ہوسکی اور وہ چیخ کر لڑھکتا ہوا کہیں دور جاگرا۔کیونکہ میں نے لیٹے لیٹے اس کے جس نازک مقام پر کک لگائی تھی اس نے اس کا برا حشر کردیا تھا۔اس کے ساتھ ہی ایک بندہ اور بھی میری اس خطرناک کک کا شکار ہوکر لڑھکتا ہوا کہیں دور جاگرا۔یہ کل پانچ آدمی تھے۔جن میں ان کا استاد بھی شامل تھا وہ تو میری اچانک نازک مقام پہ لگنے والی کک کا شکار ہوکر اپنے آپ کو کوسنے دے رہے تھے اور بقیہ تین میں سے ایک کی ٹانگوں پر میری زبردست کک پڑی تھی اور وہ بالکل ہی میرے اوپر آگرا تھا۔میں نے اسے اپنے اوپر سے دور اچھالا اور انتہائی سرعت اور تیزی سے خود بھی کھڑا ہوگیا۔

قریب ہی حیرت کی تصویر بنے دوسرے دو بندے ابھی میرے خلاف کچھ کرنے کا شاید سوچ ہی رہے تھے کہ میں نے جلدی سے قریب پڑی لوہے کی موٹی زنجیر اٹھالی اور ان پر پل پڑا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور تیزی سے ہوا کہ انہیں سوچنے سمجھنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملا۔ میرے ہاتھوں میں موٹی زنجیر اور اپنے دونوں ساتھیوں کا برا حال دیکھ کے میری زبردست کک کا مزہ چکھنے والے ان کے تینوں ساتھی پیچھے سے مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے مجھے پیچھے سے پکڑ کے قابو کرنا چاہا مگر اب میں ان کے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ چکنی مچھلی کی طرح میں ان کے ہاتھ سے پھسلتا ہوا نیچے گرا اور نیچے گرتے ہی رول کرتے ہوئے سیدھا ہوا اور ہاتھوں کی انتہائی طاقت سے زنجیر کا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے گھمایا۔ دو بندوں کے چہروں سے لوہے کی زنجیر کسی قاتل چھری کی مانند ٹکرائی۔

وہ چیخ مارتے ہوئے پیچھے گرے مگر ان میں سے ایک جھکائی دے کر بچ گیا اور اس سے پہلے کہ زنجیر اپنا چکر مکمل کر کے دوبارہ ان کی طرف بڑھتی وہ مجھ پہ آن گرا۔ چکر کھاتی زنجیر ہم دونوں سے لپٹ گئی۔ اتنے میں چوٹ کھائے ہوئے باقی چار آدمی بھی میری طرف دوڑے اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے قابو میں کر لیتے میں نے اپنے اوپر موجود بندے کو جو کہ مجھے چھا ڈال کے بے بس کرنے کے چکر میں تھا۔ اس کی پسلی میں اپنے ہاتھ کا زبردست مکا جڑ دیا۔ وہ اوغ کی آواز نکال کر کراہتا ہوا پرے جا گرا۔ اس کے دور گرتے ہی میں ایک سپرنگ کی طرح اچھلا اور تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔

زنجیر ایک بار پھر میرے ہاتھ میں تھی اور وہ لوگ میری زنجیر سے بچنے کے لیے ادھر ادھر ہو رہے تھے مگر کب تک جونہی کوئی مجھے پکڑنے کی چاہ میں آگے بڑھتا ۔زنجیر سے زخمی ہو کر بلبلاتا اور گالیاں دیتا ہوا دور جا گرتا اور پھر اس سے پہلے کہ میں ان پر مکمل طور پر قابو پا لیتا ۔ایمبولینس کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی ۔ڈرائیور شاید ایمبولینس میں ہی بیٹھا ہوا تھا اور اس نے جونہی دیکھا کہ میں ان پر قابو پا کر اس کی طرف ہی بڑھوں گا تو اس نے یہاں سے جگنی سمیت بھاگ جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

ایمبولینس کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنتے ہی میرا دھیان بٹا تو ان میں سے ایک بندے نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ سے زنجیر چھیننے کی کوشش کی اور زنجیر کا ایک زبردست وار سہنے کے بعد وہ مجھ سے آ کر لپٹ گیا۔ اسے مجھ سے لپٹا دیکھ کر اس کے دوسرے ساتھی بھی میری طرف بڑھے۔ ایمبولینس اس وقت اسٹارٹ ہو کر تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

وقت بہت ہی کم تھا اور یہ فیصلے کی گھڑی تھی ۔اگر میں ان لوگوں سے لڑنے میں ہی الجھا رہتا تو جگنی کو کھو دیتا اور میں اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے ساتھ لپٹے ہوئے شخص کی کنپٹی پر میں نے نیا حملہ وار کیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی میں اس کی بے جان ہوتی بانہوں سے نکلا۔ زنجیر وہیں پھینکی اور گیٹ کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی ایمبولینس کے پیچھے بھاگا ۔میرے پیچھے لنگڑاتے ہوئے وہ لوگ بھی بھاگے مگر میری اور ان کی رفتار میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہ وہی فرق تھا جو کہ ان کی اور میری لڑائی میں بھی نظر آ رہا تھا ۔وہ لوگ دھن دولت کے لیے لڑ رہے تھے اور دھن دولت کے لیے لڑنے والے زندگی سے پیار کرتے ہیں اور ہار جاتے ہیں مگر کسی نظریے اور مقصد کے لیے لڑنے والے زندگی سے پیار نہیں کرتے اسی لیے ہمیشہ جیت انہی کا مقدر بنتی ہے۔

ایمبولینس کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ڈرائیور نے اچانک بیک ویو مرر میں پیچھے سے مجھے بھاگ کر آتے ہوئے دیکھا۔ یکلخت اس نے ایمبولینس کی اسپیڈ بڑھا دی۔ جلد ہی ایمبولینس مین گیٹ تک پہنچی اور باہر نکل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی بھاگتا ہوا باہر نکلا مگر ایمبولینس ابھی مجھ سے کافی دور تھی ۔میں نے اپنے دوڑنے کی اسپیڈ بڑھائی مگر ایمبولینس تھی کہ ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی کیونکہ یہ راستہ بھی کافی

ناہموار اور کچا تھا اور پھر یہ کوئی باقاعدہ سڑک بھی نہیں تھی ۔جھاڑ جھنکار کو کاٹ کر اس راستے کو رواں رکھنے کی کوشش کی گئی تھی اور شاید یہی لوگ اس راستے کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ عام لوگ تو شاید اس راستے سے واقف بھی نہیں ہوں گے بلکہ عام لوگوں کو تو شاید اس مندر کا بھی علم نہیں ہو گا اور اگر کسی کو علم ہو گا بھی تو وہ اس سنسان مقام پر اس گرتے ہوئے مندر میں آ کر کیا کرے گا؟

ایمبولینس کا ڈرائیور انتہائی مہارت اور چابکدستی سے ایمبولینس کو یہاں سے نکال لے جانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا مگر میں بھی اس تک پہنچنے کے لیے اپنی جان لڑا رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر راستہ ایسا ہی رہا تو میں جلد ہی اس تک جا پہنچوں گا اور پھر شاید خدا نے میری سن ہی لی۔ ایمبولینس ایک گہرے کھڈ میں جا گری اور وہیں رک گئی۔ اب پتہ نہیں یہ کھڈا ڈرائیور کو نظر نہیں آیا تھا یا پھر شاید اس کی اندھا دھند ڈرائیونگ کی وجہ سے ایمبولینس اس کھڈ میں جا گری تھی۔

بہرحال یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ایسا ہو گیا۔ میں نے اپنی سپیڈ بڑھائی اور انتہائی تیز رفتاری سے ایمبولینس تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ڈرائیور بھی شاید اس بات کو سمجھ چکا تھا اور ایمبولینس کو کھڈ میں سے نکالنے کی بھرپور جدوجہد کر رہا تھا اور اس سے پہلے کہ میں ایمبولینس تک جا پہنچتا ۔ایمبولینس ایک جھٹکے کے ساتھ کھڈے سے نکلی اور زن سے ناہموار سڑک کی طرف بڑھی۔ میں تقریباً وہاں پہنچ ہی گیا تھا۔ ایمبولینس کو یوں گڑھے میں سے نکلتا دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا مگر میں بھی ہمت ہارنے والا نہیں تھا میں نے ایک لمبی جست لگائی اور ایمبولینس کا پچھلا بمپر پکڑ لیا۔ میرے ہاتھوں اور سارے وجود کو ایک زبردست جھٹکا لگا مگر جگنی کو بچانے کی چاہ میں ایسے جھٹکے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ گھسٹنے کی وجہ سے میں کسی بڑے حادثے کا شکار ہو کر ایمبولینس کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ۔انتہائی کوشش کر کے میں بمپر سے ایمبولینس کے پچھلے حصے میں کھڑے ہونے کے قابل ہو گیا۔ شکر ہے کہ ایمبولینس کے اوپر لوہے کے پائپ کی چھت موجود تھی ۔چھت سے ہوتا ہوا میں ڈرائیور کی مخالف کھڑکی سے اندر کودنے میں کامیاب ہو گیا۔

ایمبولینس کا ڈرائیور شاید ایسے حالات کا زندگی میں کبھی شکار نہیں ہوا تھا۔ اس نے مجھے کھڑکی سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو ایمبولینس کو یکلخت بریک ماری۔ اس سے شاید وہ مجھے نیچے گرانا چاہتا تھا مگر اس کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ اس دوران ڈرائیور بریک تو مار ہی چکا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ایمبولیس سے نیچے دھکا دیا مگر دروازہ بند ہونے کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ اب میں نے اس پر تابڑ توڑ مکے برسانے شروع کر دیے۔ جلد ہی اس نے اپنی سائیڈ کی کھڑکی کھولی اور نیچے اتر کر بھاگنے کی کوشش کی مگر میں بھی اس کے ساتھ ہی پھرتی سے نیچے اترا اور جلد ہی اس کے بھاگنے کی کوشش ناکام بنا دی۔

کچھ ہی دیر کی پھینٹی لگنے کے بعد وہ رام ہو گیا اور میرے اشاروں پہ ناچنے کی ہامی بھر لی۔ میرے پیچھے مندر کی طرف سے بھاگ کر آنے والے جانے کہاں رہ گئے تھے۔ مجھے سب سے زیادہ انہی کی فکر تھی۔ اگر وہ میرے پیچھے بھاگ رہے ہوتے تو انہیں اب تک تو یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا مگر ان کے ابھی تک یہاں نہ پہنچنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ میرے پیچھے شاید گیٹ تک ہی بھاگے تھے اور اس کے بعد وہ واپس چلے گئے تھے۔

ابھی ہم مندر سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اگر وہ لوگ ابھی تک یہاں نہیں آئے تھے تو وہ کسی وقت یہاں آ تو سکتے تھے۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ڈرائیور کو وہاں سے ایمبولینس نکالنے کے لیے کہا ۔تقریباً آدھ گھنٹہ ناہموار راستوں پر سفر طے کرنے کے بعد مجھے ایک اونچے مقام پر گھنے درختوں کا ایک جھنڈ سا نظر آیا۔ چھپنے کے لیے یہ ایک بہترین جگہ تھی۔ میں نے ڈرائیور کو ایمبولینس ادھر لے جانے کے لیے کہا۔

"سر! وہاں تک ایمبولینس کو لے جانا تو ناممکن ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہاں تک جانے کے لیے کوئی باقاعدہ راستہ تو ہے نہیں۔"

"لگتا ہے تمہیں اپنی زندگی سے پیار نہیں ہے۔ پیارے اگر جینا چاہتے ہو تو پھر تمہیں وہاں تک ایمبولینس کو لے جانا ہی ہوگا اور اگر تم ایسا نہ کر سکے تو پھر تمہاری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔" میں نے اسے غصہ ور نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

قارئین یہ اس دور کی بات ہے جب آتشیں اسلحہ نہ تو عام کہیں سے ملتا تھا اور نہ ہی اس کے استعمال کے بارے میں زیادہ تر لوگ جانتے تھے۔ البتہ کہیں کہیں یہ استعمال ضرور کیا جانے لگا تھا مگر اب بھی زیادہ تر بدمعاش اور دو نمبر قسم کے لوگ زور بازو پر ہی یقین رکھتے تھے اور اسی سے کام چلانے کی کوشش کرتے تھے اور ان لوگوں میں اس دور میں یہ تاثر بھی پایا جاتا تھا کہ آتشیں اسلحہ بزدل اور کم ہمت لوگ ہی استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال اس دور میں جس کسی کے پاس بھی اسلحہ ہوتا تھا لوگ اس سے بہت ڈرتے تھے اور کئی لوگ تو اس سے ویسے ہی کنی کترا کے گزر جاتے تھے۔ پھر وقت بدلا۔ امیر لوگوں نے اپنی نمود و نمائش اور شرفا نے اسے اپنی حفاظت کی غرض سے اپنے پاس رکھنا شروع کر دیا اور خیر آج تو یہ دور ہے کہ الاماں۔

بہر حال میں بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس دور میں اسلحہ اول تو معاشرے میں کہیں ملتا ہی نہیں تھا اور اگر کہیں تھا بھی تو لوگ اس کی تباہ کاریوں کی وجہ سے گھر پر رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اسے شروع شروع میں زیادہ تر خطرناک جانوروں کو شکار کرنے کی غرض سے اور ان سے اپنے بچاؤ کے لیے استعمال کیا گیا مگر بعد میں اس سے وہ خطرناکیاں اور تباہیاں شروع ہو گئیں جس پر آج تک انسان قابو نہیں پا سکا اور دن بہ دن یہ تباہیاں بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔

ایمبولینس کا ڈرائیور شاید کوئی شریف اور عام سا بندہ تھا اور وہ میرے زور بازو کی طاقت کو ان چھٹے ہوئے بدمعاشوں پر میرے قابو پانے کی وجہ سے جان چکا تھا۔ وہ جانتا تھا گو کہ میرے پاس پستول یا آتشیں اسلحہ نہیں ہے مگر میں اس کے مقابلے میں زور آور ہوں اور وہ اس برتری کو تسلیم کر چکا تھا۔ اس نے ایمبولینس ایک ہموار سی جگہ سے جھاڑیوں کی طرف موڑ دی۔ ایمبولینس کا انجن انتہائی طاقتور تھا۔ وہ راستے میں آنے والی چھوٹی موٹی جھاڑیوں کو روندتی ہوئے آگے بڑھی مگر تادیر یہ ممکن نہ رہا اور جلد ہی ایمبولینس جھاڑیوں کے درمیان پھنس کر رہ گئی۔ ڈرائیور نے کوشش کرنا چاہی مگر میں نے اسے منع کر دیا۔ میرا مقصد بھی یہیں تک آنے کا تھا۔

"ہاں تو میرے دوست! پھر کیا ارادہ ہے؟" میں نے ایمبولینس میں بیٹھے بیٹھے ہی ڈرائیور سے پوچھا۔

"حضور! مجھ سے غلطی ہوئی جو ان لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اپنی زندگی خراب کر بیٹھا۔ مجھے معاف کر دیجیے حضور۔ آپ چاہیں تو یہ ایمبولینس بھی لے جائیں مگر میری جان بخشی کر دیں۔ میرا ایک بیٹا ہے جو کہ کلکتہ میں رہتا ہے۔ اب تو وہ جوان ہو گیا ہوگا۔ میں زندگی میں ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔ عرصہ گزر گیا مجھے ان ظالموں کی قید میں۔ کیا آپ یہاں سے باہر نکلنے میں میری کچھ مدد کریں گے؟"

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"رام گوپال حضور!" اس نے امید بھری نظروں سے میری سمت دیکھتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔

"رام گوپال!" میں نے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کون لوگ ہیں جن کے لیے تم کام کر رہے ہو۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ اور یاد رکھنا مجھے جھوٹ قطعاً پسند نہیں۔ جو بھی کہنا سچ کہنا۔ اور یہ بھی ذہن میں رکھنا میرا اپنا بھی بہت بڑا گینگ ہے اور میں تمہارے آقاؤں سے کہیں زیادہ طاقتور ہوں اگر تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تو میں تمہاری یہیں اس جنگل میں لاش گاڑ دوں گا۔ چیل کوے کھا جائیں گے تمہیں اور یہ عجیب سی کہانی سنا کر میری ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

"ایک بتی ہے حضور! جتنا مجھ کو معلوم ہے میں وہ آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔ مگر آپ سے اتنی پرارتھنا ہے کہ ان لوگوں کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ یہ سب کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے۔ میں یہ سب کچھ آپ کے ڈر کی وجہ سے نہیں بتا رہا بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے جو کہ آپ کو یہ کہانی سننے کے بعد معلوم ہو ہی جائے گی .... یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا تو میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ اس کے بعد اس کی زبانی جو مجھے معلوم ہوا وہ انتہائی حیران کن، خوفناک اور ناقابل یقین تھا۔ اس نے بتایا۔

"جس مندر کے تہہ خانے میں تم نے رات گزاری ہے تم نے اس تہہ خانے کا ایک چھوٹا سا حصہ ہی دیکھا ہے۔ حالانکہ یہ بہت بڑا تہہ خانہ ہے جس میں ایک بہت بڑا سائنسی ریسرچ سنٹر ہے جس میں کئی عقل میں نہ آنے والے تجربات ہو رہے ہیں جس میں یہ لوگ نسل انسانی اور دوسری مافوق الفطرت مخلوق کی مخلوط نسل بنا کر کسی اور ہی چکر میں دکھائی دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں انہیں جادوگروں، جوگیوں اور پنڈتوں اور روحانی علوم کے جاننے والے کئی ہوس پرست اور دولت کے پجاریوں کی مدد حاصل ہے۔ ان کے پاس جنوں، دیوؤں اور کئی دوسری ماورائی مخلوق کے قیدی موجود ہیں جس پر یہ لوگ مختلف قسم کے تجربات کر رہے ہیں اور ان مخلوقات کے عجیب و غریب اختلاط سے ایک اور ہی عجب سی نسل وجود میں آ رہی ہے جنہیں یہ لوگ اپنا غلام بنا کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے والے ہیں۔

شاید اس طرح سے وہ ایک عجیب و غریب مخلوق کی فوج تیار کرنے کے چکر میں ہیں جو مکمل طور پر ان کے تابع ہو۔ اس میں نہ صرف ماورائی مخلوق کی صفات پائی جائیں بلکہ وہ انسانی سوچ کے بھی حامل ہوں۔ جہاں ان کی خفیہ کارروائیوں کی ضرورت پڑے تو وہ بغیر کسی کو پتہ چلے اپنا کام کریں اور اپنا مقصد حاصل کرتے ہی وہ یوں غائب ہو جائیں کہ جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

آہستہ آہستہ یہ عجیب و غریب مخلوق تیار ہوتی جا رہی ہے۔ ان کے تجربات سے اب تک جو مخلوق تیار ہو پائی ہے وہ انتہائی خوفناک اور ڈراؤنی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس مخلوق کے کچھ فوجی بارڈر پر بھیج دیے جائیں تو دوسرے ملکوں کی افواج کے لیے بہت زیادہ مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس مخلوق میں کئی قسم کی صفات پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان پر جب بھی دشمن گولی چلائے گا تو وہ ان کے جسم سے آر پار تو ہو جائے گی مگر ان کا وجود ویسے کا ویسا ہی رہے گا۔

مگر بہت زیادہ کوششوں کے باوجود یہ لوگ ابھی تک بہت کم تعداد میں ایسی مخلوق تیار کر پائے ہیں اور پھر اس سارے عمل پر ان کا خرچہ بھی بہت زیادہ آ رہا ہے۔ اب وہ اس شعبے کو انڈین تنظیم را کے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے پریوں کی تلاش شروع کی۔ خوفناک، خطرناک اور ڈراؤنی مخلوق تیار کرنے میں تو وہ کافی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں مگر اب وہ چاہتے ہیں کہ انتہائی حسین اور دلوں کو موہ لینے والی ایسی حسین و دلگداز لڑکیاں تیار کی جائیں جو کہ ان کے عظیم مقاصد کو پورا کر سکیں۔ صاف ظاہر ہے کہ حسن اگر شیطانی قوتوں کے زیر اثر ہو تو وہ انتہائی تباہ کن اور خطرناک ہو جاتا ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو کہ بڑے بڑوں کا خانہ خراب کرنے میں انتہائی کامیاب و کامران ہے اور یہی وہ چاہتے ہیں۔

اس سلسلے میں ان لوگوں کی تلاش جاری تھی مگر ان لوگوں کو گوہر مقصود نہیں مل رہا تھا۔ پھر ان کے کسی حواری کو جگنی کے بارے میں علم ہوا اور یہیں سے یہ سارا سلسلہ شروع ہوا۔" یہ سب بتانے کے بعد وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اچانک جانے اسے کیا ہوا کہ وہ بے اختیار رونے لگا۔

"صاحب! جتنی جلد ہو سکے اپنی جگنی کو یہاں سے لے کر نکل جاؤ۔ یہ بہت ظالم اور خود غرض لوگ ہیں۔ ان ظالموں نے میری بچی لاجو کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس پہ بھی ان ظالموں نے ایک خوفناک تجربہ کر ڈالا تھا۔ اس بارے میں مجھے آپ کو بتاتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ بھلا ایک ظالم درندہ صفت ماورائی مخلوق اور انسانی صنف نازک کا کیا جوڑ۔ لاجو بے چاری اس مخلوق کا ظلم سہہ نہیں پائی اور وہیں دم توڑ گئی۔ ان دنوں میں دولت کی چاہ میں اندھا ہو گیا تھا شاید...... جو...... ان کے کہنے میں آ کر اپنی بیوی کو بھی یہیں لے کر آ گیا تھا اور میں ہی کیا مجھ جیسے کئی لوگ تھے جو بہتر مستقبل کے سنہری خوابوں میں کھو کر اپنا آپ تباہ کر بیٹھے اور جب انہیں پتہ چلا کہ ان کے ساتھ کیا ظلم کیا گیا ہے تو انہوں نے زبردست واویلا کیا۔

مگر کرنل راج ملہوترا نے ان مٹھی بھر لوگوں کو قید میں ڈال دیا۔ یہاں سے اپنی مرضی سے باہر تو کوئی نکل ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس سارے سیٹ اپ کے گرد ایک وسیع ایریے کو کور کرتی ہوئی خاردار تار لگائی گئی ہے جس میں چوبیس گھنٹے انتہائی طاقتور برقی رواں دواں رہتی ہے اور اس برقی رو سے جو بھی ٹکراتا ہے، ختم ہو جاتا ہے بالفرض محال اگر کوئی کسی طرح برقی رو سے بچتے بچاتے دوسری طرف نکل بھی جائے تو وہ جنگل کے خطرناک درندوں کی خوراک بن جاتا ہے جو کہ اس جنگل کے چاروں اطراف وسیع پیمانے پر اسی مقصد کے لیے پھیلا دیے گئے ہیں۔ البتہ اس خاردار تار کی دوسری طرف برقی رو سے درندوں کو بچانے کے لیے ایک انتہائی مضبوط پلاسٹک شیٹ لگا دی گئی ہے تاکہ درندے محفوظ رہیں۔ اب اگر کسی کا قسمت ساتھ دے اور وہ یہ دونوں حفاظتی بند توڑ کے نکل جائے تو وہ یہاں سے باہر نکلتے ہی جنگل کے چاروں طرف پھیلے، دہشت گردوں کے قبضے میں چلا جاتا ہے اور پھر اس کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے وہ لوگ جو کہ ان کے مظالم کا شکار ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طریقے سے یہاں سے نکل جائیں وہ ان کے حفاظتی اقدامات کی وجہ سے ایسا سوچتے ہی نہیں۔ کچھ سر پھروں نے ایسی کوشش کی تھی مگر وہ لوگ نشان عبرت بنا دیے گئے۔

میں بھی کافی عرصہ ان کی قید میں رہا اور پھر ان لوگوں نے ہم سب کو آزاد کر کے معمولی کاموں پر لگا دیا۔ دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی ان کے احکامات کی پیروی کرنا پڑی اور مجھے اس جنگل میں ایمبولینس کی ڈرائیوری کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ تب سے میں ڈرائیوری کر رہا ہوں اس کے علاوہ بھی مجھ سے ضرورت کے مطابق کام لیا جاتا ہے مگر زیادہ تر مجھے یہی کام دیا جاتا ہے۔

آج صبح جب مجھے پوائنٹ تھری سے یہاں بھیجا گیا تو سختی سے ہدایات دی گئی تھیں کہ میں لڑکی کو لے کر واپس آ جاؤں۔ مگر جب میں نے آپ کی ان لوگوں سے مڈبھیڑ دیکھی تو میرے دل میں ایک عجب سا خیال آیا۔ اور اسی خیال کے تحت میں نے وہاں سے نکلنے میں تھوڑی سی دیر کی ورنہ جونہی آپ کی ان سے مڈبھیڑ ہوئی تو مجھے وہاں سے نکل آنا چاہیے تھا۔ حالات سازگار دیکھتے ہی میں ایمبولینس لے کر وہاں سے نکل آیا مناسب دوری پر پہنچتے ہی جان بوجھ کر میں نے ایک کھڈ میں ایمبولینس گرا دی۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ اس جگہ پہ ان لوگوں کے علاوہ کوئی بھی موجود نہیں تھا مگر میں کسی قسم کا کوئی رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے میں نے آپ کی اور بیجنل طریقے سے مدد کرنے کی کوشش کی تاکہ اگر ان کا کوئی بندہ دیکھ رہا ہو تو وہ یہی سمجھے کہ آپ کی مدد میں نے جان بوجھ کر نہیں کی بلکہ میں آپ کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ آپ کے ساتھ جو ہستی ہے مجھے امید ہے کہ وہ اگر چاہے تو آپ کے ساتھ میں بھی ان کے اس ناقابل شکست حصار کو توڑ کر بحفاظت باہر نکل سکتا ہوں۔"

انتہائی ناقابل یقین، حیرت انگیز، خطرناک اور تحیر میں ڈوبی ہوئی اس کی داستان الم سن کر مجھے انتہائی دکھ ہوا۔ کیا دنیا میں ایسا بھی ممکن ہے؟ میرا دل تو اس پر یقین کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہو رہا تھا مگر گزشتہ دو دنوں سے پے در پے مجھ پر بیتنے والے حیران کن واقعات نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اس پر یقین کر لوں اور یقین کیے بنا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے ہم آدھ گھنٹے کی جنگل میں مسافت کے بعد بھی انہی لوگوں کے نرغے میں تھے اور یہاں سے نکلنا بھی ناممکن تھا۔ جانے یہ جنگل کہاں تک پھیلا ہوا تھا اور اس وقت ہم کہاں موجود تھے۔

"رام گوپال۔ تمہاری داستان الم سن کر مجھے انتہائی دکھ ہوا۔ بہرحال اس وقت میں تمہارے ساتھ سوائے دکھ کے اظہار کے اور کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ خیر تمہاری مہربانی کہ تم نے مجھ سے تعاون کیا اور میں تم سے وعدہ تو نہیں کرتا مگر میں کوشش ضرور کروں گا کہ تمہیں اور تم جیسے دوسرے مظلوموں کی کچھ نہ کچھ مدد کر سکوں مگر اس کے لیے مجھے تمہارا اور تم جیسے دوسرے لوگوں کا بھرپور تعاون درکار ہے۔"

"جی حجور! ہم سے جو ہو سکا ہم جرور (ضرور) کریں گے۔" اس نے دور خلاؤں میں کہیں گھورتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

رام گوپال کی طرف سے تسلی ہونے کے بعد میں نے اس کے ساتھ مل کر جگنی کو چیک کیا وہ دیکھنے میں تو بالکل تندرست اور صحیح سلامت نظر آ رہی تھی۔ اس کا سانس بھی نارمل تھا۔ ایمبولینس میں پڑے پانی کے کولر سے میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ جلد ہی اسے ہوش آ گیا۔ اس کے ہوش میں آتے ہی میں نے موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا۔ جبھی حالات سے باخبر ہونے کے بعد اس نے حیرانی اور پریشانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پیارے صائم۔ شکر ہے کہ تم نے میرے ساتھ آنے کا فیصلہ کیا ورنہ اس صورت حال میں میں اکیلی تو کچھ بھی نہ کر سکتی۔" اس نے میری طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟ میرے خیال میں تو میں نے آ کر تمہیں بھی پھنسا کر رکھ دیا ہے۔ اس وقت اگر تم اکیلی ہوتیں تو شاید کبھی کی نکل گئی ہوتیں۔" میں نے ازراہ مذاق اس سے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں صائم! جسے تم مذاق سمجھ رہے ہو وہ مذاق نہیں بلکہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ مجھ پر جو کیمکل ان لوگوں نے پھینکا ہے۔ اس نے میری اڑنے کی تمام صلاحیتیں ختم کر کے رکھ دی ہیں۔ اب اس مشکل سے مجھے تم ہی نکال سکتے ہو یا پھر وہ اوپر والا ہی کوئی مہربانی کرے تو شاید میری اڑنے کی صلاحیت دوبارہ لوٹ آئے۔" اس نے مایوسی کے عالم میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

جگنی کی یہ بات سن کر مجھے پریشانی تو ہوئی کیونکہ مجھے اپنی اتنی فکر نہیں تھی جتنی کہ جگنی کی تھی مگر میں نے اس پریشانی کو اپنے چہرے پہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"رام گوپال! تم تو ایک عرصے سے یہاں رہائش پذیر ہو تمہارے خیال میں یہاں سے نکلنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" میں نے رام گوپال سے پوچھا۔

رام گوپال بھی پڑھا لکھا تھا اور میرے اور جگنی کے درمیان ہونے والی انگلش میں گفتگو کو سمجھ چکا تھا۔ اس نے جب یہ سنا کہ جگنی پریوں کی صلاحیتوں سے محروم ہو چکی ہے تو اس کا چہرہ فق ہو گیا اور اب وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

"گو کہ میں یہاں سے نکلنے کے سبھی راستوں سے واقف ہوں مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہاں سے ان لوگوں کی مرضی کے خلاف نکلنے والوں کے لیے سبھی راستے موت کی وادی سے ہو کر گزرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہ موت سو فیصد یقینی ہے۔ اب تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ میں نے تمہاری مدد کر کے بہت بڑی غلطی کی۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ ابھی تمہاری ساتھی ہوش میں آئے گی تو ہم بحفاظت ان کا حصار توڑ کر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ اتنی ترقی کر گئے ہیں اور انہوں

نے ایسا کیمیکل بھی تیار کرلیا ہے جو کہ ایک ماورائی مخلوق سے اس کی فطری صلاحیتیں بھی چھین لے۔ افسوس صد افسوس۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

انتہائی عجب اور پریشان کن صورت حال تھی اور مجھے ان حالات کا ڈٹ کر مقابل کرنا تھا اور ہر حال میں جگنی کو یہاں سے لے کر نکلنا تھا۔ اس کے لیے چاہے مجھے اپنی جان دینا پڑے۔ میں نے ایک عزم سے ایمبولینس کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔

جنگل میں اس وقت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور اس میں بتدریج تیزی آتی جارہی تھی۔ درختوں کے درمیان اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔ میں نے درختوں کے پتوں کے بیچوں بیچ اوپر کی طرف نظر دوڑائی تو مجھے آسمان کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا نظر آیا۔ جگنی اور رام گوپال بھی میرے ہمراہ ایمبولینس سے نکل آئے تھے۔ جہاں ہم اس وقت کھڑے تھے یہاں سے دور درختوں کا ایک بہت بڑا اور گھنا سا جھنڈ نظر آرہا تھا۔ بے اختیاری طور پر جانے کیوں میں اس طرف بڑھتا جارہا تھا میرے پیچھے رام گوپال اور جگنی بھی چلے آئے۔ یہ جگہ کافی اونچائی پر موجود تھی۔ جلد ہی ہم اس جگہ پر پہنچ گئے۔

وہ ایک بہت بڑا ٹیلہ تھا جو کہ چاروں طرف سے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ان درختوں کے درمیان ایک بہت بڑے بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے ایک خشک کنواں بھی موجود تھا۔ شاید کسی دور میں یہاں کوئی آباد رہا ہو اور اس نے یہ کنواں بنایا ہو مگر اس وقت یہ بالکل ناکارہ اور خستہ حال دکھائی دے رہا تھا۔ ہم تینوں اس جگہ کا معائنہ کرنے میں اتنے محو تھے کہ ہمیں خبر ہی نہ ہوسکی کہ چالاک دشمن نے ہمیں چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ حملہ آور ہونے والی ایک دفعہ پھر وہی خوفناک اور ڈراؤنی مخلوق تھی جو ہمیں پہلے بھی شکار کرکے یہاں لائی تھی۔ اسی پرانے مندر میں ہمیں ایک بار پھر سے لے جایا گیا۔ تہہ خانے میں قید کرنے سے پہلے ہمیں کھانا کھلایا گیا اور ایک بار پھر سے تہہ خانے میں دھکیل دیا گیا۔

رات کے جانے کس پہر ہمیں باہر صحن میں لے جایا گیا۔ ہم جونہی باہر نکلے تو سرد ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔ آسمان ابھی تک بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سردی اپنے جوبن پر تھی۔ رات کے اس وقت پورے مندر کے احاطے میں لائٹس کا انتظام کیا گیا تھا۔ شاید یہاں پر بجلی کا انتظام پہلے سے ہی موجود تھا مگر پچھلی رات انہوں نے اس کا استعمال نہیں کیا تھا۔ مندر میں بنے ایک پرانے سے چبوترے کی صفائی ستھرائی کرکے ایک بہت بڑا شامیانہ لگا کر وہاں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور اس وقت ان کرسیوں پر سوٹڈ بوٹڈ لوگ بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان کرسیوں کے آگے ایک جگہ آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن تھا اور اس الاؤ کے گرد کچھ لوگ گیروے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس ہاتھوں میں ترشول لیے کوئی عجب سا راگ الاپ رہے تھے۔

مجھے جگنی اور رام گوپال کو آگ کے الاؤ کے نزدیک لوہے کی باریک زنجیروں سے باندھ کر ڈال دیا گیا۔ کرسیوں پہ بیٹھا ہوا ایک شخص اٹھا اور ہماری طرف بڑھا۔ جگنی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے کوئی اشارہ کیا۔ جسے میں سمجھ نہیں پایا۔ وہ جگنی کے قریب آکر زمین پر ہی اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ ان کے ساتھیوں میں سے کوئی بھاگ کر چبوترے سے کرسی لے کر آیا اور اس نے اس سوٹڈ بوٹڈ شخص کو کرسی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''مہاراج! کرسی پر بیٹھیے ناں حجور!'' اس شخص نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔

''ابے او جنگلی! دیکھ نہیں رہا تم نے کتنی پیاری اور حسین ہستی کو جالم (ظالم) جنجیروں (زنجیروں) میں باندھ کر قیدیوں کی طرح جمین (زمین) پر پھینک دیا ہے۔ میرے جیتے جی کوئی بھی میری محبوبہ کے ساتھ ایسا کرے یہ ہو نہیں سکتا۔'' یہ کہہ کر اس نے جگنی کو زنجیروں سے آزاد کردیا۔ آزاد ہوتے ہی جگنی نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

''رام داس! بہتر ہوگا کہ تم مجھے میرے ساتھی سمیت آزاد کردو اور مجھے جانے دو کیونکہ تمہاری اور میری کوئی دشمنی نہیں۔'' جگنی نے رواں انگلش میں رام داس سے کہا۔

اس کے بعد ان دونوں کے درمیان انگلش میں بات چیت جاری ہوئی جس کا مفہوم مندرجہ ذیل ہے۔

''بھلا تم سے دشمنی کون کرنا چاہے گا اے حسن کی دیوی۔ اپن تو تم پہ دل و جان سے مرمٹا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ اس بارے میں سادھو سنت لوگ۔ عشق ہوگیا ہے اپن کو تم سے۔'' رام داس نے جگنی کے سراپا پر ایک ہوس زدہ نگاہ ڈالتے ہوئے بھونڈے سے انداز میں کہنے کی کوشش کی۔

''کیا یہ عشق ہے رام داس۔ محبوب کو اغوا کرکے اور اسے قید کرکے کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ عشق ہوتا ہے۔ نہیں رام داس۔ عشق تو ایک پوتر اور پاکیزہ جذبہ ہے جس کے بارے میں تم کیا جانو کہ یہ کیا ہوتا ہے اگر تم اس جذبے سے واقف ہوتے تو آج اپنے محبوب کے ساتھ یہ نہ کرتے جو تم نے کیا ہے۔'' جگنی نے عجب سے لہجے میں رام داس سے کہا۔

''جگنی میری جان! تم نے جو ابھی کہا۔ یہ کہاں تک سچ ہے اس کی تو ابھی پرکھ ہو ہی جاوے گی۔ تمہارا یہ مسلا سورما تو تمہارا عاشق ہے ناں۔ چلو آج ہم اسی سے شروع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کے عشق میں ایسا کیا ہے جو ہم میں نا ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے تھوڑا سا توقف کرتے ہوئے اپنے جوگی ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ میں مائک تھاما اور رواں انگلش میں کہا۔

''جوگی پریم ناتھ جی۔ اسٹیج سج چکا ہے۔ حاضرین محفل پہنچ چکے ہیں۔ جناب عزت مآب ڈیوڈ صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ آپ سب حاضرین سے ڈیوڈ صاحب کا تعارف کرواتا چلوں۔ آپ یورپین ممالک میں ایک عظیم ماہر روحانیات مانے جاتے ہیں اس سلسلے میں آپ نے کئی تصانیف بھی لکھی ہیں اور پوری دنیا میں اس وقت آپ کی تصانیف کا شہرہ ہے۔ انہیں جب ہمارے اس کارنامے کا پتہ چلا تو یہ بہت حیران ہوئے اور اپنے ملک سے بنفس نفیس ہمارا یہ کارنامہ دیکھنے چلے آئے۔ مگر ہمارے چند جلد باز جیالوں نے جگنی پر صبح ایک کیمیکل پھینک کر اسے چند روز کے لیے اس کی فطری صلاحیتوں سے محروم کردیا ہے۔ اس لیے آج رات ہم آپ کو جگنی کو پرواز کرتے ہوئے تو نہیں دکھا سکتے مگر اس کی جگہ ہم اس کے عاشق اعظم کو پرواز کرتے اور چند عجیب و غریب حرکات کرتے ہوئے ضرور دکھائیں گے۔ کیونکہ ہمارے دوست محترم ڈیوڈ صاحب بہت دور سے ہمارے ملک میں تشریف لائے ہیں ابھی ہم نے ان سے مکمل طور پر اس ادارے کا تعارف نہیں کروایا۔ اگر ہم اس ادارے کا مکمل طور پر ان سے تعارف کروا دیں تو یقیناً یہ باہر کی دنیا کے لیے ناقابل یقین، تحیر خیز اور سنسنی خیز ہوگا۔

مگر یہ سب قبل از وقت ہوگا اور ہم نہیں چاہتے کہ وقت سے پہلے ہم اپنے تجربات کو دنیا میں ظاہر کرکے اپنے آپ کو عالمی برادری میں تنقید کا نشانہ بنالیں۔ ڈیوڈ صاحب کو یہاں تک پہنچانے میں ہمارے چند بڑوں کی مرضی بھی شامل ہے کیونکہ ہم مستقبل قریب میں دنیا کے چند ایسے ذہینوں کو اپنے ادارے میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جو ہمارے ان تجربات کو صحیح سمت میں لے جانے میں ہماری مدد کرسکیں اور انہی محترم ہستیوں میں سے ایک ہستی ڈیوڈ صاحب ہیں جو کہ بنیادی پر یہودی ہیں اور ہماری حکومت کے بہترین حلیفوں میں شامل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آج کے محیر العقول واقعات دیکھنے کے بعد ہمارے ہم سے وہ معاہدہ کرنے پر مجبور ہوجائیں گے جو کہ ہم چاہتے ہیں۔

......تو میرے خیال میں دوستو! جوگی پریم ناتھ جی جو کہ ہمارے ملک کی مایہ ناز شخصیت ہیں اور آپ کی شخصیت ایسی ہے کہ جسے ملک کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک نہ صرف جانا جاتا ہے بلکہ لوگ ان کو بھگوان کا اوتار سمجھتے ہوئے ان کی پوجا کرتے ہیں۔ آپ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس عظیم شخصیت نے ہمارے ملک کی بقا کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ یقیناً ہمارے ملک کی تاریخ میں سنہری حروف میں

لکھے جانے کے قابل ہیں...... تو آؤ دوستو اس شو کو شروع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ جوگی پریم ناتھ اس مسلے کا کیا کرتے ہیں جو کہ جگنی کا عاشق ہونے کا دعویدار ہے۔" یہ کہہ کر رام داس سٹیج سے اتر کر شامیانے میں لگی کرسیوں کی طرف بڑھا۔

آپ کو بتاتا چلوں کہ رام داس کی اس ساری تقریر کے دوران منہ پہ پٹی بندھی ہونے کی وجہ سے میں کچھ بول نہیں پایا۔ رام داس کی تقریر کے خاتمے کے بعد جوگی پریم داس اپنے چیلوں کے ہمراہ میری طرف بڑھا۔ اس کے چیلوں نے مجھے زنجیر کی بندشوں سے آزاد کروایا اور میرے منہ پر بندھی پٹی بھی کھول دی۔ اس دوران جوگی پریم ناتھ کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکتا بھی جارہا تھا۔ مجھے مکمل طور پر آزادی ملی تو میں نے بلند حوصلے اور ہمت سے کام لیتے ہوئے حاضرین محفل کی طرف دیکھتے ہوئے بہادرانہ اور بے خوف انداز میں اونچی آواز میں کہا۔

"مہاشے جی رام داس نے عزت مآب ڈیوڈ اور جوگی پریم ناتھ کا حاضرین محفل سے تعارف کروادیا مگر شاید انہوں نے مجھے حقیر جانتے ہوئے اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ میرا تعارف بھی کروادیتے۔ میرے ناقص خیال کے مطابق ایسا کر کے انہوں نے جوگی پریم ناتھ کے علم اور ان کی مہان شکتی کا اپمان کیا ہے اور اپنی اس بات کی وضاحت کرنے کی شاید مجھے ضرورت نہیں کیونکہ سبھی صاحبان علم اور پڑھے لکھے لوگوں کا مجمع اس وقت ہمارے روبرو ہے۔ (اسی وقت جوگی پریم چند نے انتہائی نفرت اور حقارت سے مجھے دیکھا اور مائک میری طرف بڑھایا تو میں نے بقیہ گفتگو مائک کو استعمال کرتے ہوئے کی)

بہر حال میں اس وقت یہاں جمع ہونے والے سبھی تماشائیوں کو اپنے بارے میں تھوڑا بہت ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ جوگی پریم ناتھ جی اس وقت جسے بچہ جمہورا بنا کر آپ سب لوگوں کو مداری دکھانے پر تلے بیٹھے ہیں وہ شخص ایک عام سا مسلمان ہے اور اپنے خدا کا ایک حقیر و پر تقصیر بندہ ہے۔ میری نہ تو کوئی اوقات کبھی تھی، نہ ہے اور نہ کبھی ہوگی مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ اللہ پاک کے انتہائی فضل و کرم سے جیت اسی خاکسار کے قدموں سے لپٹی ہوئی قبولیت کی بھیک مانگتی نظر آئے گی تمہیں، اور یہ میرا دعویٰ نہیں میرا اپنے رب کے اوپر یقین ہے۔"

میرے ان پر جوش لفظوں نے شاید جوگی پریم ناتھ کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا اور اسی لیے وہ انتہائی خونخوار اور غصہ بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ سٹیج پر بیٹھا گورا ڈیوڈ اور رام داس بھی حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور حاضرین محفل میری اس بات چیت سے محظوظ ہوتے دکھائی دیے۔ میری بات ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک شخص ڈھول پیٹتا ہوا میدان میں اترا۔ اچانک آگ کے قریب بیٹھے ہوئے جوگی پریم ناتھ کے چیلے ڈھول کی آواز سنتے ہی جیسے ہوش میں آگئے اور انہوں نے جے بجرنگ بلی کا نعرہ بلند کیا۔

جوگی پریم ناتھ نے آگ میں کوئی چیز پھینکی۔ آگ لہو رنگ ہوئی اور اس میں سے گاڑھے سیاہ رنگ کے دھویں کے مرغولے اٹھے اور حیرت کی بات یہ ہوئی کہ یہ گاڑھے سیاہ دھویں کے مرغولے میری طرف بڑھے اور میرا وجود ان مرغولوں میں گھر کر رہ گیا۔ یہ دھواں میرے نتھنوں سے ٹکرا کر جب میرے پھیپھڑوں تک پہنچا تو اس نے میری انتہائی بری حالت کر دی میں دھڑام سے نیچے گرا مگر اسی وقت مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے مجھے گرنے سے پہلے تھام لیا مگر اس کے بعد وہ ہوا جو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ دھویں کے بادل چھٹے اور میرا وجود فضاؤں میں کہیں تحلیل ہوگیا۔

اچانک میرے کانوں سے مجمع کی پر جوش تالیاں ٹکرائیں۔ بے ہوش ہوتے حواس کے ساتھ میں نے نیچے دیکھا تو رام داس اور دوسرے حاضرین شامیانے سے نکل کے باہر صحن میں کھڑے نظر آئے۔ وہ میری طرف حیرت بھری اور ناقابل یقین نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت میرا وجود زمین سے کافی اونچائی پر کسی ظاہری سہارے کے بغیر معلق تھا۔ دھویں کے مرغولوں کے حصار نے تو مجھے چھوڑ دیا تھا مگر وہ تھوڑا سا دھواں جو کہ اس دوران نتھنوں سے ہوتا ہوا میرے پھیپھڑوں تک پہنچا تھا اس نے میرے ہوش وحواس اور سوچنے کی حس کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھے اپنے وجود کے نیچے کوئی چیز بہت اچھی طرح محسوس ہورہی تھی اور یہی وہ شئے تھی جس نے میرے وجود کو فضا میں تھام رکھا تھا مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ چیز نہ تو مجھے نظر آرہی تھی اور نہ ہی حاضرین محفل کو اور یہی وہ چیز تھی جس نے سبھی کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر رکھا تھا۔

میں نے اپنے دل میں اپنے رب کو یاد کیا اور اس سے مدد مانگی میرے بے ہوش ہوتے حواس نے کچھ بہتر انداز میں کام کرنا شروع کر دیا مگر ابھی تک میرا وجود ہوا میں ہی کہیں معلق تھا۔ نیچے کہیں دور سے رام داس کی گورے ڈیوڈ سے بات کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ رام داس شاید گورے ڈیوڈ کو اس صورت حال کے بارے میں بریف کر رہا تھا۔ پھر ان آوازوں میں جگنی کی آواز بھی شامل ہوگئی۔ میرے کانوں سے اس کی درد میں ڈوبی ہوئی سسکیاں ٹکرائیں۔ شاید وہ رام داس کو رام کرنے کے چکر میں تھی مگر رام داس نام کا رام داس تھا، اندر سے وہ راون داس کی بدترین شکل تھا۔

اچانک آہستہ آہستہ میرا وجود نیچے اترنے لگا اور پھر جلد ہی مجھے کسی نادیدہ قوت نے زمین پر آرام سے لا کر لٹا دیا۔ جگنی یکدم میری طرف بڑھی اور مجھ پر بے اختیاری میں گر گئی۔ گرو کے کچھ چیلے اس کی طرف بڑھے اور انہوں نے زبردستی جگنی کو میرے وجود سے علیحدہ کر دیا۔ اس وقت میری حالت انتہائی ناگفتہ بہہ تھی۔ جہاں مجھے اس وقت لا کر لٹایا گیا تھا۔ وہاں میرے نیچے وہی جال تھا جس میں قید کر کے ہمیں یہاں لایا گیا تھا۔ کوئی چیز مجھے اپنے نیچے کمر میں چبھتی محسوس ہو رہی تھی مگر مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں اسے اپنے نیچے سے نکال سکتا۔

کچھ ہی دیر میں جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے نیچے ہاتھ ڈال کر اس چیز کو نکالنے کی کوشش کی تو میرے ہاتھ جس چیز سے ٹکرائے اسے پا کر میرے دل میں اچانک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جلد ہی میں نے اسے اپنے نیچے سے نکالا تو میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ یہ وہی تسبیح تھی جس کے بارے میں میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کہیں گم ہوگئی تھی۔ اس تسبیح کے ملتے ہی میرے اعتماد میں ڈھیروں اضافہ ہوگیا۔

میں نے جلدی سے تسبیح اپنے گلے میں ڈال لی۔ شاید یہ تسبیح اس جال کے باریک دھاگوں سے لپٹ کر رات کو میرے ساتھ ہی یہاں تک آگئی تھی مگر مجھے اس کی خبر نہیں ہوسکی۔ شاید یہ وہیں کہیں میری جیب سے گری ہوگی جہاں مجھے اوپر آسمان میں زبردست چکر دیے گئے تھے اور جونہی انہوں نے ہم پر یہ جال پھینکا تھا تو اسی جال میں لپٹ کر یہ تسبیح یہاں تک آگئی تھی۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا اس وقت کسی کا بھی دھیان میری طرف نہیں تھا۔ جگنی مجھ سے کچھ دوری پر سر نیہوڑائے جانے کس سوچ میں گم تھی۔ رام داس انتہائی اعتماد اور غرور کی کیفیت میں حاضرین کو کسی نئی آئٹم کے بارے میں بتا رہا تھا اور پھر وہاں ایک عجیب وغریب، حیرت انگیز اور دلوں کو دہلا دینے والا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حاضرین محفل کی تالیوں کے درمیان وہ سلسلہ کچھ دیر تک چلتا رہا۔ جوگی پریم ناتھ لوگوں سے داد وصول کرتا رہا۔

آخر کار ایک بار پھر رام داس نے مائک سنبھالا اور حاضرین محفل کو آخری دو آئٹمز کے بارے میں بتانے لگا۔ اس دوران پھر سے میرے اور جگنی کے ارد گرد مسلح افراد آن کھڑے ہوئے۔ ہاؤ ہو اور بے انتہا شور کے درمیان رام گوپال کو شامیانے کے آگے بجے سٹیج کے درمیان ایک بہت بڑے میز پر لا کھڑا کیا۔

میں نے دیکھا اس کا وجود ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ شاید یہاں لانے سے پہلے اسے کوئی نشہ آور چیز پلائی گئی تھی۔ دو سیکورٹی گارڈز نے اسے سنبھال رکھا تھا۔ وہ بے چارہ ان کے کسی نئے ظلم کا شکار ہونے جارہا تھا

اور اسے خبر بھی نہیں تھی کہ چند لمحوں کے بعد اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ جوگی پریم ناتھ ہاتھ میں ایک لہورنگ ترشول لیے اس کے ساتھ میز کے اوپر کھڑا ہو گیا۔ اچانک اس نے ترشول ہوا میں بلند کیا اور فضا میں جے بجرنگ بلی کا نعرہ بلند کیا۔ پریم ناتھ کے چیلوں نے اس کا نعرہ سنتے ہی ایسے پرزور انداز میں نعرہ بازی کی کہ انہوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اسی دوران اچانک اک حیرت انگیز اور محیر العقول واقعہ رونما ہوا۔ جسے دیکھتے ہی مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ شور اور ہاؤ ہو کہیں دب کر رہ گیا اور اس کی جگہ حیرانی اور درد میں ڈوبی رام گوپال کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔

میں نے دیکھا اس کا ایک ہاتھ کندھے سے غائب تھا اور انتہائی حیرت کی بات یہ تھی، نہ تو کہیں خون نظر آرہا تھا اور نہ ہی کہیں جدا ہونے والے ہاتھ کا حصہ۔ تمام حاضرین محفل رام گوپال کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ابھی لوگ اس شاک سے نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ اس کا دوسرا ہاتھ بھی ہوا میں کہیں تحلیل ہو گیا۔ حیرت اور خوف میں گندھی مجمعے کی چیخیں سنائی دیں مگر رام گوپال کے ساتھ بیتنے والے اس حادثے نے تو جیسے اسے پاگل کر کے رکھ دیا۔ اس کی درد میں ڈوبی چیخیں اور واویلا سن کر کچھ لوگ تو کانوں کو ہاتھ لگاتے بھی نظر آئے اور کچھ نے دبی دبی آواز میں جوگی پریم ناتھ سے اس آئٹم کو آگے بڑھانے سے بھی روکنے کی کوشش کی مگر جوگی پریم ناتھ جو کہ شاید اس وقت کسی کی آواز بھی نہیں سن رہا تھا اور اپنے کام میں اتنا منہمک تھا کہ اسے ارد گرد کی ہوش ہی نہیں تھی۔ اس کے اگلے وار میں رام گوپال کی ایک ٹانگ کے چٹخنے کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد وہ بے چارہ اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد اس کی دوسری ٹانگ بھی اس کے وجود کا ساتھ چھوڑ گئی۔ رام گوپال کی حالت ناقابل بیان ہوتی جارہی تھی۔ سینے کے بل بڑی مشکل سے گھسٹتا ہوا وہ جوگی پریم ناتھ کے قدموں سے ٹکرایا اور انتہائی خوف و ہراس اور ناقابل بیان درد بھری آواز سے گویا ہوا۔

"جوگی پریم ناتھ جی! مجھے ماپھ (معاف) کردیں حجور۔ ماڑے سے جو گلتی (غلطی) ہو گئی اب ہم دوبارہ ناہیں کریں گے یہ گلتی۔ آپ کو اسی شکتی کا واسطہ ہے جس نے آپ کو یہ سب دان کیا ہے حجور۔"

چپ کر مورکھ! تم نہیں جانتے کہ ہم اپنے غداروں کے ساتھ کیا کیا سلوک کرتے ہیں۔ یہ تو ہم نے تمہیں بہت چھوٹی سزا دی ہے۔" رام داس جانے کب اس بڑے سے میز پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے رام گوپال کے بچے کھچے وجود کو ٹھوکر مارتے ہوئے یہ کلمات ادا کیے اور ہاتھ میں مائک تھامے وہ مبہوت ہوتے مجمعے سے ایک بار پھر سے مخاطب ہوا۔

"آپ نے دیکھا حاضرین کہ ہم فن کی کس انتہا تک پہنچ چکے ہیں مگر یہ اس کا انت نہیں ہے ابھی اس فن میں کچھ اور حیرتیں آپ کی منتظر ہیں۔ ابھی تک غدار رام گوپال کا دھڑ اور سر سلامت ہیں اور یہ صرف اس لیے ہے کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں اس کے وجود سے علیحدہ ہوئے مگر خون کا ایک قطرہ بھی اس کے وجود سے نہیں بہا۔ خون کے بہاؤ کو ایک خاص عمل کے ذریعے ہمارے مہا جوگی پریم ناتھ نے ابھی تک روک کے رکھا ہے وہ صرف اس لیے کہ رام گوپال کو زیادہ سے زیادہ اس کے ہوش و ہواس کے دران سزا کا عمل جاری رکھا جائے اور وہ اس خوف سے واقف ہو سکے جو کہ ہم اس کی روح کے اندر نقش کرنا چاہتے ہیں اور آئندہ کے لیے جب ہم اس کی روح کو ایک اور شکل میں قید کر رہے ہیں تو اس سے ہم وہ تمام مقاصد حاصل کر سکیں جو کہ ہمارا مقصود ہے۔ اس کی وضاحت ابھی تھوڑی ہی دیر میں آپ سب پر عیاں ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے جوگی پریم ناتھ کو کوئی اشارہ کیا۔

جوگی پریم ناتھ نے ترشول کو ایک خاص انداز میں اس کے گرد چکر کے انداز میں الٹا اور سیدھا کر کے گھمایا۔ یکلخت رام گوپال کی آخری چیخ فضا میں گونجی اور اس کا بقیہ وجود جیسے خون میں نہلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے سر سے دھڑ جدا ہو کر غائب ہوا اور اس

کے تھوڑی دیر بعد اس کا سر بھی ہواؤں میں کہیں بکھرتا چلا گیا۔

آلتی پالتی مارے جوگی پریم ناتھ میز پر بیٹھا منہ ہی منہ میں کچھ منمنا رہا تھا۔ سبھی چیلے اور پورا مجمع مکمل طور پر اس کے ٹرانس میں آچکا تھا۔ شامیانے اور پورے صحن میں بکھرے ہوئے سیکورٹی گارڈز بھی مبہوت سے جوگی پریم ناتھ کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ اچانک پریم ناتھ نے ایک بار پھر سے بجرنگ بلی کا نعرہ لگایا۔ اس کے چیلے اچانک ماحول کے ٹرانس سے نکلے اور انہوں نے ایک بار پھر سے اپنے گرو کا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی ڈھول والوں کو جوش چڑھا اور انہوں نے بھی ڈھول پیٹنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ماحول پہ چھائی ڈر، خوف اور سنسنی کی کیفیت بدلتی نظر آئی۔ سونڈ بونڈ کچھ جیالے بھی سٹیج سے اترے اور جے بجرنگ بلی کے نعرے لگانے والوں میں پرجوش طریقے سے شامل ہو گئے۔ ایک مرتبہ پھر سے ہاؤ ہو کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ ڈھول پٹا نعرے لگے۔ شیطان ناچا اور اچانک جوگی نے چلاتے ہوئے اپنا ترشول میز کی سطح پر مارا۔ لکڑی سے لوہے کی ٹکر ہوئی میز کے درمیان جہاں کہ ترشول کی چوٹ پڑی تھی وہاں ایک شگاف پڑ گیا۔ مگر اس کے بعد ایک ایسا محیر العقول واقعہ ہوا جس نے سبھی کو ایک بار پھر سے مبہوت کر کے رکھ دیا۔

سب نے دیکھا۔ بڑے سے لکڑی کے میز پر جوگی پریم ناتھ کے سامنے رام گوپال نہایت ادب و احترام سے کھڑا زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ نعرے لگاتے چیلے، ڈھول بجاتے ڈھولی، ہاؤ ہو کا بے ہنگم شور برپا کرتے تماش بین یکدم سبھی خاموش ہو گئے۔ مائک پر اس خاموشی کو چیرتی ہوئی رام داس کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"یہی وہ نکتہ ہے حاضرین جسے میں آپ کو دکھانا چاہتا تھا۔ سامنے کھڑا شخص کون ہے؟ جبکہ ابھی سب نے اپنی آنکھوں سے اسے سب کے سامنے تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مرنے کے بعد یہ شخص آخر زندہ کیسے ہو گیا؟ یہ وہ کمال ہے جو کہ ہمارے مہا جوگی پریم ناتھ جی نے انتہائی تپسیا اور محنت کے بعد حاصل کیا ہے۔ اگر میں آپ سب سے یہ کہوں کہ یہ سامنے جو شخص کھڑا ہے یہ مردہ ہے تو کیا آپ لوگ میری اس بات پر یقین کریں گے؟ کوئی بھی صاحب عقل اسے مردہ نہیں کہہ سکتا۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں میں اس سے بات کر کے دکھاتا ہوں۔"

"ہیلو دوست! آپ کا نام کیا ہے؟" رام داس نے رام گوپال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"رام گوپال حجور!" رام گوپال نے بالکل نارمل انسانوں کی طرح کہا۔

"کیا تمہیں علم ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ رام داس نے ایک بار پھر رام گوپال سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جی! مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ تھوڑی دیر پہلے میں نے جنم لیا ہے اور بھگوان نے میرے کان میں یہ کہا ہے کہ میں سامنے موجود اس شخص جوگی پریم ناتھ کی غلامی کروں اور کوئی بھی ایسا کام نہ کروں جو کہ جوگی پریم ناتھ جی کو ناپسند ہو۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

"اور اگر کوئی تمہیں جوگی پریم ناتھ جی کے خلاف بھڑکائے تو پھر؟" رام داس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"میں اسے قتل کر دوں گا جناب۔" رام گوپال نے دھیمے مگر پراعتماد لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں جوگی پریم ناتھ جی سے ڈر نہیں لگتا۔" رام اداس نے سرسری سے انداز میں کہا۔

"جی ڈر تو بہت لگتا ہے کیونکہ جوگی جی ایک مہان شکتی اور ہم سب کے ان داتا ہیں۔" رام گوپال نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اس ڈر کی وجہ کیا ہے میرے دوست۔ میں اور یہاں جمع میرے سبھی دوست آپ کے جوگی پریم ناتھ جی سے ڈر کی وجہ جاننے کے لیے بے چین ہیں۔" رام

داس نے دوستانہ انداز میں پوچھنے کی کوشش کی۔

"میں اس کی وجہ بتانے سے تو قاصر ہوں مگر اتنا جانتا ہوں کہ اگر میں نے جوگی جی کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیا تو میرے ساتھ جانے کیا ہو۔ ایک انجانا سا خوف میرے دل و دماغ کے اندر پنجے جمائے ہوئے ہے جو کہ شاید اگر میں چاہوں بھی تو میرے دماغ سے کبھی نہ نکل سکے۔" رام گوپال نے سراسیمگی کی حالت میں جوگی پریم ناتھ کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس رام گوپال! بس۔ مجھے آپ سے بس اتنا ہی پوچھنا تھا۔ نیا جنم مبارک ہو۔" یہ کہتے ہی اس نے قریب کھڑے چند سیکورٹی گارڈز کو اشارہ کیا۔ انہوں نے رام گوپال کو پکڑا اور تہہ خانے کے اندر لے کر چلے گئے۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی رام داس ایک مرتبہ پھر سے گویا ہوا۔

"آپ نے دیکھا ناظرین۔ رام گوپال کے اندر جوگی جی کا ڈر ایک آسیب کی مانند پنجے جمائے بیٹھا ہے۔ وہ مجبور ہو گیا ہے ہر اس حکم کو ماننے کے لیے جو اسے جوگی جی دیں گے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ یہ شخص اب ساری زندگی جوگی جی کے اشارے پر چلنے والا ایک روبوٹ ہے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ اس سے ہم ہر وہ کام لے سکتے ہیں جو کہ ہم چاہتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ بعد از موت جنم۔ یہ سب ممکن کیسے ہے تو؟ یہاں پہ بیٹھے سبھی لوگ یہ جان لیں کہ یہ وہ کمال ہے جو کہ جوگی جی نے کئی سالوں کی محنت کے بعد حاصل کیا ہے۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ رام گوپال واقعی مر چکا ہے اور جو یہ زندہ ہو کر آپ کے سامنے آیا ہے یہ اس کا بھوت ہے۔ اس کی روح کو اتنی بے چینی اور خوف کے عالم میں اس کے فانی جسم سے نکالا گیا ہے کہ اس کی بے چین، حیرت زدہ اور بھٹکتی ہوئی روح عالم بالا تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمارے قابو میں آگئی ہے اور جوگی جی نے اس پر اپنے بے انتہا علم کی وجہ سے قابو پا کر بھوت کی شکل دے دی ہے اور بھوت بھی ایسا جو کہ مکمل طور پر ان کا غلام ہے۔ اب ہم جب چاہیں اسے ظاہر کریں اور جب چاہیں اسے دنیا کی نظر سے اوجھل کر دیں۔ ایسے میں ذرا سوچیے کہ ایسا شخص خفیہ اداروں کے لیے کتنا کارآمد ہو سکتا ہے۔

خیر! یہ تو ہمارا ایک چھوٹا سا کارنامہ تھا جس کے بارے میں ہم نے آپ کو عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔ ے بہت بیت چکا ہے اور موسمی حالات بھی کچھ خراب سے نظر آ رہے ہیں۔ میرا من تو ابھی آپ کو اور بھی بہت سے آئٹم دکھانے کا تھا مگر سے کی کمی اور خراب موسم کی وجہ سے ہم اپنے آخری آئٹم کی طرف چلتے ہیں۔ اس آئٹم کے بارے میں پہلے سے بتا کر میں آپ کا مزہ کرکرا نہیں کرنا چاہتا۔

بہر حال میں یہاں اس شامیانے اور سٹیج کے سامنے اور اردگرد بیٹھے سبھی تماشائیوں سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ کمزور دل لوگ جو کہ رام گوپال کی حالت دیکھ کر گھبرا گئے تھے اور بارہا جوگی جی کا دھیان بٹانے کا باعث بن رہے تھے وہ یہاں سے چلے جائیں تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ اب جو شو یہاں شروع ہونے والا ہے وہ انتہائی خطرناک ہی نہیں بلکہ جان لیوا بھی ہے۔ اس کے لیے تو یہ جان لیوا ہے ہی جس پر یہ عمل ہمارے محترم جوگی پریم ناتھ جی کریں گے، یہ اس کے لیے کہیں زیادہ جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے جس نے اس دوران ہلکا سا شور یا کوئی بات بھی کی۔ یا خوف اور حیرت کی کیفیت میں کسی نے بے اختیاری طور پر کوئی بھی حرکت کر دی۔ اس لیے اس پنڈال میں وہی لوگ موجود رہیں جو پہاڑوں کا سا جگر رکھتے ہوں۔ بڑی معذرت کے ساتھ اگر پھر بھی آپ ہمارا یہ شو دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر نقصان و نفع کے ہم ذمہ دار نہ ہوں گے۔ کیونکہ اس شو میں کچھ ایسی بے رحم شکتیوں کو شامل کیا جا رہا ہے جو کہ انسانیت اور اس کے نام سے بھی نا آشنا ہیں اور میں اپنے اردگرد ان شکتیوں کے سائے محسوس کر رہا ہوں جو کہ شاید آپ نہیں دیکھ سکتے۔" یہ کہہ کر رام داس خاموش ہوا تو میں نے دیکھا کہ کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے کچھ لوگ انتہائی خوف زدہ حالت میں اٹھے اور مندر کے تہہ خانے کی طرف بڑھ گئے۔

شامیانے کے نیچے گورے ڈیوڈ کے ساتھ اب کچھ ہی لوگ رہ گئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ڈھول بجانے والے بھی اٹھے اور مندر کے تہہ خانے کی طرف بڑھ گئے۔ اب پنڈال میں شاید انسان نہیں پتھر ہی رہ گئے تھے اور ان پتھروں کے درمیان جگنی اور میرا وجود بھی شامل تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں کچھ لوگ میری طرف بڑھے اور انہوں نے مجھے پکڑ کر میز تک لانا چاہا۔ میں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا اور خود ہی اعتماد، بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے میز کے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ رام داس کے ماتھے پر پریشانی کی چند لکیریں نمودار ہوئیں۔ میرے حوالے سے شاید وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ مگر میری جرأت نے شاید اسے حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔

رام داس نے مائک تھاما اور کہا۔ "ان حالات میں آپ کا قدموں پر چل کر جرأت سے اسٹیج پر آنا مجھے اچھا لگا اور میرے خیال میں جب آپ سمجھ گئے ہیں کہ یہ آخری جان لیوا کھیل آپ کے ساتھ ہی کھیلا جانے والا ہے اور پھر بھی آپ نے اتنی ہمت اور جرأت سے کام لیا ہے تو آپ کی ہمت کی داد نہ دینا بھی ناانصافی ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی تو سارا پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔

"آپ کا نام؟" رام داس نے میری طرف مائک کرتے ہوئے کہا۔

"صائم...... صائم ہے میرا نام۔" یہ کہہ کر میں نے رام داس سے مائک لیا اور اسٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"جیسا کہ رام داس نے ابھی اس شو کے حوالے سے کافی کچھ کہا بھی مگر اس کی تفصیلات بیان نہیں کیں...... ایک بات جو انہوں نے کنفرم کی وہ یہ کہ اس شو میں جس بندے پر مہا جوگی پریم ناتھ جی عمل کریں گے اس کی موت یقینی ہے.......... موت کا ایک کھیل چند لمحے پہلے بھی کھیلا گیا۔ جسے میں نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر اس مردے کا بھوت بھی میں نے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیا۔ ایک بات تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ آج سے پہلے میں نے ایسا دیکھنا تو کجا کسی سے ایسی بات سنی بھی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب دیکھنے کے دوران کئی بار میرا دل بھی کانپا ہو کیونکہ یہ سب انتہائی خوفناک، حیران کن، سنسنی خیز اور ظلم کی حدوں سے بھی آگے گزرتی ہوئی کوئی چیز تھی۔ بلکہ سچ پوچھیں تو اس صورت حال کی وضاحت کے لیے مجھے یہ لفظ بھی چھوٹے سے لگتے ہیں مگر کیا کریں ہماری ڈکشنری میں ایسی صورت حال کو بیان کرنے کے لیے کوئی اور الفاظ ملتے ہی نہیں۔

بہر حال میں اس بارے میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ آپ سب لوگوں نے اس علم کو حاصل کر کے اس کا غلط استعمال شروع کر دیا ہے اور اس کے نتائج بھی کچھ اچھے نہ ہوں گے مگر طاقت کے نشے میں چور ابھی یہ بات شاید آپ کی سمجھ میں نہ آئے...... خیر میں بھی کیا بات لے بیٹھا...... جوگی پریم ناتھ جی، رام داس اور دور دیس سے آئے ہوئے گورا ڈیوڈ صاحب۔ میں اپنے خدا کا ایک حقیر و کمترین اور گناہ گار سا بندہ ہوں۔ میرے پاس نہ تو کوئی روحانی علم ہے اور نہ ہی کوئی ایسی طاقت جس سے میں آپ کے اس گندے اور سفلی علم کا مقابلہ کر سکوں۔

ہاں مگر ایک سچ ہے کہ میرے پاس اپنے روحانی پیشوا جس کا میں آج تک نام بھی نہیں جان سکا۔ ان کی دی ہوئی ایک نشانی موجود ہے جس کے بارے میں میں آپ کو نہیں بتانا چاہتا۔ اگر آپ اہل نظر ہیں تو اسے جان سکتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر آپ میرے مرشد کی دی ہوئی اس روحانی چیز کی طاقت سے واقف ہو گئے تو اپنے تجربات تو کیا سب کچھ یہاں میرے قدموں میں ڈھیر کر کے یہاں سے بھاگ جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھیں گے۔ مگر یہاں اس محفل کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ سب میں سے خود کوئی بھی اہل نظر نہیں سبھی لوگ کسی کی دی ہوئی شیطانی اطلاعات کے محتاج ہیں اور آج میں آپ کے شیطان آقا سے بھی یہی کہتا ہوں کہ وہ

مجھے نہ چھیڑے اور مجھے اپنی جگنی کے ہمراہ یہاں سے جانے دے ورنہ یہ سب جو تم نے جانے کتنے سالوں کی محنت اور تگ ودو کے بعد حاصل کیا ہے اسے مٹنے میں شاید چند......" مگر اس سے پہلے کہ میں اپنی بات مکمل کر پاتا جوگی پریم ناتھ جو انتہائی حقارت اور نفرت سے مجھے کافی دیر سے دیکھے جارہا تھا اس نے مائک میرے ہاتھ سے چھین لیا اور مائک پکڑتے ہی اس نے انتہائی غصیلی اور اونچی آواز میں کہا۔

"اوئے بے غیرت......" اس نے مجھے ناقابل اشاعت گالیوں سے نوازتے ہوئے کہا۔

"اپنی مدد کے لیے تم اپنے مرشد کی چیز تو کیا مرشد اور چاہے تو اس کے بڑوں کو بھی بلالو۔ ہم کسی سے کم نہیں ہیں اور آج میں یہ ثابت کرکے دکھاؤں گا کہ......" اور اس کے بعد اس نے دین اسلام اور اس کے ماننے والوں کی شان میں چند گستاخانہ ایسے کلمات کہے جو کہ میں تو کیا کسی بھی مسلمان کی غیرت پر ایک تازیانہ تھے۔

بے اختیاری طور پر میں بھول گیا کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور کس سے مخاطب ہوں اور اس وقت میری پوزیشن کیا ہے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ سامنے کھڑے رام داس کو ایک زبردست دھکا دیا اور جوگی پریم ناتھ کو گریبان سے پکڑ کر اس کے منہ پر تابڑتوڑ جھانپڑوں کی برسات کردی۔

"سالے میں نے تیرے بھگوان کو برا کہا جو تو نے ایسی بکواس شروع کردی ہے۔ ذاتی جنگ کو تو نے مذہبی جنگ بنا کر رکھ دیا ہے۔" اور اس کے بعد میرے بھی جو منہ میں آیا میں کہتا چلا گیا۔ جلد ہی سیکورٹی پر معمور عملہ آگے بڑھا اور انہوں نے مجھے بے دردی سے مارنا پیٹنا شروع کردیا۔ وہ لوگ مجھے جوگی پریم ناتھ سے علیحدہ کرنے کے چکر میں تھے مگر میں اسے کسی بھی قیمت پر چھوڑنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ ایک سیکورٹی گارڈ نے یہ دیکھتے ہوئے انتہائی زور سے میرے ہاتھوں پر بٹ مارا۔ گن کا بٹ لگتے ہی میری گرفت کچھ کمزور پڑی تو کئی سیکورٹی گارڈز مجھ سے چمٹ گئے اور پھر آخر کار انہوں نے مجھے جوگی پریم ناتھ سے علیحدہ کر ہی دیا اور مجھے نیچے گراتے ہوئے میری پھینٹی لگانا شروع کردی۔

جگنی جو پہلے ہی مجھے بچانے کے چکر میں اس لڑائی میں در آئی تھی وہ مجھ پر گر گئی اور جوگی پریم ناتھ اور رام داس سے میری زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔

تھوڑی دیر کی اس خونریز لڑائی نے ہی مجھے زخمی کرکے رکھ دیا تھا اور کئی جگہ سے میرے جسم سے خون بہنے لگا تھا مگر مجھے ایک اطمینان ضرور تھا کہ اس دوران میں نے جوگی پریم ناتھ کی پٹائی اچھی طرح کردی تھی۔ اب کم از کم اس کا اپنے عمل کی طرف وہ دھیان نہ رہتا جو کہ ہونا چاہیے تھا۔ اس کے گالوں پر میرے طمانچوں کے نشان ثبت ہوچکے تھے۔

اچانک سیکورٹی پر معمور عملے کے کسی فرد نے مجھے پکڑے پکڑے کوئی سوئی سی چبھوئی جس نے میرا سارا وجود سن کرکے رکھ دیا اور تھوڑی ہی دیر بعد میرا سارا وجود بے حس ہوتا چلا گیا۔ جگنی کو انہوں نے زبردستی پکڑ کر مجھ سے علیحدہ کیا۔ وہ اب بھی میرے کیے کی ان سے معافی مانگ رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس بے چاری نے میری جان بخشی کے بدلے میں ان کی ساری شرائط ماننے کی حامی بھی بھر لی۔ مگر ان راوتوں کو اس وقت کسی بھی بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

بے حس ہوئے میرے وجود کو جوگی پریم ناتھ نے پاؤں کی ایک زبردست ٹھوکر ماری اور رام داس کے ہاتھ سے مائک پکڑتے ہوئے اس نے میرے بارے میں کچھ ناقابل اشاعت باتیں کیں اور میری عبرتناک موت کا ذکر کیا اس کے بعد اس نے مائک رام داس کو پکڑایا اور خود میرے قریب ہی بیٹھ کر گیان دھیان میں مصروف ہوگیا۔

اس کے ایسا کرتے ہی میرے پاؤں کی انگلیوں کی پوروں سے ناقابل برداشت درد کی ایک لہر اٹھی اور میرے دماغ کے نازک خلیوں سے ایک ہتھوڑے کی مانند ٹکرائی۔ انجکشن کی دوا سے بے حس ہوتا میرا وجود درد

کی لہروں کے درمیان فٹ بال کی مانند اچھلا۔ بے انتہا درد کو برداشت کرتے ہوئے دانتوں تلے دبی میری زبان کٹ گئی۔ خون کا ایک فوارہ سا میرے منہ سے نکلا اور حاضرین محفل کو شاید یوں لگا ہو کہ جیسے مجھے خون کی الٹی آئی ہو۔ میرے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس کے بعد میرا وجود درد کی اذیت سہتا ہوا فٹ بال کی مانند اچھلنے لگا۔ پاس ہی کھڑی جگنی کی میری محبت میں نکلنے والی چیخیں بلند ہوتی چلی گئیں اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ ان راوتوں کی منت کرتے کرتے اور میری اذیت بھری ناقابل بیان حالت کو دیکھتے دیکھتے اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی۔ اس محفل میں موجود میرا واحد ہمدرد بھی میری حالت کو دیکھتے ہوئے بے ہوش ہوگیا اور میں حیران تھا کہ میں ابھی تک اپنا ہوش وحواس کیسے قائم رکھے ہوئے تھا۔ تمام حدوں کو چیرتا پھاڑتا ہوا درد میرے جسم کی قید سے آزاد ہونے کی خواہش میں جانے کب خود ہی بے درد ہوتا چلا گیا۔

چند لمحوں کے لیے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا جوگی پریم چند کی لال لال آنکھوں میں مجھے دیکھتے ہوئے انتہائی حیرت کا تاثر نمایاں تھا۔ اس کے خیال میں تو اب تک مجھے درد کی شدت سے بلبلاتے ہوئے اس کے پاؤں میں گر جانا چاہیے تھا مگر گھٹی گھٹی سی چیخوں کے علاوہ میری زبان سے ابھی تک کچھ بھی نہیں نکلا تھا۔ جب کہ اس کا خیال ہوگا کہ اب تک تو مجھے اپنے آپ کو بھی بھول جانا چاہیے تھا۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے میری بند آنکھوں کے درمیان کوئی تیز نورانی سی روشنی سماتی چلی گئی۔ آنکھوں کے راستے یہ روشنی میرے سارے وجود کو منور کرگئی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا وجود انتہائی ہلکا پھلکا ہوگیا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والا ناقابل بیان درد بھی ختم ہوتا چلا گیا۔ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان لٹکا میرا وجود پرسکون ہوگیا۔ میرے اندر ایک عجیب سی طمانیت بھر گئی۔ مجھے کچھ سکون ہوا تو مجھے اپنی موجودہ پوزیشن کا بھی احساس ہوا۔ اچانک میں اٹھا۔ اب یقیناً وہ وقت آگیا تھا کہ ان ظالموں سے پرانا حساب کتاب برابر کردیا جائے۔ اٹھتے ہی میں نے جوگی پریم ناتھ کے قریب ہی پڑا مائک تھاما اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتے میں نے جوگی پریم داس، رام داس حتیٰ کہ گورے ڈیوڈ کو بھی چیلنج کردیا۔ یہ کام یقیناً کچھ آسان نہیں تھا مگر مجھے محسوس ہورہا تھا کہ جیسے میرے اندر کچھ خفیہ روحانی طاقتیں در آئی ہیں اور وہ مجھ سے وہ کام کروانا چاہتی ہیں جو کہ شاید ان کی سوچ اور شعور سے بھی باہر ہو۔

جوگی پریم ناتھ اور رام داس انتہائی حیرت کی نظروں سے مجھے تک رہے تھے۔ شاید ان کے تمام عمل مجھ پہ ناکام ہوگئے تھے۔ یا پھر دوسرے لفظوں میں ایسے لوگ اپنی ناکامی کو ایک انوکھا، عجیب وغریب اور سمجھ میں نہ آنے والا نکتہ بھی پیش کرتے ہیں کہ جی،، عمل الٹ ہوگیا،،۔ مگر درحقیقت یہ اپنی ناکامی کو چھپانے کے لیے ایسے لوگوں کے ڈھکوسلے ہوتے ہیں۔ مجھے صحیح سلامت اسٹیج پر کھڑا دیکھ کر جگنی کو اطمینان ہوا اس کے قریب جو سیکورٹی والے الرٹ کھڑے تھے وہ بھی مبہوت زدہ ہوئے میری تقریر سننے میں محو تھے۔

جگنی نے یہ موقع غنیمت جانا اور ان کے حصار میں سے نکلتے ہوئے بھاگ کر اسٹیج پر میرے پاس پہنچ گئی۔ جوگی پریم ناتھ اب بھی اپنے کسی سفلی علم کو مجھ پر چلانے کی انتھک کوشش کررہا تھا مگر میں تھا کہ آزادی سے اسٹیج پر گھوم رہا تھا۔ اچانک بجلی چمکی اور جہاں میں اور جگنی کھڑے تھے وہاں خون کی بارش ہونا شروع ہوئی مگر میں نے دیکھا کہ خون کے قطروں نے ہمارے وجود کو چھوا تک نہیں۔ اوپر سے لہو رنگ خونی قطرے ہمارے وجود ہی کی طرف آتے دکھائی دیتے مگر جونہی یہ قطرے ہمارے وجود کے قریب آنے لگتے کوئی غیبی طاقت ان قطروں کو ہم سے پرے دھکیل دیتی۔ یہ دیکھتے ہی جوگی پریم ناتھ اور رام داس کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

میں نے مائک میں کہا۔ "حاضرین محفل آپ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کرسکتے ہیں کہ یہاں جوگی پریم ناتھ

جی کا کوئی بھی عمل مجھ پر اثر نہیں کر رہا۔ مگر جوگی صاحب اتنے ہٹ دھرم اور ضدی ہیں کہ اپنی شکست کو تسلیم ہی نہیں کر رہے اور شکست تسلیم کر لینا بھی مردوں کا کام ہے مگر شاید مردانگی نام کی تو کوئی چیز جوگی جی کو چھو کر بھی نہیں گزری۔ ابھی تک ان کا واسطہ کسی مسلمان روحانی قوت سے نہیں پڑا شاید۔ ورنہ یہ لوگ تو کب کے نیست و نابود ہو چکے ہوتے۔ اب تک میں خاموشی سے ان کے کھیل دیکھ رہا تھا۔ مگر جوگی جی کو شاید میری خاموشی پسند نہیں آئی۔ میں جوگی صاحب کو ایک موقع اور دیتا ہوں۔ ان کے ترکش میں کوئی اور بھی تیر ہے تو وہ چلا سکتے ہیں۔ مگر اس سے پہلے میں اس بھری محفل میں ایک اعلان کرنا چاہتا ہوں۔

حق کو تسلیم کرنے کا اعلان۔ اگر آپ سب لوگوں میں سے کوئی مسلمان ہے تو وہ ہاتھ کھڑا کرے کیونکہ اس کے بعد جو آپ کے ساتھ ہونے والا ہے وہ انتہائی بھیانک اور خطرناک ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے تھوڑا سا توقف کیا...... مگر افسوس کہ اس محفل میں کوئی بھی مسلمان نہیں تھا۔ اس ساری تقریر کے دوران مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ نہ تو میں بول رہا ہوں اور نہ ہی یہ الفاظ میرے اپنے ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی زبردست روحانی قوت میرے وجود میں سما گئی ہے اور وہی وہ قوت ہے جو مجھے یہ سب کہنے اور کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔

''اب ایک آخری بات یہ کہ آپ میں سے اگر کوئی بھی مسلمان ہو کر کلمۂ حق پڑھنا چاہے تو وہ میرے پاس سٹیج پر آ سکتا ہے......'' مگر اس سے پہلے کہ میں اپنی بات مکمل کر پاتا رام داس نے جلدی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف آنا چاہا مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ جانے کیسے اس کی کرسی گھومتے ہوئے ہوا میں معلق ہوئی اور انتہائی تیز چکر کھانے لگی۔ لوگوں نے یہ سب دیکھا تو وہ انتہائی سراسیمگی اور خوف کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''ہاں تو ناظرین آپ نے دیکھا کہ خدائی دعوے کرنے والے رام داس خود کیسے بے بس ہو کر ہواؤں میں پرواز کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ان کے ساتھ اس سے بھی برا ہو سکتا ہے مگر ہم ظالم نہیں ہیں۔ جی کہیے جوگی پریم ناتھ جی۔ آپ کے کیا وچار ہیں رام داس کے بارے میں۔ میری طرف سے آپ کو آفر ہے کہ اسے بچا کر دکھائیں۔ ورنہ آ جائیں اور کلمۂ حق پڑھ کر میرے ساتھ شامل ہو جائیں کیونکہ اس کے بعد تمہارا نمبر بھی آنے والا ہے۔''

جوگی پریم ناتھ جو کہ پہلے ہی بے بسی کی تصویر بنا غصے کی وجہ سے اندر ہی اندر بل کھائے جا رہا تھا۔ اس کے تمام عمل ناکام ہو جانے کی وجہ سے بھی وہ پاگل پن کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی کیفیت اس وقت ناقابل بیان سی ہوتی جا رہی تھی۔ مجھ سے شکست کھانا اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا اور اس وقت وہ کسی چکر میں تھا مگر شاید جلدی میں اسے اپنی ہزیمت اور ناکامی کی خفت مٹانے کے لیے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا وہ منہ ہی منہ میں شاید کسی منتر کا جاپ کر رہا تھا مگر اس جاپ کے لیے اسے جس دھیان اور گیان کی ضرورت تھی شاید وہ اسے میسر نہیں تھا اور اسکی وجہ تھی میرا آزادانہ وجود۔ جو کہ اس کے دھیان اور گیان کو ایک نکتے پر مرتکز ہونے سے روکے ہوئے تھا۔ سالوں سے اس کے تجربے اور یقین کو سچ ثابت کرتے اس کے تمام عمل جن پر اسے ناز تھا وہ بھی آج ناکامیوں سے ہمکنار ہوتے دکھائی دے رہے تھے جس کی وجہ سے اس کا ذہن منتشر ہوتا جا رہا تھا۔

اسٹیج پر میرے مقابل کھڑے اسے کچھ نہ سوجھا تو اس نے کسی عجیب زبان میں راگ الاپنے شروع کر دیے۔ یہ دیکھتے ہی میں نے جگنی کا ہاتھ تھاما اور پرجوش انداز میں نعرہ تکبیر بلند کیا۔ اس کی زبان کو یکلخت تالا لگ گیا اور فضا اللہ اکبر کے پرجوش اور دلآویز شور سے گونج اٹھی اور پھر تو جیسے مجھ پر ایک وجد سا طاری ہو گیا۔ میں نے پاؤں سے جوتا نکالا اور جوگی پریم ناتھ کے سر پر دے مارا۔

انتہائی غصے اور نفرت کے عالم میں اس نے مجھے لال لال آنکھوں سے گھورا اور سیکورٹی گارڈز کو مجھے اور جگنی کو شوٹ کرنے کا حکم دیا۔ سیکورٹی گارڈز نے ہماری طرف گنیں سیدھی کیں اور فائر کھول دیا مگر اس سے پہلے کہ گولیاں ہمیں بھون ڈالتیں ہمارے اجسام ہوا کی مانند ہلکے پھلکے ہو گئے گولیاں ہمارے جسموں سے یوں باہر نکل گئیں جیسے ہماری جگہ پر کوئی چیز موجود ہی نہیں تھی۔ حیرانی اور تجسس سے میں نے اپنے جسم کی طرف دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر میرا جسم صحیح سلامت تھا۔

اچانک جوگی پریم داس، گورا ڈیوڈ اور محفل میں موجود تمام حاضرین بشمول سیکورٹی گارڈز اپنی جگہوں پر پھدکنے لگے۔ اک عجب بے ہنگم سا شور ہر سو برپا ہو گیا۔ انہیں جانے کیا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور محیر العقول واقعہ رونما ہوا۔

اچانک مندر کا تہہ خانہ کھلا اور اس کے دہانے سے ایک عجیب و غریب اور انتہائی خوفناک مخلوق برآمد ہوئی اور پھدکتے ہوئے لوگوں کی طرف بڑھی اور پھر آن ہی آن میں اس مخلوق نے وہ تباہ کاری مچائی کہ الاماں۔ ایک ہی لقمے میں وہ سالم بندے کو اپنے دانتوں کے درمیان دبوچتی اور نگل جاتی۔ چیختا چنگھاڑتا اور خوف دہراس کی اذیت میں مبتلا وجود سیدھا اس بلا کے پیٹ میں ہی جا کر دم لیتا اور وہاں جا کر جانے اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ اس ناگہانی آفت سے بچنے کے لیے وہ بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ کوئی انجانی طاقت انہیں پھدکنے پر مجبور کیے ہوئے تھی اور ایسے میں ان پر مسلط یہ خوفناک بلا جو کہ سالم بندے کو ایک ہی لقمے میں نگلے جا رہی تھی۔ ایسی صورت حال میں وہاں پہ موجود کسی کے لیے بھی کہیں جائے فرار نہیں تھی۔

مگر خدا کا شکر ہے کہ اس بلا کو ہمارا وجود نظر ہی نہیں آ رہا تھا اور ویسے بھی ہمارے وجود دنیا والوں سے کسی انجانی مہربان نورانی قوت نے چھپا رکھے تھے۔ میں نے دیکھا گورا ڈیوڈ اور رام داس بھی ان کا شکار ہو گئے۔

اچانک بجلی چمکی اور ایک زبردست، طویل اور دلوں پہ لرزہ طاری کر دینے والی گڑگڑاہٹ شروع ہوئی اور پھر اس کے ساتھ ہی ہلکی سی بارش شروع ہو گئی۔ بارش سے بچنے کے لیے میں جگنی کے ساتھ مندر کے تہہ خانے کی طرف بڑھا۔

میں نے جگنی کے ہمراہ جونہی تہہ خانے کے داخلی دروازے میں قدم رکھا ایک اور عجیب اور محیر العقول چیز نے ہمارے قدم جکڑ لیے۔ اس سے پہلے جب ہمیں یہاں لایا گیا تھا تو یہ بہت چھوٹا سا تھا مگر اب میں نے دیکھا تو مجھے اس سے آگے جہاں ہمیں قید کر کے لا کر رکھا گیا تھا وہاں ایک بہت بڑا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس دروازے میں سے دور دور تک بجلی کی لائٹس کی روشنی میں بڑی بڑی مشینیں لگی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور ان مشینوں کے درمیان کئی بندے پڑے تڑپ رہے تھے۔ یہاں بھی وہی خوفناک اور عجیب مخلوق کارفرما نظر آ رہی تھی۔ وہ راستے میں آنے والی ہر چیز کو تباہ کیے جا رہی تھی۔ شاید نہیں یقیناً یہ وہی خوفناک اور خطرناک مخلوق تھی جو کہ ان کے عجیب و غریب ماورائی مخلوق اور انسان کے باہمی اختلاط سے وجود میں آئی تھی۔ یہاں بھی ہر سو چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ لوگ اس ظالم مخلوق کی زد میں آ کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھوتے جا رہے تھے۔

وہی خوفناک اور ڈراؤنی مخلوق جس سے ہندوستان کے بڑوں نے دنیا کی تباہی کا پلان بنایا تھا خود ان کی ہی جانیں لینے کا سبب بن رہی تھی۔ ابھی تک تو یہ مخلوق اسی جگہ پر تھی اگر یہ یہاں سے نکل کر ہندوستان کے شہروں اور گاؤں دیہاتوں میں پھیل گئی تو جانے ان کا کیا ہو گا اور ان کی گورنمنٹ ان پر قابو پانے کے لیے کیا کرے گی سوچنے کی بات یہ ہے کہ رات کے اس پہر جانے یہ مخلوق ان کے قابو سے باہر کیسے ہو گئی تھی۔ یقیناً یہ ان کے لیے ایک بہت بڑا سبق تھا۔

اس تہہ خانے میں ایک جگہ پر جگنی نے مختلف قسم کے محلول بڑے بڑے شیشے کے مرتبانوں میں پڑے

دیکھے تو اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"صائم! تھوڑی دیر کے لیے کسی کمرے کا رخ کرو اور یہ سبز رنگ کا محلول بھی وہاں لے چلو۔ یہ وہ کیمیکل ہے جو کہ میرے پروں کو کچھ ہی وقت میں انتہائی تیزی سے ٹھیک کردے گا۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا۔

میں نے کیمیکل کے محلول والا مرتبان سا اٹھایا اور ایک قریبی کمرے کا رخ کیا۔ محلول سمیت جگنی کو کمرے کے اندر چھوڑنے کے بعد میں وہاں سے نکل گیا تھوڑی ہی دیر میں جگنی بھی وہیں چلی آئی۔

یہ وہی کیمیکل ہے جو میرے پروں کو انتہائی تیزی سے ٹھیک کرنے میں بہت مدد دے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ مجھے یہاں مل گیا ورنہ اگر دیر ہو جاتی تو میرے پروں کو ٹھیک ہونے میں بھی کافی عرصہ لگ جاتا۔ جگنی نے انتہائی خوشی کے عالم میں کہا۔

ابھی ہم مختلف نوع کی مشینوں کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ تہہ خانے میں جانے کہاں سے تیزی سے پانی داخل ہونے لگا۔ تہہ خانے میں گوکہ اب بھی کافی لوگ زندگی بچنے کی جدوجہد کر رہے تھے مگر اب ایک نئی مصیبت جو پانی کی شکل میں بچے کھچے لوگوں پر نازل ہو گئی تھی اس نے بند کمروں میں پناہ لیے ہوئے لوگوں کو بھی یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ایسے لوگ کافی تعداد میں کئی کمروں سے نکلے اور خوفناک بلاؤں کی خوراک بن گئے۔ ان میں سے شاید کچھ لوگ بچ کر باہر بھی نکلے ہوں گے مگر باہر نکلنے کے بعد ان کے ساتھ کیا بیتی یہ خدا ہی جانتا ہے۔

ایسے ہی بچنے والے کچھ لوگوں کے ہمراہ ہم بھی تہہ خانے کے دہانے کی طرف بھاگے۔ اونچی سی ایک جگہ پہ جو کہ دہانے سے تھوڑا سا پیچھے تھی اور وہاں چھجا سا بنا ہوا تھا ہم وہاں پر رکے اور باہر کی طرف دیکھا تو ایک قیامت صغریٰ کا سماں تھا۔ انتہائی تیز طوفانی بارش نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہوا میں اتنی تیزی تھی کہ درخت بھی جڑوں سے اکھڑ کے ملیامیٹ ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ باہر اتنا اندھیرا اور شور تھا کہ نہ تو کچھ سنائی دے رہا تھا اور نہ ہی کوئی چیز نظر آ رہی تھی۔ درخت اور خودرو جھاڑیاں ہر جگہ پہ پانی میں تیرتی ہوئی ہیولوں کی شکل میں نظر آ رہی تھیں۔ پانی کا ایک زبردست ریلا تہہ خانے میں پڑنے والے ایک بڑے سے شگاف سے اندر تیزی سے ہر سو پھیلتا جا رہا تھا۔ اس وقت کسے یہ ہوش تھا کہ اس شگاف کو بند کرنے کی سوچتا اور تہہ خانے میں ہونے والے ناقابل تلافی نقصان کو ہونے سے روکتا۔ شاید اسی کو نظام قدرت کہتے ہیں۔

زوروں کی طوفانی بارش میں تہہ خانے کے اس دہانے سے باہر نکلنا بھی انتہائی خطرناک تھا مگر پانی کا تیزی سے بڑھتا ہوا خوفناک سیلاب سانپوں کی مانند پھنکارتا ہوا ہر چیز کو تہہ و بالا کردینے پر تلا ہوا تھا۔ اس صورت حال میں یہاں سے نہ نکلنا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ تہہ خانے کے اندر بھی شور بڑھتا جا رہا تھا یوں لگتا تھا کہ جیسے اندر بہت سی بلائیں بلبلا رہی ہوں اور ان کی خوفناک بلبلاہٹ میں کسی چیز کے گرنے کی خوفناک گڑگڑاہٹ بھی شامل ہوتی جا رہی تھی۔

جگنی نے سراسیمگی کی حالت میں مجھے دیکھا اور خوف کی شدت سے گھبراتے ہوئے چھوٹے بچوں کی طرح میرے کندھے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ پانی یہاں بھی داخل ہونے والا تھا مگر اس سے پہلے ایک اور بڑا خطرہ سامنے تھا۔ تہہ خانے کی موجودہ حالت اس قابل ہرگز نہیں رہی تھی کہ اس کے نیچے پناہ لی جاتی مگر یہاں سے نکلنے کا کوئی اور وسیلہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

سوچنے کی بات یہ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں اتنا پانی کہاں سے آ گیا تھا جس نے ہر طرف جل تھل کر کے یہاں موجود ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ شاید قریب ہی کسی نہر یا دریا کا بند ٹوٹ گیا تھا جس کی وجہ سے یہ تباہی یہاں ہر سو پھیل گئی تھی۔ مگر گورنمنٹ اتنی پاگل تو نہیں تھی کہ اتنی خطرناک جگہ پر ایسے حساس ادارے کی عمارت بنا ڈالتی۔

باہر طوفانی بارش کی طرف دیکھنے سے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں تھا کہ جس تیزی سے پانی ہواؤں کے جھکڑوں کے درمیان زمین پر گر رہا تھا وہ یونہی لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے بارشی قطروں کی بجائے بادلوں سے پانی کے چھوٹے چھوٹے نالوں کو بہا دیا ہو۔ بہر حال یہ جو کچھ بھی تھا کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔

اسی دوران پانی کے ایک بڑے ریلے نے بہت تیزی سے اس جگہ پر ہلا بول دیا جہاں ہم اس وقت پناہ لیے ہوئے تھے۔ میں نے مضبوطی سے جگنی کا ہاتھ تھاما اور وہاں سے نکلنے کی کوشش میں باہر کی طرف بھاگا۔ اچانک میرا پاؤں کسی چیز میں رپٹا اور میں گر گیا قدرتی طور پر جگنی کا وجود بھی میرے اوپر آ رہا۔ جگنی نے مضبوطی سے میرے لپٹ گئی۔ اسی دوران ہمیں پتہ بھی نہیں چلا کہ ہم پانی میں گر گئے تھے۔ مگر انتہائی تیزی سے تہہ خانے کی طرف رخ کرتا ہوا پانی ہمیں بھی اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا تھا اور یہ ایک نئی مصیبت تھی۔ جس چیز سے بچ کر ہم بھاگ نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پانی ہمیں دھکیلتے ہوئے وہیں لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم دوبارہ تہہ خانے میں جا پہنچتے۔

اللہ پاک نے ہماری سن لی۔ ایک بڑے درخت کے تنے کو بڑی مشکل سے پکڑ کے ہم پانی کے تیز بہاؤ سے نکلے۔ لمحوں میں ہی ہمارا وجود بارش کے پانی میں جل تھل ہو گیا۔ اوپر سے بدن کو چیرتی لہو کو وجود میں منجمد کرتی سرد و تند و تیز ہوائیں۔ اف تو بہ الاماں۔ پانی کے تیز ریلے سے بچتے بچاتے ہم مندر کے اونچے چبوترے کی طرف بھاگے۔

چبوترے کی طرف دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں رہا۔ جہاں کچھ ہی دیر پہلے اسٹیج لگا ہوا تھا اور اس پر چند فرعونوں نے خدائی دعوے کیے تھے مگر اب ان کا یہاں نام و نشان بھی نہیں تھا انہیں زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا۔ کچھ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا۔ اور تو اور وہاں اسٹیج پر استعمال ہونے والے بڑے بڑے لکڑی کے تختے بھی ناپید تھے۔ لگتا تھا یہ سب تند و تیز طوفانی ہواؤں کی نذر ہو گیا تھا۔

اتنا خطرناک موسم جانے کیوں ہمارے ساتھ کچھ رعایت کیے ہوئے تھا ورنہ تو میں نے یہاں سے ابھی تک کسی بھی ذی روح کو زندہ سلامت نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ میں اس چیز کو دل سے مانتا ہوں کہ یہ سب میرے اللہ پاک کا مجھ پر انتہائی کرم تھا کہ جس نے مجھے جگنی سمیت یقینی موت کے منہ سے بخیر و عافیت نکال لیا تھا۔ بھاگتے اور گرتے پڑتے جلد ہی ہم اس مقام تک پہنچ گئے جہاں درختوں کے ایک بڑے جھنڈ کے درمیان ایک خشک متروک کنواں بھی موجود تھا۔ تیز سرد ہواؤں کے زبردست تھپیڑوں سے بچنے کے لیے وہ خشک متروک کنواں انتہائی بہترین پناہ گاہ تھا۔ اس میں نیچے اترنے کے لیے لگی ہوئی مضبوط لوہے کے پائپ سے بنائی گئی سیڑھیاں ابھی تک کارآمد تھیں۔ ان سے ہوتے ہوئے ہم نیچے اترے۔

خدا کی مہربانی سے طوفانی بارش اور ہوا دونوں سے ہمارا وجود محفوظ ہو گیا گوکہ کنوئیں کے اندر بھی کافی پانی موجود تھا مگر ایک طرف گری ہوئی کچھ پختہ اینٹوں نے ہمیں اس سے بھی محفوظ کر دیا۔ وہ اینٹیں کافی تعداد میں ایک ہی جگہ گری ہوئی تھیں اور پانی کی سطح سے اوپر نکل آئی تھیں۔

پھر ایک وقت آیا جب طوفان تھما اور طوفان کے تھمتے ہی جانے کہاں سے کچھ انتہائی خوبصورت لوگ جو کہ جگنی کی اپنی فیملی کے لوگ تھے وہ کنوئیں کی منڈیر پر پہنچ گئے، انہیں جانے کیسے اور کہاں سے جگنی کے بارے میں خبر مل گئی تھی۔ جگنی کے ہمراہ واپسی کا سفر بھی انتہائی انوکھا اور عجیب تھا اور پھر جگنی کے قبائل نے جو ہمارا شاندار استقبال کیا ...... وہ بھولنے کی چیز ہی نہیں۔ ایک روز جگنی میرے پاس آئی اور مسکراتی ہوئی بولی۔ صائم، گھبراؤ نہیں، ہم دونوں کی دلی تمنا بہت جلد پوری ہونے والی ہے" اور میرے گلے سے لگ گئی۔

پراسرار سایہ

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

کھڑکی کے دونوں پٹ کھلتے ہی ایک سایہ کمرے میں داخل ہوا اور ایک کونے میں کھڑا ہوگیا، وہ ٹکٹکی باندھے اپنی محبوبہ کو دیکھتا رہا، لیکن محبوبہ اسے نہیں دیکھ سکتی تھی پھر اچانک وہ سایہ پلٹا اور پھر......

محبت خلوص اور چاہت کی ایک انمٹ کہانی، اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے تحفہ

نئے سال کی پہلی برف باری کے دوران میں سبزہ صرف دیواروں پر ٹنگی تصویروں میں نظر آتا تھا یا پھر یادوں میں۔ میں اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں تنہا رہتا تھا جو کہ ایک گھٹیا سے کم آمدنی والے علاقے میں تھا۔ یہاں کے زیادہ ترمکینوں نے اپنے گھروں سے کچھ حصہ علیحدہ کرکے اسے چھوٹے سے اپارٹمنٹ کی شکل دے کر کرایہ پر چڑھا رکھا تھا، اس طرح ان کی آمدنی کا ایک ذریعہ پیدا ہوگیا تھا اور میرے جیسے کم آمدنی والے لوگوں کو کم کرایہ پر رہائش میسر آجاتی تھی۔ میرا اپارٹمنٹ چھوٹا ہونے کی وجہ سے اس برفیلے اور ٹھنڈے موسم میں بھی اوون کی طرح گرم رہتا تھا۔ مجھے اس کمرے کی تنگی پسند تھی۔ بچپن میں میری بہن اور میں، ہم دونوں ایک سوٹ کیس میں اپنے آپ کو بند کرلیتے تھے اور پھر سوٹ کیس کو سیڑھیوں کے اوپر نیچے گھسیٹتے پھرتے اور پاگلوں کی طرح ہنستے قہقہے لگاتے رہتے۔

اس صبح میں نے دفتر جانے سے پہلے ناشتہ بنانے کے لئے چولہا جلایا تو مجھے کسی چیز کی ٹھوکر لگی، میں نے چونک کر نیچے دیکھا کہ شاید میں نے ہی رات کو کوئی چیز وہاں رکھ دی ہو اور پھر اسے اٹھانا بھول گیا ہوں مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ میں نے اوپر دیکھا تو وہ مجھے پہلی دفعہ نظر آیا۔ وہ کھڑکی کے باہر چپ چاپ کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

اس دن باہر آسمان اور زمین سب سفید تھا۔ برف گر رہی تھی ہوا کے ہر برفیلے جھونکے کے ساتھ کمرے کی بند کھڑکی کے شیشے کے باہر وہ دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔ وہ کسی برفانی ریچھ کی مانند تھا جس کو برف میں تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے مگر میں نے اس کو دیکھ لیا۔ اس کے ہاتھوں میں دستانے تھے اور اس کی گلابی انگلیوں کی پوریں اس کے پھٹے دستانے سے باہر کو جھانک رہی تھیں۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھا ہوا تھا اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی اور ہر سانس کے ساتھ بھاپ منہ سے نکل رہی تھی۔ اس کا ہیٹ اس پر جھکا ہوا تھا اور اس کی روشن چمکدار آنکھیں اس کے سائے میں نظر آرہی تھیں مگر میں یہ نہ دیکھ سکا کہ ان کا رنگ کیا تھا۔ مگر ان میں ایسی چمک تھی جیسے وہ آنکھیں نہ ہوں بلکہ تیز روشنی والے گول بلب ہوں۔ میں چیخ بھی نہ سکا۔ اسے دیکھ کر مجھے دہشت یا خوف جیسی کوئی چیز محسوس نہ ہوئی وہ احساس بھی نہ جاگا جب دل تیزی سے دھڑکنا شروع کردے اتنا تیز کہ سینے سے باہر نکلنے کو لگے...... مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ اگر کوئی اور مجھے بتاتا کہ اس نے ایک عجیب آدمی دیکھا جو اسے کھڑکی میں کھڑا گھور رہا تھا تو مجھے یقین ہے کہ وہ مزید کہتا۔

''اور تب میں چیخا، میرے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر چکنا چور ہوگیا۔ میں فون کی طرف بھاگا اور 911 کو فون کیا۔ پھر میں اپنے گھر کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھا، اندر سے اس کی چٹخنی لگائی اور خود باتھ روم میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ میرا جسم بری طرح کپکپا رہا تھا۔''

مگر میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں تھا، میں بے حس و حرکت کھڑا تھا جیسے کسی نے مجھے پکڑ رکھا ہو اور اس آدمی کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتا ہوا برف کے سفیدی میں گم نہیں ہوگیا۔

میرے اپارٹمنٹ میں کوئی قیمتی چیز نہیں تھی۔ ایسا کچھ نہیں تھا جس کی کسی کو ضرورت ہوتی۔ میری کل جائیداد ایک بکس کے اندر اور باہر ڈھیر تھی۔ میرے پاس تو بیڈ بھی نہیں تھا بس فرش پر فوم کا ایک گدا رکھا ہوا تھا جس پر میں سوتا تھا۔ وہی صوفہ تھا اور وہی میرا ڈائننگ ٹیبل۔ میرے پاس ایک پرانا سا لیپ ٹاپ تھا جو دفتر جاتے ہوئے بھی میرے بغل میں ہوتا۔ میرے پاس ٹی وی بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ میرے پاس کوئی مناسب قابل ذکر جوتا بھی نہیں تھا یعنی کل ملا کر وہاں کسی کے چرانے کے لئے کچھ نہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ جو شکل باہر نظر آئی تھی وہ منحوس شکل دینے کے باوجود میرا دن اچھا گزرے گا۔ مجھے اس شکل کو بھولنے میں وقت نہ لگا۔

ہر صبح منہ دھونے کے لئے جب میں پانی ابالتا تو وہ مجھے کھڑکی میں کھڑا نظر آجاتا۔ میرے پاس بجلی کی کیتلی نہیں تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ لوگ اس قسم کی چیزوں پر رقم کیوں خرچ کرتے ہیں حالانکہ ان کے بغیر بھی اچھی طرح گزارہ ہوسکتا ہے۔

ہر رات جب میں دفتر سے واپس گھر آتا میرا اپارٹمنٹ تاریکی کی خاموشی میں ڈوبا ہوتا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ مجھے خوف زدہ ہوجانا چاہئے مگر ایسا کچھ

نہیں...... وہاں کوئی بھی میرا منتظر نہیں ہوتا تھا۔ باہر بھی کچھ نہ ہوتا۔ کسی کے قدموں کے نشان بھی میرے گھر کے آس پاس دکھائی نہیں دیتے۔ گھر کے دروازے کے ہینڈل پر کسی زبردستی کے نشانات بھی نہ ملتے۔ میں آرام سے اندر چلا جاتا۔ وہ ہر صبح مجھے دکھائی دیتا۔ اس کے ابرو اوپر کی طرف اٹھے ہوتے اور انگلیاں منہ پر رکھی ہوتیں۔

اسی طرح تقریباً ایک ہفتہ چلتا رہا۔ میری زندگی بڑی اچھی اور نارمل گزر رہی تھی سوائے اس کھڑکی والے دوست کے۔

ایک دن جب میں دیر رات تک اپنے لیپ ٹاپ پر کام میں مصروف تھا مجھے انٹرنیٹ پر کچھ ریسرچ کرنا تھا کہ مجھے کھڑکی میں کچھ دکھائی دیا۔ یقیناً یہ وہی تھا۔ میں کام کے ساتھ ساتھ پاپ کارن کھا رہا تھا میرا پیٹ بھر گیا مگر ابھی وہ برتن میں تقریباً آدھے موجود تھے۔ مجھے پاپ کارن کو ضائع کرنا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے لگتا ہے کہ پرندے خوراک کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں لہٰذا اگر میرے پاس کچھ کھانا بچ جائے تو میں اسے کسی ایسی جگہ ڈال دیتا ہوں جہاں پرندے اسے آسانی سے حاصل کر سکیں۔ بچے ہوئے پاپ کارن کو کھڑکی سے باہر رکھنے کے لئے میں کھڑکی کی طرف گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ...... وہاں کھڑا تھا۔ میں نے کبھی اس آدمی کا اس طرح سامنا نہیں کیا تھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا اور اداس نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس رات مجھے محسوس ہوا کہ میں بہادر ہو گیا ہوں۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ وہ کھڑکی کے باہر کھڑا تھا اور چاند اس کے عقب میں تھا۔ وہ ایک سایہ کی مانند نظر آ رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کا لاک کھولنے کی کوشش کی اور پھر جب دوبارہ باہر دیکھا تو وہ کہیں نہ تھا۔ غائب ہو چکا تھا، باہر ہر طرف برف تھی۔ میں نے کھڑکی کے پٹ کھولے اور اپنا سر باہر نکال کر ادھر ادھر جھانکا۔ یخ ٹھنڈی گودے تک میں اتر جانے والی ہوا میں اس کو تلاش کرنے لگا مگر وہ گدھے کے سر سے سینگ کے مصداق کہیں گم ہو چکا تھا۔ میں نے بچے ہوئے پاپ کارن باہر رکھ دیئے۔ وہاں باہر بچھی تازہ برف پر اس کے قدموں کے نشان بھی نظر نہیں آ رہے تھے میں نے کھڑکی واپس بند کر دی۔

دوسری صبح جب میں دفتر جانے کے لئے گھر سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا، میرے اپارٹمنٹ کے سامنے سڑک پر ایک اسٹیشن ویگن کھڑی تھی اس کے سائلنسر میں سے سفید گاڑھا دھواں نکل رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر مجھے ایک عورت نظر آئی۔ وہ میرے اپارٹمنٹ کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی آنکھیں بے چمک تھیں مگر اس کے ابرو بالکل ویسے ہی تھے جیسے اس کھڑکی والے مرد کے تھے وہ اپارٹمنٹ کے دروازے کی طرف یوں متوقع نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے کسی کی منتظر ہو۔ جونہی میں باہر آیا مجھے دیکھتے ہی اس نے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

میں نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی لیکن چونکا ضرور۔ مگر پھر جب یہ واقعہ تین ہفتوں میں تین دفعہ ہوا تو میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ یہ اتفاق نہیں ہے ضرور کوئی خاص بات ہے۔ وہ عورت بھی اس کھڑکی والے آدمی کی طرح پراسرار تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ کھڑکی پر کھڑا رہتا تھا اور یہ اپنی کار کے اندر بیٹھی میرے گھر کو گھورتی رہتی تھی۔ کہیں یہ دونوں ملے ہوئے تو نہیں ایک ہی گینگ کے افراد ہوں اور لوگوں کو لوٹتے ہوں۔ اس عورت کے ابرو کی کمانیں اٹھی ہوئی مگر اس کے ہاتھ منہ کو اس مرد کی مانند گھیرے ہوئے نہیں تھے۔ وہ کوئی دستانے وغیرہ استعمال نہیں کرتی تھی اس کے ہاتھ سفید تھے اور اس سرد موسم میں بھی کھلے ہوتے تھے اور گاڑی کے اسٹیئرنگ وہیل پر اپنی گرفت قائم رکھے ہوئے تھے، میں اس کے تراشیدہ لب دیکھ سکتا تھا جو ایک دوسرے کے ساتھ سختی سے پیوست ہوتے تھے۔

چوتھی دفعہ جب یہ واقعہ ہوا کہ وہ اپنی کار میں بیٹھی میرے اپارٹمنٹ کو گھور رہی تھی۔ میں گھر سے باہر نکلا تو حسب معمول اس نے گاڑی آگے نہیں بڑھائی۔ میں منتظر رہا کہ وہ ابھی ایسا کرے گی جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتی تھی اور چلی جائے گی مگر اس دن اس نے گھر کے دروازے سے نظریں ہٹا کر اپنے سامنے سڑک کو دیکھا پھر مڑ کر میری طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے کار کی کھڑکی کا شیشہ نیچے گرنے لگا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا، میں اس کو باور کروا رہا تھا کہ میں اس کی طرف متوجہ نہیں ہوں بلکہ میرا انداز یوں تھا جیسے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ وہ متوحش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی تو میں کار کے قریب چلا گیا مگر...... مجھے سمجھ نہیں آیا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ میں نے ہولے سے گڈ مارننگ کہا اور اس کی رسمی خیریت دریافت کی۔

برفیلی ہوا نے شاید لفظ چرا لئے اور ان کو درختوں راستوں پر بکھیر دیا کیونکہ میری بات کے جواب میں وہ کچھ نہ بولی۔ یوں محسوس ہوتا تھا وہ پھر گاڑی بھگا لے جانا چاہتی ہو۔ اس نے اپنے ہاتھ دوبارہ اسٹیئرنگ وہیل پر رکھے اور سامنے سڑک کو دیکھنے لگی مگر پھر وہ مڑی اور میرے پیچھے میرے اپارٹمنٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بھی بے ساختہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ گھر کے دائیں طرف دیکھ رہی تھی اس طرف پڑوس اور میرے گھر کے درمیان تقریباً چار فٹ چوڑی گلی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میرا انجانا پراسرار دوست ہر صبح کھڑا دکھائی دیتا تھا۔

''کیا تمہیں اس کا انتظار ہے؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ جونہی میں نے یہ پوچھا تو مجھے محسوس ہو گیا کہ کچھ غلط ہو گیا ہے کیونکہ اگر وہ جواباً پوچھ بیٹھے کہ کون......؟ تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا میں اس کو کیا بتاتا کہ وہ آدمی جو ہر روز میری کھڑکی میں کھڑا ہو کر مجھے گھورتا ہے اور وہ جس کے متعلق میں سوچتا ہوں کہ وہ کوئی سیریل کلر ہو سکتا ہے جو اپنے اگلے شکار کے انتظار میں ہو۔

مگر اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا بس خالی نظروں سے میرے پیچھے میرے گھر کو گھورتی رہی۔ مجھے دفتر سے دیر ہو رہی تھی مگر میں وہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے ابھی وہ کچھ کہے گی۔ اس کے لب جنبش کر رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے مالک مکان نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے بتایا تھا کہ مجھ سے پہلے اس اپارٹمنٹ میں ایک جوڑا رہتا تھا۔ مالک مکان نے تاسف بھرے انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے اپنی زبان میں کچھ اور بھی کہا تھا مگر مجھے صرف لفظ ''حادثہ'' کی سمجھ آئی تھی۔

''کیا تمہیں کچھ مدد چاہئے......؟'' میں نے کار کی کھلی کھڑکی پر جھکتے ہوئے پوچھا، جواب میں وہ صرف آنسو بہاتی رہی۔ میں نے اپنا سیل فون نکال کر اس پر وقت دیکھا تو پتہ چلا کہ ابھی دفتر پہنچنے میں کچھ وقت ہے لہٰذا میں نے اس کی مدد کا فیصلہ کر لیا۔

''اگر آپ چاہیں تو گھر کے اندر آ سکتی ہیں اور میں آپ کو چائے کا ایک کپ بھی پیش کر سکتا ہوں۔''

وہ چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ میں بات کر رہا تھا مگر کوئی جواب نہ پا کر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ ہمت کر کے میں نے دوبارہ بات شروع کی۔

''میں یہاں چند ہفتے پہلے ہی آیا ہوں شاید ایک مہینہ بھی پورا نہیں ہوا ہے۔ میں یہاں کسی کو نہیں جانتا۔ میں ایک میگزین کے لئے گرافک ڈیزائننگ کا کام کرتا ہوں۔'' وہ پرسکون ہونے لگی اور میری طرف دیکھا۔

''تمہارا نام کیا ہے......؟'' میں نے پوچھا۔

''ایمی......'' اس نے آہستگی سے اپنا نام بتایا۔

''ہائے ایمی......!'' میں قدرے خوشگوار لہجے میں بولا۔ ''میرا نام ایلین ہے۔ کیا تم یہاں اس گھر میں رہا کرتی تھیں۔'' میں نے اپنے پیچھے اپارٹمنٹ کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے پوچھا اس نے اپارٹمنٹ کو گھورتے ہوئے اپنا سر ہلکے سے اثبات میں ہلا دیا۔

"کیا تم کچھ دیر کے لئے گھر کے اندر آنا چاہو گی...... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، مجھے جلدی دفتر پہنچنا ہے مگر...... تم چاہو تو چند منٹ کے لئے آ سکتی ہو۔"

جب میں نے اپنے پہلے گھر کو چھوڑا تھا تو میں ہمیشہ وہاں واپس جانا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ وہاں کے نئے مکینوں نے میرے پرانے گھر کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ کیا انہوں نے اس کا رنگ بدل دیا ہے یا کچھ اور...... حالانکہ میں نے تو کوئی رنگ نہیں کروایا تھا۔

میں نے ایمی کی طرف دیکھا اور مسکرایا وہ بھی دھیرے سے مسکرائی مگر بے تاثر چہرے کے ساتھ بس وہ گھر کو گھورتی تکتی رہی کبھی میری طرف دیکھتی اور کبھی گھر کی طرف۔ پھر کچھ بولے بغیر اس نے اپنی بیلٹ اتاری اور کار سے باہر آ گئی۔ ہم اس یخ بستہ موسم میں سڑک کے بیچ کھڑے تھے۔ اس کی کار کا انجن چل رہا تھا اور کار کی چھت پر پڑی برف تھرتھرا رہی تھی۔

"کیا تم چاہتی ہو کوئی تمہاری کار چرا کر لے جائے......" میں نے اگنیشن میں لٹکتی چابی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کار کا انجن بند کر دو......"

"اوہ...... ہاں...... شکریہ......" وہ دھیرے سے بولی۔ میں دیکھتا رہا وہ کار کے اندر جھکی اور انجن کو بند کر دیا۔ چابی نکالی اور اس کو اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ جب وہ دوبارہ میری طرف مڑی تو میں مسکرایا اور مڑ کر اپارٹمنٹ کی طرف چل دیا۔ وہ جھجکی اور پھر میرے پیچھے آنے لگی۔ میں اس کی گہری سانسیں سن سکتا تھا۔ یقیناً ٹھنڈی ہوا اس کے پھیپھڑوں پر اثر کر رہی تھی کیونکہ اس نے کھانسنا شروع کر دیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو نا......" میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے میرے استفسار کے جواب میں بس اپنا سر ہلا دیا۔

میں نے دیکھا اندر آتے ہی اس کے ابرو مزید تن گئے تھے۔ ہونٹ زیادہ بھینچ گئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ یہاں اس اپارٹمنٹ میں کسی مہمان کے بیٹھنے کے لئے کوئی مناسب جگہ اور چیز نہیں تھی خصوصاً ایک خاتون مہمان کے لئے۔

وہ اس گھر میں میری پہلی مہمان تھی اور میں اپنے گھر کی حالت کے بارے میں فکر مند تھا۔ میں نے میز پر سے استعمال شدہ گیلے ٹی بیگ اٹھائے اور انہیں کوڑے دان میں پھینک دیا۔ کچھ چیزیں ادھر ادھر کھسکائیں تاکہ یہ جگہ کچھ قابل عزت نظر آ سکے۔

"کیا تم چائے پینا پسند کرو گی...... میرے پاس کافی بنانے کی سہولت نہیں ہے۔" پھر اس کا جواب سننے سے پہلے ہی مگ اٹھا لئے کیتلی میں پانی بھر کر چولہے پر رکھ دیا اور ابالنا شروع کر دیا وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اس کمرے کو...... جس میں وہ پہلے رہتی تھی کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ میں چائے پینا پسند کروں گا۔" میں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا تو اس نے یوں چونک کر میری طرف دیکھا جیسے بھول گئی ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ "یقیناً......" وہ ہولے سے بولی۔

جب پانی ابل رہا تھا میں نے مختصر بات کرنے کی کوشش کی اور کچھ سوالات پوچھے مگر جواب میں وہ صرف سر ہلاتی رہی۔ اس دوران میں نے دو کپ گرم چائے تیار کر لی اور ان کو مگ میں انڈیلنے لگا۔

"اگر اس وقت میرے پاس بسکٹ ہوتے تو وہ گرم چائے کے ساتھ بڑا مزا دیتے......" میں نے اسے مگ پکڑاتے ہوئے کہا۔

اس نے چپ چاپ چائے کا مگ میرے ہاتھ سے پکڑ لیا۔

"اگر تم پسند کرو تو میرے بستر پر بیٹھ سکتی ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ تھوڑی بدتہذیبی ہے مگر میرے پاس کوئی کرسی نہیں ہے۔" میں نے آس پاس کی خالی دیواروں پر نظر ڈالی، فرش پر رول کئے ہوئے پوسٹر پڑے تھے جن کو میں دیوار پر لٹکانا ہمیشہ بھول جاتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اپنی سستی کی بنا پر شاید کبھی لٹکا بھی نہ پاؤں۔ وہ میرے بستر کے قریب آئی اور ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ میں نے کتابوں سے بھرا ایک کارٹن گھسیٹا اور اس پر جم گیا۔ میں نے چائے کا ایک لمبا گھونٹ بھرا۔ مجھے امید تھی کہ وہ بہتر ہی بنی ہے۔

"تو تم مجھ سے پہلے یہاں اس اپارٹمنٹ میں رہتی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں......" وہ ایک آہ بھر کر بولی۔

"کیا تم تنہا رہتی تھی......؟" میں نے گرم مگ سے چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔ "میرا انداز یوں تھا جیسے جواب مجھے پہلے سے معلوم ہو۔ وہ ایک جوڑی کا حصہ تھی جس کے متعلق مالک مکان مجھ سے کئی دفعہ بات کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ ہوسکتا ہے ان میں علیحدگی ہو چکی ہو۔ ہوسکتا ہے وہ ابھی اس کا منتظر ہو۔ میں نے اس آدمی کے متعلق سوچا ہوسکتا ہے یہ وہی ہو جو مجھے تنگ کر رہا تھا۔ مگر وہ تو بہت بے ضرر دکھائی دیتا تھا۔ وہ بہت اداس تھا۔ تنہا اور ٹوٹا ہوا۔

"نہیں......" وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ میں چپ چاپ اس کے دوبارہ بولنے کا منتظر رہا کہ ہوسکتا ہے وہ مجھے اپنی ساری کہانی سنا دے اور ایسا ہی ہوا۔

"میں اپنے منگیتر کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا نام ارک تھا...... وہ ایک موسیقار تھا۔" ایمی نے مسکرانے کی کوشش کی اور پھر بولی۔ "ہم نے پردے اور تولئے ساری دیوار پر ٹانگ دیئے تھے۔" اس نے چھوٹے چھوٹے سوراخوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ دیوار میں بنے ان سوراخوں کی طرف میں نے کبھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی وہ دوبارہ بولی۔ "ارک کے دوست یہاں آتے اور وہ سب مل کر ریاض کرتے۔"

"بینڈ کی ریاضت اس جگہ......؟ تو بہت عجیب بات ہے۔" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ اب وہ کھل کر مسکرائی مجھے پورا یقین ہو گیا کہ وہ اپنے ماضی میں پوری طرح منتقل ہو رہی تھی۔ میں تصور کر رہا تھا کہ چار یا پانچ لڑکے گٹار اٹھائے گاتے اور اٹھلاتے اس بستر کے گرد ناچ رہے تھے جس پر وہ بیٹھی سن رہی تھی۔ ہوسکتا ہے ڈرم بجانے والا جگہ کی تنگی کے باعث باتھ روم میں بیٹھا ہو۔ وہ چپ چاپ اپنے مگ کے اندر گھور رہی تھی۔ ہم خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے اتفاقاً نظر اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا تو بری طرح چونک اٹھا۔ وہ ایک بار پھر کھڑکی میں کھڑا اندر جھانک رہا تھا۔

میں نے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھا تو ایمی بھی چونک اٹھی اور اسی طرف دیکھنے لگی جس طرف میں دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر کوئی تاثر ظاہر نہ ہوا۔ لگتا تھا اس نے اس آدمی کو کھڑکی میں کھڑے دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ شخص کھڑکی کے قریب آیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اپنے چہرے کے گرد شیشے پر رکھا اور کھڑکی سے اندر جھانکنے لگا۔ اس وقت وہ پہلے سے زیادہ افسردہ اور دکھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے گال پھول گئے تھے اور ماتھے کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا وہ کانپ رہا ہو۔ اس نے اپنی ایک ہتھیلی کھڑکی کے شیشے پر رکھی اور جہاں اس نے اپنا ہاتھ رکھا تھا وہاں برف سی جم گئی تھی۔ اسی لمحے مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا مگر میں اس کا اظہار با آواز بلند نہیں کر سکتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا میرا دماغ چل گیا تھا جو میں اس آدمی کو کھڑکی میں کھڑے دیکھ سکتا تھا مگر ایمی اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کیا وہ کوئی بھوت تھا؟ اگر ایسا تھا تو یقیناً یہ اس کے منگیتر ارک کا بھوت تھا۔ ایسا سوچتے ہوئے میں ایمی سے پوچھنے لگا۔

"ایمی! اس کے ساتھ کیا ہوا؟ میرا مطلب ہے...... ارک کے ساتھ......"

سوال تو میں نے پوچھ لیا مگر مجھے موہوم سی امید تھی کہ وہ کچھ ایسا بولے گی۔ "تمہارا کیا مطلب ہے؟ وہ اپنی جاب پر ہے۔"

مگر اس نے جواب میں کچھ نہ کہا...... بس مجھے تکتی رہی۔ اس دفعہ اس کے چہرے پر خوشی کی جو ہلکی سی لرزش تھی وہ بھی معدوم ہو گئی تھی۔

"اس نے خودکشی کر لی تھی...... ٹھیک اسی جگہ......" ایمی خستہ حال باتھ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

میں نے تصور کیا کہ ایک آدمی سنک پر کھڑا چھوٹے سے آئینے میں جھانک رہا تھا۔ اس کے منہ میں بندوق کی نالی تھی اور وہ خودکشی کرنے والا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اب ایمی سے کیا سوال کرنا مناسب ہوگا اور پہلے کیا پوچھا جائے۔ "کیوں......" یا "کیسے؟" میں نے اندازہ لگایا کہ جو سوال کم پیچیدہ ہو وہی کرنا مناسب ہوگا۔

"گولیاں...... اس نے ڈھیر ساری گولیاں کھا لیں...... جب میں نے اس کو دیکھا تو وہ فرش پر آڑا ترچھا پڑا ہوا تھا۔" وہ بولتے بولتے رکی اور اپنی آنکھیں سختی سے بھینچ لیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دوبارہ اپنے ماضی میں کھو رہی ہے۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا وہاں وہ بھی اپنی آنکھیں بھینچے کھڑا تھا۔

"اسے...... میرا مطلب ہے...... ارک کو کیا پسند تھا۔" میں نے موضوع کو تھوڑا بدلنے کی کوشش کی۔

"میں نہیں جانتی...... وہ کس عالم سے گزر رہا تھا...... اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا اس بارے میں اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اس کو ملازمت سے جواب مل گیا تھا اور انہوں نے اسے بینڈ سے بھی نکال دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کو گٹار بجانے والے تین لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے والدین بھی اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ہماری شادی کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ نکما اور بے کار ہے اور شکل سے وہ خانہ بدوش لگتا ہے۔ مگر ارک کو اپنی داڑھی سے پیار تھا اور مجھے اس سے۔" بات کرتے ہوئے وہ بالکل الجھی اور اپنے پاؤں کو دیکھنے لگی جو لکڑی کے فرش پر آڑھی ترچھی لکیریں بنا رہے تھے۔

"مجھے افسوس ہے...... میں نہیں جانتی میں یہاں کیوں آ گئی...... میں ارک کو یہاں اپنے پاس محسوس کرتی ہوں...... میں نے اس کو کبھی خدا حافظ نہیں کہا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک آہ بھری اور ادھر ادھر خالی دیواروں کو دیکھنے لگی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ کھڑکی پر جو آدمی کھڑا ہے وہ ارک ہی ہے اور وہ مر چکا ہے مگر وہ یہاں ایمی کے لئے ہی آتا ہے۔ اب مجھے یہ سب کچھ زیادہ عجیب نہیں لگ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے وہ ابھی یہاں آ چکا ہے......"

میں نے بتایا تو وہ بس مجھے تکتی رہی یوں جیسے وہ میرے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں دوبارہ بتانے لگا۔

"کوئی اس کمرے کی کھڑکی پر آیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ بے گھر تھا یا...... مجھے نہیں معلوم میں کیا سوچ رہا ہوں مگر ہوسکتا ہے یہ وہی ہو...... ابھی وہ یہیں تھا۔" مجھے امید تھی کہ جونہی ایمی سر موڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھے گی وہ فوراً غائب ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ وہ میری طرف مڑی۔

"کہاں......؟" وہ کنفیوژن کا شکار تھی اور کھڑکی کے شیشے کی طرف اشارہ کر کے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں...... وہ...... تمہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ بہت پریشان ہے۔" مجھے یقین نہیں تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں ایک مردہ شخص کی ترجمانی کر رہا تھا۔ ایمی نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں خبطی ہوں۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی نہیں۔ نہ ہی میری توقع کے مطابق اس نے مگ میں سے چائے میرے چہرے پر اچھالی اور چیختی ہوئی دروازے کی طرف دوڑی۔ مگر میرا خیال ہے وہ ایسا چاہتی ضرور تھی۔ وہ یہاں آئی ہی اسی لئے تھی کہ کچھ حاصل کر سکے۔ کچھ دیر میں اس کا چہرہ نرم پڑ گیا۔ پھر اس نے دوبارہ مڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ میں نے بھی اسی

طرف دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے میں واقعی خبطی ہوں کیونکہ اب وہاں اس کھڑکی میں واقعی کوئی نہ تھا۔ وہ جاچکا تھا۔

"کیا اس نے کبھی کوئی بات کی....." وہ اتنی ہلکی آواز میں بولی جسے میں بمشکل سن پایا۔

"وہ اب جاچکا ہے.....مگر وہ بات نہیں کرتا.....بالکل بھی نہیں۔"

اس نے تیزی سے سر موڑ کر میری طرف دیکھا یہ اس کی تیز ترین حرکت تھی جو اس نے اب تک کی۔

"وہ جاچکا ہے..... اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔" وہ اٹھی اور کھڑکی کی طرف لپکی اس کے پٹ کھول کر بے تابی سے باہر جھانکا پھر اپنی آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔ وہ اپنی آنکھیں بند کئے وہاں کھڑی رہی اور کافی دیر تک صرف سانس لیتی رہی۔

آخر وہ مڑی اور ایک دفعہ پھر سارے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ ایک ہنکارا بھرا۔ مسکراتے ہوئے اپنے چائے کے مگ میں جھانکا پھر میری طرف دیکھا۔

"کیا..... میں دوبارہ یہاں آسکتی ہوں.....؟"

"میں آپ کا خیر مقدم کروں گا..... خوش آمدید کہوں گا۔"

"مجھے احساس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں دفتر سے دیر ہو رہی ہے۔ اب میں تمہیں مزید نہیں روکوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں زیادہ دیر ہو۔" وہ سنک پر گئی چائے کا خالی مگ وہاں گندی پلیٹوں اور کپوں کے ساتھ رکھا اور دروازے کی طرف پلٹ گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اپارٹمنٹ کے دروازے تک گیا جیسے وہ ابھی تک اس کی مالک ہو اور یہ اپارٹمنٹ اس کا ہو۔ سورج برف پر چمک رہا تھا اور اس کی چمک اتنی تھی کہ مجھے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ میرا مگ آدھی خالی تھا۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی....." وہ کہتے ہوئے مسکرائی اور اس کے سفید دانتوں کی ایک قطار دکھائی دی جس کے متعلق مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ ہیں بھی یا نہیں۔

"مجھے بھی تمہاری مدد کر کے خوشی ہوئی۔" میں رک رک کر بولا کیونکہ مجھے اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے الفاظ ڈھونڈنا پڑے۔ اس دوران میں وہ مڑی اور اپنی کار کی طرف بڑھی۔ اس کے انداز میں ہلکی سی ہچکچاہٹ تھی تب اسی وقت میری بائیں طرف سے گھر کے پہلو سے ایک سایہ سا ابھرا اور پھر وہ آدمی..... یا ایرک..... اب اس کا ایک نام تھا چلتا ہوا آگے آیا۔ اب اس کا ہاتھ اس کے چہرے پر نہیں تھا بلکہ دونوں ہاتھ اس کے پہلوؤں میں تھے۔ کار کے قریب پہنچ کر وہ رکا اور اس نے میری طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا یہ چند لمحے طویل عرصے پر محیط ہو گئے تھے تب وہ مڑا اور ایمی کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

"ایمی.....!" میں ایک دم پکار اٹھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اب وہ یہاں اس کے پاس، اس کے عین پیچھے ہے۔ مگر میں کہہ نہ سکا۔ میری آواز سن کر وہ مڑی اور میری طرف دوبارہ دیکھا۔ وہ بھی رک گیا تو مگر اب وہ اس پوزیشن میں تھی کہ ایرک اس کے اور میرے بیچ تھا اور اس کا چہرہ عین اس کے چہرے کے سامنے تھا مگر ایمی کی نظریں اس کے چہرے کو پار کرتی ہوئیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ ایرک ہم دونوں کے درمیان تھا اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اتنا قریب کہ وہ اس کو چھو سکتی تھی مگر وہ اس کو دیکھ نہیں سکتی تھی۔ میں دم بخود رہ گیا اور کچھ نہ بول پایا۔ پھر اس کی سوالیہ نظروں کی تاب نہ لا کر کہا۔

"تم..... جب چاہو یہاں آسکتی ہو۔" میں نے کہا لیکن مجھے اپنا لہجہ کھوکھلا اور آواز مصنوعی لگی۔

وہ اپنی کار میں بیٹھ گئی اور پھر میں نے دیکھا ایرک بھی کار کے اندر مسافر سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

"شکریہ....." وہ بولی اور مڑ کر گھر کو دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ اب ہماری دوبارہ کبھی ملاقات نہ ہوگی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھائی مگر نظریں گھر پر ہی تھیں یوں جیسے وہ گھر کو خدا حافظ کہہ رہی ہو۔

لاش گھر

صباء اسلم۔ گوجرانوالہ

مردہ گھر میں پڑے ہوئے تمام ساکت و جامد مردوں میں سے اچانک، ایک مردے کے ہاتھ میں حرکت پیدا ہوئی اور پھر اس کے دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھے اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں کی پتلیاں گردش کرنے لگیں کہ اچانک.....

رات کی تنہائی اور سناٹے میں جنم لینے والی ایک بہت ہی تحیر انگیز..... لرزیدہ کہانی

جس وقت میں جوزف ولیم ٹیلر کے مردہ گھر میں داخل ہوا تو صبح کی روشنی نمودار ہونے والی تھی میں کرسی پر بیٹھا اور پھر مجھے اونگھ آ گئی میں اس لاش گھر میں ملازم تھا۔ میرا کام لاشوں پر مسالا لگانا تھا کہ وہ سڑنے نہ پائیں۔ موسم سرد اور ناگوار تھا۔ نومبر کے ابتدائی دنوں کے لحاظ سے واقعی اس وقت سردی بہت زیادہ تھی۔ ایک گھنٹہ قبل کسی گھنٹی کی آواز سے میں ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ ابھی میں گھبراہٹ میں گھڑی اور ریڈیو کی طرف ہاتھ مار پایا تھا کہ مجھے پتہ چلا کہ گھنٹی دراصل ٹیلی فون کی بج رہی ہے۔

ٹیلی فون مردہ گھر سے آیا تھا۔ مجھے ویسٹرن پیسفک ڈپو پہنچنا تھا اور ایک شخص اسٹینلی جارڈن نامی کی لاش کو لانا تھا۔ لاش جس گاڑی سے آ رہی تھی وہ سوا سات بجے پہنچنے والی تھی۔ میں نے بتی جلادی اور ہال میں سے گزرتا ہوا اس ہیٹر تک پہنچا جس سے کمرہ گرم ہوجاتا ہے پھر جلدی سے میں نے اس ہیٹر کا بٹن دبا دیا۔ الغرض جس وقت میں نے اپنے گیراج کا پھاٹک کھولا اور موٹر میں بیٹھ کر عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف آیا تو سورج کی پہلی سنہری کرنیں دور اونچی اونچی پہاڑیوں پر دکھائی دے رہی تھیں۔ میں اپنے دل میں سوچنے لگا کہ "دیکھئے آج کا دن کیسا گزرتا ہے؟"

اسٹینلی جارڈن کو جب میں نے دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ جارڈن ستائیس برس کا نوجوان تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ دو بچے بھی تھے، چھوٹا سا خوبصورت مکان تھا۔ اس نے ایک کتا اور ایک کچھوا بھی پال رکھا تھا کتے کا نام ٹائیگر اور کچھوے کا نام تھا بگسی۔ جارڈن کی اچانک موت سے ساری دنیا میں ایک سنسنی پھیل گئی تھی۔ وہ محکمہ جنگ کے ایک خاص کام میں لگا ہوا تھا اور اپنے کام کے سلسلے میں دنیا کے دس اعلیٰ ترین سائنس دانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ بہر حال

کام کے دوران بجلی کا ایک ایسا زبردست جھٹکا لگا کہ وہ ختم ہوگیا۔ اس دن سے اس کی چھوٹی سی لیبارٹری پر ایسی مردنی چھائی کہ شاید قیامت تک قائم رہے۔

گاڑی دو گھنٹے دیر سے آئی۔ ہم لوگوں نے ڈپو سے مردہ گھر تک تین میل کے فاصلے کو ایک لمبی سیاہ موٹر کار میں طے کیا جسے عام طور پر مردہ گاڑی کہا جاتا ہے۔ شام کو جارڈن کو دیکھنے اس کی بیوی اور بچے آئے تو میں ان کے ساتھ اس مقام تک گیا جہاں جارڈن اپنے طویل سفر کے بعد ابدی نیند سو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جب میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا تو مجھے کسی کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گفتگو بڑے انہماک سے ہو رہی ہے۔ میں نے بات چیت سننے کی کوشش کی مگر ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ صرف ایک بات میں اچھی طرح سمجھ گیا اور وہ یہ کہ جارڈن کی بیوی اپنے بچوں سے تو اس طرح ہرگز بات نہیں کر سکتی۔

مجھے بے حد اشتیاق پیدا ہوگیا کہ اس راز کو معلوم کروں۔ ایک گھنٹہ کے بعد جارڈن کی بیوی اپنے بچوں کے ہمراہ میرے دفتر میں آئیں اور کہنے لگیں۔ ”اب ہم لوگ جا رہے ہیں۔“ چنانچہ میں انہیں رخصت کرنے کے لئے اٹھا۔ دروازہ کھولتے ہوئے جب میں نے انہیں سلام کیا تو مجھے ان لوگوں کے چہرے نہایت پرسکون اور حسین نظر آئے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس عورت کو اپنے شوہر کی جدائی پر صبر آ گیا ہو۔

رات دس بجے میں مردہ گھر کو بند کرنے کے خیال سے اٹھا اور اپنے دل میں سوچنے لگا کہ چلو آج کا دن تو خیر سے گزر گیا۔

چنانچہ میں مردہ گھر کے کمرے میں واپس آیا اور ایک کرسی کو دیوار کی طرف کھسکا کر جارڈن کے ساکت جسم کو دیکھنے لگا۔ پھر اطمینان کا سانس لیتا ہوا دروازے کی طرف گھوما۔ مگر جوں ہی میں نے بتی بجھانے کے لئے ہاتھ اوپر کو اٹھایا تو مجھے ایک ایسی آواز سنائی دی جسے سن کر میں چونک پڑا۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہوگیا کہ وہ آواز کھل کر نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی کے منہ پر کپڑا باندھا ہو، اور وہ چلانے کی کوشش کرے۔ اتنے میں وہی آواز دوبارہ سنائی دی تو میرے قدم جہاں پر تھے وہیں چپک کر رہ گئے۔ میں بت کی طرح ساکت کھڑا رہ گیا۔

مجھے سانس لینے میں بھی بڑی دشواری ہو رہی تھی۔ میرا دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ اس کی دھڑکن سے میرے کان بے کار ہوئے جا رہے تھے۔ مجھے بالکل یقین ہوگیا کہ کوئی شخص یا کوئی اور شے کمرے میں ہے اور میرے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔ میں نے تابوت کی طرف نظریں گھمائیں۔

اچانک جارڈن کا ہاتھ کفن کے کنارے پر حرکت کر رہا تھا۔

ابتدائی خوف کے بعد تو میں اس کی طرف اس طرح لپکا کہ جیسے میں کسی ڈوبتے ہوئے آدمی کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری حرکات ایک خودکار مشین کی طرح ہو رہی تھیں۔ دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ ”کیا یہ پرسکون سوتا ہوا جسم یکایک ایک ایسا دیو بن گیا ہے جو کفن پھاڑ کر باہر نکل آئے گا؟“

میں اس کے اوپر منڈلاتا رہا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کا گلا پکڑ دوں یا ہاتھ میں کوئی چیز لے کر اسے پھر سے خاموش کر دوں۔ یا پھر اسے ہوش میں لانے کے بعد جو کچھ ہو سکتا ہو وہ کروں۔ تیزی سے میں نے اس کی آنکھوں پر سے وہ ڈھکن ہٹا دیئے جن کی وجہ سے اس کے پپوٹے بند پڑے ہوئے تھے۔ اب جو پتلیوں پر روشنی پڑی تو آنکھیں اوپر کو اٹھنے لگیں۔

میں نے ناخن تراش سے وہ بندشیں کاٹ دیں جو اس کا منہ بند کرنے کے لئے لگائی گئی تھیں۔ میری طبیعت اس زور سے مالش کرنے لگی کہ میں پریشان ہوگیا۔ اتنی دیر میں وہ روشنی کا عادی ہو چکا تھا۔ ابھی وہ بولنے کے لائق نہیں ہوا تھا مگر اس کی آنکھیں مجھے صاف بتا رہی تھیں کہ وہ میرا احسان مند ہے، چند منٹ اسی طرح گزر گئے۔ پھر اس نے اپنے جبڑے پر ہاتھ پھیرا، ماتھے کو چھوا اور انگلیوں سے اپنے بالوں کو درست کیا اس کے بعد وہ بولا۔

”میری بیوی اور بچے واپس آنے والے ہیں۔

اگر تم کو اعتراض نہ ہو تو میں ان سے دالان میں ملاقات کرلوں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟“

میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا کہ ”ہاں اس میں کوئی حرج نہیں۔“ پھر وہ تابوت کے باہر نکل آیا مگر کمزوری کی وجہ سے گر پڑا۔

”میں اپنے آپ کو جتنا مضبوط سمجھتا تھا شاید اتنا مضبوط نہیں ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مگر سالے تو واقعی میرے جسم پر خوب اچھی طرح لگائے گئے ہیں۔“ میں فوراً تہہ خانے میں پہنچا اور وہاں سے ایک پہیہ دار کرسی لے آیا۔ پھر ذرا دیر بعد میں اسے کرسی پر بٹھا کر ہال سے گزرتا ہوا دالان کی طرف لے گیا۔ اسے اپنے پیروں میں بے حد سردی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ الماری میں ایک پرانا لبادہ رکھا ہوا ہے۔ چنانچہ میں اسے نکال لایا اور اس کے پیروں کے چاروں طرف اچھی طرح سے لپیٹ دیا۔

ذرا ہی دیر بعد باہر کچھ آوازیں سنائی دیں۔ میں نے مڑ کر جو دیکھا تو جارڈن کی بیوی اور اس کے بچے چلے آ رہے تھے۔ وہ لوگ بڑی محبت سے ایک دوسرے سے ملے اور پھر کرسیاں گھسیٹ کر جارڈن کے قریب بیٹھ گئے اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ ان لوگوں نے طرح طرح کی باتیں کیں۔ حال اور مستقبل سب ہی کا جائزہ لیا گیا۔ آخرکار جب جارڈن کی بیوی اپنے شوہر سے رخصت ہونے لگی تو اس نے بچوں کو جارڈن کی گود سے اٹھا لیا۔

جارڈن نے بچوں سے کہا۔ ”دیکھو اپنی ماں کا خوب خیال رکھنا۔ اور کہنا ہمیشہ ماننا۔ میں بہت جلد پھر تم سے ملوں گا۔“ اس کے بعد وہ لوگ روانہ ہوگئے۔ جارڈن اپنے کمرے میں واپس جانے کے لئے تیار تھا۔

واپس ہوتے وقت بالکل خاموشی چھائی رہی۔ لاش گھر کے کمرے میں پہنچ کر جارڈن نے مجھے اطمینان دلا دیا کہ وہ خود ہی تابوت میں داخل ہو جائے گا۔ چنانچہ بلا کسی تمہید کے اس نے بڑے سلیقے سے اس لبادے کو تہہ کیا اور بڑی کرسی پر سنبھال کر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ تابوت کے اندر داخل ہوگیا۔ اور آہستہ آہستہ اس نے اپنے جسم کو تابوت کے اندر لٹا دیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی نہانے کے بڑے ٹب میں بیٹھ کر آہستہ آہستہ لیٹ جائے۔ اس نے اپنے کپڑوں کو سیدھا کیا۔ دونوں ہاتھوں کو اپنے پیٹ کے اوپر رکھ لیا اور آرام سے لیٹ گیا۔ پھر بولا۔

”کہو یہ پوزیشن کیسی ہے؟“ چونکہ میں نے دیکھا کہ وہ بالکل صحیح حالت میں تابوت میں لیٹا ہوا ہے لہٰذا میں سر ہلا کر خاموش ہوگیا۔ وہ میری مدد کا بے حد مشکور تھا مگر اس نے اپنی حرکات کے بارے میں قطعی کوئی وضاحت نہ کی۔

پھر اس نے کہا۔ ”اب صرف دو منٹ تک مجھے مہلت دے دو اور اپنی گھڑی کو ذرا دیکھتے رہو۔ تم نے جو کچھ کیا ہے اس کے لئے میں تمہارا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

میں گھڑی دیکھنے لگا۔ دو منٹ گزرنا قیامت ہوگیا۔ بہر حال جونہی دو منٹ گزرے، میں نے جارڈن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، وہ بالکل پرسکون نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو چھوا تو وہ بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ دوسرے دن صبح جب میں اپنے کام پر آیا تو میرے افسر اعلیٰ مجھے دروازے ہی پر مل گئے۔ کہنے لگے ”گڈ مارننگ مارٹن! تمہارے لئے ایک بڑا ضروری کام ہے، سب سے پہلے اسے کر ڈالو۔ چلو میں دکھا دوں۔“

ہم دونوں ہال سے گزرتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئے جو جارڈن کے لئے مخصوص تھا۔ میں تابوت کے پاس پہنچا اور جارڈن کو دیکھنے لگا۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ جارڈن لیٹا ہوا تھا۔ مگر اس کا جبڑا بری طرح کھلا ہوا تھا۔ میرے افسر اعلیٰ بولے۔ ”معلوم نہیں کیا ہوا، بہر حال تم اسے ٹھیک کر دو۔“

میں ہانپتا ہوا جب کمرے سے باہر نکلنے لگا تو میں نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ میرے دانتوں نے اس تیزی سے میری زبان کو دبا دیا کہ گرم گرم خون کے قطرے میرے منہ میں آ گئے۔ سامنے بڑی کرسی پر وہی پرانا لبادہ نہایت سلیقے سے تہہ کیا ہوا رکھا تھا بالکل اسی طرح جیسا کہ میں نے رات کو دیکھا تھا۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 102

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

رولوکا کو اپنے سامنے دیکھ کر پرتاب سنگھ اچنبھے میں پڑگئے ان کی نظریں رولوکا پر سے ہٹ کے نہیں دے رہی تھیں کہ اتنے میں پرتاب سنگھ کا بل ڈاگ کتا اچانک طیش میں بپھرا ہوا آیا، اس کے بھونکنے سے قرب و جوار دہل رہا تھا، اس نے رولوکا پر چھلانگ لگادی، پھر اس کے بعد جو منظر سامنے آیا اس نے پرتاب سنگھ پر سکتہ طاری کردیا، کتا رولوکا تک پہنچا کہ اچانک فلک شگاف چیخ کے ساتھ زمین پر دھڑام سے گرا اور بالکل ساکت ہوگیا اسے دیکھ کر رولوکا بولا۔ آپ کے کتے میں سادھو بلراج کی آتما سماگئی تھی اور اگر میں چوکنا نہ ہوتا تو آج میرے ساتھ ساتھ آپ کا بھی صفایا ہوجاتا۔ خیر میں اس کا بھی اپائے کردیتا ہوں۔ رولوکا بولا۔ اور پھر پرتاب سنگھ کے پورے گھر کا حصار کردیا۔ اس کے بعد بلراج کی تلاش میں رولوکا نکلا مگر بلراج نے خود کو نہ جانے کہاں پوشیدہ کرلیا تھا۔ اس مسئلے کے لئے رولوکا نے اپنے استاد کی روح سے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ فلاں جنگل میں جہاں کہ جگنوؤں کی بھرمار ہے ان جگنوؤں میں بلراج نے خود کو شامل کرلیا ہے اور اس جگنو کی نشاندہی بھی کردی گئی اور پھر اس طرح رولوکا نے بلراج کو اپنے شکنجے میں جکڑ کر بلراج کی آتما کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔ حکیم وقار اپنے مطب میں بیٹھے ایک کتاب کا مطالعہ کررہے تھے کہ رولوکا آیا اور حکیم وقار کے سامنے بیٹھ گیا اور پوچھا حکیم صاحب کیا پڑھ رہے ہیں، لگتا ہے کوئی اچھی اور سبق آموز کتاب ہے۔ یہ سن کر حکیم وقار بولے۔ جی ایسا ہی ہے۔ خیر آپ تشریف رکھیں، میں سناتا ہوں۔ مصنف نے انسان کے چال چلن اور بھٹکنے پر بہت ہی جامع طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔ خیر اس کا لب ولباب یہ ہے کہ ایک صاحب جو کہ اپنی بیوی بچوں میں خوش وخرم زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے گرد ایک بازاری عورت منڈلانے لگی اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ان صاحب کو لبھالیا۔ اپنی ادائے دلربائی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ میں آپ کی محبت میں گرفتار ہوگئی ہوں، اور اگر آپ نے میرا ساتھ نہ دیا اور مجھے نظر انداز کیا تو میں خودکشی کرلوں گی۔ خیر کچھ دنوں بعد ان صاحب کو اصل حقیقت اور اس عورت کے اوچھے ہتھکنڈوں کا علم ہوگیا اور ساتھ ہی ساتھ ان کا ضمیر بھی جاگ گیا تو انہیں احساس ہوا کہ وہ گناہ کے دلدل میں دھنستے جارہے ہیں اور جب انہیں اس کا احساس ہوگیا تو انہوں نے توبہ کی اور اس عورت سے جان چھڑالی۔ پھر وہ عورت کسی اور شکار کو پھانسنے کے چکر میں اور طرف نکل پڑی۔ یہ کہانی سننے کے بعد رولوکا بولا۔ حکیم صاحب مصنف نے واقعی حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔ اس کہانی میں انسان کے لئے سبق ہی سبق موجود ہے۔ اور پھر رولوکا مطب کے کام سے یعنی جڑی بوٹیاں لینے کے لئے جنگل میں چلا گیا۔ (اب آگے پڑھیں)

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ رولوکا اپنے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹا تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اچانک آنکھ کیوں کھل گئی۔ اس نے بھرپور کوشش شروع کردی کہ دوبارہ نیند کی وادی میں پہنچ جائے مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو پارہا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ اس کے ذہن کی اسکرین پر ایک واقعہ نمودار ہوا، اس واقعہ سے وہ چند دن پہلے ہی فارغ ہوا تھا۔ اس واقعہ یا کیس نے اسے بری طرح تھکا دیا تھا۔ اس کا مدمقابل ایک بہت ہی شکتی شالی اور مہان طاقتوں کا مالک ایک پنڈت تھا۔ وہ پنڈت بار بار اس پر اپنا وار کرتا مگر رولوکا ہر بار اس کا وار ناکام بنادیتا۔ پنڈت کے جتنے وار خالی جاتے تو پنڈت اور بھی کاری وار کرتا۔

اور جب جواب میں رولوکا اپنا وار کرتا تو پنڈت راہ فرار اختیار کرکے کہیں اور جا چھپتا مگر رولوکا اس کا پیچھا کرتا۔ کیونکہ رولوکا جانتا تھا کہ آخر پنڈت تھک ہار کر

دوبارہ آئے گا اور کوئی نہ کوئی وار ضرور کرے گا۔ خیر چوہے بلی کا یہ کھیل، پنڈت کافی ٹائم تک کھیلتا رہا۔

پنڈت وار پر وار کرتا رہا، اور پھر ایک وقت آیا کہ پنڈت تھک کر چور چور ہوگیا۔ ایک پروگرام کے تحت رولوکا ایک ہفتہ کے لئے کالا ہاری کے جنگلات میں روپوش ہوگیا۔ رولوکا کا روپوش ہونا تھا کہ پنڈت رولوکا کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے حال سے بے حال ہوگیا۔ اس کا کوئی بھی جنتر منتر کام کا نہیں رہا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب کوئی اپنے دشمن کے مدمقابل ہو اور اس کا اسلحہ بے کار ہوجائے تو وہ پاگل کتے کی مانند ہوجاتا ہے۔ یہی حال پنڈت کا تھا۔

پنڈت اپنے حواس میں نہیں رہا اور تابڑ توڑ بڑے سے بڑا وار کرتا رہا۔ اس کا ہر وار واپس آتا رہا، اس کے تمام بیر اور قابو کی ہوئی روحیں ہلکان ہوگئیں۔ اس کی تمام نادیدہ طاقتیں پریشان ہوکر پنڈت کے سامنے آن وارد ہوئیں اور سب نے مل کر یہ اعلان کردیا کہ ”اس کا دشمن ان کی پہنچ سے بہت دور ہوگیا ہے۔“ یہ سنتے ہی پنڈت سکتے کی حالت میں آگیا اور اپنے آپ کو تمام منتروں سے الگ کرلیا۔

اور یہی پنڈت کی بھول تھی۔ اس وقت سے رولوکا نے فائدہ اٹھایا اور اس طرح پنڈت رولوکا کے شکنجے میں جکڑ گیا۔ اور پھر آناً فاناً پنڈت اور اس کی روح کا سنسار سے خاتمہ ہوگیا۔

اچانک رولوکا کو اپنے کمرے میں کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی تو رولوکا چونک پڑا۔ سسکنے کی آواز سے پتہ چلتا تھا کہ سسکنے والی ہستی بہت ہی کرب و اذیت میں ہے۔ اسی اثنا میں رولوکا کی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟“

”رولوکا کی آواز سن کر سسکنے والی ہستی کی آواز مزید تیز ہوگئی تو رولوکا بولا۔ ”بھئی آپ کون ہیں...... اور رات کے اس وقت میرے کمرے میں آکر آہ وزاری کا کیا مطلب ہے؟“ پھر رولوکا بولا۔ ”آپ جو بھی ہیں، کھل کر سامنے آئیں اور بتائیں کہ......“ اور

رولوکا کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ کمرے میں ایک نسوانی آواز گونجی۔

رولوکا صاحب! میں ایک بدنصیب ابھاگن، اذیت کی ماری، دکھیاری اور دردر کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی روح ہوں میرا نام شازیہ تھا، میں نے اپنی زندگی میں جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے لے کر جب تک زندہ رہی ایک پل کے لئے بھی مجھے چین نہ ملا اور ان حالات میں میرا اپنا قصور تھا۔

میں جب دس سال کی ہوئی تو میرا دماغ ہواؤں میں اڑنے لگا۔ میں آزاد پنچھی کی طرح آزاد فضاؤں میں اڑنے کے خواب دیکھنے لگی۔ اور پھر اسی سوچ کے تحت میں جوانی کی دہلیز پر پہنچ گئی۔

میرا حسن قیامت ڈھانے لگا۔ میری جوانی مجھے چین نہ لینے دیتی تھی۔ جو بھی مجھ پر نظر ڈالتا تو وہ اپنا دل پکڑ کر بیٹھ جاتا اور میں اپنی خوب صورتی کے زور پر نوجوانوں کے دلوں سے کھیلنے لگی۔ ان تمام نوجوانوں میں ایک نوجوان ایسا بھی تھا جو کہ مجھ سے حقیقی محبت کرتا تھا، مگر میں اسے گھاس نہیں ڈالتی تھی کیونکہ وہ غریب تھا۔

دولت کے معاملے میں وہ میری خواہش کی تکمیل نہیں کرسکتا تھا۔ میں پوری طاقت سے ہواؤں میں اڑتی رہی، لیکن مجھے یہ سمجھ نہ آئی کہ اندرونی طور پر میں کمزور بھی ہوتی جارہی ہوں، اور پھر ایک وقت آیا کہ میں دوسروں کے لئے کھلونا بن گئی۔ مردوں نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے مجھ پر ظلم کرنا شروع کردیا۔ لوگوں کا ظلم مجھ پر اتنا بڑھا کہ میری روح تک گھائل ہوگئی۔

اور جب مجھے اپنی اذیت برداشت نہ ہوئی تو میں اس شخص کو ڈھونڈنے لگی جو مجھ سے واقعی حقیقی محبت کرتا تھا۔ مگر وہ مجھے مل کے نہ دیا۔ میں اپنی زندگی سے مایوس ہوچکی تھی۔ میری دو بہنیں بھی تھیں۔ جنہوں نے سوتیلی ماں کے ظلم سے تنگ آکر اپنا راستہ خود ڈھونڈ لیا تھا اور پھر وہ وقت آیا کہ میں نے خودکشی کرلی۔

میری روح بھٹکنے لگی۔ انہی دنوں میری روح کو

ایک شکتی شالی سادھو نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ میں اس کی غلام بن گئی۔ اپنے کام وہ مجھ سے کروانے لگا۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ مجھے بھی طاقتور بناتا رہا، اس نے مجھے زورآور بنادیا۔ مجھ میں بے پناہ طاقت آگئی اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ سادھو اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور میں آزاد ہوگئی۔

اب میں نے ٹھان لی کہ میں اپنے تمام دشمنوں سے چن چن کر بدلہ لوں گی اور اس کے لئے مجھے ایک زندہ انسان چاہئے تھا کہ اتفاق سے مجھے وہ مل گیا جو مجھ سے حقیقی محبت کرتا تھا۔ میں ایک روح اور وہ ایک زندہ وجود۔ بہرحال وہ میرے جال میں پھنس گیا اور اس کے ذریعہ میں نے اپنے انتقام کا بازار گرم کردیا۔ اسے میں نے دولت مند بنادیا۔ اسے اونچا مقام دلوایا۔ مگر پھر بھی میں مجبور کی مجبور ہی رہی۔ اب میرا وہ محبوب مجھ سے عاجز آگیا ہے۔ مجھ سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس کام کے لئے بہت سارے دو نمبری جنتر منتر والوں کے پاس گیا مگر کوئی بھی اس کا حل نہ نکال سکا۔ یعنی اسے مجھ سے چھٹکارا نہ دلوا سکا۔

اب وہ آپ کے پاس آنے والا ہے، میں اس سے پہلے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ اس کا کام نہ کرنا اور اگر آپ میرے راستے میں رکاوٹ بنے تو......“ اور یہ بول کر وہ روح غائب ہوگئی۔

رولوکا مسکراتا رہ گیا اور پھر وہ بڑبڑایا۔ ”عجیب نادان...... بے عقل روح ہے۔“

☆......☆......☆

انسان خود کو معصوم سمجھتا ہے اور اپنے گناہوں کو اتفاقات اور حالات سے منسوب کرتا ہے میں بھی انسان ہوں، میرے حالات بھی میرے قابو میں نہیں تھے۔ دوہری مشکلات میرے سامنے تھیں۔ ایک معاشی طور پر میں لاچار تھا۔ دوسری محبت کا روگ ایک ایسی محبت کہ میں اس کو پا نہیں سکتا تھا۔ صرف محبت کرسکتا تھا اور جب وہ مجھے ملی تو آدھی ملی۔ میں نے اس کو بھی قبول کیا اور اس کے اشاروں پر چلتا رہا۔ وہ غلط تھی مگر میں کیا

کرتا۔ میرا دماغ کہتا تھا میں غلط کررہا ہوں۔ میرے احساسات مجھے بتاتے تھے غلط ہے، مگر میرا وجود میرے کنٹرول میں نہیں رہتا۔ میں وہی کرتا ہوں جو شازیہ حکم دیتی ہے۔ میں اس کا معمول بنا رہتا ہوں۔ اس کے سامنے میں ایک سحر زدہ سا آدمی ہوجاتا ہوں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ سامنے نہ بھی ہو تو میں اس کے خلاف نہیں جاتا۔ میری اندر کی محبت مجھے روکتی ہے اور میں ہر وقت شازیہ کے سحر میں مبتلا رہتا ہوں۔ میری سوچیں اندازے اس سے زیادہ دور نہیں جاتے، شازیہ کا انجام تو ہوچکا ہے، میری آدھی محبت کا انجام کیا ہوگا......“

میری محبت مجسم شازیہ سے تھی جو جس حال میں مجھے ملتی میں قبول کرلیتا۔ میں محبت کی اس منزل پر تھا کہ شازیہ میری زندگی تھی مگر اس کی روح کا میں کیا کروں، لاکھ وہ اب بھی چاہت کا اظہار کرتی ہے اور شاید سچ ہی کرتی ہے مگر میں ایک زندہ انسان ہوں اس نے مجھے ایسی لائن پر لگادیا ہے کہ میری زندگی گناہوں کی پوٹلی بن گئی ہے اور میں نے اب تک مدافعتی انداز نہیں اپنایا۔

اب میں کیا کروں جو کررہا ہوں کرتا رہوں۔ شازیہ کو بھول جاؤں۔ اس سے کنارہ کشی اختیار کرلوں مگر کس طرح وہ کب مجھے چھوڑے گی۔ اس کا کام ادھورا رہ جائے گا...... وہ لازوال طاقت حاصل کرنے کے لئے مجھے استعمال کررہی ہے اس کے بعد کیا ہوگا کیا پتہ؟ اس کا پیار محبت قائم رہے گا؟ میرا دماغ اس سے آگے کام نہیں کرتا۔

”شازیہ تم نے کبھی اپنی بہنوں کی خبر بھی لی۔“ میں نے ایک روز اس سے پوچھا۔

”ہاں مجھے پتہ ہے ایک اور ہے، میں اس کی اب کوئی مدد نہیں کروں گی کیونکہ اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے، وہ خود سے بھاگ گئی تھی۔ میں نے اپنی زندگی ان دونوں کے لئے داؤ پر لگادی، سارے دکھ خود برداشت کئے اور وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ خود سے چھوٹی مصیبت کو چھوڑ کر بڑی مصیبت میں گئی ہے اس لئے اس کو خود ہی برداشت کرنا ہوگا......“

”اور چھوٹی جس کا تم نے نکاح کسی سے کرادیا

تھا کیا نام تھا اس کا میں نے پوچھا۔

"اس کا نام روبینہ تھا۔ ہم اسے روبی کہتے تھے۔ اس وقت کے حالات ایسے تھے کہ میں اس کو ساتھ نہیں رکھ سکتی تھی۔ کوئی بارود کو باورچی خانے میں نہیں رکھتا۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"نکاح کے بعد اس کے حالات کیا ہیں کچھ پتہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے زیادہ کرید نہیں کی ہے اور نہ ہی مجھے اس کے بارے میں زیادہ پتہ ہے۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"کیا یہ خودغرضی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو اب کیا کریں؟" شازیہ نے کہا۔

"تم مجھے اس کا پتہ بتاؤ، اس کے شوہر کا نام بتاؤ میں پتہ کرتا ہوں، اگر اس کو کسی قسم کی ضرورت ہوئی تو وہ پوری کروں گا۔" میں نے کہا۔

"اس کے شوہر کا نام کمال الدین تھا۔ اور وہ روشن بازار کے پاس شاید دو نمبر میں رہتا تھا۔ اس کی ایک دکان تھی پرچون کی۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں پتہ کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

دو روز کے بعد میں روشن بازار چلا گیا۔ میں بازار میں گاڑی ایک درخت کے نیچے میں نے کھڑی کردی اور پیدل بازار میں ایک دو دکانداروں سے کمال الدین کے بارے میں پتہ کیا مگر کوئی نہ بتا سکا تو میں اور آگے چلا گیا۔ ایک چھوٹی دکان پر ایک بڑے میاں اکیلے بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا تو وہ بولے۔

"اچھا کمال الدین، بریلی والے، ہاں میاں ان کی دکان تھی، بازار میں، مگر اب تو وہ نہیں رہے وہ دکان ان کی بیوہ نے فروخت کردی ہے۔"

"کیا ان کا انتقال ہوگیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تین ماہ ہوگئے۔ تم کون ہو ان کے۔" وہ بولے۔

"میں ان کی بیوہ کا عزیز ہوں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ شام پور سے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں ان کا گھر نہیں جانتا۔ مگر جس نے وہ دکان خریدی ہے وہ ضرور جانتے ہوں گے آپ ایسا کریں اسی روڈ پر ذرا سا اور آگے جائیں۔ ایک صندوق کی دکان آپ کو ملے گی، وہی دکان کمال الدین کی تھی وہ صاحب ضرور پتہ جانتے ہوں گے۔"

اور میں روبی کے مکان پر پہنچ گیا۔

گھر پر غربت کا راج تھا۔ روبی نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے اپنا نام بتایا شازیہ کا حوالہ دیا تو وہ بولی۔ "ہاں میں سمجھ گئی۔ آپ شازیہ باجی کے پاس آتے تھے۔"

"بڑا دکھ ہوا کہ تمہارے سر سے سایہ ختم ہوگیا۔" میں نے کہا۔

"بس اللہ کی مرضی ہماری تو قسمت ہی ایسی ہے۔" وہ بولی۔

"اب تم کیسی ہو؟ گزارہ کس طرح کرتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"زندہ تو ہوں کیا بتاؤں۔" وہ بولی۔

"کچھ تو بتاؤ۔" میں نے پوچھا۔

"باجی نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے میرا نکاح ایک بوڑھے سے کرا دیا تھا۔ وہ دو بچوں کے بعد مجھے تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ باجی نے اپنی عیاشیوں کی خاطر مجھے جہنم میں ڈال دیا۔ مجھے باجی کے سارے کرتوت پتہ تھے اور تم کو بھی اندازہ تھا تم نے بھی اس کو نہیں روکا وہ کوٹھیوں میں رہنا چاہتی تھی۔

وہ اپنی اوقات سے اوپر کی بات کرتی تھی۔ روزی کے بھی انداز اسی قسم کے ہوگئے تھے اور وہ ایک روز چلی گئی۔ باجی نے بڑی جلدی کی اور مجھے بھی ٹھکانے لگا دیا۔

میرا شوہر عمر میں مجھ سے بہت بڑا تھا وہ میرا باپ نظر آتا تھا۔ بوڑھا شوہر نوجوان بیوی کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ روز بار بار آ کر دیکھتا تھا۔ پہلے تو میں سمجھی کہ شاید میری وجہ سے بار بار گھر آتا ہے؟ مگر بعد میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ اصل وجہ کیا تھی۔ اس کے ساتھ میں نے زندگی کے پانچ سال گزارے۔ میں ماں بھی بن گئی مگر اس کا شک اپنی جگہ برقرار رہا۔ بوڑھے

جب زیادہ شک اپنی بیوی پر کرتے ہیں تو شریف عورتیں بھی باغی ہو جاتی ہیں۔" روبی نے کہا۔

"تم نے ٹھیک کہا جو لوگ اپنی بیوی پر شبہ کرتے ہیں ان کے کردار خود خراب ہوتے ہیں۔ ایک غلط فہمی سے ہزاروں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرے ساتھ شروع دن سے یہ ڈرامہ ہوا ہے۔ میں کیا بتاؤں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف میاں بیوی کے درمیان رہتی ہیں۔ ان کو بتایا نہیں جاتا، صرف سمجھا جا سکتا ہے۔" روبی نے کہا۔

"میں سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں چائے بناتی ہوں۔ تم ذرا بیٹھو۔" وہ بولی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"میری لڑکی پڑھنے گئی ہے اور لڑکا سو رہا ہے۔ یہ دو بچے ہی میری کل پونجی ہیں۔" روبی بولی۔

"اللہ ان کی عمر دراز کرے۔" میں نے کہا۔

"باجی اب کہاں ہے؟" وہ بولی۔

"مجھے نہیں پتہ۔" میں نے کہا۔

"پھر تم کو میرا خیال کس طرح آگیا۔" وہ بولی۔

"تم کو پتہ ہے شازیہ سے میرا کیا رشتہ تھا۔ وہ ایک عرصہ سے نہیں ملی تو مجھے خیال آیا شاید تم کو کچھ اس کے بارے میں پتہ ہو، شاید تم سے اس کا رابطہ ہو تو پوچھنے چلا آیا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ مجھ سے کیوں رابطہ کرے گی۔ وہ بنگلوں میں رہنے والی عیاش عورت، میں غریب جھونپڑی میں رہنے والی، مجھے جس کے ساتھ اس نے باندھ دیا اس کے ساتھ چلی آئی۔ اس کے سر سے بوجھ کم ہوا، اس کی بلا سے میں مروں یا جیوں۔" روبی نے نفرت سے کہا۔

"روبی تمہاری ناراضگی اپنی جگہ اگر درست مان لی جائے تو تم بھی یہ تسلیم کرلو کہ شازیہ کے حالات ایسے تھے کہ وہ تم کو ساتھ نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ خود تو آگ میں جل رہی تھی تم کو بھی اس بھٹی میں رکھ دیتی اگر وہ نہ بھی چاہتی تب بھی ایک وقت ایسا ضرور آتا کہ وہ تمہاری حفاظت نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے پاس شاید اس وقت یہی ایک راستہ تھا کہ تم کو باعزت مقام دلایا جائے۔ عورت کے سر پر اگر مرد کا سایہ نہ ہو تو وہ کٹی پتنگ ہوتی ہے۔ ہر کوئی لوٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس جلد بازی میں غلطی تو ضرور ہوئی ہے، مگر تم کو ایک سایہ تو ملا، وہ بہت برا تھا میں مانتا ہوں مگر وہ اس سے بہتر تھا جو کچھ شازیہ کے ساتھ رہ کر تمہارے ساتھ پیش آتا۔ تم صرف اس بات پر شازیہ سے خفا ہو کہ اس نے تمہارا ہاتھ ایک بوڑھے کے ہاتھ میں دے دیا۔ تم اس بات سے خوش کیوں نہیں ہو کہ اس نے تم کو بازار کی چیز نہیں بننے دیا۔ روزی کا حال تم کو پتہ نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے مگر میں تم کو اس کے بارے میں بتاؤں گا نہیں کیونکہ تم ایک باعزت بیوی ہو، تمہارا شوہر ساتھ نہ دے سکا۔ مگر تمہاری عمر ختم تو نہیں ہوگئی ہے۔ تم اب بھی اپنی زندگی از سر نو شروع کرسکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ تو شاید بہت مشکل ہے۔ راکھ کے ڈھیر میں ایک چنگاری بھی تم کو نظر آتی ہے۔" وہ بولی۔

"کیا تم بوڑھی ہوگئی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میرے جذبات اور احساسات سب مردہ ہوچکے ہیں۔" وہ بولی۔

"میرا تم پر زور نہیں ہے مگر میری یہ بات یاد رکھنا۔ انسان عمر سے بوڑھا نہیں ہوتا۔ اپنی سوچ سے بوڑھا ہوتا ہے۔ اس کی مثال تمہارا شوہر ہے۔ تم سوچ سے خود کو بوڑھا سمجھ رہی ہو۔ عمر تمہاری بہت کم ہے۔ میری بات کو اچھی طرح سمجھ لینا اور پھر فیصلہ کرنا۔ ہوسکتا ہے آئندہ زندگی گزشتہ زندگی کے دکھوں کو دور کردے۔ رہے تمہارے بچے تو تم ان کو اچھی تعلیم اور تربیت دے سکتی ہو جس غربت کی زندگی میں تم اس وقت جی رہی ہو بتاؤ تم بچوں کو کیا دو گی۔" میں نے کہا۔

"میں ڈرتی ہوں۔" وہ بولی۔

"کس بات سے۔" میں نے پوچھا۔

"میری سوتیلی ماں نے جو کچھ میرے ساتھ کیا تھا وہی حشر میرے بچوں کا نہ ہوجائے۔" وہ بولی۔

"تمہاری سوچ عین فطری ہے۔ مگر اس وقت

جو حالات تھے وہ تمہاری گرفت سے باہر تھے۔ اب جو فیصلہ ہوگا دیکھ بھال کے اور شرائط کے ساتھ ہوگا تاکہ بچوں کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ اس میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا مشورہ تم کو ایک بڑے کا مشورہ سمجھنا چاہئے۔'' میں نے کہا۔

روزی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''میں غور کروں گی۔''

''ضرور غور کرنا۔ میں پھر آؤں گا اب اجازت دو کچھ پریشانی ہو تو بتاؤ میں پوری کروں گا۔''

''نہیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''مگر مجھے نظر آ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ اور کچھ روپے میں نے اس کی جھولی میں ڈال دیئے۔ ''یہ رکھ لو یہ ایک بھائی کی طرف سے ہے۔'' اور میں باہر نکل گیا۔

میں نے روبی کے تمام حالات شازیہ کو بتا دیئے اور پوچھا۔

''اب بتاؤ کیا کرنا ہے۔''

''تم جو کرنا چاہتے ہو وہ کرو میں منع نہیں کرتی تم اس کو بتا دیتے کہ میں مر چکی ہوں۔''

''ایک بہت بڑا صدمہ تین ماہ پیشتر وہ اٹھا چکی ہے اس لئے میں نے بتانا مناسب خیال نہیں کیا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم کیا کرنا چاہتے ہو یہ بتاؤ'' شازیہ نے پوچھا۔

''میں چاہتا ہوں اس کا عقد کسی مناسب آدمی سے کرا دیا جائے۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر تلاش کرو اور کرا دو۔'' وہ بولی۔

''تم اس قدر بے حسی کا اظہار کیوں کر رہی ہو۔ وہ آخر تمہاری بہن ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں زندہ نہیں ہوں دوسرے میں نے اپنی عزت اور زندگی داؤ پر لگا دی اس کو بچایا اور اس کے خیالات میرے لئے اس قدر خراب ہیں میں سوچ بھی نہیں سکتی۔'' شازیہ نے کہا۔

''تم نے جو کیا وہ تمہارا فعل تھا۔ وہ نادان تھی حالات کا اندازہ اس کو نہیں تھا۔ تمہاری نظر کی گہرائی دور تک دیکھ رہی تھی۔ اس کو صرف اپنا شوہر نظر آ رہا تھا۔ ناآسودہ جذبات میں سوچی گئی کسی بات کا تم برا نہ مانو اور اب بھی تم سے بڑی نہیں ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو میں کب منع کر رہی ہوں کہ تم اس کے لئے کچھ نہ کرو۔ ضرور مجھے دور ہی رکھنا میں تو ویسے بھی نقلی چہرے اور جسم کے ساتھ ہوں۔'' وہ بولی۔

''تم شریک تو ہو گی میری خاطر شریک ہو جانا۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے کرو بندوبست۔'' وہ بولی۔

میں پھر روشن بازار گیا اور اسی دکاندار سے ملا اور اس سے میں نے کہا۔

''میں آپ کو دوبارہ تکلیف دینے آ گیا ہوں آپ ناراض تو نہیں ہیں۔''

''ارے نہیں میاں ناراضگی کیوں ہو گی۔'' وہ بولے۔

''میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''میرا نام یامین بیگ ہے اور تمہارا۔'' وہ بولے۔

''میرا نام شاہنواز ہے میں زیادہ تر اپنے شہر سے باہر رہتا ہوں کاروباری چکر ہے۔ میں نے اپنی جس عزیزہ کا پتہ آپ سے کیا تھا۔ آپ کو پتہ ہے وہ بیوہ ہو گئی ہیں اور ان کی عمر بھی زیادہ نہیں ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ان کی دیکھ بھال کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں ان کا عقد کر دیا جائے۔ جو خرچ ہوگا میں کروں گا آدمی شریف ہو اتنا کماتا ہو کہ بیوی اور بچوں کو روٹی کھلا سکے اگر میری مدد کی ضرورت ہو گی تو میں بھی کروں گا۔ میں تو شہر کے زیادہ لوگوں کو نہیں جانتا اگر آپ یہ نیک کام کرا دیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''بڑا ذمہ داری کا کام ہے۔'' وہ بولے۔

''آپ مجھ سے تجربے میں اور عمر میں زیادہ ہیں۔ میں کیا عرض کروں؟'' میں نے کہا۔

''بیوہ کے چال چلن اور تمام باتوں سے اس محلے کے لوگ واقف ہی ہیں۔ آپ خود بھی پتہ کر سکتے ہیں۔ بہت مظلوم ہے دکھیاری ہے، یہ کام کرا دیں ثواب ملے گا۔'' میں نے کہا۔

''بات یہ ہے بھائی کہ ثواب کمانے کے تو اور بھی بہت طریقے ہیں۔ اس قسم کے معاملات میں کبھی کبھی نیکی گلے پڑ جاتی ہے۔ اس لئے ڈر لگتا ہے۔'' یامین بیگ بولے۔

''آپ نے درست فرمایا۔ مگر لوگ اس قسم کے خدشات سے ڈر کر نیکی کرنے کا خیال تو نہیں چھوڑ دیتے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے میاں میں کوشش کروں گا، دو چار اور لوگوں سے تذکرہ کروں گا اللہ بہتری کرے گا۔'' یامین بیگ نے کہا۔

''آپ کی بڑی عنایت ہو گی۔'' میں نے کہا اور چلتے چلتے کہا۔ ''میں آپ کے پاس آتا رہوں گا۔'' اور میں روبی کے پاس چلا گیا۔

''میری بات پر تم نے غور کیا۔'' میں نے پوچھا۔

''بہت غور کیا۔ میرے حالات ایسے ہیں کہ دور دور تک دو روٹی کا آسرا نظر نہیں آتا۔ میرے مرحوم شوہر کا کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہیں ہے۔ اور میرا بھی کوئی نہیں ہے۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا، سوتیلی ماں چچا کے ساتھ چلی گئی۔ اس کا کچھ پتہ نشان نہیں، دونوں بڑی بہنیں غائب ہیں، اتنی بڑی دنیا میں، میں اکیلی ہوں۔ ان حالات میں تمہارا مشورہ موزوں نظر آتا ہے۔'' روبی نے جواب دیا۔

''میں کوشش میں لگ گیا ہوں۔ جب تک تم اکیلی ہو خرچ کی فکر نہ کرنا۔ میں آتا رہوں گا۔'' اور میں واپس چلا آیا۔

دو چار دن کے بعد میں پھر روشن بازار چلا گیا۔ یامین بیگ سے ملا تو وہ بولے۔

''ایک آدمی ہے سرکاری محکمے میں کام کرتا ہے۔ اس کا ذاتی مکان بھی ہے۔ بیوی کو طلاق دے چکا ہے، وجہ طلاق کی یہ تھی کہ وہ عورت بہت زیادہ بدزبان اور جھگڑالو تھی یہ آدمی ذرا کم گو قسم کا ہے عمر ہو گی چالیس کے لگ بھگ۔ کہو تو بلا لوں اپنے پاس، تم خود بات کر لینا۔'' یامین بیگ نے کہا۔

''آپ جب کہیں میں آ جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کل شام میرے پاس آ جائیں مغرب کے بعد میں دوکان بند کر دیتا ہوں، میرا غریب خانہ قریب ہی ہے، وہیں پر اس کو بلا لوں گا اور آپ سے ملاقات کرا دوں گا۔'' وہ بولے۔

''بہتر ہے میں مغرب تک آ جاؤں گا......'' اور میں واپس چلا آیا۔

شازیہ کی عدم دلچسپی کی وجہ سے میں نے اس کو کچھ نہیں بتایا اور دوسرے روز مغرب سے ذرا پہلے میں یامین بیگ کے پاس پہنچ گیا۔

مغرب کے بعد یامین بیگ نے دکان بند کی اور مجھے لے کر گھر آ گئے۔ ان کا چھوٹا سا صاف ستھرا گھر تھا۔ گھر کی حالت بتاتی تھی کہ ان کی بیگم سلیقہ شعار خاتون ہیں۔

ایک کمرہ ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں مجھے بیٹھایا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک صاحب آ گئے۔ یامین بیگ نے تعارف کرایا۔

''یہ شاہنواز صاحب ہیں۔ ان کا شام پور میں کاروبار ہے۔ اور یہ رحیم الدین جن کے بارے میں، میں نے آپ کو بتایا تھا آپ دونوں باتیں کریں میں چائے بنواتا ہوں۔'' اور وہ چلے گئے۔

میں نے رحیم الدین سے پوچھا۔ ''آپ کا تعلق انڈیا کے کس علاقے سے ہے۔''

''میں گنگا پور یوپی کا رہنے والا ہوں۔'' رحیم الدین نے جواب دیا۔

''یہاں کب آئے؟'' میں نے پوچھا۔

''بیس سال ہو گئے میں میٹرک کر کے آیا تھا۔ یہاں آ کر سرکاری ملازم ہو گیا۔ میں اپنے والدین

کی واحد اولاد تھا والد اور والدہ کو لے کر یہاں پر رہنے لگا۔ والدہ نے میری شادی کردی مگر عورت ایسی ملی کہ زندگی اجیرن ہوگئی۔ بوڑھے والدین بھی اس کو بھاری لگتے تھے، میں والدین کو چھوڑ تو نہیں سکتا اس لئے اس کو چھوڑ دیا۔ والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، بوڑھی والدہ ہیں اور میں ہوں۔" رحیم الدین نے کہا۔

"بہت خوب۔" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میرے بھائی میں جس خاتون کا رشتہ آپ سے کرنا چاہتا ہوں وہ بہت مصیبت زدہ ہیں۔ زندگی میں اس نے کوئی خوشی نہیں دیکھی بھری دنیا میں اس کا کوئی قریبی عزیز نہیں ہے میں بھی دور کا اس کا بھائی ہوں۔ میرا مکان یہاں پر ہے۔ مگر میں رہتا بہت کم ہوں۔ جب مجھے اس کے حالات پتہ چلے اور اس کے بیوہ ہونے کا پتہ چلا تو میں آیا اور آپ کو بھی بلایا۔ میں چاہتا ہوں دونوں کا گھر بس جائے۔" میں نے کہا۔

"آپ میرے بارے میں تحقیقات کرنا چاہیں تو ضرور کریں۔ میرے دفتر میں پتہ کریں محلے میں پتہ کریں یہ آپ کا حق ہے۔" وہ بولا۔

"اور آپ بھی بیوہ کے بارے میں اس کے محلے میں پتہ کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یامین بیگ بہت نیک آدمی ہیں۔ مجھے پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"یامین بیگ ایک ٹرے لے کر اندر آگئے۔ چائے کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی وہ لے آئے۔ میں نے کہا۔" یامین صاحب میری وجہ سے آپ زیر بار ہورہے ہیں۔ مجھے شرمندگی ہورہی ہے۔"

"آپ یہ کہہ کر مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔ زندگی میں ایک دوسرے کے کام آنا ہی پڑتا ہے۔"

"میں آج کسی کے کام آؤں گا تو کل کوئی اور میرے کام آئے گا اور قافلہ آگے بڑھتا رہے گا۔" وہ بولے۔

"آپ کو زحمت تو ہورہی ہے۔" میں نے کہا۔

"زحمت نہیں ہے یہ برکت ہے۔ آپ نے مجھے کچھ سمجھا ہے تو کام دیا ہے۔" یامین بیگ بولے۔

"اللہ آپ کو خوش رکھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں تو آپ دونوں نے کیا فیصلہ کیا۔" وہ بولے

"فیصلہ تو آپ نے کرنا ہے۔" رحیم الدین بولے۔

"میرا کام یہ تھا کہ دونوں پارٹیوں کو ملوادوں وہ میں نے کردیا ہے۔" بیگ صاحب نے کہا۔

"درست فرمایا آپ نے مگر بزرگوں کے تجربے اور سوچ ہمارے پاس نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"بیوہ کے بارے میں، میں گارنٹی لیتا ہوں، نہایت نیک چال چلن اور صبر شکر سے رہنے والی خاتون ہیں۔ یہ بات تو میں نے رحیم الدین صاحب کے لئے کی ہے۔ اور آپ کے لئے یہ ہے کہ آپ رحیم الدین کے بارے میں پتہ کرنا چاہیں تو ضرور کریں۔ میں ان کو بہت عرصہ سے جانتا ہوں کہ کوئی خرابی ان میں آپ تلاش نہیں کرسکیں گے۔" بیگ صاحب نے چائے کا کپ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"بیگ صاحب آپ دونوں طرف کے بزرگ ہیں۔ جو مناسب ہے حکم کریں۔" میں نے کہا۔

"میاں میرا تو خیال ہے جتنا جلد ہو یہ نیک کام کرلیا جائے۔" وہ بولے۔

"تو پھر ایک ماہ بعد کی تاریخ طے کردیں۔" میں نے کہا۔

انہوں نے کہا۔ "تو ٹھیک ہے۔ زیادہ تیاریوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ماہ کے بعد نکاح کردیا جائے گا آپ میرے پاس کچھ روز پہلے آجانا تاکہ تاریخ اور دن مقرر کردیا جائے۔"

اور میں خوشی خوشی واپس آگیا۔ واپس آکر میں نے شازیہ کو پوری بات بتائی تو وہ بولی۔ "ٹھیک ہے کرلو تم اپنی خوشی۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا یہ وہی بہن ہے جو بہنوں کی خاطر خود کو برباد کررہی تھی۔

"تم کو خوشی نہیں ہے کہ تمہاری بہن دوبارہ آباد ہورہی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"مجھے ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ لاپرواہی سے بولی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم وہی شازیہ ہو۔" میں نے کہا۔

"شاہنواز مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش مت کرو۔ تم کو صاف بات بتادوں کہ میں جس منزل پر ہوں وہاں پر محبت ہمدردی نیکی کا گزر نہیں ہے۔" وہ بے حسی سے بولی۔

"اس کا مطلب ہے تم مجھ سے بھی محبت نہیں کرتی ہو۔" میں نے کہا۔

"تم سے محبت میری ضرورت ہے۔ میں تم سے محبت کرنے پر مجبور ہوں۔" وہ لگاوٹ سے بولی۔

"وہ مجبوری بھی بتادو۔" میں نے پوچھا۔

"تم جانتے ہی ہو میرے چار سبق پورے ہوگئے ہیں تم میرے معاون ہو اگر تم میرا ساتھ نہیں دو گے تو باقی تین پورے نہیں ہوں گے۔" وہ بولی۔

"اس کے بعد میری ضرورت تم کو نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"ضرورت ہو نہ ہو تم میرے ساتھ ہی رہو گے....."

"تم نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کچھ نہ سوچنا یاد رکھو کہ تم چار قتل کرچکے ہو تین اور کرو گے۔" وہ بولی۔

"اگر میں انکار کردوں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر چار قتل کرنے والا جو سزا پاتا ہے اس کے لئے تیار ہوجانا۔"

"میرا دل اور دماغ قبول نہیں کررہا ہے کہ تم وہی شازیہ ہو۔ وہ شازیہ جو مجھ سے محبت کرتی تھی۔" میں نے کہا۔

"تم اس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ میں زندہ نہیں ہوں۔ میری ضروریات وہ نہیں ہیں جو تمہاری ہیں۔ میری خواہشات اور ضروریات احاطہ انسانی سے بالاتر ہے۔ مجھے لازوال طاقت ملنے والی ہے۔ وہ مجھے ابدی زندگی دے گی تم اپنی طبعی عمر پوری کرکے ختم ہوجاؤ گے تم میرا ساتھ نہیں دے سکو گے پھر بتاؤ تمہارے ساتھ کیا رشتہ رکھوں۔ مجھے اس کی تلاش ہوگی جو میرا ساتھ دے گا۔" شازیہ نے کہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے مجھے استعمال کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم ٹھیک سمجھے اب تم اس مقام پر کھڑے ہو کہ میرے ایک اشارے پر جیل چلے جاؤ گے۔" وہ بولی۔

"میں ایسی نادانی نہیں کروں گا ایک قتل ہو یا دس سزا تو ایک ہی ہے۔ پھر تمہارا کام کیوں خراب کروں گا۔" میں نے کہا۔

"اب تم نے بات عقل مندی کی کی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"میں تمہارا کام کرنے پر اس لئے بھی مجبور ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرو نہ کرو میں تو کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ بہت زور سے ہنس پڑی۔ "تم زندہ ہو اس لئے عشق کا بخار تم پر چڑھا ہوا ہے اب تک مر جاتے تو قبر میں ہڈی بھی نہ ہوتی۔" وہ بولی۔

"زندہ ہوں تو زندوں کی بات کروں گا۔" میں نے کہا۔

"پھر میں مردوں کی بات کروں تو تم بھی مان لینا۔" وہ بولی۔

"میں نے کب تمہاری نہیں مانی۔" میں نے کہا۔

"انسان کیا ہے میرا اشارہ زندہ انسان کی طرف ہے گوشت اور ہڈیوں کا منصوبہ لالچ و حرص کا غلام ہر شے اپنی دسترس میں رکھنے کا خواہاں لیکن اتنا بے بس کہ قریب رکھی کسی شے کو بھی اٹھا نہیں سکتا۔ اس کو دولت بھی چاہئے حسین مرد ہے تو عورت چاہئے عورت ہے تو مرد چاہئے۔ میں جب زندہ تھی تو تم میری منزل تھے۔ مگر اب میں زندہ نہیں ہوں اس لئے تم میری منزل نہیں ہوسکتے اور تم بھی مجھے اپنی منزل تصور مت کرنا۔" اس نے کہا۔

"یہ تو مجھ پر ہے کہ میں تصور کس کا رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم دنیا میں ہو زندہ ہو احمقوں والی بات نہ کرو، تم ہواؤں سے سیراب نہیں ہو سکتے۔

تم کو مادی اجسام کی ضرورت ہے اور وہ اس دنیا میں بہت ملتے ہیں۔ خوب عیش کرو تمہارے پاس کرنسی نوٹ ہیں۔ گاڑی ہے اور کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ بھی مل جائے گی تم اپنی ہر خواہش پوری کر سکتے ہو۔" شازیہ نے ہنس کر کہا۔

مجھے اب احساس ہو رہا تھا کہ میں گرداب میں پھنس گیا ہوں۔ میرے چاروں طرف نظر نہ آنے والی آنکھیں ہیں۔ میری ایک ایک حرکت پر وہ کڑی پہرا داری کر رہی ہے۔

☆......☆......☆

رات میں میری کیفیت ہی کچھ اور ہو جاتی تھی۔ میں بے چین ہو جاتا تھا۔ اور ان مقامات کی طرف نکل پڑتا تھا۔ جدھر میری بھوک مٹانے کا سامان ہو۔

وہ کون تھی مجھے نہیں پتہ میں تو اس کا دلآویز اور حشر انگیز جسم دیکھ کر ہی اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس کی بڑی بڑی چمکتی روشن آنکھیں، دہکتے گال اور ستواں ناک اور گداز ہونٹ۔ وہ پتھر کا تراشا ہوا مجسمہ ہے، اس کا سیاہ چمکدار جسم حیرت انگیز طور پر انسانوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا اس کو دیکھ کر میرے چہرے کے عضلات جیسے تن گئے تھے۔

رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔ یہ وقت وہ ہوتا ہے جب سب کے پیٹ میں چار چھ پیگ ہوتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ پیر قابو میں نہیں ہوتے ہیں اور صرف زبان اور نظروں سے کام لیتا ہے۔ میں زیادہ نہیں پیتا مگر میری حالت بھی آج بہتر نہ تھی۔ وہ خود میرے پاس آ گئی۔

"نواب صاحب آپ کیسے ہو؟"

"دیکھ رہی ہو ٹن ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"عورت ہوں اتنا کافی نہیں ہے۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

"بہت زیادہ کافی ہے۔" میں نے بھی ہنس کر کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" اس نے کہا اور چل پڑی اور میں مدہوشی کے عالم میں اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

ناشتہ پر شازیہ کا سامنا ہوا تو اس نے ذرا حیرت سے مجھے دیکھا اور بولی۔ "رات کہاں رہے۔"

"بس کیا بتاؤں ایک کالی بلا مل گئی تھی۔" میں نے کہا۔

"ہوشیار رہنا اس سے بہت خطرناک ہے۔ میں جان گئی ہوں وہ کون ہے۔" وہ بولی۔

"مجھے بھی بتا دو۔" میں نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں فضائے بسیط میں کیا کیا مخلوق آباد ہے۔ ہر طرف زندگی ہے، روحیں ہیں، جن بھوت چڑیلیں اور نہ جانے کیا کیا، تم یقین نہ کرو گے آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں میں بھی آبادی ہے۔ سمندر کے اندر اور درختوں کے پتوں پر ہر جگہ زندگی موجود ہے۔" شازیہ نے کہا۔

"میں نے کالی بلا کے متعلق پوچھا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہارے لئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ ایک اسرار ہے ایک بھیانک اسرار تم اس سے دور رہو ورنہ وہ تم کو چند روز میں ایسا کر دے گی کہ میں بھی تم کو نہیں پہچان سکوں گی۔" شازیہ نے کہا۔

"تم اس کا کچھ نہیں کر سکتیں۔" میں نے کہا۔

"میرا جاپ درمیان میں ہے اگر یہ پورا ہو جاتا تو وہ تمہارے نزدیک نہیں آتی۔ ہو سکتا ہے وہ آئی ہی اس لئے کہ تم میرے کام کے لائق نہ رہو۔ اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اس سے دور رہو۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"اس سے دور رہنے کا کوئی طریقہ بھی تو بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"جب وہ تمہارے پاس آئے تو چاقو اس کو دکھا دو پھر بھی نہ جائے تو اس کو کہو مجھے کچھ بالوں کی ضرورت ہے تم دے دو وہ ہرگز نہیں دے گی اور فوراً چلی جائے گی......" شازیہ نے کہا۔

"ہاں اب ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

رات کو میں کلب گیا تو وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔

بولی۔ "کیا بات ہے، بہت ترساتے ہو۔"

"میں ذرا پریشان ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا پریشانی ہے مجھے بتاؤ۔" وہ بولی۔

"مجھے کچھ زنانے بالوں کی ضرورت ہے کوئی عورت دے نہیں رہی تم دے دو۔" میں نے کہا۔

"بال تم کیا کرو گے۔" وہ فوراً بولی۔

"کہا نا ضرورت ہے۔" اور میں نے جیب سے چاقو نکال لیا۔

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ دور چلی گئی۔ "نہیں میں بال نہیں دوں گی۔"

"ارے دے دو تمہارا کیا جائے گا۔" میں نے کہا اور آگے بڑھا۔

"وہ بڑی تیزی کے ساتھ دروازے سے نکل گئی۔

بڑی آسان ترکیب شازیہ نے بتا دی تھی۔ ایک بدروح نے دوسری بدروح کو بھگانے کی۔ میں بظاہر شازیہ کا ہی وفادار تھا۔ مجھ پر شازیہ کی حقیقت بھی کھل چکی تھی۔ وہ صرف مجھ سے اپنا مطلب حاصل کر رہی تھی اس کے بعد وہ میرا کیا حشر کرتی کیا کہا جا سکتا ہے۔ میرا دماغ اور دل میرے کنٹرول میں تھے مگر شازیہ کے سامنے میرے اعصاب جواب دے جاتے تھے۔ وہ اس کے کہنے پر عمل کرتے تھے۔ میں دھند میں چلا جاتا تھا۔ اپنی کیفیت کو کس طرح بیان کروں بس یہ سمجھ لیں کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے کہنے پر عمل کرتا تھا۔ اس نے اب تک اپنے پانچویں شکار کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ مجھے خود سے پوچھنے کی ضرورت کیا تھی۔

☆......☆......☆

حسین صورتیں حواس پر اثر انداز تو ہوتی ہیں۔ مگر میں کالی بلا سے ایک دفعہ دھوکا کھا چکا تھا اس لئے اجنبی چہروں سے دور ہی رہتا تھا۔ جو جانے پہچانے چہرے تھے ان سے ملتا تھا۔ پندرہ دن گزر گئے۔ نیا چاند شروع ہونے والا تھا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی میں کس طرح شازیہ کے کہنے کو ٹالوں، کس طرح خود کو مزید قتل کرنے سے بچاؤں۔ میرے دماغ کی چولیں ہل رہی تھیں۔ میں فرار ہونے کے بارے میں بھی غور کر چکا تھا۔ مگر فرار بے کار تھا۔ شازیہ مجھے تلاش کر لیتی میں جہاں بھی ملتا وہ لے آتی۔ اور مجھ پر پہرے سخت کر دیئے جاتے۔ جو آزادی ملی ہوئی ہے اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے۔ پھر میں کیا کروں۔ جو شازیہ کہتی ہے کرتا رہوں۔ کرنا تو پڑے گا، میں پھر سوچتا ہوں جب تک اس کا جاپ پورا نہیں ہوتا وہ مجھے چھوڑے گی تو نہیں۔ میں کس عذاب میں گرفتار ہو گیا ہوں۔

رات کو شازیہ نے بتایا۔ "میرا اگلا شکار میرا چچا ہے۔ میں نے اس کو تلاش کر لیا ہے۔ وہ اب تک میری سوتیلی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کا مکان شام پور میں ہے۔ مجھے اس نے گھر پر بلایا ہے۔ وہ نہیں جانتا میں کون ہوں وہ صرف میرا جسم اور جوانی دیکھ کر لٹو ہو گیا ہے۔ اتوار کی رات کو وہ اکیلا گھر پر ہوگا۔ ایک ویران سی بستی ہے۔ دور دور مکانات ہیں۔ دن میں سناٹا ہوتا ہے۔ رات میں تو ہو کا عالم ہوتا ہے۔ تم گاڑی میں رہنا میں دروازہ کھلواؤں گی۔ پانچ منٹ کے بعد تم آ جانا دروازہ کھلا ملے گا۔" شازیہ نے پورا پروگرام مجھے بتا دیا۔

جمعہ اور ہفتہ درمیان میں تھا میں دو روز تک جیسے سولی پر لٹکتا رہا۔ اتوار کو رات آٹھ بجے ہم مطلوبہ جگہ کے لئے چل پڑے۔ پورے علاقے میں تو بالکل سناٹا پڑا تھا اس نے ایک جگہ مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے گاڑی کھڑی کر دی اور ہیڈ لائٹس بند کر دیں شازیہ نے اور میں نے ڈارک کلر کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

شازیہ نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور ایک گلی میں داخل ہو گئی۔ میں نے گاڑی کا رخ بدل دیا تاکہ واپسی میں دیر نہ ہو۔ گھڑی دیکھ کر پانچ منٹ کے بعد میں بھی گلی کے اندر چلا گیا۔ ایک مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور شازیہ دروازے پر کھڑی تھی۔ اس مکان کے اطراف کوئی مکان نہیں تھا۔ آبادی شروع ہو رہی تھی اس لئے دور دور مکانات تھے۔

میں تیزی سے اندر چلا گیا۔ ایک آدمی زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ شازیہ نے اس کو چت کر دیا۔ اور

چھری مجھے پکڑادی اور دل کے مقام پر انگلی رکھ دی۔ میں نے عین اسی جگہ سوراخ کردیا اور باہر آکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

دس منٹ کے بعد شازیہ آگئی۔ وہ گاڑی میں آگئی تو میں نے کہا۔ ”تم دس منٹ لیٹ ہو......“

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”اس کی حالت بھی تو بگاڑنا تھی۔“

اور میں تیزی سے واپس روانہ ہوگیا۔ دونوں راستہ بھر خاموش رہے۔ اور شازیہ کا پانچواں شکار ہوگیا۔

اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر لگ گئی اور بس۔ اب شازیہ نے طریقہ کار تبدیل کردیا تھا ہر جگہ پر وہ نیا طریقہ اختیار کرتی تھی۔ میں صرف ایک دفعہ چھری چلاتا تھا باقی کام وہ خود کرتی تھی۔ اتنی پھرتی اور صفائی سے کرتی تھی کہ اس کے کپڑوں پر ایک چھینٹ خون کی نہیں ہوتی تھی میری کیفیت کچھ دیر خراب رہتی تھی اور پھر آہستہ آہستہ میں نارمل ہوجاتا تھا۔ مگر اب میں واردات کے بعد مشروب پی کر خود کو مدہوش کرلیا کرتا تھا۔ یہ میرے لئے آسان نسخہ تھا۔ اور جب تک مرنے والا یاد رہتا میں پیتا ہی رہتا تھا۔ شازیہ نے گھر پر بہت اسٹاک جمع کردیا تھا۔

شراب بہت خراب چیز ہے یہ انسان کے ہوش حواس چھین لیتی ہے مگر جو خود اپنے ہوش حواس میں نہ رہنا چاہے اس کے لئے تو اس سے بڑھ کر کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

تین ہفتہ کے بعد میں یامین بیگ کے پاس چلا گیا۔ اور ہم دونوں روبی کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے کہا۔

”میں چاہتا ہوں جلد از جلد نیک کام کرلیا جائے۔“

روبی گردن جھکا کر خاموش ہوگئی تو بیگ صاحب نے کہا۔

”شرم وحیا عورت کا زیور ہے مگر بیٹا یہ شرح کا معاملہ ہے تم اپنی مرضی بیان کرو۔“

وہ گردن جھکائے جھکائے ہی بولی۔ ”آپ بزرگ ہیں اور یہ میرے بھائی ہیں جو مناسب خیال کریں مجھے اعتراض نہیں ہے۔“

”بہت بہتر ہے۔“ اور ہم دونوں رحیم الدین کے مکان پر پہنچ گئے۔

بیگ صاحب نے کہا۔ ”آج ہفتہ ہے اب جو جمعہ آئے گا اس دن تمہارا نکاح ہوگا تیار رہو۔“

”میں تو آپ لوگوں کا انتظار کررہا تھا۔“ وہ بولا۔

”تو پھر ٹھیک ہے اپنے پانچ چھ دوستوں کے ساتھ جمعہ کو مغرب کے بعد روبی کے مکان پر آجاؤ۔“

جمعہ کو مغرب کے بعد روبی کے ساتھ رحیم الدین کا عقد ہوگیا۔ اور روبی رحیم الدین کے گھر آگئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ شازیہ کو بتایا تو وہ بولی۔

”اب اور زیادہ سماج سدھارنے کی طرف مت جانا۔ بہت کرلیا تم نے آئندہ ایسا کام نہ کرنا۔“ شازیہ کے چہرے پر خباثت ٹپک رہی تھی۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا تو وہ پھر بولی۔

”تم اس دنیا کو نہیں جانتے تم جس کے ساتھ بھلائی کروگے وہ تم کو برا کہے گا۔ تم جس کے پاس جاؤ گے وہ تم کو چکر دے گا۔ یہ پوری دنیا صرف ایک چیز کے گرد گھوم رہی ہے وہ ہے دولت۔ تمہارے پاس ہے تو یہ تمہاری غلام ہے اور نہیں ہے تو تم کتے سے بدتر ہو۔ تم اس کو سدھارنے کی بات اب نہ کرنا۔ جو جیسا ہے رہنے دو کوشش کرو بلکہ کوشش کرو کہ وہ اٹھنے نہ پائے، دونوں پیر کاٹ ڈالو۔ اپاہج کردو تاکہ وہ تمہارا کہنا مانے۔ طاقت کا نام زندگی ہے۔ کمزوروں کو زندہ رہنا ہی نہیں چاہئے۔“ شازیہ کے چہرے پر نفرت اور حقارت پھیلی ہوئی تھی۔

”تم یہ بات کیوں بھول جاتی ہو کہ تم خود زندگی میں کیا تھیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ ردعمل اسی کا ہے مجھے اگر عزت ملی ہوتی اور زندگی سکون سے گزری ہوتی تو میں ایسی نہیں ہوتی۔ مجھے زندگی نے کیا دیا۔ وہی میں اب واپس کررہی ہوں۔ تم پر دورہ پڑتا ہے ہمدردی کا، محبت کا، میں نوچ کر پھینک دوں گی، تمہارے احساسات کو تم کو میرا جیسا بننا پڑے گا۔ اب منزل دور نہیں ہے۔ صرف دو سیڑھی دوری پر اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت موجود ہے۔

مجھے اشارے مل رہے ہیں۔ اب صرف دو چاند اور نکالنے ہیں۔ تم خوب عیش کرو دل بھر کر پیو اور پلاؤ ایک سے ایک بڑھ کر حسین جسم سے دل بہلاؤ مجھے اعتراض نہیں ہے مگر کسی ایسے کام میں ہاتھ مت ڈالنا جس سے کسی کو فائدہ ہوتا ہو۔ ہمارا کام نقصان کرنا ہے جو فائدہ کرنے والے ہیں ہم ان کا ہاتھ کیوں بٹائیں وہ ہمارا کام کرتے ہیں۔“

اب میری سمجھ میں پوری طرح آچکا تھا کہ شازیہ کس سے طاقت حاصل کررہی تھی۔ اور کس کی چیلی تھی۔ میں اس کا غلام بنا ہوا تھا۔ اندر سے میں باغی تھا مگر میرا جسم اس کے کنٹرول میں تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہی کررہا تھا۔ جو وہ چاہتی تھی۔

میں طاغوتی قوتوں سے دست وگریباں نہیں ہوسکتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ ٹپک کر رخساروں پر بہنے لگے۔ میں کتنا بے بس اور بے اختیار ہوں۔ انسانی جبلت پر غور کرنے لگا۔ میں شاہنواز اس وقت تک اختیاری اور غیر اختیاری طور پر حالات سے مجبور ہوکر پانچ قتل کرچکا تھا۔ اس کے بعد تو مجھے عادی ہوجانا چاہئے تھا۔ مگر میں پچھتا رہا تھا رو رہا تھا۔ ان سب کی موت کا ماتم کررہا تھا۔ میں نے زندگی میں نیک کام شاید کوئی نہیں کی۔ میں انسان بھی ہوں کہ نہیں۔ میں انسان کہاں۔ انسان ہوتا تو انسانوں سے محبت کرتا ان کے دکھ سکھ میں ساتھ رہتا۔ میں انسانیت کے رتبہ سے گرگیا ہوں میں نے ایک نئی بوتل کھولی اور پینے لگا اور پیتے پیتے ہوش سے بے گانہ ہوگیا۔

میرے لئے یہی بہتر تھا کہ ہوش سے بے گانا رہوں۔ مگر یہ کب تک کی زندگی ہے تو ہوش بھی ہوگا یہ عارضی سہارے کب تک چلیں گے...... میں سوچوں کے آخری سرے تک چلا جاتا مگر پھر واپس بوتل کے قریب آجاتا۔

شازیہ میرے پاس آتی مسکراتی خوش ہوتی اور واپس چلی جاتی۔ اس نے جس راہ پر مجھے لگانا تھا لگا دیا۔ اور میں آنکھیں بند کرکے اس پر چلا جارہا تھا۔ وہ خوش

کیوں نہ ہوتی۔ اس کی منزل قریب آرہی تھی اور میری منزل گم ہوتی جارہی تھی۔ وہ شیطان کی چیلی اپنے گرو کو خوش کررہی تھی اور میں اپنے رب سے دور ہورہا تھا۔ میرے گناہوں کی گٹھری بھاری ہورہی تھی۔

میں ایک ہفتہ سے روشن بازار نہیں گیا تھا۔ دوپہر کو بیگ صاحب کے پاس چلا گیا۔

"آؤ میاں خیریت سے ہو۔" وہ بولے۔

"بس زندہ ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم چند منٹ آرام سے بیٹھو میں نماز پڑھ لوں۔ دکان کی وجہ سے جماعت سے نماز نہیں پڑھ پاتا۔" اور وہ اٹھ کر اندر سے جائے نماز اٹھا لائے۔ اور نماز پڑھنے لگے۔

میں بھی مسلمان ہوں۔ میں نے سوچا میں نماز نہیں پڑھتا۔ میں کیسا مسلمان ہوں۔ ہر وہ کام کرتا ہوں جو منع کیا گیا ہے۔ میں سوچتا رہا اور شرمندہ ہوتا رہا۔

بیگ صاحب نماز ختم کرکے آگئے تو بولے۔

"اب سناؤ چہرہ کچھ فکرمند نظر آتا ہے۔"

"ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوگیا ہوں۔ کیا عرض کروں۔" میں نے کہا۔

"انسان پر مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ اکثر حالات میں انسان خود مصیبتوں کو دعوت دیتا ہے۔" بیگ صاحب نے جواب دیا۔

"آپ کی بات درست ہے میں خود ہی ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوگیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں بہت معمولی آدمی ہوں۔ مدد کرنے کا وعدہ تو نہیں کرسکتا مگر جو کچھ بتاؤ گے وہ میرے سینے میں محفوظ رہے گا میں رازوں کی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔" وہ بولے۔

"اسی امید پر آپ کے در پر آیا ہوں۔ اگر میں اب بھی خاموش رہا تو شاید میرا دماغ بوجھ کو برداشت نہ کرسکے اور میں پاگل ہوجاؤں۔" میں نے کہا۔

"جو کچھ کہنا ہے سکون سے کہو میں سن رہا ہوں۔" وہ بولے۔

"میں اللہ کے بندوں کا بھی گناہ گار ہوں اور اللہ کا بھی ہوں۔ میری پکڑ دونوں طرف سے ہے۔" میں نے کہا۔

"اللہ بڑا رحیم ہے کریم ہے۔ وہ دل سے توبہ کرنے والے کو معاف کردیتا ہے۔ رہا بندوں کا معاملہ تو میں کیا کہوں۔" بیگ صاحب نے کہا۔

"میں توبہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"انسان بڑا خودغرض ہے۔ اللہ سے بھی سودے بازی کرنا چاہتا ہے۔ میاں پہلے اس کا راستہ اپناؤ اور پھر توبہ کرو۔ وہ ضرور تمہاری توبہ قبول کرے گا۔ ارے وہ تو معاف کرنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ اس کے پاس کوئی جائے تو۔" بیگ صاحب نے کہا۔

"میں آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں۔ پھر آپ مجھے مشورہ دیں۔" میں نے کہا۔

"ضرور سناؤ۔" وہ بولے۔

اور میں نے اپنی اور شازیہ کی پوری کہانی بیگ صاحب کو سنادی۔

"بڑی دردناک اور حیرت ناک کہانی ہے۔ انسانی جذبوں کی کہانی ہے۔ نفرت و محبت کی کہانی ہے۔ تم نے زندگی کے بہت سے رخ دیکھ لئے ایسے رخ جو بہت کم لوگوں کو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میرے خیال میں تم ذہین بھی ہو، زیرک اور سمجھدار بھی ہو۔ اگر تم ایک دم شازیہ کے خلاف ہوجاتے تو شاید وہ تم کو زندہ برداشت نہ کرتی۔ ابھی اس کی شکتی اتنی نہیں ہے کہ وہ تمہارے دل کا حال پڑھ سکے۔ میں تمہاری مشکلات کا حل نہیں ہوں مگر حل تلاش کرنے میں تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ تم شازیہ کے ساتھ ہی رہو گے۔ اس کو ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہئے کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ وہ تم کو زیادہ دیر نظروں سے دور بھی کرنا نہیں چاہے گی۔" بیگ صاحب نے کہا۔

"مگر میں اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔

"ابھی تم کو رہنا ہوگا۔ میں جانتا ہوں تمہاری

اندرونی کیفیت کیا ہوگی۔ مگر بعض اوقات انسان وہ کام بھی کرتا ہے جو اس کو سخت ناپسند ہوتا ہے۔ تم اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں کرو گے کہ تم شازیہ سے نفرت کرنے لگے ہو۔ اس کو آخر تک اس خوش فہمی میں مبتلا رہنا چاہئے کہ تم اس کی محبت کی خاطر سب کچھ کرنے پر تیار ہو۔ یاد رکھو یہی تمہاری کامیابی کی کنجی ہے۔"

"مجھے اپنے گناہوں کا احساس ہے۔ میں خود کو معصوم خیال نہیں کرتا اور نہ ہی اپنے گناہوں کو اتفاقات سے منسوب کرتا ہوں۔ میں سزاوار ہوں اور جو سزا خدا مجھے دے وہ قبول کروں گا۔ مگر اس چڑیل کے ساتھ میں کس طرح رہوں۔ وہ مجسم بری ہے۔ اس کا ہر کام شیطانی ہے۔" میں نے کہا۔

"قابل قدر ہیں تمہارے احساسات، مگر تم نے جہاں اتنے عرصے اس کو برداشت کیا ہے کچھ عرصہ اور برداشت کرو۔ بڑے مقصد کو پانے کے لئے انسان کو کچھ تکلیف برداشت کرنا پڑے تو ضرور برداشت کرنا چاہئے۔" بیگ صاحب نے جواب دیا۔

"تم میرے پاس جمعرات کو آنا پھر تم کو میں کسی سے ملواؤں گا۔" بیگ صاحب پھر بولے۔ "اور فکر نہ کرو انشاء اللہ تم بہت جلد سکون محسوس کرو گے۔"

اور میں واپس آگیا۔ بیگ صاحب کو بتانے کے بعد مجھے ذہنی سکون سا محسوس ہوا، شاید میرے ذہن کا بوجھ کچھ بیگ صاحب کی طرف منتقل ہوگیا تھا۔

جمعرات کو میں بیگ صاحب سے ملا تو وہ میرے ساتھ ایک جگہ گئے اور انہوں نے جن صاحب سے ملایا۔ وہ تقریباً پچاس برس کے تھے۔ چہرے پر سفید اور کالی داڑھی تھی مگر کوئی مولانا یا صوفی وغیرہ نظر نہیں آتے تھے۔

نہایت اخلاق سے ملے۔ بیگ صاحب نے میرا تعارف کرایا اور میری پوری کہانی ان کو سنادی۔ وہ بڑے غور سے سنتے رہے۔ جب بیگ صاحب خاموش ہوگئے تو وہ بولے۔

"دیکھو میاں تم جو زندگی گزارتے رہے ہو میرے خیال میں حقیقی زندگی نہیں ہے۔ جب تم ملازمت کرتے تھے اور چھوٹے مکان میں رہتے تھے اصل زندگی وہ تھی۔ تم اپنی اصل زندگی سے کٹ گئے اور نقلی زندگی پر آگئے، وجوہات کچھ بھی ہوں تم نے اپنے فیصلے خود نہیں کئے تمہارے بارے میں دوسروں نے فیصلے کئے اور تم ان پر چلتے گئے۔ اب ان راستوں پر اتنی دور نکل آئے تو اب تم کو احساس ہورہا ہے کہ تم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ یہ دنیا بڑی عجیب جگہ ہے۔ تصوراتی، زندگی صبر کرنے والے اکثر فریب کھا جاتے ہیں۔ کچھ وقت دو مجھے میں اپنی کہانی تم کو سناؤں۔" وہ بولے۔

بیگ صاحب نے کہا۔ "آپ کے پاس آئے اسی لئے ہیں۔"

"تو پھر بتاتا ہوں میرا نام ادریس احمد ہے۔ میں ایک چھوٹے سے شہر بجنور کا رہنے والا ہوں۔ میں جو سنانے والا ہوں یہ داستان آپ کے ذہن سے محو ہوجائے گی۔ کیونکہ وقت کی یہ خوبی ہے کہ وہ تصورات کو اڑا لے جاتا ہے اور انسان حال پر تکیہ کرتا ہے۔

میرے دادا یا پردادا شاید بہت بڑے زمیندار یا نواب رہے ہوں گے کیونکہ جس مکان میں، میں نے آنکھ کھولی وہ ایک بہت بڑی حویلی تھی۔ یہ دو منزل حویلی بہت مضبوط بنی ہوئی تھی اس سے بڑا مکان پورے منشی ٹولہ میں نہیں تھا۔

میرے والد اور والدہ اوپری منزل پر رہتے تھے۔ نیچے بہت بڑے بڑے دالان اور بڑے بڑے کمرے بنے ہوئے تھے۔ درمیان میں کافی بڑا میدان تھا۔ یہاں پر جانور باندھے جاتے تھے، نیچے کی منزل میں نوکر پیشہ لوگ رہتے تھے۔ جن میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی، وہی ان مویشیوں کی خدمت کرتے تھے۔ وہ ان ہی کمروں میں رہتے بھی تھے، دروازہ بڑی اونچی جگہ پر بہت بڑا سا بنا ہوا تھا اور اس پر پرانے انداز کے بڑے بھاری بھاری کواڑ لگے ہوئے تھے۔ میں یہ سب بتا کر آپ کو بور تو نہیں کررہا ہوں۔" وہ بولے۔

"آپ جس انداز سے بیان کررہے ہیں اس کا ضرور کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا۔" میں نے کہا۔

"دراصل میں اس ماحول میں آپ کو لے جانا چاہتا ہوں۔" وہ بولے۔

"اوپر جہاں پر ہم لوگ رہتے تھے وہی جگہ اتنی بڑی تھی کہ ہمیں نیچے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ نیچے کے بڑے بڑے کمروں میں ہم لوگ کبھی نہیں جاتے تھے۔ ہمارا اوپر جانے کا زینہ بھی الگ تھا۔ گویا پہلی منزل کی دنیا ہی الگ تھی۔ کسی ملازم کو اوپر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ والد صاحب ان سے سب معاملات نیچے ہی کرتے تھے۔

ایک گوالہ نے ایک روز والد صاحب سے کہا۔

"سرکار ایک مہینہ کی چھٹی دے دو گاؤں جانا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "دو چار دن کی چھٹی لے لو اور ہو آؤ۔"

"بات یہ ہے سرکار کہ گھر والی کے بچہ ہونے والا ہے۔ پندرہ بیس دن کے بعد بچہ ہوگا۔ بس ہوتے ہی واپس آجاؤں گا، ایک مہینہ تو ضروری ہے۔" گوالہ نے کہا۔

"ارے تو بھلے مانس جب وقت قریب آئے چلے جانا۔" والد صاحب نے کہا۔

"آپ کو پتہ نہیں ہے حضور۔ میں پہلے والے بچے پر نہیں گیا تھا وہ بچہ ساتھ خیریت کے ہوگیا تھا مگر چند منٹ کے بعد اچانک اس کی حالت خراب ہوگئی اور وہ مرگیا۔" گوالہ بولا۔

"مجھے یاد ہے۔"

"دوسرے پر بھی یہی ہوا آپ کو یاد ہے۔" وہ بولا۔

"ہاں مجھے یہ بھی یاد ہے۔" والد صاحب نے جواب دیا۔

"اب حضور میں تیسرا بچہ نہیں مروانا چاہتا۔" وہ بولا۔

"جس کی زندگی جتنی ہوتی ہے وہ اتنی ہی سانسیں لیتا ہے تم وہم نہ کرو اوپر والا اپنا فضل کرے گا۔" والد صاحب نے اسکو تسلی دی۔

"میں وہمی نہیں ہوں سرکار۔ مجھے کہہ دیا ہے کہ یہاں پر بچہ نہ ہونے پائے۔" وہ بولا۔

"کس نے کہہ دیا ہے۔" والد صاحب نے پوچھا۔

"پتہ نہیں بھگوان جانے کون ہے اسی کارن آپ خود دیکھ لو۔ نیچے تین گھرانے موجود ہیں کسی ایک کے بھی بچہ نہیں ہے اور جو ہوا مارا گیا۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔

"ارے تم کن توہمات میں پڑگئے۔" میں نے کہا۔

"نہیں سرکار یہ بات نہیں میں بھی اتنا کچا نہیں ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ جو کونے میں چارہ رکھنے والی بڑی کوٹھری ہے اس کے برابر ہی ایک اور بھی بہت بڑی کوٹھری ہے۔ میں نے رات کو وہاں کئی دفعہ بڑی چہل پہل دیکھی ہے۔ میرا کام تو سویرے شروع ہوتا ہے۔ اٹھتا تو میں بہت جلدی ہوں۔ کبھی کبھی بہت جلدی آنکھ کھل جائے ہے۔ مگر وہ سب اسی کوٹھری تک ہے۔ یہ پتہ نہیں کا ہے کی چہل پہل ہوتی ہے۔"

"میرا جب پہلا بچہ ہونے والا تھا اس وقت مجھے بازار میں ایک آدمی ملا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی دونوں جوان تھے۔ آدمی بولا۔

"دیکھو سری ناتھ تم ہمارے ساتھ رہتے ہو ہمارے ساتھ رہو مگر یہ بچہ نہیں رہے گا۔ تم اپنی گھر والی کو کہیں اور رکھو بچہ کوئی پیدا نہ کرنا نہیں تو دکھ اٹھاؤ گے۔" اور وہ چلے گئے۔ میں تو سچ بتاؤں ان کی بات سمجھ ہی نہ پایا۔ اور پہلا بچہ مارا گیا۔ اس کے بعد دوسرا بھی گیا تو میری سمجھ میں بات آگئی اور اب میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ گھر والی کو گاؤں میں رکھوں گا بچہ بھی وہیں ہوگا۔ مجھ پر رحم کرو سرکار۔" وہ گڑگڑا کر بولا۔ والد صاحب کو اس کے گڑگڑانے پر رحم آگیا۔ اور اس کو جانے دیا۔

"ایک مہینے کے بعد وہ خوش خوش واپس آگیا اور اس نے بتایا کہ لڑکا ہوا ہے اور ٹھیک ہے۔"

"یہ بات یہاں پر ختم ہوجاتی تو شاید والد صاحب اس کو سری ناتھ کا وہم ہی سمجھتے مگر ایسا نہیں ہوا ایک بہت پرانا ملازم رام سروپ نیچے ہی رہتا تھا۔ اس کی ایک لڑکی بھی تھی اب وہ جوان تھی، پہلے رام سروپ اکیلا رہتا تھا۔ جب وہ گھر والی کو لے کر آیا اس وقت لڑکی دس برس کی تھی، کبھی کبھی اوپر بھی آجاتی تھی۔ میری ہم عمر تھی، ہم دونوں ساتھ کھیلتے تھے۔ وہ اپنی ماں پر گئی تھی۔ اس کی ماں گاؤں کی تھی مگر شکل وصورت کی بہت اچھی تھی۔ اس کا نام گوری تھا۔

رام سروپ کی یہ لڑکی اب جوان تھی۔ بہت دنوں سے اوپر بھی نہیں آئی تھی۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ ایک روز رام سروپ والد صاحب کے پاس آگیا اور بولا۔

"حضور ہم گاؤں جارہے ہیں اب شاید واپس نا ہی آئیں گے۔"

"کیوں رام سروپ تم کیوں جارہے ہو؟" والد صاحب نے پوچھا۔

"بس کا بتائیں سرکار بات کہن جوگی نہیں ہے۔" وہ گردن جھکا کر بولا۔

"جب تک تم جانے کی وجہ سے نہیں بتاؤ گے میں جانے نہیں دوں گا۔" والد صاحب نے کہا۔

"سرکار کس پھیر میں ڈال دیا ہے۔" وہ روہانسی آواز میں بولا۔

"تم پریشان بہت ہو بتاؤ کیا پریشانی ہے۔ شاید میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں۔" والد صاحب نے کہا۔

"ارے صاحب بہت خراب بات ہے۔ بہت شرم کی بات ہے ہم کا بتائیں منہ ہی نہ پڑت ہے۔" وہ بولا۔

"تم کو شاید مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔" والد صاحب نے کہا۔

"ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ ہم نہ ہی جانا چاہو رہے پر کیا کریں۔ عزت بہت بڑی چیز ہے۔ ہم غریبن کے پاس اور رکھا کیا ہے۔" وہ بولا۔

"تو پھر بتاؤ تو شاید کچھ مدد میں کرسکوں۔" والد صاحب نے کہا۔

"بات یہ ہے سرکار کہ ہماری ایک ہی چھوری ہے اوکی فکر ہے اسی کارن جارہے ہیں۔" رام سروپ نے کہا۔

"ارے تو کیا وہ میری بیٹی نہیں ہے۔ فکر نہ کرو، شادی بیاہ کی بات ہے تو ہوجائے گی خرچ کی فکر نہ کرنا۔ سب ہم کریں گے۔" والد صاحب نے کہا۔

"یہ بات نا ہی سرکار۔" وہ بولا۔

"تو اور کیا بات ہے۔" والد صاحب نے تعجب سے پوچھا۔

"چھوری بڑے جنجال میں پھنس گئی ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"جنجال میں پھنس گئی کیسا جنجال بتاؤ تو۔" والد صاحب نے پوچھا۔

"کا بتائیں سرکار کیسے بتائیں۔ اوکا پیچھے ایک بلا لگ گئی ہے۔ وہ روز رات کو آوت ہے۔ پہلے چھوری اپنی ماں کے ساتھ سووت تھی اب الگ کھاٹ پر سووے ہے۔ شکل صورت اور شریر سے اب وہ بالکل بدل گئی ہے۔ وہ مہتاری کے پاس سوجائے تو بھی رات ما الگ ہوجاوت ہے۔ میری گھر والی نے پوچھا تو او بتائی کہ کوئی آوت ہے اور رات بھر اس کو اپنی جورو بنائے رکھے ہے اب وہ لاگت بھی کنواری نہ ہے۔ اور کا بتائیں سرکار ہماری عزت تو مٹی میں مل گئی۔

وہ کون کچھ نظر تو آوے، پن وہ چھوری کو بھی نظر نہ آوے ہے، چھوری نے بتایا وہ زیادہ بات بھی نہ کرے ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو رام سروپ۔" والد صاحب نے حیرت سے کہا۔

"جو کچھ کہہ رہے ہیں جھوٹ نا ہی کہہ رہے ہیں۔ ہم کس کو پکڑیں ارے کوئی سامنے ہو تو عزت کی خاطر اس کی جان لے لیں یا دے دیں، پھر جو نظر ہی نہ آئے اس سے کیا جھگڑا کریں ہوا میں لڑائی نہیں ہوتی۔" رام سروپ نے کہا۔

"یہ بتاؤ یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے۔" والد

صاحب نے پوچھا۔
"ایک مہینہ سے زیادہ ہوگیا ہے۔ ایک مہینہ میں چھوری بدل گئی ہے۔ اگر ہم یہیں پر رہے تو وہ مر جائے گی۔ سرکار ہم کا چھٹی دے دو۔" رام سروپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اچھا ٹھیک ہے رام سروپ ایسے حالات میں ہم تم کو نہیں روکیں گے۔" اور رام سروپ اسی دن چلا گیا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوا پتہ نہیں۔

مگر یہ سلسلہ رکا نہیں ایک کے بعد ایک نوکر جاتے رہے۔ سب کے ساتھ کچھ نہ کچھ انوکھا واقعہ ہوتا رہا۔ اللہ دتہ چالیس سے اوپر کا تھا مگر جوانی میں پہلوانی کرتا تھا۔ بہت تگڑا تھا۔ اس کی گھر والی بھی تیس کے لگ بھگ ہی ہوگی، اس کے ساتھ بھی وہی ڈرامہ شروع ہوگیا، جو رام سروپ کی لڑکی کے ساتھ ہوا تھا، اللہ دتہ کے بستر سے اٹھ کر وہ جانے لگی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کو روک لیا۔ مگر اس کو کسی نے اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیا۔ وہ رات بھر باہر پڑا رہا۔ اور دوسرے دن بغیر بتائے چلا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ جانور مرتے گئے۔ اور ایک وقت یہ آگیا کہ ایک بکری بھی نہ رہی۔ گھی دودھ بازار سے آنے لگا۔ نیچے کی منزل پوری ویران ہوگئی تو والد صاحب کو بھی اندازہ ہوا کہ نیچے کچھ ہے مگر وہ کبھی وہاں نہیں گئے اور نہ ہی اوپری منزل خالی کی۔

ایک روز ایک عجیب سا آدمی ان سے ملنے آیا اور آتے ہی بولا۔

"بہت دن رہ لئے، اب چلتے پھرتے نظر آؤ۔ جتنی جلدی یہ گھر خالی کردو تمہارے حق میں اچھا ہے۔"

والد صاحب نے پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"

تو وہ بولا۔ "ہم کون ہیں یہ بات تم جانے دو تمہارے ساتھ شرافت سے پیش آرہے ہیں اس لئے کہ تم نے اب تک ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا۔ کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی، میرا خاندان بڑھ رہا ہے، اس کو جگہ کی ضرورت ہے، اسی لئے ہم نے کسی بچے کو پیدا نہیں ہونے دیا کہ کسی اور کی تعداد بڑھنے پائے۔ تمام اپنے باپ کے اکلوتے تھے اور تمہارا بھی ایک ہی لڑکا ہے۔ اس کو لے کر چلے جاؤ۔ دنیا بہت بڑی ہے اگر نہ گئے تو نقصان اٹھاؤ گے۔" اور وہ چلا گیا۔

والد صاحب نے مجھے اور والدہ کو فتح پور سیکری روانہ کردیا۔ جہاں پر والدہ کا میکہ تھا۔ مگر والد صاحب خود نہ گئے۔ حویلی میں تو کوئی تھا ہی نہیں وہ اکیلے رہتے تھے۔ ایک روز وہ وصولی کے لئے گاؤں جارہے تھے، کرائے کا تانگا تھا کوچوان جانا پہچانا آدمی تھا۔ بڑے روڈ پر آتے ہی نہ معلوم گھوڑے کو کیا ہوا کہ سرپٹ دوڑنے لگا۔ کوچوان نے اس کو روکنے کے ہر جتن کرلئے مگر وہ تیز سے تیز ہوتا گیا۔

سڑک کے دونوں طرف لوگ حیران کھڑے دیکھ رہے تھے گھوڑا تھا کہ ہوا کی طرح اڑتا چلا جارہا تھا۔ شہر سے نکل گیا اور گاؤں کی طرف چل پڑا سڑک کے گڑھوں پر تانگا اچھلتا رہا اور ایک پہیہ نکل گیا۔ ایک زور دار جھٹکا دونوں کو لگا مگر دونوں ہوشیار تھے پکڑے بیٹھے تھے، تانگا چلتا رہا مگر ٹیڑھا، چند منٹ کے بعد دوسرا پہیہ بھی نکل گیا پھر ایک جھٹکا لگا مگر گھوڑے کے اوپر تو نہ جانے کیا بلا سوار تھی، گھوڑا سرپٹ دوڑا چلا جارہا تھا اس کو شاید کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ یا شاید وہ اس قدر خوف زدہ ہوگیا تھا کہ اپنی جان بچانے کو تیزی سے دوڑا چلا جارہا تھا۔ ایک چھوٹی سی پلیا روڈ پر آگئی، اس کی کنارے کی دیواروں سے تانگہ اس بری طرح ٹکرایا کہ کوچوان اور میرے والد دور نالے میں جاگرے اور گھوڑا بھی روڈ کے کنارے بے دم ہوکر گر پڑا اور وہیں پر مرگیا۔ کوچوان شدید زخمی ہوا اور میرے والد بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔

بجنور کے منشی ٹولہ والی حویلی کی کہانی ختم ہوگئی۔ میں اور میری والدہ فتح پور سیکری میں ہی رہے، وہیں پر میری شادی ہوگئی اور والدہ بھی اللہ کے پاس روانہ ہوگئیں۔

میرے ہاں ایک لڑکی اور ایک لڑکا ہوا۔ لڑکی کی عمر 18 سال اور لڑکے کی عمر چودہ سال تھی، اس کے بعد کیا ہوا۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔

ایک دفعہ نادیدہ پراسرار دشمنوں نے برباد کیا۔ مگر انسانوں نے بھی میرے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا۔ ایک گھاؤ سینے کے اندر لئے پھر رہا ہوں مجھے نہیں پتہ میری لڑکی زندہ ہے یا مرگئی کہاں ہے کس حال میں ہے کس کے پاس ہے؟

میری یہ کہانی ایک میری نہیں ہے نہ جانے اور کتنے لوگ ہیں۔ جو اپنے پیاروں کو تلاش کررہے ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ ہر عمل قدرت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور جو عمل قدرت کی طرف سے ہو وہ انسان کی بھلائی اور بہتری کے لئے ہوتا ہے۔ انسان کو صبر کرنا چاہئے۔ اور اپنے رب سے دعا کرنا چاہئے اور اپنے ماضی کی گناہوں کی پردہ پوشی کرنا چاہئے۔ انسان اپنے گناہوں کو خود منظر عام پر لے آئے تو پھر اس کے لئے معافی کی گنجائش ختم ہوجاتی ہے۔ میری کہانی میں تم کو کوئی ڈرامائی منظر نہیں ملا ہوگا میرا والد کوئی مافوق البشر نہیں تھا وہ ایک عام بشر تھا مگر فطری طور پر ایک نڈر آدمی تھا۔ اور وہ اسی بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی وجہ سے مارا گیا۔ اس نے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا اور نہ میں نے زندگی میں کوئی ایسا کیا ہے کہ جو قابل بیان ہو، میری عزت بازار میں رل گئی میں کچھ نہ کرسکا انسان کو زندگی بہت پیاری ہوتی ہے وہ ہر حالت میں زندہ رہنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔

زندگی سے زیادہ قیمتی شے شاید اس کے لئے کوئی اور نہیں ہوتی چاہے وہ کتنے ہی برے حالات کا شکار ہو، مگر بعض مقامات ایسے آجاتے ہیں کہ زندگی کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔ اپنے پیاروں کو ڈوبتے دیکھ کر وہ لوگ بھی سمندر میں چھلانگ لگا دیتے ہیں جن کو تیرنا نہیں آتا۔ یہی جذبہ ہے جو انسان کو دوسروں کے کام کرنے پر اکساتا ہے۔ تمہارا کام میں نہیں کرسکتا کیونکہ میں خود بے بس آدمی ہوں۔ میں یا تم ہی اس دنیا میں ایسے حالات کا شکار نہیں ہیں اور بھی نہ جانے کتنے ہوں گے، مگر پہلے صرف تمہارا اکیلے کا غم تھا پریشانی تھی اب ہم تین ہیں مل کر سوچ کر اس کا حل تلاش کریں گے اور انشاء اللہ کچھ نہ کچھ بہتر حل نکل آئے گا۔" اور ادریس صاحب خاموش ہوگئے ان کے چہرے پر غم کے بادل منڈلاتے صاف نظر آرہے تھے۔

چند منٹ خاموشی رہی۔ اور پھر بیگ صاحب نے کہا۔ "آج پہلی دفعہ آپ کے گزشتہ حالات میں نے سنے ہیں۔ بہت بڑا دل ہے آپ کا ادریس صاحب۔"

"یہ بات نہیں ہے بیگ صاحب میں بھی انسان ہوں، مگر قدرت کا یہ نظام ہے کہ وہ جو غم دیتا ہے اس کو برداشت کرنے کی ہمت بھی دیتا ہے۔ دنیا میں جو غم و پریشانیاں انسان کو ملتی ہیں۔ وہ ہم قدرت کی طرف سے سمجھتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا، یہ سب ہماری ہی کرنی کا پھل ہوتا ہے۔ ہمارے باپ دادا نے جو بویا ہوتا ہے وہی ہم لوگ کاٹتے ہیں۔ جو لوگ صبر شکر کرکے ساتھ سزا پوری کرتے ہیں ان کو وہ صلہ بھی دیتا ہے۔" ادریس صاحب نے کہا۔

"بڑی خوب صورت بات کی ہے آپ نے۔" بیگ صاحب بولے۔

"اب میرے لئے کیا حکم ہے۔" میں نے کہا۔

"تم وہیں رہو جہاں ہو، تمہارا اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ اگر تم روپوش ہوگئے تو بھی وہ تم کو تلاش کرلے گی۔" ادریس صاحب نے کہا۔

"اور جو کام میں اس کے ساتھ رہ کر گناہ کے کررہا ہوں اس کے متعلق بھی بتائیں۔" میں نے کہا۔

"وہ کام نہ کرو اور جب بھی موقعہ ملے نماز پڑھ لیا کرو۔ وہ تمہارا جسم پلید رکھنا چاہتی ہے۔ مگر تم طہارت اختیار کرو، وہ ضرور محسوس کرے گی وہ تمہارا کچھ بگاڑے گی نہیں کیونکہ اس کو تم سے کام لینا ہے۔ مگر تمہاری طہارت اس کو ڈرا ضرور دے گی وہ ہوشیار ہوجائے گی مگر تم ڈرنا نہیں خطرہ مول لئے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا، تم کو یہ کرنا ہے آگے کے لئے میں راستہ تلاش کرتا ہوں۔" ادریس صاحب نے کہا۔

"ٹھیک ہے ادریس صاحب میں آپ کے طریقہ پر عمل کروں گا۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر بیگ صاحب دوسری باتیں کرتے رہے اور پھر ہم دونوں چلے آئے۔

رات کو شازیہ سے ملاقات ہوئی وہ بولی۔ ”آج کل تمہاری تفریح کے اوقات بدل رہے ہیں۔ میں پوچھ سکتی ہوں کہاں وقت گزارا جارہا ہے۔“

”میں نے تم سے کبھی پوچھا ہے۔“ میں نے کہا۔

”مجھ میں اور تم میں فرق بھی تو ہے۔“ وہ بولی۔

”تم کس فرق کی بات کررہی ہو؟“ میں نے کہا۔

”یہی کہ تم زندہ انسان ہو جوان ہو، خوب صورت ہو، صحت مند ہو، مگر ان مقامات پر نظر نہیں آتے جہاں تم کو نظر آنا چاہئے۔“ وہ بولی۔

”تمہارا مطلب ہے مجھے بار میں نظر آنا چاہئے میرے پہلو میں کوئی حسین عورت ہونی چاہئے۔ جوئے کی ٹیبل پر نظر آنا چاہئے۔ گویا ہر اس جگہ نظر آنا چاہئے جو جگہ تمہاری پسند ہو اس کے علاوہ میں کہیں اور جاؤں تو تم ناراض ہو ایسا ہی ہے نا۔“ میں نے کہا۔

”زندگی اسی کا نام ہے جوانی اسی کا نام ہے۔ تم جواب دو، جوان ہو کیا ہمیشہ رہو گے۔ جو امنگیں تمہارے اندر دب رہی ہیں دس سال کے بعد رہیں گی جو عورتیں تم پر جان نچھاور کرتی ہیں۔ وہ دور دور نظر نہیں آئیں گی، زندگی کے سارے کھیل جوانی کے بیس پچیس سال ہی کے ہیں۔ اس کے بعد تم ان دونوں کو یاد کرو گے کوئی تم کو لفٹ کرائے گی۔ کوئی تمہاری طرف نہیں بڑھے گی، تم صرف ٹھنڈی سانسیں بھرو گے اور منہ ڈھانپ کر سو جاؤ گے۔“ شازیہ نے کہا۔

”میں تمہارے بارے میں جستجو نہیں کرتا۔ تم میرے بارے میں نہ کرو، میری اپنی بھی کچھ پسند نہ پسند ہے۔ اس کا فیصلہ مجھے کرنے دو۔“ میں نے کہا۔

”تم شاید بھول رہے ہو کہ تم مجھ سے جڑے ہوئے ہو۔ میری مرضی پر تم کو چلنا ہے کیونکہ تم کو اگر کچھ ہوگیا تو میرا کام ادھورا رہ جائے گا......“ وہ بولی۔

”تم اپنے مفادات کی خاطر میرے پیروں میں بیڑیاں ڈالنا چاہتی ہو۔“ میں نے کہا۔

”میں نے یہ کب کہا۔ تم میری بات کو سمجھو، میں چاہتی ہوں کہ تم میری نظروں کے سامنے رہو، جو کرنا ہے کرو، میں کب روکتی ہوں۔ تمہاری حفاظت بھی ضروری ہے۔“

”مجھے کسی حفاظت کی ضرورت نہیں ہے، میرا دل جہاں جانے کو کرے گا جاؤں گا، تم مداخلت نہیں کرتا، مجھ کو اپنی ملکیت خیال کرتی ہو۔ اپنا محکوم خیال کرتی ہو، کیا خیال کرتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

شازیہ نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

”آج تمہارے انداز بدلے بدلے نظر آرہے ہیں۔ کیا بات ہے؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پھر بولی۔

”تم کسی بھروسے میں مت رہنا تم قاتل ہو پولیس تمہاری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔ میرا ذرا سا اشارہ تم کو جیل کے اندر پہنچا سکتا ہے۔“

”یہی آخری حربہ ہے تمہارا تو اس کو آزمالو، میں جیل جانے کو تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔

”مگر میں تم کو جیل نہیں پہنچانا چاہتی۔“ وہ بولی۔

”پھر دھمکی دینے کا مطلب کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”دھمکی نہیں میں صرف تم کو یاد دلا رہی تھی۔“ وہ بولی۔

”تم نے خود پر غور کیا ہے، تم نے کیا کچھ کیا ہے اور مجھ سے کرایا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں تمہاری دنیا کی نہیں ہوں، مجھے تمہاری کوئی عدالت سزا نہیں دے سکتی۔ وہ ہنس کر بولی۔

”ایک عدالت اور بھی ہے عالم بالا کی عدالت، تم نے اس کے بارے میں غور نہیں کیا۔“

”میرا مشن اور میری منزل اور ہے تم معمولی عقل رکھنے والے ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔“ وہ جھنجلا کر بولی۔

”تم خود کو بہت ہوشیار سمجھتی ہو، تمہاری ہوشیاری صرف ریاکاری ہے۔ مکاری ہے۔“ میں نے کہا۔

شازیہ کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھر آئی اور ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ آ گئی۔

”لگتا ہے تم ضرور غلط صحبت میں بیٹھ رہے ہو تم کو سیدھا کرنا پڑے گا۔“

”تو پھر نکالو وہی چھری اور کردو میری گردن جدا تم یہ بات یاد رکھو کہ میں نہ جیل سے ڈرتا ہوں اور نہ موت سے، تم مجھے سیدھا کرنے کے چکر میں خود سیدھی ہو جاؤ گی۔“ میں نے کہا۔

”میں تم کو پالتو کتا بنا سکتی ہوں۔“ وہ غصے سے بولی۔

”وہ کتا پھر بھی تم پر ہی بھونکے گا۔“ میں نے کہا۔

”تم آخر آج اس قسم کی باتیں کیوں کررہے ہو؟“ وہ بولی۔

”تم اپنے رویہ پر غور کرو مجھے اپنا محکوم سمجھنا اور حکم چلانا یہ کیا ہے، میں انسان ہوں اپنی مرضی کا مالک ہوں تم اپنی شکتی پر ناز مت کرو تم ابھی ادھوری ہو تم میری محتاج ہو میں تمہارا محتاج نہیں ہوں۔ اس کے باوجود تم مجھ پر حکم چلاتی ہو اب میں یہ سب برداشت نہیں کروں گا۔ کان کھول کر سن لو۔“ میں نے کہا۔

”تم واقعی بہت ناراض ہو، ہاں مجھ سے غلطی ہوگئی۔“ اس نے فوراً پینترا بدلا۔ ”دراصل جب محبت زیادہ ہو تو انسان اس کے بھروسے بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔ میں غلط فہمی میں مبتلا ہوگئی تھی کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو مجھے ناز تھا اس پر اور اس ناز ہی نے مجھ سے غلطی کروادی۔ مجھے معاف کردو۔“ وہ بولی۔

”معاف تو میں کردوں گا مگر تم کو وعدہ کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”کیسا وعدہ؟“ وہ جلدی سے بولی۔

”میں کہاں جاتا ہوں کس سے ملتا ہوں تم میری جاسوسی نہیں کروگی اور دخل نہیں دوگی۔“ میں نے کہا۔

”میں وعدہ کرتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو میں بھی اپنی مرضی کا مالک ہو جاؤں گا یہ بات یاد رکھنا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں کروں گی وعدہ خلافی۔ تم غصہ تھوک دو اور کلب چلو۔“

”میں کلب نہیں جاؤں گا تم جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”ابھی تک ناراض ہو۔“ وہ بولی۔

”نہیں کلب نہیں جاؤں گا تم جاؤ۔“ میں نے پھر کہا۔

”ایک بہت ہی اسپیشل چیز آئے گی آج کلب میں۔“ وہ بولی۔

”وہ چیز تم کھالینا۔“ میں نے کہا۔

”ارے کھانے کی چیز نہیں ہے تم چلو تو، چاروں ہاتھ پیروں سے فدا ہو جاؤ گے۔“ وہ بولی۔

”اسی لئے تو نہیں جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”بہت ضدی ہو۔“ اور وہ چلی گئی۔

ادریس صاحب کا تجربہ میرے کام آرہا تھا۔ پہلے اس نے دھمکی دی پولیس سے ڈرایا اور پھر خوشامد پر اتر آئی۔ تجربہ اور عقل انسان کے بہت بڑے ہتھیار ہیں، بشرط انسان ان کو موقع محل کے اعتبار سے استعمال کرنا جانتا ہو۔ میں نے ادریس صاحب کے تجربے اور اپنی عقل کو استعمال کیا اور اس چڑیل کو اپنی مرضی کے مطابق رام کرلیا۔ میں غسل خانے میں گیا غسل کیا اور پاک کپڑے پہن کر نکل گیا۔ ٹہلتا ٹہلتا مین روڈ پر آ گیا میرا ارادہ کسی مسجد میں جانے کا تھا مگر سڑک کے قریب کوئی مسجد نہیں تھی۔ میں دائیں جانب چل دیا۔ تھوڑا رک گیا تو ایک مسجد نظر آئی میں مسجد میں چلا گیا۔ بہت عرصہ کے بعد میں کسی مسجد میں گیا تھا۔ میرے قدم کانپ رہے تھے، میں سخت خوف زدہ تھا یہ کس کا خوف تھا، سب لوگ اپنی اپنی نمازیں پڑھ رہے تھے۔ عشاء کی جماعت میں ابھی وقت تھا۔ مجھے کیسا خوف تھا، میں اس کو کیا نام دوں کچھ خوف ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہوتا، کوئی قریب نہیں ہوتا، مگر آدمی خود بخود خوف کھاتا ہے۔

ہاں میرا ماضی مجھے خوف زدہ کررہا ہے۔ میرا ماضی مجھے ڈرا رہا ہے یہ ٹھیک ہے میرا ماضی بہت گندہ بہت خراب ہے، غلطی ساری میری تھی سارا قصور مجھے اپنا ہی نظر آتا ہے۔ دنیا میں بسنے والے ہزاروں لاکھوں

لوگ محنت کرتے ہیں، مزدوری کرتے ہیں اپنا پیٹ بھرتے ہیں، اگر میری طرح ہر شخص آسان راستوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرے تو دنیا کا نظام معطل ہوجائے۔ میں نے ایک گندہ سہارا پکڑلیا یہ جائز نہیں تھا، یہ اللہ کے بنائے ہوئے اصولوں سے انحراف تھا۔ میں قبول کرتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ میں اس انحراف کی سزا کے لئے خود کو پیش کرتا ہوں۔

جماعت کھڑی ہوگئی میں بھی شریک ہوگیا اور نماز پڑھنے لگا۔ بہت جگہ غلطی کی بہت عرصہ کے بعد نماز پڑھ رہا تھا، کیا پڑھنا ہے بھول گیا تھا۔ شرمندہ ہوتا رہا مگر رب کائنات سے مایوس نہیں تھا۔ وہ میری کیفیت کو جانتا ہے وہ سب کچھ جانتا ہے نماز ختم ہوگئی اور نماز کس طرح پڑھوں۔ سب لوگ بقیہ نمازیں پڑھنے لگے۔ میں نے دو رکعت کی نیت کی اور کھڑا ہوگیا۔

آخری سجدے میں کب تک پڑا رہا پتہ نہیں۔ ایک نورانی چہرے والے بزرگ میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے سلام پھیرا اور بیٹھ گیا۔ مسجد خالی ہوگئی تھی سب نمازی جاچکے تھے صرف ہم دونوں بیٹھے تھے۔ وہ نورانی داڑھی اور چہرے والے بزرگ بولے۔

”بہت دکھی نظر آرہے ہو۔ بتاؤ کیا پریشانی ہے؟“

”میں کیا کیا بتاؤں۔ ایک پریشانی نہیں ہے، یہ دکھ میرے ہیں، میرے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ ان کو صرف خدا ہی دور کرسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بے شک تم نے ٹھیک کہا، مگر اللہ بھی وسیلہ پیدا کرتا ہے، تم بے وسیلہ اس تک نہیں جاسکتے۔ تم بغیر زینے کے ایک منزل نہیں چڑھ سکتے۔ زینہ اوپر جانے کا وسیلہ ہوتا ہے۔ میری بات کو سمجھ رہے ہو؟“ وہ بولے۔

”جی ہاں میں بہت بھٹکا ہوا آدمی ہوں مگر کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اللہ کی ذات سے مایوسی ٹھیک نہیں ہوتی، وہ اپنے بندے کے لئے جو کرتا ہے وہ اس کی بھلائی کے لئے کرتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ انسان فطری طور پر بے صبرا ہے وہ فوراً بھلائی چاہتا ہے اس کا نقصان اور فائدہ وہ نہیں سمجھتا مگر اللہ سب کچھ جانتا ہے میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں بتاؤ۔“ وہ بولے۔

”آپ مہربان آدمی ہیں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میرے حق میں دعا فرمادیں یہی میرے لئے بہت ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم میرے بچوں کی عمر کے ہو، میں نہیں جانتا کہ تمہاری پریشانی کیا ہے۔ مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ تم جس مقام پر آگئے ہو یہی وہ مقام ہے جہاں ساری پریشانیاں دور ہوتی ہیں۔ تم نے جو غلطیاں کی ہیں ان کی صدق دل سے معافی مانگ لو اور توبہ کرلو۔ جو توبہ کرنے والا ہوتا ہے اللہ اس کی توبہ ضرور قبول کرتا ہے۔ میں قریب ہی رہتا ہوں اور یہیں پر نماز پڑھتا ہوں۔ میں ہر نماز میں تم کو ملوں گا، میری خدمت کی ضرورت تم کو ہو تو ضرور بیان کرنا۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔“

اور وہ صاحب اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں بھی مسجد سے نکل آیا۔

ماضی کے نشیب و فراز ایک فلم کی طرح میرے پردہ تصور پر نمودار ہوئے اور پھر اوجھل ہوگئے اور گھر پہنچ گیا۔ شازیہ میرا انتظار کررہی تھی، اس کی گھنی پلکیں رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں، یاقوتی ہونٹوں پر ایک ہلکی سی توبہ شکن مسکراہٹ تھی اور بازو لاپرواہی سے پھیلے ہوئے صوفے پر پڑے تھے۔ آج اس کے انداز ہی مختلف تھے۔ روز سے زیادہ حسین نظر آرہی تھی۔ میں شاید چند روز پہلے والا شاہنواز ہوتا تو اس کے اس جال میں ضرور پھنس جاتا۔

”آؤ کہاں گھوم آئے۔“ وہ اپنی آواز میں شیرینی بھر کر بولی۔

”کیا کروں پڑے پڑے تھک جاتا ہوں تو روڈ پر چہل قدمی کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”پرانے دوستوں کے پاس جایا کرو۔“ وہ بولی۔

”دوستی محبت اب دنیا میں کہاں رہی، دوستی کی برکتیں اب ختم ہوگئی ہیں اور دشمن نفرت کے مکروہ نقاب اوڑھ کر ایک دوسرے کو قتل کررہے ہیں۔ اوپر سے دوستی کا نقاب اور اندر دشمنی یہ ہے آج کا انسان۔ میں نے ان پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”زندہ انسانوں کا یہی حال ہے۔ مگر میں زندہ نہیں ہوں اس لئے تمہاری بات میرے اوپر نہیں آئی۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”میں نے تم سے کبھی بھی نہیں ہے۔ میں جنرل بات کررہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”میں تو صرف محض ایک سایہ ہوں۔“ وہ بولی۔

”اور سایہ بھی وہ جو حقیقت کا دشمن ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم مجھ پر طنز کررہے ہو۔“ وہ بولی۔

”طنز وہ ہوتا ہے جو حقیقت نہ ہو۔ میں تو حقیقت بیان کررہا ہوں۔“

”پھر اکھڑی اکھڑی باتیں کررہے ہو، میں محبت کی باتیں کرنے کے موڈ میں تھی۔“ وہ بولی۔

”محبت کی باتیں سائے سے نہیں ہوتیں تم نے خود تسلیم کیا ہے کہ تم سایہ ہو۔“ میں نے جواب دیا۔

”کچھ ہو نہ ہو باتیں تو ہوسکتی ہیں۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔

”صرف باتیں کرنے سے پیٹ نہیں بھرتا۔ پیٹ کے لئے ٹھوس غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔“ اور میں اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلا۔

”تم بیٹھو میں لاتی ہوں۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”آج کیا بات بڑی خاطر کررہی ہو؟“ میں نے کہا۔

”کبھی کبھی تابعداری کرنے کو دل کرتا ہے آخر ہوں نا عورت، ہر عورت کے اندر خدمت کا جذبہ ہوتا ہے آج وہی عورت باہر آگئی۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”میں کچھ اور سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تمہارے دل میں بدگمانی نے گھر کرلیا ہے۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”تمہاری محبت اور خدمت گزاری کا جذبہ اتنے دنوں کہاں باہر نہیں آیا اور اب اچانک باہر آگیا۔ میرے لئے یہ بات حیرت کی تو ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں تم سے محبت کرتی ہوں یہ تو تم کو پتہ ہے میں تمہارے کسی کام نہ آسکی اور مرگئی، یہ میری قسمت کی بات تھی مگر میری روح اب تک تم کو چاہتی ہے۔“ وہ بولی۔

”اور وہ جذبہ ملکیت تھا وہ کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ میری مجبوری ہے۔ تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ مجھے منزل کے قریب پہنچادیا ہے۔ میں تمہارا احسان مانتی ہوں اور جب تک دنیا میں رہوں گی احسان مند رہوں گی۔“ شازیہ نے کہا۔

”تم مجھے یہ بتاؤ تم دنیا میں رہنا کیوں چاہتی ہو؟ تمہارے نصیب میں جتنی زندگی تھی وہ تم نے دنیا میں گزار لی۔ تم نے خود اپنی زندگی ختم کرلی، صرف روح کی شکل میں تم نے اپنے دشمنوں کو بھی ختم کرلیا۔ پھر تمہارا دنیا میں رہنے کا جواز کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے جو زندگی گزاری وہ لاچاری کی زندگی تھی میری مرضی کی زندگی نہیں تھی۔ پیدا ہونے کے بعد میں نے صرف دکھ ہی دیکھے تھے۔ میرے قریب کے عزیز باپ چچا تک میرے دشمن تھے۔ میری زندگی میں سوائے ہوسناکی اور مطلب پرستی کے کچھ نہیں تھا۔ میں نے سخت مایوسی کے عالم میں خود کو ختم کیا تھا اور یہ عہد کیا تھا کہ سب ظالموں سے انتقام لوں گی ابھی بہت باقی ہیں۔ میں ان سب سے انتقام لوں گی۔“ شازیہ نے غصہ سے کہا۔

”مگر اب تم شاید انتقام نہ لے سکو، کیونکہ تم جس کو انتقام کہہ رہی ہو، وہ انسانیت پر ظلم ہے۔“ میں یہ ظلم تم کو نہیں کرنے دوں گا۔“ میں نے کہا۔

”تم مجھے کس طرح روکو گے، میں نے بہت کچھ پالیا ہے۔“ وہ بولی۔

”وہ تمہارے کسی کام نہیں آئے گا...... میں اب تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔“

”تم ایک پالتو کتے کی طرح میرے ساتھ پھرو گے...... میں تمہیں دنیا میں عبرت ناک سزا سے دوچار کردوں گی۔“ وہ غیض و غضب کے انداز میں بولی۔

(جاری ہے)

پراسرار محبت

راجہ باسط مظہر۔حامد جھنگی

تابوت کا جب ڈھکن کھلا تو دیکھنے والے انگشت بدنداں ہوگئے کیونکہ تابوت میں ایک بہت ہی خستہ حال اور بوسیدہ ڈھانچہ موجود تھا کہ پھر اچانک اس ڈھانچے کی دونوں آنکھیں روشن ہوگئیں لیکن پھر......

صدیوں پرانی چاہت وخلوص کی عجیب دل گرفتہ خوف کے لبادے میں لپٹی کہانی

''**ساحل** بیٹا اب اٹھ جاؤ صبح کے دس بج رہے ہیں، آج کالج بھی نہیں گئی اور اب اٹھنے کا نام بھی نہیں لے رہی، اٹھ جاؤ۔'' میری امی مجھے کافی دیر سے آوازیں دے کر جگا رہی تھیں جب امی آواز دیتے ہوئے آتیں تو میں اٹھ جاتی اور ان کے جانے کے بعد دوبارہ سو جاتی پھر ایسا ہوا کہ میں امی کی آوازوں سے تنگ آتے ہوئے اٹھ گئی، منہ دھویا، کپڑے بدلے اور آ کر ٹی وی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی امی سامنے بیٹھے مجھے مسلسل گھور رہی تھیں۔

میں نے امی کو پیار سے کہا۔ ''ماما! آپ جانتی ہیں ناں، میرا کالج جانے کو دل نہیں کرتا تو میں نہیں جاتی، پلیز...... ماما! سمجھنے کی کوشش کریں۔''

میں بچپن سے بھرپور لاڈ پیار میں بڑی ہوئی میرے والدین بہت ہی امیر کبیر تھے۔ میں شکل وصورت اور خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ مجھے اگر کوئی ایک بار دیکھتا تو دوبارہ مڑ کر ضرور دیکھنا چاہتا۔

ابو تو بچپن میں ہی فوت ہوگئے سارا بزنس میری امی اور ماموں مل کر سنبھالتے، میرے ماموں ہمیشہ سے ہی اپنی شادی کے خلاف تھے اور اپنی زندگی اکیلے ہی گزارنا مناسب سمجھتے تھے۔

ویسے میں کافی بدتمیز اور ضدی بھی ہوگئی تھی ہمیشہ اپنے پیسے اپنی دوستوں پر خرچ کرتی تھی۔

اس روز میں نے ناشتہ کیا اور اپنی دوست منزل سے فون پر بات کرنے لگی اور پھر فون پر بات کرتے کرتے جب بور ہونے لگی تو میں نے فون کریڈل پر پٹخا اور اپنے کمرے میں چلی گئی، میری امی ان میری حرکتوں سے تنگ آ چکی تھیں۔ امی اکثر میری وجہ سے کچھ لیٹ آفس جاتی تھیں۔ لیکن آج وہ کچھ زیادہ ہی لیٹ ہو چکی تھیں، صرف میری وجہ سے......!

پھر جیسے ہی مجھے پتہ چلا کہ امی آفس چلی گئی ہیں تو میں بہت خوش ہوئی اور میں نے گھر میں اپنے تمام فرینڈز کو بلا لیا، انگلش گانوں کی آواز پورے گھر میں گونجنے لگی، دوستوں کے ساتھ شام کے چھ بج گئے اور میں اپنی مستی بھری دنیا میں گم تھی۔

اچانک باہر دروازے کی بیل بجی تو سب ایک دم سے چونک گئے لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوئی بلکہ میں اپنی ہی دھن میں مگن گانوں کو سن رہی تھی۔ ''سلامو'' جو کہ ہمارے گھر میں نوکر تھا اس نے دروازہ کھولا اور زور سے بلند آواز میں بولا۔

''بڑی مالکن......! آپ۔''

''ہاں...... میں۔ کیوں میں اپنے گھر میں نہیں آ سکتی کیا......؟''

امی غصے سے بولیں۔ اور اچانک جب میں نے امی کی آواز سنی تو دوستوں کو جانے کا اشارہ کیا، دوستوں کے باہر جاتے ہی امی نے میری طرف دیکھا تو میں اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''ماما! سوری، میں بور ہو رہی تھی اس لئے دوستوں کو گھر پر بلا لیا۔''

''ماما نے ہمیشہ کی طرح ''Its ok'' کہتے ہوئے اپنے گلے سے لگا لیا۔ خیر ہم دونوں ماں بیٹی نے رات کا کھانا کھایا اور میں اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی اور بیڈ پر لیٹنے کے ساتھ ہی آنکھیں بند کر لیں اور پھر نیند کی وادی میں گم ہوگئی۔

لیکن پھر کچھ دیر بعد مجھے وہی آواز سنائی دینا شروع ہوگئی، وہ آواز میں ٹھیک رات کے بارہ بجے مجھ کو سنائی دیتی تھی اور آج اس تسلسل کا تیسرا ہفتہ تھا۔

میں برق رفتاری سے بیڈ سے اٹھی، میں اس آواز کے راز کو پا لینے کے لئے بے چین تھی اور سر توڑ کوشش کے باوجود اس میں کامیابی حاصل نہیں کر پائی تھی اور میں اسی وجہ سے ٹینشن میں رہنے لگی تھی اور کالج بھی نہیں جا رہی تھی حالانکہ میرا کالج میں آخری سال تھا پھر میں نے یونیورسٹی میں داخل ہو جانا تھا۔

میں نے ہمت کا دامن نہ چھوڑا، وہ آواز کسی کے سانسوں کی آتی تھی، میں ان سانسوں کی آواز سن کر اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھی جہاں سے باہر کا نظارہ صاف طور پر کیا جا سکتا تھا۔

میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر دیکھا، باہر ہر سو چاند کی روشنی پھیلی تھی، آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا میں چاند کی چاندنی میں اس قدر کھو چکی تھی کہ مجھے اپنے ارد گرد کا ہوش نہ رہا تھا اور پھر میرے قدم خود بخود باہر کے لئے اٹھنے لگے۔

میں جب باہر نکلی تو وہ منظر اور بھی اچھا لگنے لگا، چاندنی میں نہاتی ہوئی فضا، پیڑ، بیل بوٹے بڑے بھلے لگ رہے تھے درخت اور پھول پتے ایک نئی بہار دکھلا رہے تھے، میں اسی منظر کو دیکھتے دیکھتے کافی دور نکل آئی اور پھر پودوں کے قریب پڑے ہوئے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئی اور یہی سوچتی رہی کہ۔ ''آخر یہ مجھے سانسوں کی آوازیں کیوں سنائی دیتی ہیں؟ آخر...... یہ سب...... کیا یہ میرا وہم ہے؟ یا...... پھر......'' یہ سوچتے ہوئے میں ڈر سی گئی لیکن پھر بھی میں ان سب سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی اور پھر میں گھر میں واپس آ گئی۔

صبح ہوتے ہی میں نے ماما سے کہا ''میں کچھ دنوں کے لئے کالج سے چھٹیاں لے کر کہیں دور جانا چاہتی ہوں۔''

ماما نے حیرانگی سے پوچھا۔ ''کیوں بیٹا! خیریت تو ہے ناں؟''

''اوہ ماما! آپ بھی ناں، پلیز! مجھے فارم ہاؤس پر جانے دیں۔''

ماما نے کہا۔ ''چلی جاؤ۔ ماما ہر وقت کام میں

مصروف رہتیں اور وہ میری ضرورتوں کو کبھی سمجھ نہیں پاتی تھیں۔ میں نے اپنا ضروری سامان سلامو سے پیک کرایا اور اپنی گاڑی لے کر اکیلی ہی فارم ہاؤس پر چلی گئی۔ فارم ہاؤس میرے گھر سے دو گھنٹے کی دوری پر تھا۔ میں فارم ہاؤس پہنچ گئی، یہاں پر گھومنے پھرنے کے علاوہ دیگر تمام سہولتیں بھی موجود تھیں۔ پہلے جب میں کئی مرتبہ آئی تھی تو اپنے دوستوں کے ساتھ یا پھر امی کے ساتھ آئی تھی لیکن آج میں اکیلی یہاں آئی تھی میں نے کمرے میں اپنا سامان سیٹ کیا، کچھ دیر آرام کرنے کے بعد باہر چہل قدمی کے لئے نکل پڑی۔

اچانک دور سے میں نے سلامو کو آتے ہوئے دیکھا۔ ”سلامو قریب آ گیا تو میں نے پوچھا۔ ”تم کیوں آئے ہو؟“

وہ بولا۔ ”چھوٹی مالکن مجھے بڑی مالکن نے بھیجا ہے تاکہ میں آپ کی دیکھ بھال کرسکوں، تنہا جگہ اور آپ اکیلی ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے زیادہ باتیں نہ کرو اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ میں نے کہا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی کہ اچانک دور سے آتی ہوئی سانسوں کی آوازیں پھر مجھے سنائی دیں، بالکل ویسی ہی آوازیں جو گزشتہ کئی دنوں سے رات کے سناٹے میں میری سماعت سے ٹکرا کر میرے دماغ میں ہلچل پیدا کر دیتی تھیں، میں فوراً بستر سے اٹھی اور کھڑکی کے پٹ کھول کر کھڑی ہوگئی تو میری نگاہ درختوں کے جھنڈ کی طرف گئی اس لئے کہ وہ آوازیں اسی جانب سے سنائی دے رہی تھیں۔ پھر یہ ہوا کہ وہ آوازیں رفتہ رفتہ میرے قریب تر ہوتی گئیں۔

فارم ہاؤس کی خاموشی اور پرکیف فضا رومان پرور چاندنی رات میں اب وہ آواز بہت سحر انگیز ہوگئی تھی پھر آواز سنائی دی۔ ”مناحل تو باہمت اور بہت بہادر ہے۔“

اس آواز کو سنتے ہی میری ہمت جواب دے گئی اور جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی، دہشت کے مارے میرا دل بری طرح اندر ہی اندر دہلنے لگا، پھر مجھے خیال آیا کہ ”یہ آواز یقیناً کسی بدروح کی ہے۔“

کیونکہ بچپن میں میری نانی درختوں کے نزدیک جانے اور بال کھول کر درختوں کے سائے میں بیٹھنے سے منع کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ”درخت پر بدروحوں کا سایہ ہوتا ہے اور بدروحیں انسان کا خون پی لیتی ہیں۔“

مجھ پر جیسے سکتہ طاری ہو چکا تھا میرے قدم ڈگمگا رہے تھے، میں اپنے کمرے میں کس طرح پہنچی مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ میں بری طرح پریشان تھی کہ ”آخر کیا کروں، کس کے پاس جاؤں، پتا نہیں کوئی میری بات پر اعتبار کرے گا بھی کہ نہیں“ طرح طرح کے خیالات میرے دل میں آ رہے تھے اور پھر جانے کب میں نیند کی وادی میں گم ہوگئی۔

پھر مجھے نظر آیا کہ میں کسی صحرا میں موجود ہوں۔ ہر طرف ریت ہی ریت ہے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کروں تو کیا کروں، خیر تھوڑی دیر بعد میں آگے بڑھی، ابھی چند قدم کا فاصلہ طے ہی کیا تھا کہ میرے سامنے ایک عالی شان محل نظر آیا، ہر طرف ریت ہی ریت اور ایسے میں عالی شان محل جسے دیکھ کر میں اچنبھے میں پڑ گئی۔ محل میں یا محل کے اردگرد کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں آگے بڑھی اور محل کے صدر دروازے کے قریب کھڑے ہو کر دیدے پھاڑے دیکھتی جا رہی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں یہ سب کیا ہے؟ میں نے جیسے ہی دروازے کو چھوا تو ایک دم سے مجھے ہوش آ گیا اور میں ہڑبڑا کر بیدار ہوگئی، میں اپنے بستر پر پسینے میں مکمل طور پر شرابور تھی، میری متلاشی نگاہیں کمرے میں چاروں طرف پھرنے لگیں مگر کچھ بھی تو نہیں تھا۔“

”او...... خدایا اتنا عجیب و غریب خواب......“

میں اٹھی اور کچن میں جا کر ایک ہی سانس میں پانی کے دو گلاس غٹا غٹ پی گئی اور دوبارہ بستر پر دراز ہوگئی گھڑی کی طرف نگاہ اٹھائی تو رات کے دو بج رہے تھے اب نیند مجھ سے کوسوں دور جا چکی تھی مگر میں پھر بھی سونے کی

ناکام کوشش کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ”آج رات سانسوں کی آواز...... گھنگھروؤں کی آواز...... نہیں آئی۔ یہ خواب فرضی تھا...... یا پھر...... میرا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟“

بہرحال صبح تقریباً ساڑھے دس بجے کے قریب سلامو کے جگانے پر میں بیدار ہوئی، فریش ہونے کے بعد ناشتہ میں صرف کافی لی۔

رات والا خواب ابھی تک میرے ذہن پر مسلط تھا، لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس عظیم محل کو میں نہیں بھلا پائی تھی، میں دوسرے کمرے میں گئی اور اپنی بیسٹ فرینڈ ”منزل“ کو کال کر کے فارم ہاؤس پر بلا لیا تاکہ یہاں سے اکٹھے کہیں گھومنے چلیں تقریباً دو گھنٹے بعد منزل میرے پاس موجود تھی۔

”مناحل کیسی ہو؟ اور پھر آج کدھر کا پروگرام ہے؟ شاپنگ کے لئے چلیں کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں! کیونکہ آج میرا دل بہت پریشان ہے۔“ میں نے اداسی اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات میں منزل کو جواب دیا۔

منزل نے جواباً مسکرا کر کہا۔ ”کیوں کیا ہوا میری جان......؟ میں تمہاری جان از عزیز دوست ہوں مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو، کھل کر بتاؤ، آخر ماجرہ کیا ہے؟“

میں نے سارا قصہ اس کے گوش گزار کر دیا، پہلے تو وہ بہت حیران ہوئی کہ شاید میں اس سے مذاق کر رہی ہوں لیکن جب میں نے اسے مکمل طور پر یقین دلایا کہ یہ سب سچ ہے تو اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دکھائی دینے لگے۔

میں نے کہا۔ ”منزل، پلیز......! آج رات میرے پاس ہی رک جاؤ، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پلیز!“

خیر وہ مان گئی اور گھر کال کر کے بتا دیا کہ وہ آج رات میرے پاس فارم ہاؤس پر ہے۔ ہم دونوں کمرے سے باہر نکل کر ادھر ادھر چہل قدمی کرنے لگیں۔ چلتے چلتے ہم فارم ہاؤس کے آخری سرے تک آ پہنچے تو میری نظر اس کمرے کی طرف اٹھ گئی جو ”پاپا“ کا تھا، پاپا جب بھی فارم ہاؤس آتے اپنا زیادہ ٹائم اسی کمرے میں گزارتے تھے، وہ کمرہ الگ تھلگ تمام کمروں سے کافی فاصلے پر تھا۔ اور جب بھی میں اس کمرے میں جاتی تو پاپا مجھے منع کرتے تھے۔ اس وقت میں چھوٹی تھی لیکن اب پاپا کو اس دنیا سے گئے ہوئے بارہ سال گزر چکے تھے۔ کمرے کا تالہ بہت پرانا اور دروازہ بھی بوسیدہ تھا، میں اور ماما جب بھی یہاں آتیں ماما فارم ہاؤس کے اس حصے کی طرف مجھے نہیں جانے دیتی تھیں میں نے منزل سے کہا۔

”یہ کمرہ میرے پاپا کا تھا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تک میں اس کمرے میں نہیں گئی، چلو! آج اسے دیکھ ہی لیتے ہیں۔“ میں نے سلامو کو آواز دی۔

”سلامو...... ذرا ادھر آؤ۔ جلدی!“

سلامو دوڑتے ہوئے آیا۔ ”جی چھوٹی مالکن...... کیا حکم ہے میرے لئے؟“

”سلامو ذرا اس کمرے کے تالے کی چابی تو لے آؤ۔“ میں نے کہا تو سلامو کے چہرے پر پریشانی اور حیرت کے آثار نمایاں طور پر دکھائی دینے لگے تھے۔

”بی بی جی...... اس کمرے کی چابی تو ”بڑی مالکن کے پاس ہے۔“

”بڑی مالکن کے پاس کیوں؟ باقی چابیاں تو میرے پاس ہیں، صرف اس کمرے کی چابی ماما کے پاس...... کیا بات ہوئی بھلا ماما نے صرف اس کمرے کی چابی کو کیوں پاس رکھا ہوا ہے؟ سلامو اس تالے کو توڑ دو۔ مجھے کمرے کے اندر جانا ہے اور ویسے بھی ہم دونوں کل صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

میری بات سن کر سلامو نے سر جھکا کر کہا۔ ”جو حکم، چھوٹی مالکن......“ تھوڑی دیر میں سلامو نے تالا توڑ دیا تو میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا کمرے کی حالت شکستہ ہو چکی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ پاپا کے جانے کے بعد دوبارہ اس کمرے میں نہ کوئی آیا اور نہ ہی اس کمرے کی صفائی ہوسکی۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ پاپا کو پرانی چیزوں اور عجائبات سے لگاؤ تھا مگر اتنا جنون کی حد تک لگاؤ یہ میں نہیں جانتی تھی ہر طرف مختلف تاریخی کی کتابیں اور کمرے کے ایک طرف بہت سارے نوادرات پڑے تھے، جب میرا رخ بائیں جانب کے کونے کی طرف ہوا تو میں چونک گئی، بائیں کونے میں ایک عجیب وغریب تابوت پڑا ہوا تھا جس پر نہ جانے کس زبان میں الفاظ تحریر تھے جو کہ میری سمجھ سے بالاتر تھے، خیر میں کتابوں کو الٹا پلٹا کر دیکھنے لگی، جن میں پاپا کی ڈائری بھی تھی، پاپا یہ ڈائری ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے انہیں شروع سے ہی مختلف قسم کی تاریخی چیزوں پر کام کرنے کا بڑا شوق تھا اور وہ اپنے اس شوق پر کروڑوں روپے خرچ کر دیتے تھے۔

میں نے وہ ڈائری اٹھالی، منزل میرے ساتھ ہر چیز کو بڑے غور سے ہونقوں کی طرح دیکھے جارہی تھی، پھر اچانک بولی...... "مناحل مجھے تو اس عجیب وغریب کمرے سے ڈر لگ رہا ہے...... چلو چلتے ہیں۔"

"ویسے یہ تابوت کس قسم کا ہے؟" میں نے کہا۔ "چلو کھول کر دیکھتے ہیں۔"

تابوت کا ڈھکن کافی بھاری تھا چنانچہ ہم دونوں نے مل کر زور لگایا تو وہ کھل گیا، تو اچانک ہماری تو چیخیں نکل گئیں، تابوت کے اندر کسی پرانی لاش کا ڈھانچہ پڑا تھا۔

میں نے فوراً تابوت کے ڈھکن کو نیچے کی جانب دھکیل دیا اور وہ دھم کی آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔

ہم دونوں کے دل اتنی تیز دھڑک رہے تھے کہ ان کی آواز صاف ہمارے کانوں میں پہنچ رہی تھی، منزل نے تیزی سے میرا بازو پکڑا اور باہر نکل گئی۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کردیا ہم دونوں کافی ڈر چکی تھیں اس ڈھانچے اور تابوت کو دیکھ کر۔ مجھے اپنے اندر بہت بے چینی محسوس ہورہی تھی۔

منزل نے کہا۔ "جو ہوا اسے بھول جاؤ، ویسے بھی وہ ڈھانچہ تھا۔ تمہارے پاپا کو لگتا ہے مصریات وغیرہ سے بھی دلچسپی رہی ہوگی اور اسی سلسلہ کا یہ پرانا تابوت ہو سکتا ہے۔"

"خیر چھوڑو! چلو باہر چلتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو منزل بھی مسکرا دی اور ہم گاڑی لے کر ایک پارک میں چلے گئے جو کہ حکومت کی جانب سے صرف خواتین کے لئے مخصوص تھا۔

کچھ دیر وہاں پر رہ کر ہمیں کافی سکون ملا، اس کے بعد ہم سیدھے شاپنگ سینٹر گئے اور پھر شام کو فارم ہاؤس واپس آگئے۔ زوروں کی بھوک لگی تھی اور اوپر سے سلامو نے "سندھی بریانی" پکائی تھی۔ ہم دونوں نے کھانا ڈٹ کر کھایا، پھر کافی پی اور کمرے میں آگئے، ایک رومانٹک موی دیکھی اور بستروں پر دراز ہوگئے۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے گال کو چھوا ہو، میں اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اسے اپنا وہم قرار دے کر دوبارہ سوگئی اور نیند کی وادی میں گم ہوگئی۔ مجھے نظر آیا۔

میں کسی صحرا میں تھی ہر طرف ریت ہی ریت تھی اور سامنے وہ عظیم، عالی شان محل تھا۔ پھر مجھے یاد آیا۔ "ہاں یہ محل...... یہ محل...... میں نے اس محل کی فوٹو پاپا کے کمرے میں دیکھی تھی۔" پورے ماحول پر ایک عجیب سی نحوست چھائی ہوئی تھی، میں نے محل کا دروازہ اندر کی طرف دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر بڑے، بڑے کمرے تھے جن کے دروازے عجیب طرح کے تھے، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے بدی کی ساری قوتیں فضا میں منڈلا رہی ہوں۔

اچانک میں نے اپنے عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور میں اچھل پڑی۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ میں حیرانی سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ پھر اچانک ہی میرے منہ سے ایک وحشت زدہ سی آواز نکلی۔ "ہاں...... ہاں...... سب کچھ ختم ہوگیا ہے، مندر، مینار، راج محل، آدمی، عورتیں، دیوتا۔ سب مٹ گئے ہیں۔ دیکھو! کیسی ویرانی ہے چاروں طرف۔ سب خاک میں مل گئے۔ کسی کا نام ونشان نہیں۔"

اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے سامنے آیا ہو اور پھر میں حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ میں خود تھی، لیکن لباس مختلف تھا۔ البتہ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا۔

"اوہ...... تم...... تم نہیں...... میں ہوں۔ سمجھیں......؟ تم...... تم نہیں میں ہوں...... صرف میں اور میں...... میں نہیں...... تم ہو۔ میری بات غور سے سنو۔ تمہیں آنا ہے۔ تمہیں وہاں آنا ہے۔ جہاں میں ہوں۔ میں تم سے ملوں گی۔"

خوف سے میرے پورے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ میں جیسے ہوش میں آگئی تھی، اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، میں اپنے بستر پر تھی، ادھر دیکھا، اپنے بستر پر منزل خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔ گھبراہٹ مجھ پر طاری تھی۔

میں کمرے سے باہر آگئی۔ "کیا ہے یہ سب کچھ...... کیا ہو رہا ہے؟" غرض یہ کہ میں بہت دیر تک ادھر ادھر گھومتی رہی پھر اس کے بعد اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ لیکن مجھ پر ایک عجیب سا خوف طاری تھا۔

دوسری صبح معمول کے مطابق تھی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن میرے وجود میں کوئی انوکھی بات سرائیت کر گئی تھی۔

میں نے رات والی بات منزل کو بتائی تو منزل نے مذاق میں کہا۔ "مناحل...... تم تو خواب کے شکنجے میں جکڑ چکی ہو، یہ سب تمہارا وہم ہے۔ کل ہم تمہارے پاپا کے کمرے میں گئے تھے۔ اسی خوف کی وجہ سے اور انکا سے ملتے جلتے خواب تمہیں نظر آرہے ہیں، تم تمام باتوں کو بھول جاؤ۔"

"نہیں منزل! کچھ تو ہے، تم میرے ساتھ دوبارہ پاپا کے کمرے میں چلو، پلیز تم انکار نہ کرو۔" میں نے کہا۔

"اوکے بابا! چلو چلتے ہیں اور ہاں! اب کی بار بالکل بھی نہیں ڈریں گے۔ ویسے بھی پتا نہیں وہ ڈھانچہ کتنے سو سال پرانا، لیکن مجھے تو لگتا ہے ہزاروں سال پرانا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا؟" میں نے منزل سے پوچھا۔

"ارے بھئی...... تم نے وہ تابوت نہیں دیکھا اور اس پر لکھی ہوئی وہ عبارت نہیں پڑھی، ایسا لگتا ہے جیسے پتا نہیں کتنی صدیوں پرانی ہے، میں نے تو آج تک ایسی لکڑی کا تابوت نہیں دیکھا۔"

ہم کمرے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ پھر آگے بڑھ کر میں نے دروازہ کھولا، اندر داخل ہوئے، ہم دونوں نے تابوت کے پاس جا کر تابوت کا ڈھکن کھول دیا، تابوت میں وہی سڑا بھسا ڈھانچہ لیٹا تھا۔ اس بار ہم دونوں بالکل بھی نہیں ڈرے۔

لیکن اچانک ڈھانچے میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کی آنکھیں روشن ہوگئیں، آنکھوں سے نکلتی ہوئی روشنی سیدھی میرے ماتھے پر پڑ رہی تھی۔

منزل نے جیسے ہی یہ منظر دیکھا تو فوراً تابوت کا ڈھکن بند کردیا اور بولی۔ "مناحل یہ کیا ہوا، کیا ڈھانچہ زندہ ہوگیا......؟"

لیکن میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا تھا۔ منزل مجھے سنبھالنے لگی۔ اور میں اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

ایک بار پھر میں اسی دنیا میں موجود تھی۔ محل میں عجیب وغریب قسم کے لوگ گھوم رہے تھے جن کے لباس بہت مختلف تھے۔ وہ سب ایک بڑے کمرے میں داخل ہو رہے تھے، جو ہال نما تھا۔ کمرے میں بیش بہا قیمتی ہیروں اور نگینوں سے سجاوٹ کی گئی تھی اور فرنیچر عجیب مگر باکمال تھا۔ سامنے ایک بہت عالی شان تخت تھا۔ جس پر مضبوط قد وقامت کا ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ نوجوان کے سر پر قیمتی ہیروں سے مزین تاج تھا۔ تمام لوگ اسے سجدہ کر رہے تھے اور بلند آواز میں کہہ رہے تھے۔ "فرعون" سورج اور چاند کا ہمارا خدا ہے۔" ہمارا خدا مہان ہے۔"

پھر اس فرعون نامی نوجوان نے تالی بجائی اور تمام لوگ دائیں بائیں موجود کرسیوں پر بیٹھنے لگے، ان لوگوں میں، میں بھی موجود تھی۔ میں بائیں سمت کی سامنے والی نشست پر بیٹھی تھی۔ فرعون کے سامنے دو کڑیل جوان

آئے اور آتے ہی سجدہ کیا، ایک کا نام "الکلوس" اور دوسرے کا "قابوس" تھا۔ فرعون نے حکم صادر کیا "تم دونوں میں جو جیتے گا وہی "الکوینہ" سے شادی کرے گا۔" فرعون کی انگلی میری طرف تھی مگر میرے جذبات الکلوس سے وابستہ تھے، میں الکلوس سے محبت کرتی تھی۔

دونوں کے درمیان، محبت کو پالینے کی جنگ شروع ہوچکی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے قابوس نے الکلوس کو زیر کردیا اور فرعون کے حکم کے مطابق الکلوس کی گردن توڑ کر قابوس نے اسے زندگی سے رہائی دلادی۔ جیسے ہی الکلوس کی روح قفس عنصری سے پرواز ہوئی، میں تو وہاں زندہ لاش بن چکی تھی جبکہ فرعون حکم فرمارہا تھا "الکوینہ" قابوس کی ہوئی۔"

"قابوس مجھے فاتحانہ اور خونخوار نظروں سے گھورے جارہا تھا۔ میں اسی لمحے بول پڑی۔ "نہیں...... ہم قابوس سے شادی نہیں کریں گے۔" میری بات سن کر فرعون غصے سے چلا اٹھا۔ "ہر حال میں تمہاری شادی قابو س سے ہی ہوگی۔"

میں فوراً وہاں سے بھاگ کر اوپر کے زینے چڑھنے لگی۔ ادھر فرعون نے سپاہیوں کو مجھے پکڑنے کا حکم دے دیا، سپاہی میرے پیچھے آرہے تھے، لیکن میں ان کے پہنچنے سے پہلے ہی زینے چڑھ کر اوپر کی منزل کی چھت پر موجود تھی۔ میں نے جھٹ چھت سے نیچے چھلانگ لگادی، نیچے گرنے کی وجہ سے میرے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں، سر سے خون بہہ رہا تھا اور میں زندگی کی جنگ ہار چکی تھی۔

اچانک وہاں پر ایک لمحے کے لئے ریت کا طوفان سا آیا اور چلا گیا۔

میرے سامنے قابوس موجود تھا۔ بہت خوب صورت، عالیشان اور قدیم طرز کی عمارت میں، جس کے عین وسط میں سنگ مرمر کا فوارہ پانی اگل رہا تھا۔

فوارہ کے نیچے حوض تھا، جس میں آسمانی رنگ کا شفاف سنگ مرمر استعمال کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے شفاف پانی نیلا رنگ لئے بڑا ہی بھلا دکھائی دے رہا تھا۔

حوض کے چاروں کونوں میں "فرعون" اور "قابوس" کے مجسمے سجائے گئے تھے۔ سنگی مجسموں کے گرداگرد سرسبز گھاس بچھی ہوئی تھی جس میں جگہ جگہ سرخ گلاب کے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس کے آگے کافی دور تک سبزہ بچھا ہوا تھا۔ جس کی حد بندی دیگر خوشنما پھولوں سے کی گئی تھی۔

وسیع وعریض ہال کے چاروں طرف دیواریں اطلسی پردوں کے پیچھے گم تھیں اور انہی اطلسی پردوں میں سے جابجا دروازے نظر آرہے تھے جو غالباً صندل کی لکڑی سے تیار کردہ تھے۔ چاروں طرف صندل کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ چھت کے ساتھ جہازی سائز کا فانوس لٹکا ہوا تھا۔ اس میں جڑے بیش قیمت ہیروں کی چمک کچھ ایسی تھی کہ فانوس روشن کرنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ڈوب رہی ہوں اور جیسے کوئی شدید خطرہ میرے اردگرد منڈلا رہا ہے۔ قابوس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"حسن کی دیوی "الکوینہ" تو ہے ناں...... مجھے نہیں پہچانتی۔ کیا تو نہیں جانتی کہ میں کون ہوں؟ میں...... تیرا سچا عاشق قابوس ہوں...... تیرا ذہن خلاؤں میں بھٹک گیا ہے۔ تو نہیں جانتی کہ مجھ سے کوئی نہیں لڑسکتا۔ ہاں...... اب تیرے جسم پر میرا قبضہ ہے۔ سمجھ رہی ہے ناں تو، میں بہت عرصے سے یہاں ان کھنڈرات میں جو حقیقت میں ایسا عالی شان محل تھا۔ میں مدفون تھا۔ صدیاں گزر گئیں۔ مگر تیرے باپ کی بے وقوفی کی وجہ سے میں باہر آیا اور اوپر سے وہ مجھے اپنے گھر لے گیا، میں نے اس کے خون سے پہلے غسل کرکے یہ شکتی حاصل کی مگر میرا جسم ابھی بھی مکمل طور پر مجھے حاصل نہیں، میں چلنے پھرنے سے قاصر ہوں اگر تو مجھے کسی جواں حسین لڑکی کے خون میں نہلادے تو میں دوبارہ وہی پہلے والا قابوس بن جاؤں گا۔ اور پھر ہم دونوں مل کر حکومت کریں گے، پہلے تیری بے وقوفی کی وجہ سے ہم ایک نہیں ہوپائے کیونکہ تو نے چھت سے کود کر اپنی جان دے دی تھی، لیکن...... لیکن اب ہمیں کوئی نہیں روک سکتا...... آخرکار میں نے تجھے حاصل کرہی لیا...... میری لاش اسی تابوت میں ہے۔

میرے پیار کی قدر کر۔ "الکوینہ" میں نے تیرا کئی صدی انتظار کیا ہے۔"

اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے سمجھ نہ آئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں بستر پر لیٹی تھی پر کمرہ میرا نہیں کسی اور کا تھا، میں نے ادھر ادھر دیکھا، اچانک میرے کانوں میں شفقت بھری آواز رس گھولنے لگی۔ "ڈاکٹر صاحب...... ڈاکٹر صاحب، پلیز! چیک کیجئے مناحل کو ہوش آگیا ہے۔" یہ آواز یقیناً میری ماما کی تھی۔

ڈاکٹر نے آتے ہی میرا چیک اپ کیا اور ماما سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ بالکل ٹھیک ہیں، آپ انہیں گھر لے جائیں، مگر ان کا بھرپور خیال رکھئے گا۔"

پھر اسپتال سے میں، منزل اور ماما گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوگئے مگر میرا ذہن ابھی تک خلاؤں میں بھٹکا ہوا تھا اور گزشتہ واقعات میرے ذہن پر سینما اسکرین کی طرح چل رہے تھے۔

جب گھر پہنچی تو ماما نے مجھے پیار سے سمجھایا۔ "مناحل بیٹا تمہارے پاپا مصریات کے شوق میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور تم ان کی شفقت سے محروم رہ گئی، اور اب تم نے میری اجازت کے بغیر اس کمرے کو جو گزشتہ سالوں سے بند ہے اس کو کھولنے کا قصد کیوں کیا......؟ اگر تمہیں کچھ ہوجاتا......؟" ماما نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ مگر کسی حد تک ان کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے ماما کو گلے سے لگالیا، ساتھ منزل بھی ہمارے ہم نوا ہوگئی۔ پہلے منزل نے تابوت کے متعلق ماما کو بتایا اور اس کے بعد جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا وہ میں نے لفظ بہ لفظ منزل اور ماما کے روبرو کردیا۔

ماما اور منزل کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن میں نے ماما کو حوصلہ دیا کہ "مجھے کچھ نہیں ہوگا آپ بے فکر ہوجائیں بس آپ مجھے ایک آخری موقع دے دیں، اس بار میں اس شیطان سے پاپا کے ساتھ ساتھ اپنا بھی ہر حساب بے باک کردوں گی۔"

"لیکن بیٹا......" ماما کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

خیر میں نے منزل کو ذہنی طور پر راضی کرلیا۔ میں اور منزل گاڑی کی طرف بڑھے گیراج سے گاڑی نکالتے وقت میری نظر کونے میں پڑے پیٹرول کے ایک کیبن پر پڑی، اکثر ہم گیراج میں تھوڑا بہت پیٹرول رکھتے تھے کہ جانے کب ضرورت پڑ جائے۔ میں نے اسے گاڑی میں رکھ لیا۔ فارم ہاؤس پہنچتے ہی ہمارا رخ اسی کمرے کی جانب تھا۔ جو باقی کمروں سے الگ تھلگ تھا۔

منزل نے کہا۔ "مناحل تم کیا کرنے جارہی ہو، کچھ تو بتاؤ اگر......

"اگر وہ شیطان تابوت سے باہر نکل آیا...... تو......" منزل بولی۔

"ابھی اس میں اتنی طاقت نہیں، بس تم حوصلہ رکھو، ڈرنا مت۔" یہ بولتے ہوئے میں نے کمرے کا دروازہ کھولا، کونے میں پڑے تابوت کے پاس پہنچی، تابوت سے اب بھی نحوست ٹپک رہی تھی، میں نے تابوت پر پیٹرول کا کین الٹا کردیا، تابوت مکمل طور پر پیٹرول سے بھیگ گیا۔ زیادہ تر پیٹرول فرش پر پھیل چکا تھا۔ میری جینز کی پینٹ کی جیب میں لائٹر موجود تھا، میں نے لائٹر نکالا اور جلا کر تابوت پر پھینک دیا تابوت نے فوراً آگ پکڑلی۔

میں اور منزل کمرے سے فوراً باہر آگئیں، رفتہ رفتہ آگ نے پورے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اب ہمارا رخ گاڑی کی جانب تھا، جیسے ہی ہم گاڑی میں بیٹھے...... دھماکے کی سی آواز ہمارے کانوں میں سنائی دی کیونکہ پورا کمرا زمین بوس ہوچکا تھا۔

میں بہت خوش تھی کہ میں اپنے پاپا پر ہونے والے ظلم کا بدلہ لے لیا تھا۔ ہمارا رخ گھر کی جانب تھا، تھوڑی دیر میں ہی ہماری گاڑی روڈ پر فل اسپیڈ سے رواں دواں تھی۔

خونی ناگ منی

ملک فہیم ارشاد-ڈجکوٹ فیصل آباد

کمرے میں اچانک دھواں بھرگیا اور پھر جب دھواں چھٹا تو ایک خوفناک اور دہشت ناک ناگ موجود تھا پھر وہ زمین پر لوٹنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان کا روپ دھار لیا۔

رگوں میں خون کو منجمد کرتی اور جسم پر لرزہ طاری کرتی......اپنی مثال آپ انوکھی کہانی

”بابا اس علاقے میں سانپوں کی تعداد کم ہو رہی ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوگئی ہے۔“ تیمور نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں بیٹا کافی دنوں سے سانپ نہیں مل رہے، لگتا ہے ڈر کی وجہ سے سانپ یہ علاقے چھوڑ رہے ہیں۔“ تیمور کا باپ ناصر اداس لہجے میں بولا۔

”بابا لگتا ہے ہمیں یہ علاقہ اور گاؤں چھوڑنا پڑے گا، کل شیر ابتا رہا تھا کہ اس نے سنا ہے کہ راجن پور میں سانپوں کی کافی تعداد موجود ہے۔“ تیمور نے بتایا۔

”ہاں بیٹا سنا تو میں نے بھی ہے۔“ پیٹ کیلئے جگہ تو بدلنا پڑے گی، اناج کے دانے ہمیں ہر وقت سفر پر لگائے رکھتے ہیں۔“ ناصر نے کہا۔

”ہاں بابا ہمارا یہی مقصد ہے اور مقدر بھی، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور دوسرے گاؤں سے تیسرے گاؤں۔ اب تو سانپ بھی انسانوں کی طرح سمجھ دار ہونے لگے ہیں، خطرے کو محسوس کرنے لگتے ہیں اور ہمارے رزق کے دشمن بننے لگ گئے ہیں۔“ تیمور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں بیٹا کچھ بھی ہوجائے سانپ کتنے ہی سمجھدار کیوں نہ ہوجائیں وہ ہمارے رزق کے دشمن نہیں بن سکتے کیونکہ رزق دینے والی ذات رب کی ہے اور رب کی ذات ہر حالت میں رزق سے نوازتی ہے، یہی تو اس ذات کی خاصیت ہے، غریب ہو یا امیر مسلمان ہو یا غیر مسلم انسان ہو یا جانور وہ ہر ایک کو رزق دیتا ہے۔“ تیمور کے باپ نے کہا۔ ”سمندر میں مچھلیاں ختم ہونے سے یا گاؤں میں سانپ ختم ہونے سے ہمارا رزق ختم نہیں ہوسکتا بلکہ ہمارے رزق کی جگہ تبدیل ہوجاتی ہے۔“

”ہاں بابا! ہماری زندگی ہی ایسی ہے۔“ تیمور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بیٹا تیری شادی نہ کردوں۔“ ناصر نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”یہ میری شادی کا ذکر کہاں سے آ گیا۔“ تیمور حیران ہوا۔

”تو تیری شادی نہیں کرنی کیا؟“ ناصر نے سوالیہ نگاہوں سے تیمور کی طرف دیکھا۔

”نہیں بابا ابھی کچھ عرصہ ٹھہر جاؤ پھر سہی۔“ اور تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔

”چل ٹھیک ہے جیسے تیری مرضی! میں نے تو ساتھ والے قبیلے والوں سے بات کی تھی وہاں ایک سپیرے کی بیٹی ہے، فریدہ بڑی خوب صورت لڑکی ہے اور اچھی سپیرن بھی، تیرے دھندے (کام) میں تیری مدد بھی کرے گی۔“ تیمور کے باپ نے اسے سمجھایا۔

”بابا ابھی نہیں ابھی میں آزادی سے اپنے کام کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ سانپوں کے ہر پینترے کو سمجھنا چاہتا ہوں، ناگ منی کی حقیقت، تیمور اپنی ہی دھن میں بولے جا رہا تھا کہ ناصر نے اسے غصے سے ٹوکا۔ ”تیمور۔“

تیمور یکدم سہم سا گیا اس کے باپ نے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک کبھی نہیں ڈانٹا تھا، آج یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ ”کک کیا ہوا بابا؟“ تیمور گھبراہٹ کے باعث ہکلایا۔

”ناگ منی کا ذکر تو دوبارہ نہیں کرے گا، ناگ منی انسان کا دشمن ہے، پتہ ہے اس ناگ منی سے۔“ ناصر اچانک کہتے کہتے رک گیا۔

”کیا بابا، آپ چپ کیوں ہوگئے۔“ تیمور نے تیزی سے پوچھا۔

”بیٹا یہ ناگ منی کا حصول انسان کی موت کا باعث بنتا ہے اس چکر میں ہرگز نہ پڑنا اس چکر میں جو سپیرا بھی پڑا اس نے اپنی جان ہی گنوائی ہے، سانپوں کی زندگی بڑی پراسرار ہوتی ہے، ان میں گھسنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا، انہیں صرف اپنے ذوق کا ذریعہ ہی سمجھو اس سے مزید کچھ بھی نہیں۔“ ناصر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے بابا جیسے آپ کہیں۔“ تیمور نے کسی فرمانبردار بیٹے کی طرح اثبات میں سر ہلایا وہ اپنے باپ کی ہر بات مانتا تھا کیونکہ اس کے باپ نے اسے بڑے پیار سے پالا تھا، ماں کی شکل تو اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ ”بابا ٹھیک ہے اب آپ آرام کرو، کل ہم راجن پور کے لئے نکلیں گے۔“ تیمور نے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا شانتوں کو پہاڑی سے نکال کر ان کی جگہ پر چھوڑ دو۔“ تیمور کے باپ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”بابا جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے آپ کسی نہ کسی زہریلے سانپ کو خیمے کی نگرانی پر ضرور لگاتے ہو، ایسا کیوں؟“ تیمور نے پوچھا۔

”بیٹا ہم کام بھی تو ایسا کرتے ہیں ناں، سانپ پکڑتے ہیں، نجانے کون سا سانپ ہمارا دشمن بن جائے اور سوتے میں حملہ کردے انسان سوتا ہے آنکھ بند کرکے جاگتے میں تو انسان ان کا حل سوچ سکتا ہے لیکن سوتے میں نہیں اس لئے میں کسی نہ کسی سانپ کو جھونپڑی کی نگرانی پر لگاتا ہوں، شانتوں کافی پرانا سانپ ہے اور وفادار بھی، ویسے بھی لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔“ تیمور کے باپ نے اسے سمجھایا اور تیمور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک طرف پڑی پٹاری اٹھائی اور اس کا ڈھکن

کھول دیا، ایک کالے رنگ کے ناگ نے تیزی سے اپنا سر باہر نکالا، تیمور نے پٹاری زمین پر رکھ دی، سانپ پھنکارتا ہوا پٹاری سے باہر نکل آیا، تیمور نے پٹاری کا ڈھکنا بند کر کے واپس اسے اس کی جگہ پر رکھ دیا اور خود چارپائی پر لیٹ گیا۔

ناگ منی کے موضوع پر اس کے باپ کو کافی غصہ آیا تھا، بشیرا اس کا سپیرا دوست تھا اسی نے اس سے ناگ منی کا ذکر کیا تھا، لیکن اس نے ناگ منی کا ذکر اپنے باپ سے کیا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا وہ ابھی سوچوں میں گم نیند کی میٹھی آغوش میں جا سویا اسے پتہ ہی نہ چلا شانتوں جھونپڑی میں کبھی رینگنے لگتا اور کبھی کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا وہ واقعی بڑی ذمہ داری سے جھونپڑی کی نگرانی کر رہا تھا۔ اچانک جھونپڑی میں دوسری پھنکار سنائی دی، شانتوں نے تیزی سے گردن گھمائی اس کے پیچھے اسی جیسا ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہوا تھا، اس سانپ نے تیزی سے شانتوں پر حملہ کیا، دونوں سانپوں میں خونی اور خوفناک جنگ چھڑ گئی، کبھی شانتوں اس سانپ پر بھاری پڑتا تو کبھی وہ سانپ شانتوں پر بھاری پڑتا، کافی دیر یہ جنگ جاری رہی، آخر کار یہ جنگ شانتوں کی موت پر ختم ہوئی، ایسا نہیں تھا کہ شانتوں نے آسانی سے جان دے دی تھی بلکہ اس نے دوسرے سانپ کو کافی حد تک زخمی کر دیا تھا، وہ سانپ بھی زمین پر پڑا لمبی لمبی پھنکاریں مار رہا تھا۔

اچانک تیمور کے باپ ناصر کی آنکھ کھلی اس کی نگاہ زمین پر پڑی تو وہ حیران رہ گیا اس سے پہلے کہ آواز دے کر وہ تیمور کو اٹھاتا، زمین پر پھنکاریں مارتا سانپ یکدم اچھلا اور ناصر کے پاؤں پر ڈنک مار دیا، ناصر کے منہ سے ایک زوردار دار چیخ نکلی تو تیمور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، اس کی نگاہ پہلے زمین پر مردہ حالت میں پڑے شانتوں پر پڑی اور پھر وہ جلدی سے اپنے تڑپتے ہوئے باپ کی طرف بڑھا۔

''بب...... بب...... بابا یہ کیا ہو گیا؟'' تیمور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''بب...... بب...... بیٹا میرے دل پر ایک بوجھ ہے۔'' تیمور کا باپ اکھڑتی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولا۔ ''بب...... بیٹا میں تمہیں برسوں پرانے ایک راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی بابا بولئے......'' تیمور نے روتے ہوئے پوچھا مگر ناصر کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ تیمور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

☆......☆......☆

پورے بنگلے میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی، بنگلے کے سارے ملازمین ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور ان سب سے بڑا امداد حسین ملازموں پر برس رہا تھا۔ ''کم بختو...... ڈھونڈو اس سانپ کو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' امداد حسین چلاتے ہوئے بولا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے امداد حسین کی بیوی نے اپنے کمرے میں ایک سانپ دیکھا تھا جو حمیرا کے چیخنے پر یکدم رینگتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھا، امداد حسین کے ملازموں نے پورا بنگلہ چھان مارا تھا مگر وہ سانپ کہیں بھی نہ ملا، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس سانپ کو آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی تھی۔

''مالک ہم نے پورا بنگلہ چھان مارا ہے مگر وہ سانپ کہیں بھی نہیں ہے۔'' آخری کوششوں کے بعد ملازمین نے اپنا آخری فیصلہ سنایا۔

''نکمے ہو گئے ہو تم سب کے سب ایک سانپ کو نہیں پکڑ سکے تم۔'' امداد حسین کا پارہ مکمل طور پر چڑھا ہوا تھا۔

''بیٹا ایک سانپ ہی تو تھا نکل گیا ہوگا۔'' امداد حسین کی ماں جنت بی بی نے کہا۔

''بالکل بھیا وہ چلا گیا ہوگا اب اتنے ملازم اسے ڈھونڈ رہے ہیں آخر کار اسے اپنی جان پیاری ہے۔'' امداد حسین کے بھائی احمد نے مسکراتے ہوئے کہا جو امداد حسین سے چھوٹا تھا۔

''ابو میں نے سانپ کبھی نہیں دیکھا......'' امداد حسین کے بیٹے فہد نے کہا۔

''اللہ کرے، کبھی دیکھو بھی ناں، فہد کی ماں حمیرا نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔'' وہ اتنا خوفناک سانپ تھا کہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

''چلو اب اپنے اپنے کمروں میں، وہ سانپ چلا گیا ہوگا، اور جنت بی بی نے کہا تو سب اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئے۔

''ابو یہ سانپ دیکھنے میں کیسے ہوتے ہیں؟'' فہد نے امداد حسین سے پوچھا۔

''تم چپ نہیں کرتے ایک تھپڑ لگاؤں گی تمہیں۔'' حمیرا نے غصے سے فہد کو ہاتھ دکھایا۔

''بیگم بچوں کو ایسے نہیں ڈانٹتے، بلکہ پیار سے سمجھاتے ہیں۔'' امداد حسین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ کے لاڈ پیار نے ہی اسے بگاڑا ہے، دن بدن ضدی ہوتا جا رہا ہے۔'' حمیرا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''بچہ ہے...... سمجھ جائے گا میری جان۔'' امداد حسین پیار سے بولا۔

''بچپن سے ہی تو بچہ سمجھتا ہے اور آپ ہیں کہ اس کی عادتیں خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

حمیرا نے کہا وہ تینوں اب اپنے کمرے میں آ چکے تھے۔ ''اچھا، اچھا آج کے بعد میں تم ماں بیٹے کے بیچ میں نہیں آؤں گا۔'' امداد حسین نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

جنت بی بی بیڈ پر لیٹی گہری سوچوں میں مبتلا تھی، اور بنگلے میں آنے والے اس سانپ کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ''یہ سانپ'' جنت بی بی پریشانی سے بڑبڑائیں۔ صبح کسی سپیرے کے پاس جاؤں گی۔ جنت بی بی خود سے ہمکلام ہوئی، انہیں پیاس محسوس ہو رہی تھی، انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر پڑے جگ کی طرف دیکھا وہ خالی تھا وہ بیڈ سے نیچے اتریں اور کمرے سے باہر نکلیں تو اچانک ان کی نظر نیچے قالین پر پڑی وہاں ایک کالے رنگ کا بڑا سانپ رینگ رہا تھا اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

جنت بی بی نے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں، سائیڈ دیوار پر ایک کلہاڑی ٹنگی ہوئی تھی، جنت بی بی نے ہولے سے دیوار سے وہ کلہاڑی اتاری اور ہلکے ہلکے قدموں سے کچن کی طرف بڑھیں، ان کے ہاتھ مضبوطی سے کلہاڑی پر جمے ہوئے تھے، ان کے دل کی دھڑکنیں تیز تھیں، اور دل کی حالت ایسی تھی جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔

جنت بی بی کافی بہادر عورت لگتی تھیں، اسی لئے تو اس نے اپنے کسی بیٹے یا ملازم کو بلانے کی زحمت تک نہ کی تھی لگتا تھا جیسے وہ خود ہی سانپ کا کام تمام کرنا چاہتی ہوں، وہ کچن میں داخل ہوئیں تو انہوں نے ایک حیرت انگیز منظر تھا، مضبوطی سے پکڑی ہوئی کلہاڑی ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری اور یہی جنت بی بی کی سب سے بڑی بھول تھی، اسی وقت جنت بی بی کی زوردار چیخ نکلی اور لہرا کر فرش پر گر پڑیں۔

☆......☆......☆

وقت کے بارے میں کئی باتیں مشہور ہیں ایک اچھی مثال یہ مشہور ہے کہ وقت اچھا ہو یا برا گزر جاتا ہے۔ اسی طرح تیمور کا برا وقت بھی گزر گیا تھا، باپ کی موت کا صدمہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی شکل میں آیا مگر وقت نے اس کے آنسو خشک کر دیئے تھے۔

وقت کی ایک اچھی مثال اور بھی مشہور ہے کہ وقت ہر زخم بھر دیتا ہے کسی سے کتنی بھی محبت کر لی جائے لیکن جب سانسوں کی ڈور اس کا ساتھ چھوڑ جائے تو پھر کسی شے پر چھائی ہوئی دھند کی طرح اس کی یادیں بھی دھندلی ہو جاتی ہیں مگر جب اپنا کسی کے ہاتھوں مارا جائے تو وہ انتقام بن جاتا ہے، اسی وجہ سے تیمور کو سانپوں سے نفرت ہو گئی تھی اسی لئے اب ہر سانپ سے اسے نفرت ہو گئی تھی، سوائے شانتوں کے جس نے اپنی جان دونوں باپ بیٹوں کو بچاتے ہوئے دیدی تھی۔

دوسرے سانپ نے شانتوں کی جان توڑ کوششوں کے باوجود ناصر کی جان لے لی تھی۔ تیمور اپنے دشمن سے بھی انجان تھا، لیکن اسے اتنا تو پتہ چل گیا

تھا کہ وہ سانپ بہت طاقتور تھا اور انسانی شکل بھی اپنا سکتا تھا۔

تیمور اپنا گاؤں چھوڑ کر راجن پور آ گیا تھا، پیٹ کی بھوک کوئی غم نہیں دیکھتی، یہ انسان کو در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیتی ہے، تیمور بھی اس وقت ایک سنسان جگہ پر کھڑا تھا، اس کا تھیلا اس کے کندھے اور بین ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی، اس کے سامنے جھاڑیوں کا ایک لمبا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

تیمور نے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں اس کی نظر ایک بلند ٹیلے پر پڑی، وہ اس ٹیلے کی طرف بڑھا، ٹیلے پر چڑھنے کے بعد اس نے بین بجانا شروع کر دی، تھوڑی دیر بعد تیمور کو جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ ایک کالے رنگ کا سانپ تھا جو جھاڑیوں سے نکل کر رینگتا ہوا تیمور کے قریب آ کر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا تیمور کافی دیر بین بجاتا رہا اور پھر اس کی سانس کمزور پڑنے لگی تو اس نے تیزی سے ہاتھ آگے بڑھا کر اس سانپ کو پکڑ لیا، سانپ کافی طاقتور تھا وہ تیمور کے ہاتھوں میں بری طرح مچل رہا تھا۔ تیمور نے دوسرے ہاتھ سے تھیلے سے پٹاری نکالی اور سانپ پٹاری میں رکھنے کے بعد پٹاری واپس تھیلے میں رکھ لی، وہ ٹیلے سے نیچے اتر آیا، تیمور کو یقین تھا کہ اس سانپ سے کافی زہر نکلے گا۔

☆......☆......☆

"Teacher May I Go To Washroom" فہد نے اپنی ٹیچر سے اجازت چاہی، Yes you can go ٹیچر نے اسے اجازت دی وہ کلاس روم سے باہر آیا، باہر ایک لمبی راہداری تھی اور ارد گرد کمرے تھے جن میں باقی استاد اپنی کلاس کے بچوں کو پڑھا رہے تھے راہداری کے اختتام پر واش روم تھے، وہ واش روم میں داخل ہوا، کنڈے لگانے کے بعد اچانک اسے پھنکار کی تیز آواز سنائی دی، فہد نے تیزی سے پینٹ چڑھائی اور چیختا ہوا واش روم سے باہر نکل آیا۔ باہر تمام کلاسوں کے بچے اور ٹیچر جمع ہو چکے تھے۔

"کیا ہوا فہد۔" ایک ٹیچر نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"وہ...... وہ...... وا...... واش روم میں سانپ ہے۔" فہد نے ہکلاتے ہوئے بتایا۔

"کک...... کیا؟ کئی آوازیں یک بیک ابھریں، تھوڑی دیر بعد وہاں میڈم بھی آ گئیں۔ "یہ کیا بھیڑ لگا رکھی ہے سب نے، میڈم غصے سے بولیں۔

"وہ...... وہ میڈم واش روم میں سانپ موجود ہے۔" ایک ٹیچر نے ہکلاتے ہوئے بتایا، اس سے پہلے کہ مزید کوئی بات ہوتی، ایک کالے رنگ کا لمبا سا سانپ واش روم سے باہر نکلا اور رینگتا ہوا ایک طرف بنی کیاریوں میں گم ہو گیا، اسی وقت وہاں چوکیدار آیا اور کیاریوں میں سانپ کو ڈھونڈنے لگا لیکن وہاں کہیں بھی سانپ نظر نہ آیا، تھوڑی دیر بعد میڈم نے سارے بچوں اور ٹیچرز کو واپس کلاسوں میں جانے کا حکم دیا۔

فہد کی کلاس میں اسی سانپ کا ذکر ہوتا رہا، چھٹی ہونے پر فہد گاڑی میں بیٹھ کر گھر پہنچا، باہر لان میں کچھ لوگ تعزیت کے لئے بیٹھے ہوئے تھے، ان لوگوں میں امداد حسین اور احمد بھی افسردہ بیٹھے ہوئے تھے جنت بی بی کو مرے ہوئے آج چوتھا روز تھا، جنت بی بی اسی رات کچن میں مردہ حالت میں پائی گئی تھیں، ان کے پیر پر ڈنک کا نشان تھا، فہد ابو، ابو کہتا ہوا امداد حسین کی طرف بڑھا، اسی وقت فہد کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی۔

"ارے فہد کو سانپ نے کاٹ لیا۔ لان میں بیٹھے ہوئے افراد کی آوازیں گونجیں۔ "وہ جا رہا ہے سانپ۔"

امداد حسین اور احمد نے آگے بڑھ کر جلدی سے گرتے ہوئے فہد کو سنبھالا۔ "جلدی سے ڈاکٹر کو فون کرو۔" امداد حسین چلاتے ہوئے بولا۔

امداد حسین فہد کو اٹھا کر کمرے میں لے آیا، جیرا گھر کے لئے سامان لینے گئی تھی۔ فہد کے ہونٹوں کا رنگ نیلا پڑ گیا تھا، تھوڑی دیر بعد ان کا فیملی ڈاکٹر آ گیا چیک اپ کرنے کے بعد مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "امداد صاحب جتنی جلدی ہو سکے فہد کو اسپتال لے جائیں، دل کی

دھڑکن دھیمی پڑ رہی ہے، لگتا ہے زہر تیزی سے جسم میں پھیل رہا ہے۔"

امداد حسین اور احمد نے فہد کو گاڑی میں لٹایا اور اسپتال لے گئے، ڈاکٹر نے نبض دیکھی تو بولا۔ "سوری امداد صاحب" آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی، بچہ سانسوں کی ڈور سے آزاد ہو چکا ہے۔"

"نن...... نن...... نہیں ڈاکٹر صاحب...... یہ...... یہ نہیں ہو سکتا۔" امداد حسین روتے ہوئے بولا۔

"اپنے آپ کو سنبھالئے امداد صاحب شاید اللہ کو یہی منظور تھا۔" ڈاکٹر نے امداد حسین کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ مگر ایسی حالت میں حوصلہ کہاں سے آتا ہے وہ روتا رہا۔

"میں اس بچے کو زندہ کر سکتا ہوں۔ اچانک ایک آواز گونجی تو سب حیرانگی سے اس طرف دیکھنے لگے۔

☆......☆......☆

تیمور نے اس گھر کے باہر ہجوم دیکھا تو اس طرف بڑھا۔ "یہاں کیا ہوا بھئی؟" تیمور نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"امداد حسین کے بیٹے کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔" اس آدمی نے بتایا۔

"سانپ نے۔" تیمور حیران ہوا۔

"ہاں سانپ نے۔" اسی آواز نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کہاں ہے وہ بچہ؟" تیمور نے پوچھا۔

"یہاں پاس میں ہی ایک اسپتال ہے فہد کو وہیں لے کر گئے ہیں۔" اس آدمی نے بتایا، تیمور جلدی سے اسپتال کی طرف بھاگا، وہ اسپتال پہنچا تو اس نے دیکھا ڈاکٹر نے فہد کی موت کا اعلان کر دیا تھا۔

"میں اس بچے کو زندہ کر سکتا ہوں۔" تیمور پر سوچ انداز میں گویا ہوا تو سب حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔" ڈاکٹر غصے سے بولا۔

تیمور نے ڈاکٹر کا جواب دینے کے بجائے آگے بڑھ کر فہد کی آنکھوں کو کھول کر دیکھا اور پھر نبض چیک کی۔ "یہ بچہ زندہ ہے، ابھی مرا نہیں۔" تیمور نے پختہ لہجے میں اعلان کیا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے جنگلی، اسے اندر کس نے آنے دیا، گارڈ اسے باہر نکالو۔"

ڈاکٹر نے ایک طرف کھڑے گارڈ سے کہا تو گارڈ تیزی سے تیمور کی طرف بڑھا۔

"صاحب میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں، آپ کا بیٹا ابھی مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔" تیمور نے امداد حسین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو ایک منٹ۔" امداد حسین نے گارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

امداد صاحب آپ تو پڑھے لکھے انسان ہیں، ان سپیروں کی باتوں پر یقین کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کا لہجہ حیرت سے بھرپور تھا۔ ہمیں بھی آپ کے بیٹے کی موت کا افسوس ہے مگر یہ 100 فیصد مر چکا ہے۔

"ڈاکٹر صاحب آپ بچے کو مردہ کہہ رہے ہیں جبکہ میرا کہنا ہے کہ یہ بچہ سو فیصد زندہ ہے۔" تیمور کا لہجہ بدستور پختہ تھا۔

"کیا تم ڈاکٹر ہو جاہل انسان، تم مجھے جھٹلا رہے ہو۔" ڈاکٹر نے غصے سے کہا۔

"بات یہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب، آپ مجھے صرف آدھا گھنٹہ دیں، انشاء اللہ یہ بچہ آپ کی آنکھوں کے سامنے آنکھیں کھولے گا۔" تیمور نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آزمانے میں کیا حرج ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔" امداد حسین نے کہا۔

اب اس جگہ کافی بھیڑ لگ چکی تھی۔ "امداد صاحب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے امداد حسین کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر صاحب اس نوجوان نے جس سچے دل سے انشاء اللہ کہا ہے، مجھے اس کی بات میں سچائی نظر آ رہی ہے۔" امداد حسین نے کہا اور پھر تیمور کی طرف

مڑا، دیکھو سپیرے اگر تم نے اپنی کہی بات سچ کردی تو میں تمہیں نوٹوں میں تول دوں گا، اور اگر تمہاری بات جھوٹ نکلی تو تھانے میں تمہارا وہ حال کرواؤں گا کہ تم یاد رکھو گے۔"

"ٹھیک ہے۔" مجھے منظور ہے، پر میری ایک شرط ہے۔" تیمور نے کہا۔

"نوٹوں والی بات میں نے پہلے کی ہے۔" امداد حسین نے کہا۔ "مجھے نوٹوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، امداد صاحب نوٹوں کا لالچ آپ کسی اور کو دیجئے گا، مجھے میرا اللہ اتنا رزق دے دیتا ہے کہ میں دو وقت کی روٹی پیٹ بھر کر کھاتا ہوں۔" تیمور نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "تو پھر اس کے علاوہ تمہاری کیا شرط ہے؟" امداد حسین نے حیرانگی سے پوچھا۔

"میری شرط یہ ہے کہ اس آدھے گھنٹے میں جو کچھ بھی کروں گا مجھے کوئی نہیں ٹوکے گا۔" تیمور نے کہا۔

"ٹھیک ہے مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔"

امداد حسین نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، اب سب کی نظریں تیمور پر لگی ہوئی تھیں کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔

تیمور نے اپنے تھیلے سے ایک تیز دھار چاقو نکالا سب حراساں نظروں سے تیمور کی طرف دیکھنے لگے، تیمور نے سب کی نظروں کی پرواہ کئے بغیر فہد کے پاؤں پر زخم لگایا، فہد کید پاؤں سے خون نکلنے لگا، تیمور نے اپنی مٹھی بند کی اور منہ میں کچھ پڑھنے لگا، تقریباً پندرہ منٹ تک وہ پڑھتا رہا اور پھر اس نے آنکھیں کھول کر اپنی مٹھی کو فہد کی طرف کرکے ہاتھ کو جھٹکا دیا اسی وقت فہد کے پاؤں سے نکلتے خون کا رنگ نیلا ہوگیا سب حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے، دو تین منٹ بعد خون کا رنگ دوبارہ لال پڑ گیا، اب سب کی نظریں فہد پر لگی ہوئی تھیں، اب تیمور کی نظریں بھی فہد پر لگی ہوئی تھیں، اس کے ہونٹ اب بھی ہل رہے تھے۔

اچانک سب نے ایک حیرت کن منظر دیکھا کہ فہد کی بے جان پلکوں میں حرکت سی ہوئی اور پھر اس نے ہولے ہولے سے آنکھیں کھول دیں۔

"اب...... ابو......" فہد نے امداد حسین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور امداد حسین روتا ہوا فہد کے گلے لگ گیا، بے اختیار وہاں موجود لوگوں نے تالیاں بجانی شروع کردیں۔"

ڈاکٹر صاحب آپ کا پیشہ ضرور مرتے ہوئے انسان کی جان بچانا ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مریض کی جان آپ کے ہاتھوں میں ہے، انسان کی زندگی اور موت کا مالک صرف ایک اللہ ہے، آپ کے پیشے نے اس زندہ بچے کو مردہ قرار دے دیا، لیکن میں نے تحمل مزاجی سے اس نوجوان کا معائنہ کیا اور مجھے اس کے جسم میں زندگی محسوس ہوئی، آپ کے پیشے نے نجانے کتنے زندہ انسانوں کو موت میں مبتلا کردیا ہوگا۔" تیمور کی تقریر نے ڈاکٹر کو لاجواب کردیا اور تیمور کو ایک مرتبہ پھر پرجوش تالیاں سننی پڑیں، سب کی داد بھری نظریں تیمور پر تھیں اور تیمور خاموشی سے اب باپ اور بیٹے کی محبت دیکھ رہا تھا۔

"اچھا امداد صاحب، اب میں چلتا ہوں۔" تیمور نے تھوڑی دیر بعد اجازت چاہی۔

"نہیں تم رکو۔" "آج تم نے مجھے اپنا گرویدہ کرلیا ہے، اگر آج تم نہ ہوتے تو میں اپنے جگر کے ٹکڑے کو کھو دیتا، تم میرے ساتھ چلو، مجھے تم سے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں۔" امداد حسین نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب امداد حسین، تیمور، فہد اور احمد، امداد حسین کے گھر پر تھے، حمیرا کا تو رو رو کر برا حال ہو رہا تھا، جب ان کو تیمور کے کارنامے کا پتہ چلا تو وہ تیمور کے ہاتھ پکڑ کر ہچکیوں سے رونے لگیں، تیمور نے تیزی سے کہا۔ "آپ روئیں نہیں انسانیت کے ناطے یہ تو میرا فرض تھا۔"

امداد حسین، احمد اور تیمور ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ "تمہارا نام کیا ہے بیٹا۔" امداد حسین نے پوچھا۔

"تیمور...... تیمور نے اپنا نام بتایا۔

"تم نے یہ کیسے کردیا؟" امداد حسین نے پوچھا۔

"کیا۔" تیمور نے بے خیالی میں پوچھا۔

"فہد کو زندہ۔" امداد حسین نے بتایا۔

"امداد صاحب نعوذ باللہ آپ کیسی باتیں کررہے ہیں، زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، آپ کا بیٹا تو زندہ تھا جسم میں، زہر تو خیر پھیل گیا تھا مگر اتنا نہیں کہ زندگی کی ڈور ٹوٹ جائے۔" تیمور نے کہا۔

"اچھا...... آج میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" امداد حسین نے کہا۔

"کیسی باتیں؟" اور تیمور نے سوالیہ نگاہوں سے امداد حسین کی طرف دیکھا۔ "ان سانپوں کا چکر ہمارے ساتھ کافی عرصے سے چل رہا ہے۔" امداد حسین نے عجیب بات کہی۔

"کیا مطلب اور تیمور حیران ہوا۔" میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب یہ کہ میرے والد صاحب کی موت بھی سانپ کے ڈسنے سے ہوئی تھی۔" امداد حسین نے عجیب انکشاف کیا۔ "اور میری ماں جنت بی بی کی موت بھی سانپ کے ڈسنے سے ہوئی تھی، اور اگر آج تم وقت پر نہ آتے تو میرا بیٹا بھی۔" امداد حسین نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہوں۔" تیمور نے گہری سانس کھینچی۔ اس کا مطلب کہ سانپوں کی کوئی دشمنی ہے آپ کے خاندان سے۔"

"دشمنی، کیسی دشمنی۔" اس مرتبہ احمد بولا۔

"یہ تو سانپ ہی جانیں۔" اور تیمور نے کندھے اچکائے۔

"میری بھی اکثر جب رات کے وقت آنکھ کھلتی ہے تو کمرے میں سانپ کے پھنکارنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن جب میں لائٹ آن کرتا ہوں تو وہ سانپ مجھے کمرے میں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔" احمد نے بھی دل کی بات بتائی۔ "میرے ساتھ بھی اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔" امداد حسین نے بھی احمد کی تائید میں سر ہلایا۔

"اب تو مجھے پکا یقین ہو گیا ہے کوئی نہ کوئی چکر ضرور ہے، سانپوں کا کوئی گروہ یا کوئی سانپ آپ کا دشمن ضرور ہے اور مجھے پکا یقین ہے وہ دوبارہ آپ لوگوں پر حملہ کرے گا۔" تیمور نے پختہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر تم کچھ کرو، تم تو سانپوں کے متعلق سب کچھ جانتے ہو۔" امداد حسین کا لہجہ التجائیہ تھا۔

"ٹھیک ہے کل میں اپنے قبیلے کے سردار سے بات کروں گا وہ مجھے ضرور اس کا حل بتائیں گے۔" تیمور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔"

"نہیں، تم آج رات ہمارے مہمان ہو۔" اگر وہ سانپ ہمارے دشمن ہیں تو یقیناً پھر حملہ کر سکتے ہیں، اس لئے آج رات تم یہیں رہو گے۔" امداد حسین نے کہا تو تیمور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

بنگلے کی نگرانی پر مامور چوکیدار کی نظر اچانک فرش پر رینگتے ہوئے ایک سانپ پر پڑی تو وہ چونکا اور تیزی سے سانپ کی طرف بڑھا، سانپ رینگتا ہوا گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا، چوکیدار گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوا تو اسے سانپ کہیں بھی نظر نہیں آیا، وہ حیران رہ گیا کہ سانپ کہاں چلا گیا، چوکیدار امداد حسین کے کمرے کی طرف بڑھا، امداد حسین کے کمرے سے پہلے احمد کا کمرہ آتا تھا احمد کے کمرے کے قریب سے گزرا (چوکیدار) تو اسے احمد کمرے سے سرگوشیوں کی آواز سنائی دی، چوکیدار ٹھٹک کر رکا، اس نے دروازے سے کان لگا دیا۔ "وہ ڈبیہ کہاں ہے؟" اندر سے ایک گرجدار مردانہ آواز آئی جو چوکیدار کے لئے انجان تھی۔

"کون سی ڈبیہ؟" تم کس ڈبی کی بات کر رہے ہو۔" احمد کی آواز آئی۔

"ناگ منی والی ڈبیہ۔" وہی گرجدار مردانہ آواز دوبارہ چوکیدار کے کانوں میں پڑی۔

"کون سا ناگ منی؟ میں کسی ناگ منی کے بارے میں نہیں جانتا اور تم میری گردن تو چھوڑ دو۔" احمد کی آواز آئی۔

چوکیدار نے تیزی سے احمد کے کمرے کے دروازے پر زور ڈالا اور پھر اس نے ایک حیران کن منظر دیکھا، ایک خوب صورت نوجوان نے احمد کو گردن سے پکڑا ہوا تھا۔ "کون ہو تم؟" چھوڑو احمد صاحب کو۔" چوکیدار گرجدار آواز میں بولا۔

"وہ نوجوان تیزی سے گھوما اس کی انگارہ اگلتی آنکھیں چوکیدار کو گھور رہی تھیں، اس نوجوان نے اپنا ہاتھ چوکیدار کی طرف کیا چوکیدار کی گردن میں درد کی تیز لہر اٹھی، ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے جا گری چوکیدار نے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن پکڑ لی، اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا اور وہ لہرا کر فرش پر جا پڑا۔

ادھر تیمور کی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھلیں، وہ حیرانگی سے ارد گرد دیکھنے لگا، اسے ایک عجیب سی تیز بو محسوس ہو رہی تھی، وہ جب سے اس گھر میں آیا تھا، اسے یہ بو ہلکی ہلکی آ رہی تھی، لیکن اب یہ بو تیز ہو گئی تھی۔ وہ بستر سے نیچے اترا اور کمرے سے باہر نکل آیا، وہ بو کو سونگھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، وہ احمد کے کمرے کے پاس رکا، وہاں چوکیدار مردہ حالت میں پڑا ہوا تھا اور احمد بری طرح تڑپ رہا تھا، وہ تیزی سے احمد کی طرف بڑھا۔ "وہ...... وہ ڈبیہ......" احمد بس اتنا ہی کہہ سکا اس کی سانسوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

"تیمور تیزی سے امداد حسین کے کمرے کی طرف بھاگا اس نے امداد حسین نے دروازہ کھولا تو تیمور کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ "کیا ہوا تیمور خیریت تو ہے، تم اس وقت یہاں۔" امداد حسین نے فکر مندانہ لہجے میں پوچھا۔

"جلدی چلئے اس سانپ نے حملہ کر دیا ہے، آپ کا بھائی اس دنیا میں نہیں رہا۔" تیمور نے تیز لہجے میں کہا۔

"کک...... کیا؟" امداد حسین چیخ چلاتے وہ تیزی سے احمد کے کمرے کی طرف بھاگے، کمرے کی حالت دیکھ کر امداد حسین دھاڑیں مار مار رونے لگے۔

حمیرا بھی امداد حسین کے پیچھے ہی آ گئی تھیں وہ بھی احمد کی حالت دیکھ کر رونے لگی۔ احمد کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔

"تیمور خدا کے لئے میرے بھائی احمد کا زہر بھی نکال دو، جس طرح تم نے فہد کے جسم سے زہر نکالا تھا۔" امداد حسین تیمور کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے۔

"نہیں امداد صاحب، اب میں یہ نہیں کر سکتا۔" تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟" امداد حسین نے سسکتے ہوئے پوچھا۔

"ہر سپیرے کو یہ طاقت زندگی میں صرف ایک بار ملتی ہے جو میں نے آپ کے بیٹے کی زندگی بچانے میں لگا دی تھی اور ویسے بھی اب احمد صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔" تیمور نے بتایا۔

"آخر یہ سانپ میرے گھر والوں کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟" امداد حسین چلاتے ہوئے بولے۔

"مرنے سے پہلے احمد صاحب کسی ڈبیہ کا ذکر کر رہے تھے۔" تیمور نے کہا۔

"ڈ...... ڈبیہ۔" حیرت کے باعث امداد حسین کے منہ سے نکلا۔

"کیا آپ کسی ڈبیہ کے بارے میں جانتے ہیں؟" تیمور حیران ہوا۔

"ہاں...... ایک ڈبی مرنے سے کچھ دن پہلے میرے والد نے مجھے دی تو تھی۔"

"کہاں ہے وہ ڈبی؟" تیمور نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" امداد حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ سب امداد حسین کے کمرے میں آئے، امداد حسین نے آگے بڑھ کر کمرے میں موجود تجوری کھولی، تجوری میں پیسوں کے اوپر ایک نیلے رنگ کی بڑی سی ڈبی پڑی ہوئی تھی۔ "یہ ہے وہ ڈبی" امداد حسین نے کہا۔ تیمور نے آگے بڑھ کر اس ڈبی کو ہاتھ لگایا تو اسے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ "ارے یہ کیا؟" تیمور اپنا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "اس ڈبی پر تو منتر پڑھا گیا ہے۔"

"منتر...... کیسا منتر؟" امداد حسین نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اس ڈبی کے متعلق سانپوں کو پتہ نہ چلے اور آج مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ سانپ اس ڈبی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، لیکن مجھے ایک بات کی شدید حیرت ہے۔" تیمور کہتے کہتے رکا۔

"کیسی حیرت؟" امداد حسین نے پوچھا۔

"اس ڈبی پر منتر صرف اور صرف ایک کامیاب سپیرہ ہی پڑھ سکتا ہے۔" تیمور نے کہا۔

"امداد حسین کا باپ ایک سپیرہ ہی تھا۔" اچانک کمرے میں ایک آواز گونجی، سب نے حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک خوب صورت نوجوان کھڑا تھا۔

"کک...... کون ہو تم؟" امداد حسین نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"میں اس ڈبی کا اصل مالک۔"

"کیا ہے اس ڈبی میں اور تم اس گھر میں داخل کیسے ہوئے۔" امداد حسین نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں اگر اس گھر میں داخل ہو کر تمہارے بھائی کو مار سکتا ہوں تو اس کمرے میں نہیں آ سکتا کیا؟" وہ نوجوان مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم...... پر احمد کو تو سانپ نے ڈسا تھا" امداد حسین حیرانگی سے بولا۔

"میں سانپ ہی تو ہوں۔" اس نوجوان نے کہا۔

"کیا......؟" امداد حسین چلاتے ہوئے بولے۔

"ہاں امداد صاحب یہ سانپوں کی خاص نسل

سے ہے جو سو سال بعد انسانی شکل وصورت اختیار کرلیتی ہے۔'' تیمور نے کہا پھر وہ اس نوجوان کی طرف مڑا۔ ''لیکن تم یہ کیا کہہ رہے تھے کہ امداد حسین کا باپ ایک سپیرہ تھا۔''

''ہاں...... بلکہ وہ تمہارے باپ کا سگا بھائی تھا!!!'' اس نوجوان نے انکشاف کیا۔

''کیا؟'' اس دفعہ تیمور حیران ہوا۔

''ہاں تمہارا باپ اور امداد حسین کا باپ سگے بھائی تھے۔'' اس نوجوان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' امداد حسین کو شاید یقین نہیں آرہا تھا۔

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں آج تک جو اپنے قتل ہوئے ہیں وہ تمہارے اور تیمور کے باپ کی وجہ سے ہوئے ہیں، صرف ایک ناگ منی کی خاطر، ناصر اور امداد حسین کے باپ کاشف نے میرے اور میری بہن کے ماں باپ کو ماردیا، صرف ایک ناگ منی کی خاطر۔'' اور یہاں تک کہہ کر اس نوجوان کی آواز رندھ گئی۔

''تمہاری بہن کہاں ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''وہ سامنے کھڑی ہے۔'' اس نوجوان نے جس طرف اشارہ کیا اس طرف دیکھ کر تیمور اور امداد حسین کو ایک زوردار جھٹکا لگا کیونکہ اس نوجوان نے اشارہ جس طرف کیا تھا وہ تھی حمیرا!

''حمیرا...... تت...... تت...... تم......'' امداد حسین کی زبان شاید ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''ہاں میں...... تمہارے باپ تمہاری ماں کو میں نے ہی قتل کیا ہے اور فہد کو بھی میں نے ہی ڈسا تھا۔'' اس دفعہ حمیرا نے جیسے دھماکہ کیا۔

''تم نے خود اپنے بیٹے کو ڈسا...... تیمور یقین نہ آنے والے لہجے میں بولا۔

''فہد میرا بیٹا نہیں ہے!! حمیرا نے ایک اور دھماکہ کیا۔

''ہاں تیمور حمیرا صحیح کہہ رہی ہے فہد میری پہلی بیوی سے ہے جو ایک کار ایکسیڈنٹ میں مرگئی تھی۔ حمیرا میرے آفس میں پرسنل سیکریٹری کی حیثیت سے آئی تھی۔ وہاں ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوگئی اور ہم دونوں نے کورٹ میرج کرلی۔ حمیرا کی گود سے کوئی اولاد نہیں ہے۔'' امداد حسین نے بتایا۔

''میں تم دونوں کو شروع سے ساری بات بتاتا ہوں۔'' یہ تقریباً آج سے پچیس سال پہلے کی بات ہے، ناصر اور امداد حسین کا باپ کاشف سانپوں کو پکڑ کر ان کا زہر بیچ کر اور تماشا دکھا کر پیٹ کی آگ بجھاتے تھے۔ ایک رات دونوں نے عجیب منظر دیکھا، سانپوں کا ایک جوڑا ناگ منی کے پاس کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ دونوں بھائیوں کے من میں لالچ جاگی تو انہوں نے دونوں سانپوں کا خاتمہ کرکے ناگ منی حاصل کرلیا، تھوڑی دیر بعد جب حمیرا اور میں واپس آئے تو اپنے ماں باپ کو مردہ حالت میں دیکھ کر سکتے میں آگئے ہم دونوں نے اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں ناصر اور کاشف کے چہرے دیکھے، ناصر اور کاشف ناگ منی کو پاکر بہت خوش تھے۔

رات سونے کے بعد کاشف کے من میں لالچ جاگی اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لیا اور راتوں رات وہ گھر چھوڑ دیا، اب میں نے اور حمیرا نے کاشف اور ناصر کی تلاش شروع کردی، ہم دونوں نے قسم کھائی تھی کہ ناصر اور کاشف کے خاندان کا مکمل طور پر خاتمہ کریں گے۔ جس رات کاشف اپنی بیوی بچوں کو لے کر بھاگا، میں نے ناصر کی بیوی کو ڈس لیا، بیوی کی چیخ کی آواز پر ناصر کی آنکھ کھلی۔ مرتی ہوئی بیوی نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ مرتے دم تک اس کے اکلوتے بیٹے تیمور کی حفاظت کرے گا۔

دوسری طرف کاشف راجن پور میں نئے نام سے رہنے لگا، اس نے ناگ منی کو ایک ڈبی میں بند کرکے اس پر منتر پڑھ کر اپنی تجوری میں رکھ لیا، کاشف کے دن، دن بدن بہتر ہونے لگے یہ ناگ منی کی خاصیت تھی کہ کاشف بہت جلد امیر ہوگیا۔

حمیرا نے کئی مرتبہ کاشف پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے منتروں کی وجہ سے اسے بچتا رہا، کاشف کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ بہت جلد مرنے والا ہے اس لئے اس نے ناگ منی کی وہ ڈبی امداد حسین کو دیدی مگر اصل حقیقت سے آگاہ نہ کیا۔ آخر کار ایک دن حمیرا اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی، اس نے کاشف کو ڈس لیا۔

میں نے کئی مرتبہ ناصر اور تیمور پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر ناصر چوکنا تھا، وہ ہر رات ایک طاقتور سانپ اپنی جھونپڑی میں چھوڑ دیتا، وقت کا پہیہ تیزی سے گھومتا رہا، تیمور، امداد اور احمد جواں ہوگئے جبکہ ہم دونوں بہن بھائی اس عمر کو پہنچ گئے جس عمر میں ہم انسانی شکل اختیار کرسکتے تھے، ہم دونوں کو ناگ منی کی بھی تلاش تھی لیکن کاشف کے پڑھے گئے اس منتر کی وجہ سے ہم دونوں بھائی بہن اس ڈبی کو تلاش نہیں کرپا رہے تھے پھر قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور امداد حسین کی بیوی کا کار ایکسیڈنٹ ہوگیا اور حمیرا انسانی روپ میں امداد حسین کے آفس میں کام کرنے لگ گئی، اس کا اتنا دل جیت لیا کہ امداد اس سے شادی کرنے پر مجبور ہوگیا۔ حمیرا امداد کو پہلے ہی بتا چکی تھی کہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

ایک رات میں نے دل میں پکی ٹھان لی تھی کہ ناصر کو ہر حالت میں ختم کردوں گا، اس مرتبہ بھی مجھے ایک طاقتور سانپ سے مقابلہ کرنا پڑا لیکن جیت میری ہی ہوئی، سانپ کو ختم کرنے کے بعد میں نے ناصر کو ڈس لیا۔ میں کافی زخمی ہوگیا تھا اس لئے تیمور کو چھوڑ کر وہاں سے نکل گیا۔

ادھر حمیرا نے اسی رات جان بوجھ کر سانپ کی کہانی گھڑ دی کہ اس نے بنگلے میں سانپ دیکھا ہے۔ اور پھر اسی رات حمیرا نے جنت بی بی کا کام تمام کردیا اور پھر فہد کو ڈسا لیکن اسے تیمور نے بچالیا۔

آج میں نے احمد کا خاتمہ کردیا اب میں نے تم تینوں امداد حسین، تیمور اور فہد کو ختم کرنے کے بعد اپنا ناگ منی لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا، اور میری بہن بھی۔'' یہاں تک کہہ کر وہ نوجوان خاموش ہوگیا۔

حرام زادے تو نے اور تیری اس کمینی بہن نے میرے ماں باپ کا خون کیا، میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' تیمور نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس نوجوان کے پیٹ میں لات ماری۔

نوجوان کو تیمور سے اس حرکت کی بالکل توقع نہ تھی وہ چیختا ہوا پیچھے جا گرا تو تیمور نے تیزی سے منہ ہی منہ میں منتر پڑھ کر اس نوجوان کی طرف ہاتھ کو جھٹکا دیا، نوجوان کے جسم میں تیزی سے آگ لگ گئی۔

''نہیں'' حمیرا چلائی۔

''اگر تو نے بچنے کی کوشش کی تو تیرا حال بھی تیرے بھائی جیسا کردوں گی۔'' تیمور نے حمیرا کو دھمکی۔ ''تو کیا سمجھتی ہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ تو ایک ناگن ہے، میں نے تو اسی وقت تیرے جسم کی بو سونگھ لی تھی جب میں اس گھر میں آیا تھا۔ مگر میں امداد حسین کی آنکھوں کے سامنے یہ منظر لانا چاہتا تھا۔ اب تو بھی اپنے بھیانک انجام کے لئے تیار ہوجاؤ۔'' تیمور نے کہا اور پھر حمیرا کا حال بھی اپنے بھائی جیسا ہی ہوا۔

''امداد صاحب آپ یہ ناگ منی مجھے دیدیں تاکہ میں سانپوں کو ان کی یہ امانت لوٹا دوں۔'' تیمور نے کہا۔

''امداد صاحب نہیں امداد بھائی کہو، تم میرے چچا کے بیٹے ہو، اور اس طرح میرے بھائی ہو۔'' امداد حسین نے تیمور کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اور اب تم میرے ساتھ یہاں رہو گے۔''

''نہیں امداد بھائی میں جھونپڑیوں میں رہنے والا، ان محلوں میں نہیں رہ سکتا، یہ حویلیاں یہ بنگلے آپ کو ہی مبارک، آپ مجھے بس یہ ناگ والی ڈبی دے دیں۔'' تیمور نے کہا تو امداد حسین نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ ڈبی تیمور کو پکڑا دی۔

مردوں کا جنگل

ایس امتیاز احمد-کراچی

پورے جنگل میں ہو کا عالم تھا خوف نے نوجوانوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا کہ انھوں نے سامنے ایک کٹیا دیکھی اور وہ اس طرف بڑھنے لگے اور جب وہ اس جگہ پہنچے تو ان کی موت آگے بڑھی اور پھر......

خاموشی کا سینہ چیرتی موت کی آواز جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی

چالیس سال کی عمر کا صحت مند اور دراز قد ہیڈن قلپ کئی سال سے ناٹال افریقہ میں مقیم تھا۔ اس کے پاس دو چھکڑے جن کے ذریعے وہ زولولینڈ کے قبائل سے تجارت کرتا تھا۔ ایک بار ایک دکان دار کے ساتھ اس کی لڑائی ہوگئی، اس نے چاقو سے دکاندار کو شدید زخمی کر دیا اور سزا سے بچنے کے لئے وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس نے زولو قبائل کے لئے بہت سا سامان جمع کرلیا جسے بیچنے کے لئے زولولینڈ گیا، سامان بیچ کر اسے خیال آیا کہ تجارت کو جاری رکھنے کے لئے اسے ناٹال جانا پڑے گا مگر وہ گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر وہاں نہ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ لو چلو بہت کما لیا اور اب کچھ وقت شکار کھیلا جائے، تفریح بھی ہو جائے گی اور ممکن ہے اس عرصے میں اس کی مشکل کا کوئی حل بھی نکل آئے۔

چند روز بعد وہ زولو کے بادشاہ سیٹی وایو کے پاس اس کے جنگلوں میں شکار کھیلنے کی اجازت کے حصول کے لئے جا پہنچا۔ سیٹی وایو نے شکار کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا جس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں زولو بادشاہ اور ناٹال کے سفید فام حکام کے درمیان سخت اختلافات پیدا ہوگئے تھے اور دونوں کے درمیان کسی وقت بھی خون ریز قسم کی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا۔

''میرا خیال تم شکار کے بہانے یہاں جاسوسی کرنے کے لئے آئے ہو۔'' بادشاہ نے شبہ کا اظہار کیا۔ ہیڈن نے اس کی تردید کی، لیکن سیٹی وایو کا شک دور نہ ہوا۔ آپ کچھ بھی سمجھیں لیکن میں جاسوس نہیں ہوں۔ میں تو صرف یہاں شکار کھیلنے آیا ہوں۔ اگر آپ اجازت نہیں دیتے تو بھی مجھے کوئی افسوس نہیں ...... بہرحال میں اپنی طرف سے ایک شاندار بندوق آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں ہیڈن نے کہا۔ ابھی دونوں کی گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔

دربان نے بڑے ادب کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ زولو ملاقاتی آئے ہیں۔

''بھیج دو۔'' سیٹی وایو نے کہا اور تھوڑی دیر بعد دو زولو وہاں آئے، ان میں سے ایک دراز قد صحت مند نوجوان زولو سپاہی تھا اور پوری طرح مسلح، وہ کپتان تھا، دوسرا آدمی ادھیڑ عمر تھا اور غیر مسلح وہ سپاہی نہیں تھا۔

نوجوان کپتان ادب سے زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''میرا نام ناہون ہے، میں زومبا کا بیٹا ہوں۔ یہ میرا ماموں انگوتا ہے میرے باپ کی سب سے چھوٹی بیوی کا بھائی۔''

"تم یہاں کیوں اور کس لئے آئے ہو فوج کو چھوڑ کر یہاں آنے کی تمہیں جرأت کس طرح ہوئی؟" بادشاہ نے گرج کر پوچھا۔

"میں اپنے افسر سے رخصت لے کر حاضر ہوا ہوں۔" ناہون نے جواب دیا اور میرے آنے کا مقصد آپ سے اجازت حاصل کرنا ہے۔

"کس بات کی اجازت؟" بادشاہ نے پھر اسی غصیلے لہجے میں دریافت کیا۔

"میرے ماموں کی ایک بیٹی ہے۔ تانیا اس کا نام ہے، ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی اجازت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ شادی کے معاوضے کے طور پر اپنے ماموں کو پندرہ عمدہ گائیں اور بچھڑیں پہلے ہی دے چکا ہوں، لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ ہی کے علاقے کا ایک سردار ماپوتا جو بڑا طاقت ور ہے ہماری شادی کی راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے، کیوں کہ وہ بھی تانیا سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے۔"

"خاموش" سیٹی وایو نے چیخ کر کہا۔ "تمہیں شرم نہیں آتی کہ اس وقت شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کررہے ہو جب سفید فام ہمارے سروں پر جنگ مسلط کرنے کے لئے پر تول رہے ہیں، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ کل ہی میں نے بیس لڑکیوں اور ان کے باپوں کو موت کی سزا دی ہے اس لئے کہ انہوں نے میری اجازت کے بغیر اپنی بیٹیوں کی شادیاں کردی تھیں، میں نے ان کی لاشیں چوراہوں پر پھنکوادیں تاکہ دوسروں کو عبرت ہو کیا تم لوگ بھی اپنا یہی حشر چاہتے ہو تمہاری گستاخی کی سزا بڑی ہے لیکن چونکہ تم میری فوج کے افسر ہو، میں تمہیں معاف کرتا ہوں، شادی کا خیال دماغ سے نکال دو اور سن بڈھے! تیری سزا یہ ہے کہ تو اگلے چاند کے پہلے ہفتے میں اپنی بیٹی جسے ناہون بڑی خوبصورت دوشیزہ کہتا ہے اور پندرہ گائیں اور بچھڑے جو تمہیں پیش کئے، لے کر شاہی محل میں حاضر ہوجا۔ تانیا اگر واقعی خوبصورت ہوئی تو میں اسے اپنی بیوی بناؤں گا۔"

ہیڈن خاموشی سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا بڈھے اگوتا کا رنگ یک لخت زرد پڑ گیا۔ ناہون کا البتہ حال مختلف تھا۔ ہیڈن نے دیکھا بادشاہ کے انکار سے پہلے تو اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے پھر آہستہ آہستہ اس کی جگہ غصے نے لے لی۔ اس کی گردن اور پیشانی کی رگیں تن کر ابھر آئیں۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ ذرا دیر بعد یہ تاثرات ماند پڑ گئے۔

"سنو! ناہون...... ابھی فوج میں واپس جانے کی بجائے تم اس سفید فام کے ساتھ جاؤ، یہ ہمارے جنگلوں میں شکار کھیلنے کا خواہش مند ہے، یہ ہمیں ایک بندوق بھی پیش کرچکا ہے، اس لئے اسے شکار کی اجازت ہے، جاؤ اور اسے ساتھ رکھو، یہ دھیان رکھنا کہ یہ بھاگ نہ جائے، مجھے اس سے کئی کام لینے ہیں۔ جاتے ہوئے اپنے ساتھ کچھ سپاہی لیتے جاؤ، اگلے چاند کے پہلے ہفتے میں اسے لے کر یہاں آجانا، اب تم جاسکتے ہو۔"

دس دن تک وہ جنگل میں مارے مارے پھرتے رہے لیکن انہیں شکار نہ ملا، ایک روز وہ ایک پہاڑی کے دامن میں ڈیرہ ڈالے پڑے ہوئے تھے، ہیڈن سمجھ چکا تھا کہ وہ قیدی ہے اور ناہون اس کا نگران...... وہ سوچ رہا تھا کہ موقع ملتے ہی فرار ہوجائے، اس وقت ہیڈن اور ناہون ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑے تھے، ان کے بائیں طرف ایک چھوٹا سا بے حد گھنا جنگل تھا، جنگل کے بیچوں بیچ ایک دریا گزرتا تھا، "اس جنگل کا کیا نام ہے؟" ہیڈنے دریافت کیا۔

"مردوں کا جنگل......" ناہون نے بے خیالی میں جواب دیا۔ وہ اس وقت تانیا کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا گھر وہاں سے کوئی ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔

"مردوں کا جنگل...... وہ کس طرح؟" ہیڈن نے تعجب سے پوچھا۔

"اس لئے کہ وہاں روحیں رہتی ہیں اور وہ تمام روحیں زندہ ہیں۔ وہاں کوئی زندہ انسان نہیں جاسکتا۔"

ہیڈن آہستہ آہستہ آگے بڑھا، چٹان کے کنارے پر کھڑے ہوکر اس نے پھر غور سے دیکھا۔ بائیں جانب ایک گہری جھیل تھی اور اس کے دامن میں اس راستے پر جو چٹان اور جنگل کے درمیان تھا، ایک جھونپڑی تھی تنہا اکیلی جھونپڑی۔ "اس جھونپڑی میں کون رہتا ہے......؟" ہیڈن نے متعجب ہوکر پوچھا۔

"عظیم کاہنہ سانوسی...... جس کا مطلب ہے گمس شہد کی مکھی کیونکہ وہ ان روحوں سے مستقبل کی پیشگوئیاں جمع کرتی ہیں جو مردوں کے جنگل میں رہتی ہیں۔"

"کیا وہ یہ بتاسکے گی کہ مجھے کوئی شکار ملے گا یا نہیں۔"

"شاید......" ناہون نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جو لوگ کاہنہ کے پاس جاتے ہیں یا تو انہیں کچھ بھی سننا نہیں پڑتا یا پھر انہیں وہ باتیں سننی پڑتی ہیں جن کا ذکر انہیں ناگوار گزرتا ہے۔"

ناہون اور ہیڈن کاہنہ کی جھونپڑی میں داخل ہوگئے، وہ عجیب و غریب حلیے میں تھی شیر کی گندی کھال میں ملبوس اس بوڑھی کاہنہ کو دیکھ کر دل پر خوف طاری ہوجاتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چیتے کی آنکھوں جیسی چمک اور عیاری تھی۔ وہ جلتے ہوئے الاؤ کے پاس بیٹھی تھی جس کے گرد انسانی کھوپڑیاں یوں جوڑ، جوڑ کر کے رکھی تھیں جیسے وہ آپس میں باتیں کررہی ہوں...... ہیڈن نے دیکھا اس کی گردن کے گرد ایک سانپ لپٹا ہوا تھا اور اسے پتہ تھا کہ وہ افریقہ کا سب سے زہریلا اور خطرناک ترین قسم کا سانپ ہے...... ہیڈن اور ناہون چپ چاپ اس کے پاس بیٹھے رہے۔

"سفید فام کس لئے آئے ہو؟" بوڑھی کاہنہ نے کہا۔ "بولتے کیوں نہیں؟ لیکن نہیں...... تمہارے بولنے کی ضرورت نہیں، میں تمہارے خیالات پڑھ سکتی ہوں...... اور ناہون زومبا کے بیٹے! تمہیں تو اپنی فوج کے ساتھ ہونا چاہئے تھا، سفید فاموں سے جنگ کرنے کے لئے جو سفید فاموں اور زولوؤں کی آخری خوفناک جنگ ہوگی۔ اگر جنگ سے خوف زدہ ہو تو تمہیں حسین تانیا کے پاس ہونا چاہئے تھا مگر تم زندگی میں اس سے نہیں مل سکتے۔"

"میں اس لئے آیا ہوں کہ تم اپنے علم سے مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کوئی شکار ملے گا یا نہیں......" ہیڈن نے کہا، ناہون نے کوئی جواب نہ دیا وہ ادب سے بیٹھا رہا...... کاہنہ نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی۔

"سفید فارم بتاؤ مجھے اس کا کیا معاوضہ دوگے۔"

"اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔" ہیڈن نے کہا۔

"کوئی بات نہیں......" کاہنہ نے پھر قہقہہ لگاتے ہوئے۔ "کہا کوئی بات نہیں میں زیادہ لالچی نہیں ہوں...... میں معاوضہ پھر لے لوں گی۔ اس وقت جب ہم دوبارہ ملیں گے اور وہ وقت دور نہیں۔"

پھر کاہنہ دفعتاً اپنی جگہ سے اچھلی اور اس سے پہلے کہ ہیڈن کچھ سمجھ سکتا، اس نے اس کے سر سے بالوں کی ایک لٹ کاٹ لی۔ "بس مجھے یہی کچھ درکار تھا، آئے ہو تو اپنی تقدیر کا لکھا سن لو...... زومبا کے بیٹے تم بھی اپنے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر مجھے دو۔"

ناہون نے فوراً کاہنہ کے حکم کی تعمیل کی۔ اب وہ پھر آگ کے روبرو کھڑی تھی، اس نے اپنے تھیلے میں سے چند خشک جڑی بوٹیاں نکالیں اور شعلوں میں پھینک دیں۔ گاڑھا نیلگوں دھواں اٹھا اور اس نے کاہنہ کے چہرے کو لپیٹ میں لے لیا۔ پھر اس نے ہیڈن اور ناہون کے بالوں کی لٹیں بھی آگ میں پھینک دیں جو چرمرا کر جلنے لگیں...... اب وہ زور زور سے سانس لے کر دھواں اپنے پھیپھڑوں میں کھینچ رہی تھی۔ چند لمحوں میں اس کا جسم اکڑنے لگا، اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور دفعتاً بیٹھ گئی۔ اس کا سر اوپر کی جانب اٹھا ہوا تھا، ہیڈن نے دیکھا اس کے چہرے کا رنگ نیلگوں ہوچکا تھا، اور آنکھیں اپنے حلقوں میں

اس طرح ڈوب گئی تھیں جیسے مردے کی...... تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی...... پھر وہ بولنے لگی۔

”سن اے سفید فام!، تیرا جسم خوبصورت اور سفید ہے، لیکن دل سیاہ ہے تجھے شکار ضرور ملے گا اور وہ تجھے مردوں کے جنگل میں لے جائے گا، اس کی شکل ایک شیر کی ہوگی۔ وہ دوشیزہ جسے بادشاہ اور دریا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ سفید جسم اور سیاہ دل !میرے الفاظ اس وقت یاد کرنا جب جنگ کی حشر سامانیاں تیرے اردگرد پوری شدت سے برپا ہوں گی اور میرے لفظ ان آخری لمحات میں موت کے روبرو کھڑے ہوں گے۔

سن اے سیاہ چہرے اور سیاہ جسم والے ناہون !میں تیرے دل میں جھانکتی ہوں جو دودھ کی طرح سفید ہے...... ہاں جنگ کا بازار گرم ہے۔ تعاقب کر کیوں کہ وہ زبان جو جھوٹ بولتی ہے رحم کی درخواست نہیں کر سکے گی۔

”سفید دل !موت کیا ہے؟ موت میں زندگی ہے، اور مردوں کے درمیان تو اپنی زندگی تلاش کرے گا جو کھوگئی کہ وہ جسے بادشاہ اور دریا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے وہاں تیرا انتظار کرتی ہوگی۔“

”سفید فام تو ہنس کیوں رہا ہے؟“ ناہون نے پوچھا۔

”میں اس بڑھیا کی بے معنی باتوں پر ہنس رہا ہوں“ ہیڈن نے کہا۔

”وقت بتائے گا کہ یہ باتیں بے معنی ہیں یا بامعنی۔“ کاہنہ نے کہا۔ اس کی نظر ہیڈن کی انگلی میں پڑی ہوئی اس طلائی انگوٹھی پر پڑی جو سانپ کی شکل کی تھی، سانپ کی آنکھوں کی جگہ دو چھوٹے چھوٹے قیمتی زمرد جڑے ہوئے تھے۔

”سفید فام ایک سانپ میرے گلے میں ہے اور دوسرا یہ تم مجھے دے دو۔“ کاہنہ نے کہا۔ ”میں اسے اپنی انگلی میں پہنوں گی۔“

”اس کے لئے تو تمہیں میری موت کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ ہیڈن نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ کاہنہ نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ”میں اس وقت کا انتظار کروں گی جب تم مردہ ہو گے۔ اس وقت یہ انگوٹھی لے لوں گی اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکے گا کہ میں نے چوری کی ہے۔ ناہون تم سفید فام کے اس وعدے کے گواہ ہوگے۔“

ہیڈن کانپ گیا۔ کیا بڑھیا جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سچ ثابت ہوگا؟ مگر جلد ہی اس نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور ناہون سے کہا۔ ”اٹھو چلیں۔“

دوسرے ہی دن کاہنہ کی پہلی پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی۔ اس روز بھی وہ شکار کی تلاش میں نکلے تھے۔ اور بالکل غیر متوقع طور پر انہیں جنگل میں ایک جگہ بھینسیں ملی تھیں اور ان کے ساتھ ایک قوی ہیکل بھینسا تھا۔ ہیڈن اور اس کے ساتھی پیٹ کے بل رینگتے ہوئے آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھنے لگے بندوق صرف ہیڈن کے پاس تھی اس کے ساتھی تیروں اور برچھیوں سے مسلح تھے۔ تیس گز کے فاصلے پر پہنچ کر ہیڈن رک گیا۔ اور بھینس کا نشانہ لے کر اس نے پہلی گولی چلائی جو شاید اس کے دل میں لگی اور بھینس مرگئی۔ دوسری بھینسوں نے بھاگنے کی بجائے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ ہیڈن نے فوراً دوسرا کارتوس نال میں ڈال کر بھینسے کا نشانہ لیا اور گولی چلادی جو بھینسے کی گردن یا شاید کندھوں پر لگی۔

وہ اگلی ٹانگوں کے بل زمین پر گرا پھر دفعتاً اٹھا اور بھاگ کھڑا ہوا، اور اس کے پیچھے ریوڑ دوڑ پڑا۔

ہیڈن نے کچھ آدمی تو مری ہوئی بھینس کا گوشت کاٹ کر کیمپ میں لے جانے کے لئے وہیں چھوڑ دیئے اور خود ناہون اور چند ساتھیوں کے ہمراہ زخمی بھینسے کے تعاقب میں چل پڑا۔ زمین پر گرے ہوئے خون کے دھبے ان کی رہنمائی کر رہے تھے...... لمبی لمبی گھاس جھاڑیوں اور سبزے کو عبور کرتے ہوئے آخر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں زمین پتھریلی تھی۔ لیکن یہاں آکر خون کے دھبے غائب ہوگئے تھے۔ کئی گھنٹے کے طویل سفر اور دھوپ کی وجہ سے وہ تھک گئے تھے۔

اس لئے انہوں نے درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھ کر خشک گوشت کھانا شروع کردیا، ان کے چار ساتھی پانی پینے کے لئے قریب ہی بہتی ہوئی ایک ندی کی طرف چلے۔ بمشکل آدھ منٹ بعد ایک ہولناک چیخ سنائی دی۔ سب نے چونک کر دیکھا۔ ان کا ایک ساتھی فضا میں بلند تھا...... دوسرے لمحے وہ زمین پر گرا تو سب اس کی طرف دوڑے پڑے۔

زخمی بھینسا ان کے قریب ہی ندی کے کنارے گھنی جھاڑی میں دیر سے چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک آدمی پر حملہ کیا اور نوکیلے سینگوں پر اٹھا کر اوپر اچھال دیا تھا اس آدمی کا سینہ کھل گیا تھا اور وہ مر چکا تھا۔ بھینسا بھاگ اٹھا، ہیڈن اور ناہون کو اپنے ساتھ لے کر اس کے تعاقب میں چل پڑا۔

”جانتے ہو۔ اس وقت ہم کہاں ہیں؟“ ایک چھوٹی سی چٹان پر کھڑے ہوئے ناہون نے ہیڈن سے کہا۔ ”وہ دیکھو سامنے مردوں کا جنگل ہے اور بھینسے کا رخ اسی طرف ہے۔“

”ٹھیک ہے ہمیں اس کے پیچھے جنگل میں جانا پڑے گا۔“

”نہیں تم مردوں کے جنگل میں نہیں جاؤ گے۔“ ناہون بولا۔

”میں ضرور جاؤں گا۔ ہاں اگر تم خوف زدہ ہو تو بے شک یہیں رہو، میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔“ ہیڈن نے جواب دیا۔

”میں روحوں سے خوف زدہ ضرور ہوں لیکن اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔“ ناہون نے کہا۔ ”اس لئے کہ بادشاہ نے مجھے حکم دیا تھا کہ ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں اور تمہاری نگرانی کروں۔“

دونوں مردوں کے جنگل میں داخل ہوگئے۔ وہ واقعی بہت ڈراؤنی جگہ تھی۔ بلند و بالا درختوں کی پھیلی ہوئی شاخیں اوپر جا کر آپس میں مل گئی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پورے جنگل پر ایک چھت سی پڑی ہوئی ہے۔ ہوا میں عجیب قسم کی نمدار بو رچی ہوئی تھی اور پورے جنگل پر پراسرار سناٹا طاری تھا۔ کسی پرندے کی چہکار تک سنائی نہ دیتی تھی۔ دونوں جنگل میں آگے ہی بڑھتے چلے گئے جا بجا گلے سڑے پتوں اور نمدار زمین پر پڑے ہوئے خون کے دھبے ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ کوئی ایک میل آگے جا کر انہوں نے دیکھا کہ خون کے دھبے اب بڑے بڑے ہوگئے تھے بلکہ اب تو خون کی ایک لکیر دکھائی دینے لگی تھی جس کا مطلب تھا کہ بھینسے کے زخم کا منہ زیادہ کھل گیا ہے اور خون زیادہ تیزی سے بہنے لگا ہے ہلکی سی روشنی میں وہ احتیاط سے چلتے ہوئے کچھ ہی آگے گئے ہوں گے کہ ناہون یک لخت رک گیا۔ کچھ دیر وہ غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”ادھر دیکھو! ان دور درختوں کے تنوں کے درمیان۔“ ہیڈن نے بھی غور سے دیکھا۔ دونوں تنوں کے درمیان اس طرف کوئی سیاہ رنگ کی بڑی سی چیز تھی۔ پھر اسے سینگ نظر آئے۔ وہ بھینسا تھا جو بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ہیڈن نے کہا کہ وہ مر چکا ہے۔ لیکن ناہون نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس پر ایک اور گولی چلاؤ۔“

ہیڈن ایک گھٹنا ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے بھینسے کا نشانہ لیا اور گولی چلادی جنگل کی گھمبیر خاموشی میں ایک خوف ناک دھماکہ ہوا گولی بھینسے کی ریڑھ کی ہڈی پر لگی اگلے لمحے بھینسا اٹھا اور ان کی طرف لپکا...... ہیڈن کے لئے اتنا وقت نہیں تھا کہ بندوق کھول کر دوسرا کارتوس ڈال سکے بھینسا سر پر آن پہنچا تھا۔ موت سر پر کھڑی تھی...... لیکن دفعتاً ناہون اپنا نیزہ تول کر آگے بڑھا اور جونہی بھینسا اس کی زد میں آیا پوری قوت سے نیزہ بھینسے کے جسم میں اتار دیا۔ بھینسا رک گیا ادھر ادھر دیکھا اور گر پڑا۔ اب وہ مر چکا تھا۔

ہیڈن اور ناہون واپس چل پڑے۔ ہیڈن کو ایک خیال سوجھا...... فرار کا یہ بہترین وقت ہے، اس نے سوچا۔ ”میں اگر دوڑ پڑوں تو ایک گھنٹے میں زولو لینڈ کی سرحد پر پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں...... ناہون اس وقت اکیلا میرے ساتھ ہے۔ اس

کا نیزہ ٹوٹ چکا ہے اور وہ بالکل غیر مسلح ہے اس کے مقابلے میں میرے پاس بھری ہوئی بندوق ہے۔ اگر اس نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں آسانی سے گولی کا نشانہ بنا سکتا ہوں۔"

ہیڈن نے ایک درخت تلے رک کر بندوق کی نالی ناہون کی طرف کردی اور کہا۔ "ناہون! اپنی جگہ سے جنبش نہ کرو ورنہ گولی چلا دوں گا، میری بات سنو اور سمجھنے کی کوشش کرو، تمہیں معلوم ہے میں یہاں قیدی ہوں۔ اب میں آزادی چاہتا ہوں، اور آزادی کا یہ بہترین وقت ہے، اگر تم میرا راستہ نہ روکو تو میں ایک گھنٹہ بعد زولو لینڈ کی سرحد عبور کر جاؤں گا اور اگر تم میری راہ میں حائل ہوئے تو یہ نہ بھولنا کہ میرے پاس بندوق ہے۔"

ناہون...... بڑے پرسکون انداز میں اس کی طرف تھوڑی دیر دیکھتا رہا پھر بولا۔

"سفید فام تم واقعی سیاہ دل ہو...... تم جانتے ہو کہ بادشاہ نے مجھے تمہاری نگرانی کا حکم دیا تھا...... پھر میں تمہیں جانے کی کس طرح اجازت دے سکتا ہوں؟"

"تم اس بادشاہ کا حکم مان رہے ہو جو تمہاری منگیتر پر قبضہ جمانے کی فکر میں ہے...... چھوڑو اسے اور اگر چاہو تو تم بھی میرے ساتھ بھاگ چلو۔"

"اپنے سارے خاندان کو بادشاہ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر میں کیسے جا سکتا ہوں سفید فام۔"

"تو پھر میرا راستہ نہ روکو...... مجھے جانے دو۔" ہیڈن نے کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا...... تم میرے سینے پر گولی مار کر ہی فرار ہو سکو گے۔ میں سپاہی ہوں اور اپنے فرض کو پہچانتا ہوں۔ لو مارو گولی۔"

ناہون مسکراتا ہوا سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

"میں تمہاری بہادری اور فرض شناسی کی داد دیتا ہوں۔" ہیڈن نے بندوق سے اس کے دل کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہیں ہلاک کرتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے۔ لیکن میں اپنی جان کی حفاظت کے لئے ایسا کر رہا ہوں۔"

ہیڈن لبلبی دبانا چاہتا ہی تھا کہ قریبی درخت کی ایک موٹی شاخ پر موجود ایک چیتا غرایا اور بجلی کی طرح ہیڈن پر کود پڑا۔ دوسرے ہی لمحے بندوق دور جا پڑی تھی، ہیڈن زمین پر پڑا ہوا تھا اور چیتا اس کے سینے پر سوار تھا، چیتے کا ایک پنجہ ہیڈن کی ران میں اور دوسرا سینے میں اتر گیا۔ چیتے نے منہ کھول کر ہیڈن کے سر کو جبڑوں میں لینا چاہا تو چیتے کی پیٹھ پر زور سے ڈنڈا پڑا۔ چیتے نے ہیڈن کو چھوڑ دیا اور ناہون پر لپکا۔ اسے ڈنڈا اسی نے مارا تھا۔ اس کا نیزہ تو بھینسے کے جسم میں ٹوٹ گیا تھا اب اس کے ہاتھ میں اتفاق سے درخت کی موٹی اور خشک شاخ آ گئی تھی۔ چیتا اس کی طرف مڑا تو ناہون نے اس کے منہ پر ڈنڈا مارا اور اس کی جست کی زد سے ایک طرف ہو گیا۔ چیتا پیچھے ہٹ کر پھر حملہ آور ہوا لیکن ناہون بہت پھرتیلا ثابت ہوا۔ وہ ہر حملے میں چیتے کے منہ اور سر پر وار کرتا تھا، ہیڈن ایسا بری طرح زخمی تھا کہ ناہون کی مدد کرنے کے قابل نہ تھا۔ آخر ناہون نے چیتے کی کھوپڑی توڑ کر مار دیا۔

ہیڈن نے اس کا شکریہ ادا کیا تو ناہون نے اس سے کہا۔ "شکریہ ہمارے بادشاہ کا ادا کرو جس نے مجھے تمہاری حفاظت کے لئے مجھے ساتھ بھیجا ہے۔" ناہون بات کر ہی رہا تھا کہ ہیڈن پر غشی طاری ہو گئی۔

جب ہیڈن کو ہوش آیا تو اس نے ایک نسوانی آواز سنی۔ "ناہون! سفید فام کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔"

"کوئی بات نہیں تانیا!" ہیڈن کو ناہون کی آواز سنائی دی۔ "یہ خطرے سے نکل آیا ہے۔ زخم جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ناہون۔" تانیا نے دکھی لہجے میں کہا۔ "ناہون! اگر تم سفید فام کی بات مان لیتے تو کیا حرج تھا؟ اس نے تمہیں بھی اپنے ساتھ بھاگ چلنے کے لئے کہا تھا۔ اس کی بھی جان بچ جاتی اور تمہاری بھی...... اب بھی وقت ہے۔ آؤ یہاں سے بھاگ چلیں، اس وقت سے اگر ہم نے فائدہ نہ اٹھایا تو ہم ایک دوسرے کو ساری عمر نہ پا سکیں گے۔"

"میرا امتحان نہ لو تانیا۔" ناہون نے جواب دیا۔ "محبت اور فرض کی جنگ میں فرض نے فتح پائی ہے میں سپاہی ہوں بادشاہ کا ہر لفظ اور ہر حکم میرے لئے تقدیر کی حیثیت رکھتا ہے۔"

"نہیں ناہون۔" تانیا نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "اپنے آپ کو فریب نہ دو، تم اس بادشاہ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر رہے ہو جو تمہاری منگیتر پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہے۔" تانیا نے کہا۔ "صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں مجھ سے بالکل محبت نہیں ہے۔"

"یہ بات کہہ کر میرے دل کے ٹکڑے نہ کرو تانیا۔ چپ رہو، خدا کے لئے مجھے مجبور نہ کرو...... تم نہیں جانتیں کہ میرے جذبات کی کیا حالت ہے۔" ناہون نے گلوگیر آواز میں کہا اور تانیا کے جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گیا، تانیا اب سسکیاں لے رہی تھی۔

ہیڈن نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف دیکھا...... اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ بادشاہ کے سامنے ناہون نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ خوب صورت تھی، بلاشبہ بے پناہ خوب صورت بہت دیر تک ہیڈن کی نگاہیں اس کے دل کش چہرے اور سڈول بدن کا جائزہ لیتی رہیں۔ تانیا اپنے خیالوں میں ڈوبی پریشان اور رنجیدہ جھونپڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اس کی نظر ہیڈن پر پڑی تو بولی۔ "ہوش آ گیا تمہیں سفید فام۔"

"ہاں، شکریہ خاتون۔" ہیڈن نے جواب دیا۔ "لیکن میں اٹھ نہیں سکتا۔"

تانیا نے دودھ کا پیالہ اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے ہیڈن کو سہارا دے کر بٹھا دیا۔ اور بولی...... "دودھ پی لو۔"

ہیڈن نے دودھ پیا تو جیسے اس کے رگ و پے میں ایک نئی روح دوڑ گئی۔ ہیڈن کو لٹا کر وہ خاموشی سے اس کے زخموں کی مرہم پٹی کرنے لگی۔ ہیڈن چپ چاپ اس کو دیکھتا رہا، اس پر زولو لڑکی کے حسن کا سحر طاری ہو چلا تھا۔ تانیا مرہم پٹی سے فارغ ہو کر اٹھی اور پھر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

ہیڈن نے اس کے اچھے سلوک کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ اپنے بادشاہ کی ملکہ بن رہی ہو۔"

تانیا نے آہ بھر کر کہا۔ "کاش ایسا کبھی نہ ہو، یہی تو ایک غم ہے جو مجھے کھائے جا رہا ہے۔"

ہیڈن اس کے جذبات کو خوب سمجھتا تھا، اس نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا "غم نہ کرو...... انتظار کرو...... بڑی کٹھن مشکلیں آسان ہو جایا کرتی ہیں۔"

تانیا ہر روز آتی اور اس کی مرہم پٹی اور تیمارداری کر کے چلی جاتی۔ وہ ہیڈن کے دل میں اترتی چلی جا رہی تھی لیکن وہ کبھی اظہار محبت کی جرأت نہ کر سکا آخر وہ وقت آیا کہ ہیڈن کے زخم بھر آئے اب وہ ہر وقت جھونپڑی میں رہنے کی بجائے وقتاً فوقتاً باہر ٹہلنے کے لئے بھی نکل جاتا تھا۔

ایک روز شام کے جھٹپٹے میں وہ باہر نکلا، دور دور تک سبزہ اور جھاڑیاں تھیں وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور تانیا ہی کے بارے میں سوچنے لگا۔ تانیا چشمے سے پانی بھر کر آ رہی تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب آ رہی تھی لیکن اس نے ابھی تک ہیڈن کو دیکھا نہیں تھا جب وہ اس سے تھوڑے سے فاصلے پر رہ گئی تو اچانک ایک چھوٹا سے سانپ جو شاید راستے میں پڑا تھا تانیا کے قدموں کی چاپ سن کر اٹھا اور جلدی سے گھاس میں چلا گیا۔ تانیا خوف زدہ ہو کر اچھلی تو پانی کا گھڑا اس کے سر سے گر گیا اور سارا پانی بہہ گیا۔ ہیڈن جلدی سے آگے بڑھا اور بولا۔ "کوئی بات نہیں تانیا تم یہیں رکو، میں تمہارے لئے چشمے سے پانی لے کر آتا ہوں۔"

"نہیں سفید فام شکریہ...... میں خود ہی لے آتی ہوں۔" تانیا نے کہا لیکن ہیڈن گھڑا اٹھا کر چشمے کی طرف جا چکا تھا جب وہ پانی لے کر واپس آیا تو تانیا وہیں

کھڑی تھی۔

"کہو تو میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں۔" ہیڈن نے کہا اور شکریہ کے لہجے میں کہنے لگا۔ "تم نے میری جان بچائی ہے اگر تم نہ ہوتیں تو اب تک میں مر چکا ہوتا۔"

"میں نے نہیں بلکہ ناہون نے چیتے کو ہلاک کر کے تمہاری زندگی بچائی اور پھر زخمی ہونے کے باوجود تمہیں اٹھا کر یہاں تک لایا۔"

"لیکن اس نے میرا جسم بچایا اور تم نے میری روح کو نئی زندگی بخشی ہے۔" ہیڈن نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "سنو تانیا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"مجھ سے؟ ایک زولو لڑکی سے؟" تانیا نے حیرت زدہ ہو کے کہا۔ "سفید فام تم یہ کہہ رہے ہو؟"

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں تانیا۔ میں تم کو اپنی بیوی بنانے کا خواہش مند ہوں۔"

"شکریہ سفید فام، تم نے مجھے عزت بخشی ہے۔ لیکن میں پہلے ہی کسی کی ہو چکی ہوں۔"

"لیکن تمہاری شادی بادشاہ سے ہونے والی ہے۔"

"یہ شادی نہیں ہوگی سفید فام۔ زولو لڑکیاں اپنی محبت کے لئے جان دے دیا کرتی ہیں۔ میں دریا میں خود کو خودکشی کر لوں گی۔"

"تم جیسی حسین لڑکی کو بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہئے تانیا۔ میری مانو اور میرے ساتھ چلی چلو۔ ہم راتوں رات زولو لینڈ سے نکل کر ناتال چلے جائیں گے۔"

"نہیں سفید فام میں ناہون کی ہو چکی ہوں۔ اب اس سے مجھے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔"

ہیڈن بے بس ہو گیا۔ اس زولو لڑکی کے آگے وہ شکست کھا گیا۔ لیکن ابھی اس کے پاس ایک حربہ تھا مکاری کا...... وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ اور پھر بولا۔

"ٹھیک ہے تانیا...... میں تمہاری محبت اور وفا کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تم کسی اور کی ہو لیکن میری محبت کا تقاضہ ہے کہ میں تمہیں خوش دیکھوں اور تمہاری حفاظت کروں۔ ابھی مجھے ایک تجویز سوجھی ہے تم اگر ناہون کو تیار کر لو تو ہم سب اکٹھے یہاں سے فرار ہو کر ناتال چلے جائیں گے وہاں تم دونوں شادی کر لینا، اور بلا خوف و خطر میرے پاس رہنا۔ زولو بادشاہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تم لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے تیار ہوں گا۔"

"مگر ناہون مانے گا نہیں۔" تانیا نے کہا۔

"تم کوشش کرو تانیا، اگر وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے تو ضرور مانے گا۔ تم اسے چلنے پر مجبور کرو۔"

"بہتر ہے میں کوشش کروں گی، شاید...... شاید وہ مان جائے۔"

اس رات نصف شب کے قریب ہیڈن کی جھونپڑی پر آہستگی سے دستک ہوئی اس کے ساتھ ہی تانیا اندر آئی اس کے پیچھے اس کا باپ اور اس کے پیچھے ناہون بھی اندر آ گیا تانیا نے کہا۔ "سفید فام ناہون میری بات مان گیا ہم سب چلیں گے۔ میرا باپ بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔"

باقی تمام رات وہ فرار کی اسکیم مرتب کرتے رہے۔ صبح کے وقت جھونپڑی سے باہر کسی شور و غل سے ہیڈن کی آنکھ کھل گئی۔ باہر جا کر دیکھا۔ ایک ہٹا کٹا زولو، تانیا کے باپ کو گالیاں دے دے کر کہہ رہا تھا۔ "تو نے اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اس سپاہی ناہون سے اس کی منگنی کر دی۔ اس کے بعد تم دونوں نے جا کر میرے خلاف بادشاہ کے کان بھرے، اسے میرے خلاف کر دیا اور تو نے اپنے مکروہ جادو سے میرے جانوروں کا دودھ خشک کر دیا، اب گائیں دودھ کا ایک قطرہ نہیں دیتیں۔ میں تجھ سے تیرے کرتوت کا بدلہ لوں گا اور تیرے سارے خاندان کو ہلاک کر کے تیرے گھر کو آگ لگا دوں گا۔"

تانیا کا باپ خوف سے کھڑا کانپ رہا تھا، ناہون نے اس زولو کو جس کا نام ماپوٹا تھا۔ گردن سے پکڑ کر اس

زور زور سے دھکا دیا کہ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

ہیڈن نے یہ نظارہ دیکھا اور قہقہہ لگا کر چشمہ کی طرف چلا۔ جو وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا، چشمے کے کنارے جا کر وہ رک گیا۔ بلند و بالا درختوں، سر بفلک پہاڑیوں اور حد نظر تک پھیلے ہوئے سبزے کو دیکھنے لگا۔ بڑا خوبصورت منظر تھا، شکست خوردہ ماپوٹا گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اس کا منہ غصے اور بے عزتی کے جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ ہیڈن چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ دفعتاً اسے ایک تجویز سوجھی اس نے ماپوٹا کو روک کر کہا۔ "سردار ماپوٹا مجھے تمہاری بے عزتی پر دلی رنج ہوا ہے، اس لونڈے اور بے حقیقت سپاہی نے تمہارا لحاظ نہیں کیا۔"

"میں اس سے خوفناک انتقام لوں گا۔" ماپوٹا نے پھنکار کر کہا۔

"کس طرح؟" ہیڈن نے پوچھا اور کہا۔ "کہو تو میں ایک تجویز بتاؤں جس سے تم اپنے دشمنوں سے بے عزتی کا انتقام لے سکتے ہو۔ لیکن اس کے لئے تمہیں ایک چیز میرے حوالے کرنی ہوگی۔"

"وہ کون سی چیز ہے سفید فام؟" اس نے پوچھا۔

"تانیا۔" ہیڈن نے کہا۔ "میری کامیابی کے بعد تمہیں تانیا میرے حوالے کرنی ہوگی۔ اور اس کے بدلے میں تمہیں اپنی ولایتی بندوق دوں گا۔"

ماپوٹا چند لمحے غور کرتا رہا۔ پھر بولا۔ "تانیا سے میں خود شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس جیسی لڑکیاں میں اور بھی حاصل کر سکتا ہوں، مجھے منظور ہے تم مجھے بندوق دے دینا۔ مجھے بندوق کی بڑی آرزو ہے۔"

"تو سنو ماپوٹا، آج سے چار دن بعد تانیا اس کا باپ اور اس کا منگیتر ناہون یہاں سے اپنے تمام مویشیوں کو لے کر فرار ہو رہے ہیں، ہیڈن نے رازداری سے کہا بعض وجوہات کی بنا پر میں بھی اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں۔ وہ صبح کے وقت اس دریا کے کنارے پہنچیں گے جو ناتال اور زولو لینڈ کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے۔ تم وہاں اپنے آدمی لے کر آ جانا۔ تانیا کے باپ اور ناہون کو قتل کر کے تم اپنا بدلہ لے لینا وہیں پر تم تانیا کو میرے حوالے کر دو گے، اور اس کے بدلے، میں تمہیں اپنی قیمتی بندوق دوں گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" ماپوٹا کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ "سفید فام تم نے مجھے ایسا راز بتا دیا ہے جس سے میں دشمنوں کو فنا کر سکتا ہوں۔"

اس کے بعد وہ دیر تک اس تجویز کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے لیکن اس وقت بڈھے ماپوٹا کا دماغ کسی اور طرف لگا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "اگر میں اس سازش کی خبر بادشاہ کو پہنچا دوں تو نہ صرف وہ ان کا خاتمہ کر دے گا۔ بلکہ مجھے انعام دے گا اور ہو سکتا ہے کہ خوش ہو کر وہ تانیا ہی مجھے بخش دے۔"

دو گھنٹے کے بعد جب ماپوٹا اپنی جھونپڑی میں پہنچا تو اس نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ اپنے دو قابل اعتماد آدمیوں کو ساری بات سمجھا کر بادشاہ کی طرف روانہ کر دیا۔

چار دن بعد ناہون تانیا اس کا باپ اور ہیڈن پروگرام کے مطابق فرار کی راہ پر چل پڑے ان کا رخ جنوب کی طرف تھا۔ دریا عبور کر کے انہیں ناتال کے علاقے میں داخل ہونا تھا لیکن دریا تک پہنچنے سے پہلے ہی انہیں ماپوٹا کی سرکردگی میں زولو سپاہیوں کے ایک دستے نے گھیرے میں لے کر روک لیا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ تانیا کے باپ نے خوف زدہ ہونے کے باوجود جرأت کر کے پوچھا۔ "ہم تو بادشاہ کے حضور میں جا رہے ہیں۔"

ماپوٹا نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ "بڈھے شاید تیری عقل ماری گئی ہے، بادشاہ جنوب کی طرف نہیں رہتا ادھر تو دریا ہے اور دریا کے پار ناتال...... سنو! بادشاہ کو پتہ چل گیا ہے کہ تم فرار ہونا چاہتے ہو۔ اور اس سازش کا راز فاش کرنے والا تمہارا یہ ساتھی سفید فام تھا۔ بادشاہ نے یہ خبر سنتے ہی مجھے حکم دیا کہ مقررہ وقت پر تمہیں پکڑ لوں اور اس کے بعد تمہیں دریا کے حوالے کر دیا جائے۔"

ماپوٹا کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ ناہون نے پلٹ کر ہیڈن کی طرف دیکھا اور اس پر چھلانگ لگائی۔ مگر وہ ہیڈن تک نہ پہنچ سکا کیونکہ زولو

سپاہیوں نے راستے ہی میں اسے پکڑ لیا۔ "اس بدمعاش کو اچھی طرح قابو کیے رکھو۔" ماپوٹا سردار نے حکم دیا۔

ہیڈن کا دل دھڑک رہا تھا۔ اسے ماپوٹا کی عیاری پر بڑا طیش آ رہا تھا کہ اس گنجے سردار نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے، تانیا نے پلٹ کر ہیڈن کی طرف دیکھا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ اس کی آنکھوں میں حقارت تھی۔

"چلو اب تمہارا انجام تمہارا منتظر ہے۔" ماپوٹا نے کہا۔

سپاہیوں کے گھیرے میں وہ آگے بڑھے۔ اور ایک چٹان کے کنارے آ کر رک گئے۔ یہ ایک بلند جگہ تھی۔ اور یہیں سے ایک آبشار پچاس فٹ نیچے دریا میں گرتا تھا، اس مقام کو زولو موت کا دریا کہتے تھے کیونکہ سزائے موت کے مجرموں کو یہاں سے نیچے دریا میں گرا کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔

"چلو بڈھے پہلے تم۔" ماپوٹا نے تانیا کے باپ کو حکم دیا۔ سپاہی اسے گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھے۔

"نہیں مجھے چھوڑ دو، میں خود ہی آگے جاؤں گا۔" تانیا کے باپ نے عزم سے کہا۔ سپاہیوں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بڑے استقلال سے چلتا ہوا کنارے تک آیا۔ ایک بار اس نے سارے منظر کو دیکھا جیسے اس خوبصورت دنیا کو آخری بار دیکھ رہا ہوں اور اس کے بعد بغیر کچھ کہے نیچے کود گیا۔

"خوب صورت لڑکی اب تمہاری باری ہے۔" ماپوٹا نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ تم اپنے باپ کی طرح بہادری کا ثبوت دو گی اور خود ہی اپنے آپ کو دریا کی لہروں کے حوالے کر دو گی۔"

"یقیناً......" تانیا نے بغیر کسی خوف کے کہا اور باوقار انداز میں چلتی ہوئی چٹان کے کنارے جا کھڑی ہوئی۔ "مرنے سے پہلے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "یہ درست ہے کہ ہم لوگ یہاں سے فرار ہو رہے تھے۔ اور فرار کی سزا چونکہ موت ہے اس لئے ہمیں یہ سزا قبول ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سازش کا منصوبہ تیار کرنے والا یہ شخص ہے جو سفید فام ہے، لیکن اس کا دل سیاہ ہے، اس نے ہمیں فرار ہونے کے لئے ورغلایا تھا۔ پھر اس نے غداری کی اور ہمیں موت کے منہ میں دھکیل دیا اور مرنے سے پہلے یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ سیاہ دل نے ایسا کیوں کیا۔ اس لئے کہ یہ مجھ سے محبت کرنے لگا تھا اور مجھ سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا اس نے مجھے اپنے ہمراہ فرار ہونے کے لئے بھی اکسایا لیکن میں نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا جس کا انتقام اس نے اس طرح لیا ہے۔"

"تم سچ کہتی ہو۔" بڈھے ماپوٹا نے کہا۔ "اس نے مجھے اس سازش میں شریک کیا تھا، کہ میں ناہون اور تیرے باپ کو قتل کر دوں اور تجھے اس کے حوالے کر دوں جس کے بدلے میں اس نے مجھے اپنی بندوق دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"دیکھا تم نے ناہون۔" تانیا نے مڑ کر ناہون سے کہا۔ "جس شخص کی تم نے جان بچائی تھی اس نے یہ صلہ دیا ہے۔"

چند لمحے وہ خاموش رہی پھر بولی۔ "ناہون میں تم سے بڑی شرمسار ہوں، میں نے تمہیں فرار ہونے اور اپنے فرض سے منہ موڑنے پر مجبور کیا مجھے معاف کر دینا۔ ناہون اب ہم آگے کا سفر کر رہے ہیں، ہم اس دنیا میں تو ایک دوسرے کو نہیں پا سکے، لیکن موت کے دروازے سے گزر کر ہم ایک دوسرے کو ضرور مل جائیں گے، میں جا رہی ہوں تم میرے پیچھے آؤ۔ روحوں کے جنگل میں ہماری ملاقات ہو گی۔"

تانیا نے آخری بار ناہون کو دیکھا جو بالکل خاموش کھڑا تھا پھر ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی اور پچاس فٹ نیچے بہتے ہوئے دریا کی طوفانی لہروں اور آبشار کے قیامت خیز دھارے میں کود گئی۔

"اب ناہون تم آگے بڑھو۔" ماپوٹا نے چلا کر کہا۔ "لیکن ناہون جو ابھی تک چپ چاپ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شیر کی طرح دھاڑا اور اپنے ارد گرد کھڑے سپاہیوں کو جنہوں نے اسے پکڑ رکھا تھا۔ ادھر ادھر گرا کر دیوانوں کی طرح آگے بڑھا اور چیخا۔ "اب تیری باری ہے غدار...... اب تیری باری ہے۔" اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ سپاہیوں سے الجھتا ہوا آگے بڑھا تو راستے میں ماپوٹا کو حائل دیکھ کر اس نے پوری قوت سے اچھل کر اسے ایک گھونسہ مارا۔ ماپوٹا دور جا گرا پیشتر اس کے کہ ناہون سفید فام تک پہنچتا۔ زولو سپاہیوں نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا۔ اور اس کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے بے بس کر دیا۔

"کیا اسے دریا میں پھینک دیا جائے؟" ایک زولو سپاہی نے ماپوٹا سے پوچھا۔

"نہیں......" ماپوٹا نے ناہون کی دیوانگی سے متاثر ہو کر کہا۔ "اس کے دماغ کو آسمانی آتش نے چھو کر مقدس بنا دیا ہے، اب ناہون بھی مقدس ہو گیا ہے۔ اب اسے حفاظت سے ہمیں بادشاہ کے پاس پہنچانا ہو گا۔ اس کے بارے میں وہ فیصلہ کرے گا۔"

زولو پاگل آدمی کو مقدس انسان گردانتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مقدس آسمانی آتش جب کسی انسان کے دماغ کو چھو لے۔ تو وہ مقدس یعنی پاگل ہو جاتا ہے۔

ہیڈن نے دیکھا کہ سب لوگ ناہون کے ارد گرد کھڑے ہیں اور اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں اور ماپوٹا کا گھوڑا ابھی خالی کھڑا ہے اور اس کی بندوق جو ماپوٹا نے چھین لی تھی زمین پر پڑی ہے۔ ہیڈن یک لخت دوڑ پڑا۔ اس نے بندوق اٹھا کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوا۔ اور جب زولو سپاہیوں نے اسے دیکھا تو وہ کئی سو گز دور جا چکا تھا۔ ماپوٹا پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگا۔ "میرا گھوڑا میرا بندوق" وہ چیخ کر دوڑ رہا تھا۔

ہیڈن نے ماپوٹا کو عیاری کی سزا دینے کے لئے گھوڑا روکا اور اتر کر زمین پر کھڑا ہو گیا پھر اس نے بندوق میں کارتوس ڈالا اور گھٹنا ٹیک کر ماپوٹا کا نشانہ لینے لگا۔ ماپوٹا کی نظر جو ایک دم بندوق پر پڑی تو وہ دہشت زدہ ہو کر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ پھر ایک لمحہ کے بعد وہ جس طرح چیختا ہوا آ رہا تھا اسی طرح شور مچاتا ہوا واپس دوڑ رہا تھا۔ ہیڈن نے بندوق کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی ماپوٹا کی پیٹھ پر لگی۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

ہیڈن اچھل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑانے لگا۔ اس کا رخ ناٹال کی طرف تھا۔

ہیڈن جب ناٹال پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ سفید فاموں اور زولو کے درمیان اعلان جنگ ہو چکا ہے۔ ہیڈن کے دو چھکڑے کرائے پر اور ہیڈن کی خدمات معقول معاوضے پر حاصل کر لی گئیں۔ ہیڈن کا تقرر کالم نمبر 3 میں ہوا جس کا کمانڈر لارڈ چیمس فورڈ تھا۔ 20 جنوری 1879ء کو انہوں نے کوچ کیا۔ اور تیز رفتاری سے زولینڈ جا پہنچے۔

دوسری طرف سے زولو فوجیں بھی چل پڑیں۔ اور کھلے میدان میں دونوں فوجوں نے ایک دوسرے کے مقابل آ کر ڈیرے ڈال دیئے۔

"وہ پاگل سا نوجوان کون ہے جو جھومتا جھامتا چلا آ رہا ہے۔" زولو سردار نے ایک سپاہی سے پوچھا۔

"وہ ناہون ہے زومبا کا بیٹا چند دن پہلے اس کی منگیتر اور اس کا باپ بادشاہ کے حکم سے مار دیئے گئے تھے، ناہون اس صدمے سے پاگل ہو گیا ہے کیونکہ مقدس آسمانی آگ نے اس کے دماغ کو چھو لیا ہے۔"

اتنی دیر میں ناہون بھی وہاں پہنچ گیا۔

"ناہون کیا چاہتے......؟" سردار نے بلند آواز میں پوچھا۔

"میری فوج اور میرے ساتھی سفید فاموں سے جنگ کے لئے جا رہے ہیں۔ مجھے بھی ایک نیزہ اور دو ڈھال دے دو کیونکہ میں بھی لڑنا چاہتا ہوں کیونکہ دشمن فوجوں میں مجھے ایک شخص کی تلاش ہے۔"

ناہون کو دونوں چیزیں دے دی گئیں۔

اگلے دن باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی، انگریزی فوجوں کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی تو زولو سپاہی بھی اپنی ڈھالیں لے کر اور نیزے لے کر نعرے لگاتے اور چنگھاڑتے ہوئے آگے بڑھے، گولیاں ان کی ڈھالوں پر پڑ رہی تھیں۔ دونوں طرف کے آدمی زخمی ہو رہے تھے مر رہے تھے، نعروں چیخوں کراہوں اور آوازوں سے میدان اور پہاڑ گونج اٹھے۔

جنگ کی غارت گری میں ایک زولو سپاہی شیر کی طرح دھاڑتا ہوا دشمنوں کی صف کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ناہون تھا زومبا کا بیٹا، یوں لگتا تھا جیسے اسے دوسرے سفید فام سپاہیوں سے کوئی غرض نہیں۔ وہ تو صرف اس شخص کی تلاش میں تھا جو اس کی ساری تباہیوں اور ساری محرومیوں کا ذمہ دار تھا۔ وہ ہیڈن کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ اور آخرکار اس نے ہیڈن کو ڈھونڈ ہی لیا، چھکڑوں کے پاس جہاں سے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی ناہون دیوانوں کی طرح آگے بڑھا۔

ہیڈن نے ناہون کو دیکھا اور ناہون نے ہیڈن کو، ہیڈن نے اپنی رائفل ناہون کی طرف کی لیکن عین وقت پر پتہ چلا کہ وہ آخری گولی تک فائر کر چکا ہے۔ بارود اس کے پاس ختم ہو چکا تھا۔ ناہون اپنا نیزہ تان کر اس کی طرف لپکا لیکن ہیڈن نے بندوق ایک طرف پھینک دی اور بھاگ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ سپاہیوں کے درمیان وہ لاشوں کو روندتا ہوا گھوڑے پر سرپٹ بھاگا۔

وہ جنگ کے شوروغل سے بہت دور نکل آیا۔ تو اس نے ایک بار پلٹ کر دیکھا ایک گھوڑے پر اس کے پیچھے تھا۔ اس نے ڈھال پھینک دی تھی اور صرف برچھی لئے ہوئے اس کے تعاقب میں شکاری کتے کی طرح آ رہا تھا۔ ہیڈن کو یاد آیا کہ اس کے پستول میں ایک گولی بچی ہوئی ہے۔ جس سے اسے آسانی سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ ہیڈن نے سوچا لیکن اگر نشانہ خطا گیا تو ناہون کی برچھی سے مجھے کوئی نہ بچا سکے گا۔ وہ خطرہ مول لینے کو تیار نہ ہوا تو گھوڑے کو پھر ایڑ لگا دی، بہت دیر بھاگنے کے بعد ہیڈن کا گھوڑا تھک کر چور ہو گیا۔ وہ خود بھی بے دم ہوا جا رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا سامنے چند قدم دور ایک جھونپڑی تھی۔ اور وہ جھونپڑی زولو کاہنہ کی تھی جسے وہ عکس کہتے تھے۔

یکایک ہیڈن کا گھوڑا اتھرایا اور زمین پر گر کر ساکت ہو گیا۔ اس وقت ہیڈن نے دیکھا کاہنہ جھونپڑی کے باہر کھڑی مضحکہ خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا کوئی دو سو گز دور ناہون اسی رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ اور برچھی کی انی دھوپ میں چمک رہی تھی۔

"سیاہ دل کہو جنگ کا کیا حال ہے؟ تم جنگ سے کیوں بھاگ آئے ہو؟" کاہنہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"مجھے بچاؤ! وہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔" ہیڈن نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"سیاہ دل مقابلہ کرو کہ آخر یہ دن آنا ہی تھا۔ آج پھر ایک ایک مدت کے بعد سیاہ دل اور سفید فام میرے پاس اکٹھے ہو رہے ہیں۔ مقابلہ کرو اور اگر نہیں کر سکتے تو بھاگو اور مردوں کے جنگل میں پناہ لو۔ کیونکہ وہی ہے جو آخرکار سب کو پناہ دیتا ہے۔"

ہیڈن نے سنا اور سوچا دریا کی لہریں طوفانی تھیں وہ تیر کر دریا عبور نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سوچا جنگل میں پناہ لی جائے اور وہ دریا کے کنارے کنارے دوڑنے لگا۔ وہ جنگل میں دوڑتا رہا۔ دوڑتا رہا اور آخر تھک کر چور ہو گیا۔ مزید ایک قدم بھی چلنا اس کے لئے محال ہو گیا تو وہ رک گیا۔ اور دیکھا ناہون بدستور اس کے پیچھے تھا۔ اس کی پشت پر ایک عظیم الشان درخت تھا جس کے تنے میں ایک بہت بڑی کھوہ تھی اور جنگل میں سناٹا تھا۔

ہیڈن نے اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

"ناہون رک جاؤ۔" ہیڈن نے پستول کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ وہ رک گیا۔ "دیکھو ناہون ہم بہت لڑے ہیں بہت دوڑے ہیں میں جانتا ہوں تم میرا تعاقب کیوں کر رہے ہو لیکن جو ہو چکا اس کا مداوا اب کوئی نہیں کر سکتا، جو مر چکے ان کو اب کوئی واپس نہیں لا سکتا۔ میرے ہاتھ میں پستول ہے تمہارا برچھی والا ہاتھ ہلنے سے پہلے میں تمہیں گولی کا نشانہ بنا سکتا ہوں۔ لیکن نہیں، میں تمہیں زندہ چھوڑتا ہوں اور تم مجھے زندہ رہنے دو۔"

ناہون خاموشی سے سنتا رہا۔ اور چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ پھر ناہون برچھی تول کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے دور سے برچھی پھینکی اور اسی لمحے ہیڈن نے گولی چلا دی۔

برچھی ہیڈن کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ اور گولی نے ناہون کے دائیں بازو کو زخمی کر دیا۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ناہون زخمی تھا لیکن وہ جان توڑ کر لڑ رہا تھا، ہیڈن ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس لئے اس کا پلہ بھاری تھا۔ آخر ہیڈن نے ناہون کو گرا لیا۔ اور اس کے سینے پر سوار ہو بیٹھا۔

"ناہون، اب اپنے انجام کے لئے تیار ہو جاؤ۔" ہیڈن نے کہا لیکن اسی لمحے اس کے منہ سے ایک فلک شگاف چیخ نکل گئی اور وہ جیسے پتھر بن گیا۔ سفید لبادے میں ملبوس تانیا ناہون کی برچھی ہاتھ میں لئے ہوئے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ تانیا کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اور برچھی ہیڈن کے سینے میں پیوست ہو گئی، ہیڈن نے ایک دل دوز چیخ ماری اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

"ناہون...... ناہون...... اٹھو...... آنکھیں کھولو۔" تانیا مترنم آواز میں کہہ رہی تھی۔ "اٹھو ناہون...... میں روح نہیں ہوں۔"

ناہون نے آنکھیں کھول دیں، اس کا سارا بانکپن جاتا رہا، وہ بے اختیار تانیا سے لپٹ جانا چاہتا تھا۔ مگر تانیا نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ "محبت میں اتنی بے صبری اچھی نہیں میرے پیچھے آؤ اور جتنی جلد ممکن ہو سکے اس دنیا سے دور بھاگنے کی کوشش کرو۔ دنیا کے بے رحم اصول ہمیں ملنے نہیں دیں گے۔"

ناہون پہلے ہی اپنے مرنے والی محبوبہ کو زندہ دیکھ کر دم بخود ہو گیا تھا۔ اب اس کی زبان سے ایسی ایسی کن باتیں سن کر سناٹے میں آ گیا۔ "تانیا مجھے اتنا بتاؤ، کہ تم زندہ کیسے بچیں؟" ناہون کے لہجے میں عجیب سی بے قراری تھی۔

"پھر بتا دوں گی۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں جلدی کرو۔"

تانیا کے مسلسل انکار سے ناہون بجھ کر رہ گیا تھا۔ ابھی وہ اپنے خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ تانیا نے اسے پکارا۔ "آؤ میرے وفادار ساتھی۔"

ناہون کو سر جھٹک کر تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ تانیا کے قریب ہونا چاہتا تھا مگر تانیا کی رفتار کئی گناہ تیز تھی جیسے ہوا درختوں کے درمیان سے گزر رہی ہو۔ ناہون نے کئی مرتبہ اپنی بے چینی کا اظہار کرنے کی کوشش کی مگر تانیا ہر مرتبہ اسے انگلی کے اشارے سے خاموش کر دیتی۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل، مردوں کے جنگل میں سے گزر رہے تھے، عجیب تحیر انگیز سناٹا تھا عجیب پراسرار خاموشی تھی۔

مردوں کے جنگل سے گزرنے کے بعد تانیا کا رخ پہاڑوں کی طرف تھا۔ ناہون کچھ کہے بغیر تانیا کے پیچھے چلتا رہا۔ اب دونوں پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تانیا کی رفتار یہاں تیز تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ پہاڑ پر دوڑ رہی ہو۔ چوٹی پر پہنچنے کے بعد ناہون نے دیکھا کہ کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ایک خوبصورت محل اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے، پہاڑ اور محل کے درمیان سنگ مرمر کی خوبصورت سڑک بنی ہوئی تھی۔ تانیا اچانک مڑتے ہوئے بولی۔

"ناہون! وہ ہے ہمارے خوابوں کی منزل" تانیا کا اشارہ محل کی طرف تھا۔ اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے جیسے وہ اپنے محبوب کی آغوش میں سما جانے کے لئے بے چین ہو۔ تانیا کا یہ انداز دیکھ کر ناہون عجیب سے وارفتگی میں آگے بڑھا۔ جیسے ہی اس نے سنگ مرمر کی سڑک پر قدم رکھا اس کے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے اور وہ ہزاروں فٹ گہری وادی میں گرتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد لوگوں نے دیکھا کہ سفید فاموں سے لڑنے والا جانباز سپاہی خون میں نہایا ہوا بے حس و حرکت پڑا ہے۔

ادھر جو لوگ بوڑھی کاہنہ سے اپنے مستقبل کا حال معلوم کرنے آئے تھے انہوں نے دیکھا کہ سانپ بار بار اپنا پھن بوڑھی کاہنہ کی گردن پر مار رہا تھا اور کاہنہ عجیب سے وحشیانہ قہقہے لگا رہی تھی۔

"میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں، دلوں کے فاصلے ختم ہو گئے"

سنہری تابوت

ایم اے راحت

قسط نمبر:18

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

"وہ سب کچھ جو تمہاری حماقتوں سے ہونا تھا، تم کیا سمجھتی ہو، تم تاریخ کے طلسم میں گرفتار ہو اور یہ طلسم اتنا کمزور نہیں ہے کہ تم اپنی کسی احمقانہ کوشش میں کامیاب ہو جاؤ۔ تم سرزمین مصر تک پہنچ چکی ہو اور تمہیں اپنی تھوڑی بہت تفصیل معلوم ہے، تمہارا کیا خیال ہے قدیم روحوں کے اس حصار سے تم باہر نکل سکو گی؟ ناممکن ہے۔ نشا دانش ناممکن ہے! ایسا تمہارے لئے ممکن نہیں ہوگا، خواہ تم کتنی ہی کوشش کرو۔"

"فرشتوں کو بہت سی آگے کی باتیں معلوم ہوں گی، مجھے علم ہو سکتا ہے کہ مجھے میرے ہوٹل سے کیوں اغوا کیا گیا۔؟"

"کس نے اغوا کیا تمہیں، تم جھوٹ بولتی ہو، تم خود وہاں سے فرار ہوئیں، اور تم نے اپنے آپ کو قاہرہ میں کہیں گم کرنا چاہا لیکن تمہارا روپوش ہو جانا بھی تمہارے ہی لئے نقصان دہ تھا ہم اگر کوشش کرتے تو پولیس کو تمہارے بارے میں اطلاع دے دیتے، لیکن ہم نے ایسا اس لئے نہیں کیا کہ پولیس تمہیں حاصل کر کے فوراً تمہارے ملک پہنچانے کے انتظامات شروع کر دیتی اور یہ گناہ ہم پر ہی لاگو ہو جاتا۔ ہم روحوں کے حصار سے تمہیں نکالنے کے مجرم قرار پاتے، چنانچہ ہم نے یہ سوچا کہ تمہیں تلاش کرنے کے لئے کوئی اور ذریعہ اختیار کیا جائے۔"

یہ احمق رئیس زادہ جو ناقابل یقین دولت کا مالک ہے اس خبط کا شکار ہے کہ یہ زمانہ قدیم کا فرعون ہے۔ اس کے عجیب وغریب بیانات ہم بہت پہلے مصر سے متعلق اخبارات میں پڑھتے رہے ہیں اچانک ہی ہمیں اس کا خیال آیا اور ہم نے سوچا کہ اس وقت تمہیں مصر میں روکنے کا بہترین ذریعہ یہ احمق بن سکتا ہے بشرطیکہ اسے احساس دلایا جائے کہ تمہارا روکے جانا ضروری ہے۔ چنانچہ ہم اس سے اس کی اپنی پسند کی شخصیت میں ملے اور فرشتے بن کر ہم نے اسے تمہارے بارے میں بتایا، ہمارا داؤ کارگر رہا اور اس احمق نے اپنی دولت کے بل پر ایسا جال پھیلا دیا کہ تم اس جال میں گرفتار ہو گئیں اس سے تمہارے خلاف کوئی کام کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ تمہیں مصر میں روکنا چاہتے تھے ہم اور یہ بھی چاہتے تھے کہ تم بے سکون نہ رہو یقینی امر ہے کہ تم نے ہمارے خلاف یہ سازش کی ہے جو کہ طوطا چشمی کی انتہا ہے یہ۔ خیر ہمارا تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا لیکن تم اب اپنی تمام ہمدردیاں کھو چکی ہو۔"

"تم لوگ میری تقدیر کے مالک ہو..... یکن

بات ہے نا...... تم نے ہمیشہ سازشیں کر کر کے مجھے مصیبت میں گرفتار کرانا چاہا، میں اگر الجزائر جانا نہیں چاہتی تھی اور سارے مسئلے ختم کرنا چاہتی تھی تو تمہیں اس میں کیا اعتراض تھا، میں اپنی مرضی کی مالک ہوں، تم نے جو کچھ کیا ہے میں نے وہی تمہارے اوپر الٹ دیا ہے سمجھے اور اب بھگتو اپنے کئے کو، میں تو صرف تم سے ملنے آ گئی تھی یہ بتانے کے لئے کہ کبھی کبھی کوئی کمزور ہستی بھی اپنے دفاع کے لئے بہت بڑے اقدامات کر سکتی ہے۔ اس وقت امیر غیری پر میرا مکمل اختیار ہے کیونکہ مجھے ظہورہ تم نے ہی بنایا ہے۔ میں اگر چاہوں تو تاریخ ہی کے کسی حوالے سے تمہیں موت کے گھاٹ اتار سکتی ہوں لیکن وسکن ڈیزل میرے والد کے دوست ہو تم...... جاؤ رعایت کرتی ہوں تمہارے ساتھ زندہ رہو...... لیکن طویل عرصے تک اسی قید میں رہو، میں نے امیر غیری سے یہ کہہ کر تمہیں گرفتار کرایا ہے کہ تم جھوٹے فرشتے ہو اور وہ ہو جنہوں نے ماضی کی تاریخ میں ہم دونوں کو نقصانات پہنچائے ہیں، میں اگر اسے چند الفاظ کہہ کر اس بات پر اکسا دوں کہ تمہاری موت ہمارے حق میں فائدہ مند ہوگی تو یہیں اسی قید خانے میں تمہاری گردنیں تمہارے شانوں سے اتار کر تمہیں یہیں آس پاس کسی گڑھے میں پھینک دیا جائے گا۔ تمہارے احسان کا صلہ تمہاری زندگی ہے، تم لوگوں نے ایک اچھے کام کے لئے غلط راستے اپنائے ہیں، کسی کی زندگی کو اس طرح مفلوج کر دینا کوئی انسانیت کی بات تو نہیں تھی۔ ٹھیک ہے آرام کرو میرا خیال ہے، امیر غیری تمہارے ساتھ کوئی سخت سلوک اس وقت تک نہیں کرے گا جب تک میں نہ چاہوں۔

میں واپسی کے لئے مڑی، وہ لوگ مجھے کینہ توز نگاہوں سے گھورتے رہے۔ آخری نگاہ ان پر ڈال کر میں دروازے سے باہر نکل آئی، دل بڑا ہلکا ہلکا محسوس ہو رہا تھا لیکن جو پر اسرار واقعات میری زندگی سے چمٹ گئے تھے ان کا کوئی حل مجھے یہاں بھی نہیں ملا تھا مثلاً یہ کہ میں ہوٹل سے نکل کر اس صحرا میں کیسے پہنچ گئی۔ جہاں بدوؤں نے مجھے پایا اور یہ زبان مجھے کیسے آ گئی، لیکن دماغ میں اب اس قدر قوت نہیں تھی کہ ان باتوں پر سوچ سوچ کر اپنے آپ کو تھکا لیتی، چنانچہ انہیں نظر انداز کر دیا، اور شام کا انتظار کرنے لگی۔ امیر غیری پر یقین تھا کہ وہ آج کے پروگرام کو نہیں بھولے گا، سر شام وہ اس محل میں واپس آ گیا اور کچھ دیر کے بعد عظیمہ نے آ کر پوچھا۔ ''کیا میں تیار ہوں؟''

''میر سے کہو کہ میں انتظار کر رہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر کے بعد ہم ایک کار میں سفر کر رہے تھے اسے احسان ڈرائیو کر رہا تھا، راستے میں غیری نے کہا۔

''مصر کتنا جدید ہو گیا ہے، دنیا بھر سے یہاں سیاح آتے ہیں اور ان مقبروں کی پراسرار زندگی کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے ہیں نام نہاد جمہوری حکومتوں نے ہمارے مصر کو جدیدیت کے رنگ میں ڈھال لیا ہے، لیکن ظہورہ، یہ سب کچھ مصنوعی لگتا ہے یہ پر رونق زندگی بڑی کھوکھلی ہے میرا دل و دماغ اس زندگی کو بالکل قبول نہیں کرتا، ہم برسر اقتدار آ کر مصر کو اس کا قدیم رنگ دیں گے، وہی طرز حکومت ہوگا وہی طرز بادشاہت، دیکھو ہمارے نیل کو کتنا بدشکل کر دیا گیا ہے، تمہیں دیا ہے نیل کے پانی پر جب ہمارا بجرہ تیرتا تھا، لہروں پر سونے کی سڑک بنی ہوئی تھی اور ہم اسے دیکھتے رہتے تھے اب نیل کے سینے میں یہ مینار بنا دیا گیا ہے، وہ اسے قاہرہ ٹاور کا نام دیتے ہیں، بے شمار سیاح یہاں سے پورے قاہرہ کا نظارہ کرتے ہیں، میں نیل کو دوبارہ قدیم روایتوں کی تصویر بنا دوں گا۔''

امیر غیری مسلسل کچھ نہ کچھ بولے جا رہا تھا۔

''یہ ابوالہول ایونیو ہے اور ہمیں قبے کر ناک پہنچنا ہے، ہمارے دور میں یہ ممفس کہلاتا تھا، جہاں فراعنہ کے مقبرے پھیلے ہوئے ہیں، تمام معبد اسی جگہ ہیں، اب یہاں سیاحوں کا مجمع رہتا ہے، لیکن چاندنی راتوں میں مقبروں میں بھٹکنے والے بعض اوقات ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں وہ فرعونوں کے جلال کی تاب نہیں لا پاتے، کچھ عرصہ کے لئے یہاں چاندنی راتوں کی سیر پر پابندی لگا دی گئی تھی لیکن محکمہ سیاحت کو احساس ہوا کہ اس طرح سیاحوں کی دلچسپی کچھ کم ہونے لگی ہے چنانچہ اب یہ اجازت دے دی گئی ہے کہ سیاح اپنے رسک پر راتوں میں بھی یہاں آ سکتے ہیں۔''

میں دل جمعی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ احسان کسی روبوٹ کی مانند گردن اکڑائے بالکل خاموش تھا، پورے سفر میں اس کی گردن نے جنبش بھی نہیں کی تھی، پھر اس نے معبدوں کے سامنے کار روک دی۔ نگاہ کی آخری حد تک مصر کے پراسرار قدیم کھنڈرات بکھرے ہوئے تھے۔ ماحول پر ہیبت ناک سناٹا مسلط تھا، میں امیر غیری کے ساتھ نیچے اتر آئی، میرے دل میں کپکپاہٹ سی ہو رہی تھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ نظر نہ آنے والوں نے میرا استقبال کیا ہو جیسے مجھے دیکھ کر اچانک یہاں خاموشی چھا گئی ہو۔ بہت سی نگاہیں میرا جائزہ لے رہی ہوں۔

''آؤ!'' اچانک امیر غیری کی آواز ابھری اور میں اچھل پڑی۔ میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر آواز پر قابو پانے کی کوشش کر کے کہا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے؟''

''آہ...... تم نے محسوس نہیں کیا کہ یہاں تو ہزاروں ہیں، دیکھو وہ سب تمہیں دیکھ رہے ہیں ظہورہ وہ سب تمہیں دوبارہ دیکھ کر انگشت بدنداں ہیں، وہ ملکہ مصر کی تعظیم کے لئے خاموش ہیں، آؤ اندر چلو اس وقت ہمیں کوئی نہیں روکے گا آؤ ملکہ مصر......'' اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھنے لگا۔

بغیر چھت کے لامتناہی وسعتوں کے حامل قبرستان میں فراعنہ اور ان کی ملکاؤں کے خاموش مجسمے ایستادہ تھے۔ مدہم چاندنی میں یہ سب سانس لیتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے غیری میرا ہاتھ پکڑے ان کے درمیان سے گزرتا رہا، اچانک ہی سرسراہٹیں ابھرنے لگیں۔ ہمیں یوں لگا جیسے کسی نے تھک کر پہلو بدلا ہو۔ میں دہشت زدہ ہو کر بار بار پلٹ کر دیکھنے لگتی۔ لیکن غیری کسی خوف سے بے نیاز مسلسل آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ احسان قبرستان کے باہر گاڑی میں ہی بیٹھا رہ گیا تھا۔ غیری نے کہا۔

''بادشاہوں کی وادی میں اوپر جو کچھ ہے وہ کچھ نہیں ہے، اصل معبد اس کے نیچے ہیں کچھ ظاہر کچھ پوشیدہ...... زمین کی گہرائیوں میں ہمارے خاندانوں کی پوری تاریخ پوشیدہ ہے مگر میں تمہیں دور زمانوختہ میں لے جاتا ہوں آؤ اپنا ماضی دیکھو۔''

امیر غیری ان مجسموں کے درمیان سے گزرتا ہوا دور تک گیا پھر ایک ٹوٹے ہوئے دروازے کے پاس آ گیا۔ اس نے ایک خاص جوہری لیمپ روشن کر لیا جس کی روشنی نے ماحول کو اجاگر کر دیا تھا۔ پھر ہم دونوں اس ٹوٹے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ مدہم اجالوں نے ایک سرنگ کا اختتام بھی ایک دروازے پر ہوا تھا۔ جس کے دوسری طرف ایک وسیع ہال تھا۔ ہال میں چھت پر کچھ ایسے سوراخ کئے گئے تھے جن سے چاند کی مدہم روشنی چھن رہی تھی، انہی سوراخوں کی وجہ سے وہاں گھٹن بھی نہیں تھی پورے ہال میں چاروں طرف تابوت رکھے ہوئے تھے، صدیوں پرانے بوسیدہ تابوت جو صاف نظر آ رہے تھے۔ فضا میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی مدھم گونج پھیلی ہوئی تھی، یوں لگتا تھا جیسے یہ آوازیں ان تابوتوں سے اٹھ رہی ہوں، ان تابوتوں میں سینکڑوں سال قبل کے انسان سو رہے تھے، موت کی ابدی نیند، نہ جانے یہ کتنی صدیوں کی داستانیں سمیٹے ہوئے تھے، میرا دل سوکھے پتے کی مانند کانپ رہا تھا، امیر غیری آہستہ آہستہ کسی پراسرار روح کی مانند آگے بڑھ رہا تھا، ایک بار پھر اس کی آواز نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔

''یہ ہماری داستان ہے، ان تابوتوں میں ہمارے جاں نثار سو رہے ہیں۔ وہ سب جو ہمارے ہم سفر ہوں گے، سونے والے جاگ اٹھیں گے وہ وقت بالکل قریب ہے، ہاں ملکہ ظہورہ، وہ وقت اب بہت نزدیک ہے، آؤ دیکھو یہ میرا تابوت ہے، آ میرے ساتھ

آ......"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا، ایک بلند وبالا چبوترے پر منقش تابوت رکھا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں دوسرا تابوت بھی تھا چبوترے کی چار سیڑھیاں چڑھ کر ہم تابوتوں کے پاس پہنچ گئے۔ امیر غیری نے ایک تابوت کا ڈھکن کھول دیا۔ تابوت خالی تھا۔

"جانتی ہو یہ خالی کیوں ہے؟" امیر غیری نے پوچھا۔

"نہیں۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کیونکہ اب میں اس میں موجود نہیں ہوں، پہلے میری لاش اس میں رکھی ہوئی تھی۔ ظہورہ دیکھ یہ دوسرا تابوت تیرا ہے دیکھ تو بھی اس میں موجود نہیں، احسان کہتا تھا کہ تو بھی بھٹک رہی ہے، مجھ تک پہنچنے کے لئے بے قرار ہے، پہچان لے یہ تیری صدیوں کی استراحت گاہ رہی ہے۔"

"احسان کہتا تھا......؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں اس کے سوا کون ہمیں ہماری شناخت کرا سکتا تھا۔"

"تمہیں تمہاری شناخت احسان نے ہی کرائی تھی زمانوختہ؟"

"اور کون ہوسکتا ہے وہ ہمارا جان نثار اول ہے۔ آ میں تجھے اسالیس سے ملاؤں۔ اسالیس کے جاگنے کا مجھے شدید انتظار ہے، بس اسالیس جاگ جائے، ہمارے دور کا آغاز ہو جائے گا۔"

"اسالیس کون ہے؟"

"سالار اعظم اسی کے شانوں پر سلطنت کا بوجھ تھا اور یہی جاگ کر ہمارے راستے ہموار کرے گا...... وہ بھی میرا عظیم جاں نثار ہے۔"

امیر غیری مجھے چبوترے سے اتار لایا پھر کچھ فاصلے پر رکھے ہوئے ایک تابوت کے پاس جا کر اس نے تابوت کا ڈھکن کھول دیا۔ اس تابوت میں ایک لاش لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر قیمتی زیورات سجے ہوئے تھے، غالباً ہیروں کے زیورات تھے، جن سے مدہم روشنی پھوٹ رہی تھی۔

میرے بدن پر شدید کپکپی طاری تھی۔ اس لاش پر نگاہیں نہیں ڈالی جارہی تھیں۔ بمشکل میں نے کہا۔

"تابوت کا ڈھکن بند کرو۔" امیر غیری نے مسکرا کر ڈھکن بند کر دیا۔

"تو نے اسالیس کو دیکھا؟"

"ہاں، اب یہاں سے واپس چلو۔"

"کیوں اتنی جلدی کیوں؟"

"میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں۔"

"ہم نے یہاں صدیاں گزاری ہیں، سینکڑوں نہیں ہزاروں صدیاں، یہاں ہمارا دم کیسے گھٹ سکتا ہے۔"

"چلو غیری چلو اب یہاں سے چلو......"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ اور وہ گہری سانس لے کر وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ ہال سے باہر نکل کر سرنگ میں داخل ہوئے تو غیری نے الیکٹرو لیمپ دوبارہ روشن کر دیا اور ہم چڑھائی چڑھنے لگے۔ غیری اس عالم میں بھی کچھ بول رہا تھا۔ لیکن میں نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں سفر کی رفتار تیز رکھنا چاہتی تھی تاکہ اس منحوس سرنگ سے جلد چھٹکارا ملے۔ پھر ہم اس ٹوٹے دروازے سے باہر نکل آئے۔ دروازے کے دوسری طرف وہی سناٹا، وہی خاموشی طاری تھی، فرعونوں کے پتھریلے مجسمے ساکت کھڑے تھے اور ہوا ان کے درمیان سرسراتی پھر رہی تھی۔

"یہ ہماری تاریخ تھی ظہورہ، جو بہت جلد دوبارہ شروع ہوگی۔ لیکن میں نے تمہیں کچھ دہشت زدہ پایا۔"

"ہاں نجانے کیوں۔" میں نے آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر کے کہا۔

"تم نے پہلی بار اپنا ماضی دیکھا ہے شاید اس لئے۔"

"آپ یہاں آتے رہتے ہیں امیر؟"

"اکثر یہاں مجھے بے حد سکون ملتا ہے۔"

"اب ہم چلیں گے......؟"

"جیسا تم چاہو......"

اس نے کہا اور میں نے اس سے واپسی کی فرمائش کر دی ہم پیچ در پیچ راستوں سے گزرتے ہوئے باہر جانے والے راستے پر چل پڑے۔ جگہ جگہ فراعنہ کے مجسمے قبر کے کتبوں کی مانند راہ میں مزاحم تھے۔

اچانک کسی نے میرا لباس پکڑ لیا اور میرے حلق سے آواز نکلتے نکلتے رہ گئی۔ غیری کئی قدم آگے بڑھ گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور گہری سانس لے کر گردن ہلائی۔ میرا لباس ایک پتھریلے مجسمے کے سنگی ہاتھ میں پھنس گیا تھا۔ چنانچہ مجھے پلٹ کر اپنا لباس اس کے ہاتھ سے چھڑانا پڑا۔ میں نے اس کے قریب جا کر اس کا ہاتھ چھوا اور پھر بری طرح کانپ کر رہ گئی۔ وہ گوشت پوست کا ہاتھ تھا نرم گرم لچکدار...... میرا لباس جان بوجھ کر پکڑا گیا تھا۔ میں نے سخت خوف ودہشت کے عالم میں مجسمے کا چہرہ دیکھا اور ایک اور ذہنی جھٹکا مجھے برداشت کرنا پڑا مجسمے نے دوسرے ہاتھ کی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھی ہوئی تھی۔ جیسے وہ مجھے خاموش رہنے کی تلقین کر رہا ہو۔

یہ زندہ مجسمہ عسکری تھا بادشاہوں کی وادی میں ایستادہ سنگی مجسموں کے رنگ جیسا چست لباس پہنے ہوئے وہ ان مجسموں کے درمیان کھڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں نے شدید حیران نگاہوں سے اسے دیکھا اور کچھ بولنے کا ارادہ کیا لیکن دوسرے لمحے مجھے خود پر احساس ہوگیا کہ یہاں میرے منہ سے نکلنے والی ہلکی سی سرگوشی بھی باآسانی سنی جاسکتی ہے گہرے سکوت اور سناٹے میں ہواؤں کی آواز ہی کافی زوردار لگ رہی تھی ایسے عالم میں اگر میرے منہ سے آواز نکلی تو صرف چند گز کے فاصلے پر مسلسل آگے بڑھتا ہوا امیر غیری یہ آواز سن لے گا۔ یہ اندازہ تو ایک لمحے میں ہوگیا تھا کہ عسکری زندہ سلامت یہاں موجود ہے اور اسی نے مجھے روکا ہے۔ جب عسکری کو یہ احساس ہوگیا کہ میں بے اختیار بولنے کی کوشش نہیں کروں گی تو اس نے میرا لباس چھوڑ دیا اور برق رفتاری سے اپنے ہاتھ کو اپنی پشت پر لے جا کر غالباً اس عجیب وغریب لباس میں بنی ہوئی کسی جیب سے ایک بند لفافہ نکالا اور میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے بے اختیاری کے عالم میں وہ لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسی وقت امیر غیری کی آواز ابھری۔

"ارے تم کہاں رہ گئیں ظہورہ...... کیا ہوا کیا بات ہے؟"

میں بے شک اس وقت شدید ذہنی بحران میں مبتلا تھی۔ لیکن نجانے کہاں سے میرے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ میں موقع کی نزاکت کو سمجھ لوں۔ عسکری کی یہاں موجودگی یہ لفافہ اور یہ سارا ماحول میرے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ لیکن میں نے آگے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ امیر غیری خود ہی واپس پلٹا اور بولا۔

"تم کہاں رہ گئیں تھیں ظہورہ......؟"

"مجھے اچانک ہی احساس ہوا کہ میرے قدموں کی آواز میں تمہارے قدموں کی آواز شامل نہیں ہے۔" میں نے انتہائی مشکل سے اسے جواب دیا۔

"میرا لباس ایک مجسمے میں پھنس گیا تھا۔"

"آؤ...... آؤ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" اس نے کہا۔

میرے وجود کی کپکپاہٹوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ عسکری کا دیا ہوا لفافہ میری مٹھی میں دبا ہوا تھا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ امیر غیری کی نگاہوں میں آئے۔

بہر حال اس وقت مجھ پر جو کچھ بیت رہی تھی میرا دل ہی جانتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس وقت عسکری سے شدید ہمدردی اور محبت کا احساس ہوا اس کا یہاں نظر آ جانا خواب کی سی بات لگتی تھی نظر کا دھوکہ معلوم ہوتا تھا یہ کیسے ممکن ہے یہاں اس عالم میں اس پراسرار اور ہولناک ماحول میں وہ یہاں کیسے ہوسکتا ہے۔ لیکن مٹھی میں دبا ہوا لفافہ یہ احساس دلا رہا تھا کہ یہ سب کچھ

ہوا ہے، سب کچھ سچ ہے۔

بے اختیار دل میں شدید خواہش ابھری کہ یہاں رکوں اور اس سے باتیں کروں، غیری پر لعنت بھیجوں، لیکن جانتی تھی کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ امیر غیری اپنی بکواس لگائے ہوئے تھا۔ اسے میرے رک جانے سے کسی طرح کا شبہ نہیں ہوا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ہم اس احاطے سے باہر نکل آئے، کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اور احسان بونٹ سے ٹکا ہوا ہماری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

"یہ اتفاق ہے کہ اس وقت یہاں کوئی سیاح نہیں ہے، کیا تم نے کوئی اور گاڑی دیکھی احسان۔"

"نہیں کوئی نہیں امیر۔" احسان نے کہا اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔

"حالانکہ ایسا کم ہی ہوتا ہے، خصوصاً چاندنی راتوں میں اکثر سیاح یہاں فرعونی جلال دیکھنے آتے ہیں آؤ بیٹھو۔" امیر نے کہا۔

ہم دونوں کے بیٹھنے کے بعد احسان نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے واپس موڑ لیا۔

"اس جگہ آ کر دل کی خواہش شدت اختیار کر لیتی ہیں اور مزید انتظار مشکل ہوتا جاتا ہے۔ آہ کتنی شدت سے میں بدلنے والے وقت کا منتظر ہوں...... تم خاموش کیوں ہو ظہورہ......"

"مجھ پر سحر طاری ہے امیر۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہ وادی سحر ہے۔" غیری ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

میں نے کئی بار پلٹ کر پیچھے دیکھا، بے چارہ عسکری نہ جانے کیسے یہاں سے واپس جائے گا، اس ہولناک، ماحول میں وہ یہاں تنہا ہے، بڑی ہمت کی بات ہے، کلیجہ پھٹ سکتا ہے خوف سے لیکن، لیکن اس نے صرف مجھ سے ملاقات کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے، بہت بڑی بات ہے اس کا مطلب ہے کہ اسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہے، وہ صحیح معنوں میں میرے لئے سرگرداں ہے، ظاہر ہے اتنی اہم اور مشکل جگہ وہ مجھ سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا پتہ نہیں اس لفافے میں کیا ہے؟

بہت سی سوچیں بہت سے خیالات دل میں آ رہے تھے امیر غیری کی قربت اس وقت زہر لگ رہی تھی۔ دل مچل رہا تھا، تڑپ رہا تھا، میں کسی بھی طرح عسکری سے تفصیلی ملاقات کر لوں، اخبار کی اس خبر کو بھولی نہیں تھی جس میں میرے فرار کی داستان تھی عسکری کا تذکرہ بھی تھا اس میں اور اسی وقت مجھے خیال آیا تھا کہ وہ صرف میری وجہ سے روپوش ہوا ہے نہ جانے کس طرح قاہرہ میں پولیس کی نگاہوں سے بچ کر وقت گزار رہا ہوگا۔ میرا معاملہ تو امیر غیری نے سنبھال لیا تھا۔ لیکن اس کے لے مفرور حالت میں پولیس کی نگاہوں سے بچ بچ کر زندگی گزارنا کتنا مشکل ہو رہا ہوگا۔ احمق ہے دیوانہ ہے آخر کیوں میرے لئے وہ اس قدر ایثار کر رہا ہے، صاف الفاظ تو کہہ چکی ہوں اس سے کہ میری طبیعت میں بے پناہ ضد ہے، اسی ضد نے تو مجھے تباہ و برباد کیا ہے اگر میں ضد نہ کرتی تو ان مصیبتوں میں کیسے پڑتی۔ اسے میں کیسے قبول کر سکتی ہوں، وہ کسی اور کی امانت ہے، کتنا ہی کچھ کر لے میرے لئے احسان مند ہو سکتی ہوں اس کی لیکن شاید دل سے اسے کبھی نہ چاہ سکوں، کیونکہ اس نے میری چاہتوں کا مذاق اڑایا ہے۔

امیر غیری نے پھر کچھ کہا اس کی آواز کی بھنبھناہٹ میرے کانوں تک بے شک پہنچی تھی، لیکن الفاظ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس نے ایک نگاہ مجھے دیکھا اور خاموشی سے سامنے دیکھنے لگا، کچھ دیر کے بعد ہم محل میں واپس پہنچ گئے امیر غیری نیچے اترتا ہوا بولا۔

"بہتر ہے کہ اب تم آرام کرو ظہورہ، لیکن اپنی رات بادشاہوں کی وادی کے تصور کی نذر نہ کر دینا۔ تم عام شخصیت نہیں ہو، تمہیں اپنی ذمہ داریوں کے اہم ترین معاملات سنبھالنا ہوں گے ہاں اگر دل چاہے تو مستقبل کی منصوبہ بندی کر سکتی ہو لیکن اس کے لئے دن کا وقت ہی بہتر ہوگا۔"

پھر ایک مخصوص جگہ پہنچ کر اس نے مجھے الوداع کہا اور اپنی آرام گاہ کی جانب چلا گیا کم از کم اس کمبخت میں اتنی انسانیت ضروری تھی کہ اس نے مجھے اس ذہنی بیماری کے علاوہ اور کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچایا تھا۔ وہ درحقیقت ایک ہوشمند دیوانہ تھا۔ ہر معاملہ میں ٹھیک لیکن نہ جانے کیوں اس پر فرعونیت کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ویلی آف کنگز میں جو کچھ دیکھا تھا اس کا سحر عسکری کے اس طرح مل جانے سے ٹوٹ گیا اور اب اس کے دیئے ہوئے لفافے کھولنا چاہتی تھی۔

کمرے کا دروازہ بند کر کے میں نے وہ لفافہ چاک کیا اور اس میں رکھا ہوا پرچہ نکال لیا، میری نظریں اردو میں لکھی اس تحریر پر بے صبری سے دوڑنے لگیں۔

"نشاودانش......

نہ کوئی تمہید کروں گا نہ کسی کیفیت کا اظہار...... تم کسی بھی طلسم میں گرفتار ہو مجھ پر صرف تمہارا طلسم طاری ہے، ہزار کوششوں کے باوجود تم سے چشم پوشی نہیں کر سکا، تم گم ہو گئیں تو مجھ پر دیوانگی طاری ہو گئی روشاق اگر رہنمائی نہ کرتا تو شاید میرے فرشتے بھی تمہارا سراغ نہ لگا سکتے۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا اور تمہاری ایک حماقت کی نشاندہی کی جس کی وجہ سے تم ان مشکلات کا شکار ہوئی ہو۔ میں تو اس بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن وہ کہتا ہے کہ اس نے تمہیں ایک محافظ سونپا تھا جس سے بے اعتنائی اور بے قدری نے تمہیں اس حالت میں پہنچایا ہے ورنہ وہ تمہارا پورا تحفظ کرتا۔ روشاق نے اس محافظ کا نام شلسرانہ ہوشیاس بتایا ہے۔

بہرحال روشاق اب مادی شکل میں نہیں ہے بلکہ وہ بھی نادیدہ شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس کی آواز مجھے خوابوں میں سنائی دیتی ہے اس لئے میں اپنی کوششوں سے اس سے نہیں مل سکتا بس وہ جب چاہتا ہے مجھ سے نادیدہ شکل میں مل لیتا ہے شاید وہ میرا تحفظ کر رہا ہے ورنہ میں اب تک مصری پولیس کے ہاتھ لگ گیا ہوتا۔ میں نے اس سے درخواست کی ہے کہ وہ تمہیں اس مشکل سے بچائے۔ اس نے وعدہ کیا ہے اور کہا ہے کہ مقدور بھر کوشش کرے گا دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اپنے بارے میں کچھ لکھنا تمہارے لئے بے مقصد ہوگا اس لئے خدا حافظ مشکل حالات سے بددل نہ ہونا تمہیں کوئی جسمانی نقصان پہنچا تو زندگی تم پر نچھاور کر دوں گا۔ تمہاری مشکلات کے حل کے لئے مسلسل کوشاں ہوں۔

عسکری......"

مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا تھا یہ خط پڑھ کر وہ تاثر اور گہرا ہو گیا تھا جو راستے بھر طاری رہا تھا۔ اس نے درحقیقت اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی میرے لئے...... بہت مشکل تھا یہ سب کچھ اتنا کوئی کسی کے لئے نہیں کر سکتا تھا، یہ سب کسی لگن ہی سے کیا جا سکتا ہے، کوئی بھی لالچ کسی کو اس طرح زندگی کھونے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد اس خط میں کئے گئے انکشافات نے مجھے اپنے بھنور میں پھنسا لیا...... روشاق نادیدہ شکل اختیار کر گیا ہے۔ روشاق ایک انوکھا کردار تھا۔ اگر اس کی سنائی ہوئی کہانی پر یقین کر لیا جائے تو پھر خود سے متعلق پوری داستان پر یقین کرنا پڑے گا وہ سنہرا زیور، جسے روشاق نے میرا محافظ قرار دیا تھا...... کون کون سی باتوں کو نظر انداز کروں؟...... اس زیور کی ناقابل یقین تحریک میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ مجھے وہ سنہری لڑکی بھی یاد تھی۔ خدایا کس طلسم میں گرفتار ہو گئی ہوں میں۔ اس سے نکلنے کا کوئی ذریعہ ہے کہ نہیں...... آنکھوں میں آنسوؤں کی دھندلاہٹ آ گئی۔ عسکری کا چہرہ بار بار ذہن میں ابھر رہا تھا پتہ نہیں اسے کس حد تک تفصیل معلوم ہے، پتہ نہیں وہ امیر غیری کے جنون کو جانتا ہے یا نہیں، اور روشاق، اس کی سنائی ہوئی کہانی تو کچھ اور تھی...... میں بھلا ظہورہ کیسے ہو سکتی ہوں اور سب سے حیرت ناک بات یہ تھی کہ کہیں ایک لفظ معلوم ہوئے بغیر مجھے قدیم مصری زبان کیسے آ گئی، یہ

مجھ سے متعلق سب سے تعجب خیز بات تھی میرے لئے۔

دماغ بری طرح دکھنے لگا۔ حسب معمول ان باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں اخذ کر سکی پھر اس خط کا خیال آ گیا۔ بے شک یہ اردو میں ہے، لیکن خطرناک ہو سکتا ہے مصر میں کسی اردو داں کا مل جانا غیر ممکن تو نہیں ہو سکتا۔ عسکری بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ میں نے سب سے پہلے اس خط کو پرزے پرزے کیا اور واش روم میں جا کر اسے پانی میں بہا دیا، پھر بستر پر لیٹ کر گہری سوچوں میں گم ہو گئی؟ دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔"

عسکری سے دوسری ملاقات کہاں ہوتی ہے۔" اس رات عسکری کو خواب میں دیکھتی رہی۔ ماحول میرے شہر کا تھا۔ عسکری میرے ساتھ تھا، اور مشل دور کھڑی حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

دوسرے دن امیر غیری کے بھروسے پر ناشتے کے کمرے میں پہنچی تو امیر کا موڈ بے حد خراب نظر آیا، کسی بات پر ملازموں کو ڈانٹ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے گردن خم کی اور غلاموں سے کمرے سے باہر نکل جانے کے لئے کہا۔ غلام باہر چلے گئے۔

"کوئی نہیں بتا سکتا مجھے...... کسی کے پاس اس بات کا جواب نہیں ہے کہ زمانہ قدیم میں اس عورت کا کیا کردار تھا، اس وقت وہ کون تھی، میری دوست تھی یا دشمن...... آہ اس کا پتہ نہیں چلتا۔"

"کون عورت ہے وہ غیری......؟" میں نے کرسی پر بیٹھ کر پوچھا۔

"میری چچی...... خاتون زبونا......"

"یہ کون ہے زمانو ختہ...... تم نے مجھے ان سے کبھی نہیں ملایا۔"

"آہ...... دعا کرو ظہورہ کہ وہ وقت کبھی نہ آئے۔ دعا کرو کہ ایسا کبھی نہ ہو ورنہ وہ سارے کھیل بگاڑ دے گی۔ اُف"

"کیا وہ بھی اس محل میں رہتی ہے؟"

"دعا کرو ایسا کبھی نہ ہو...... ناشتہ کرو...... مجھے اس کے پاس جانا ہے۔ وہ اسکندریہ میں رہتی ہے۔"

"تمہیں اس کے پاس جانا ہے......؟"

"ہاں اس کے قاصد آئے ہیں۔ آج بڑی منحوس صبح کا آغاز ہوا ہے۔"

"تم جانے سے انکار کر دو۔"

"میں بے حد بزدل انسان ہوں۔ دنیا بھر میں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا نہ جانے کیوں میرے دل پر بچپن سے اس کا خوف طاری ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اس محل میں قدم رکھے ورنہ تباہی آ جائے گی۔"

"وہ یہاں کبھی نہیں آئی۔؟"

"کبھی نہیں...... ورنہ تمہیں یہ آباد نہ نظر آتا۔ اصل میں اس نے میری پرورش کی ہے۔ اس نے مجھے مار مار کر جوان کیا ہے۔ پتہ نہیں وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے یا محبت...... حالانکہ عثمان امیری اور فیصل امیری کے ساتھ اس کا رویہ حقیقی ماؤں جیسا ہے...... اس بار نہ جانے کیا کیا سوالات کرے مجھ سے۔"

"یہ دونوں کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میری چچی کے بیٹے...... دونوں انتہائی اوباش طبع ہیں، کون جانے وہ اس وقت بھی قاہرہ کے کسی ہوٹل میں مقیم ہوں۔ افسوس میں تمہیں اس وقت ان لوگوں کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا، مجھے جانے کی تیاریاں کرنی ہیں۔"

"تمہاری واپسی کب تک ہوگی امیر......؟"

"ہو سکتا ہے کل ورنہ پرسوں ضرور واپس آ جاؤں گا، اچھا جان غیری اب میں تم سے رخصت چاہتا ہوں، احسان تمہارا خیال رکھے گا۔ بہتر ہوگا کہیں باہر نہ جاؤ اور میری واپسی کا انتظار کرو۔"

"اگر میرا دل گھبرائے تو کیا میں احسان کے ساتھ قاہرہ کے دلچسپ مقامات کی سیر نہیں کر سکتی، جیسے دریائے نیل میں بنا ہوا قاہرہ ٹاور......" میں نے اس خیال سے کہا کہ ممکن ہے اس طرح مجھے عسکری سے دوبارہ ملاقات کا موقع مل جائے۔

"میرے خیال میں یہ بہتر نہ ہوگا، اس کے لئے تم میری واپسی کا انتظار کرو۔"

میں خاموش ہو گئی۔ دوپہر کو عظیمہ نے بتایا کہ امیر سکندریہ جا چکا ہے۔ ان دونوں لڑکیوں پر قطعی اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے اب میں دل کی کوئی بات ان سے نہیں کرتی تھی۔

شام کو چھ بجے کے قریب احسان میرے پاس آیا اور بہت نرم لہجے میں بولا۔

"اپنے کمرے سے باہر نکلئے عالیہ...... ایک ہی جگہ وقت گزارتے ہوئے آپ کا دم گھٹتا ہوگا۔"

"شکریہ احسان...... میں ٹھیک ہوں۔"

"باہر موسم بے حد خوشگوار ہے اس کے علاوہ مجھے آپ سے اہم گفتگو کرنی ہے، ممکن ہے دوبارہ اس کا موقع نہ ملے۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا، تو اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔

"ہاں بعض لمحات بے حد قیمتی ہوتے ہیں، بشرطیکہ انہیں گنوا نہ دیا جائے۔"

"ٹھیک ہے تم چلو میں آتی ہوں۔"

"تنہا آیئے...... میں آپ کا منتظر ہوں۔"

کچھ دیر کے بعد میں باغ میں پہنچ گئی، اس نے مجھے احترام سے خوش آمدید کہا۔ اور بڑے ادب سے ایک جگہ بیٹھنے کی پیش کش کی، پھر خود بھی مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"خاتون بعض لوگوں کو ساری زندگی اپنے مزاج اور خواہش کے برعکس جینا ہوتا ہے، میں خود کو انہی میں سمجھتا ہوں، مجھے امیر غیری کے لئے بہت سے ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جنہیں میرا دل نہیں قبول کرتا، لیکن آپ کو یقیناً اس کا علم نہ ہوگا کہ میں خاتون زبونا کا زرخرید غلام ہوں، ان کا اور اس خاندان کا قدیم غلام...... مجھے حکم ہے کہ امیر کی وفاداری کروں اور ان کی کسی جائز اور ناجائز بات سے انحراف نہ کروں۔"

"مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہو......؟"

"اس لئے کہ میرا دل آپ کی طرف سے صاف ہو چکا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"پچھلے دنوں میں آپ کے بارے میں خفیہ طور پر تحقیق کرتا رہا ہوں، مجھے یہ علم ہو گیا ہے کہ آپ ایک معصوم خاتون ہیں اور کسی سازش کے تحت یہاں پہنچی ہیں۔"

"تمہاری تمام باتیں الجھی ہوئی ہیں احسان...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"صرف ایک بات کی یقین دہانی چاہتا ہوں۔"

"کہو۔"

"میرا کچھ بھی کہا آپ کے خلاف نہیں ہوگا...... لیکن آپ سے ہمدردی بھی مجھے آپ سے کچھ کہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ امیر غیری سے کچھ نہ کہیں گی۔"

"کہو میں وعدہ کرتی ہوں کہ امیر سے کچھ نہ کہوں گی......"

"کیا آپ اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ آپ زمانہ قدیم کے مصر کی کوئی ملکہ ہیں......؟"

اس نے سوال کیا اور میں چند لمحات کے لئے ساکت رہ گئی، بڑا ٹیڑھا سوال تھا...... میرے لئے خطرناک بھی ہو سکتا تھا، لیکن اب خطرناک ہو بھی تو جہنم میں جائے، کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی ہے۔

"نہیں میں یقین نہیں رکھتی...... بالکل یقین نہیں رکھتی......"

"تب آپ اس کا اعتراف کیوں کرتی ہیں۔"

"تم سے زیادہ اس بارے میں اور کون جانتا ہے، کیا تمہیں علم نہیں ہے کہ مجھے کس قدر بے بس کر دیا گیا ہے، بتاؤ میرے پاس کون سا راستہ ہے کیا تم خود اس بارے میں دھمکیاں نہیں دے چکے ہو...... تم مجھے بتاؤ کیا تم زمانہ قدیم کے پروہت ہو......؟"

"نہیں اور میں نے آپ کو دھمکی بھی نہیں دی ہے، میں ایک غلام ہوں صرف ایک زرخرید غلام...... یہ

جواب ہے میرا، آپ کی سمجھ میں آ گیا۔"

"لیکن یہ سب کیا ہے احسان...... آخر یہ سب کیا ہے؟"

"آپ مجھ سے وعدہ کر چکی ہیں کہ اس گفتگو کو راز میں رکھیں گی، امیر غیری عام حالت میں ذہین انسان ہیں بہترین کاروباری لیکن نہ جانے کیوں ان کے دماغ کی گہرائیوں میں یہ خیال جما ہوا ہے کہ وہ زمانہ قدیم کے حکمراں ہیں اور وہ دوبارہ مصر کے مالک ہوں گے انہوں نے اس خیال کو یقین بنالیا ہے، اور آپ نے خود دیکھا ہے انہوں نے اپنے تمام راستے اسی سمت موڑ دیے ہیں، اس معبد کی تعمیر میں جو کچھ خرچ ہوا ہے وہ ناقابل یقین ہے۔ اس کے تحت لاکھوں پاؤنڈ تنخواہوں کی مد میں ہر ماہ خرچ ہوتے ہیں، اس دیوانگی نے اس معصوم لڑکی کو زندگی سے محروم کردیا۔ آہ ظہورہ...... وہ...... وہ......" احسان کی آواز بھرا گئی۔

"اسے تم نے زہر دیا تھا احسان......"

"نہیں...... بالکل نہیں، لیکن آقا غلام کے بارے میں جو کچھ بھی کہے وہی سچ ہوتا ہے۔"

"ظہورہ کو زہر کس نے دیا؟"

"خود امیر غیری نے...... اسی جنون کے عالم میں......"

"اوہ......" میں نے آہستہ سے کہا، کچھ دیر خاموش رہی، پھر میں نے کہا۔

"امیر کہتے ہیں کہ ارمناس کی وادی میں ہو جانے والی رات کو ان پر یہ انکشاف ہوا سنہری بگولوں میں نمودار ہونے والے دروازے کے دوسری طرف انہوں نے اپنا ماضی دیکھا۔"

"مصری قدامت پرستوں کے ایک محدود طبقے میں ارمناس کے ریگستانوں کے بارے میں یہ روایات پائی جاتی ہیں لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں ہے مصر کی ہواؤں میں آج تک زمانہ قدیم کے اثرات رچے ہوئے ہیں کون سی روایت میں کیا سچائی ہے فیصلہ مشکل ہے۔"

"امیر کا کہنا ہے کہ اس رات تم بھی اس کے ساتھ تھے؟"

"ہاں مجھ پر بھی بے ہوشی طاری ہوگئی تھی لیکن ہمیں ساتھ ہی ہوش آیا تھا۔"

"کیا تم نے ماضی میں قدم نہیں رکھا......؟"

"نہیں خاتون...... خدا نے مجھے صحیح الدماغ رکھا بعد میں آقا کا حکم ملا کہ میں ان کا ہم آواز بن جاؤں۔"

"گویا وہ سب کچھ......؟"

"آپ صاحب عقل ہیں خاتون......" احسان بالکل بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"کیا دیوانگی لاعلاج ہے؟"

"شاید نہ ہو، لیکن روئے زمین پر انہیں سمجھانے والا کون ہے۔"

"خاتون زبونا بھی نہیں......؟"

"وہ بیوہ خاتون ہیں، اپنی عزت سے ڈرنے والی۔ امیر اپنے والدین کی چھوڑی ہوئی بے پناہ دولت کے وارث ہیں۔ خاتون ڈرتی ہیں کہ کوئی ان پر انگلی نہ اٹھائے۔"

"حالانکہ امیر غیری ان سے ڈرتے ہیں۔"

"تھوڑا بہت فرض پورا کرتی ہیں وہ، آخر انہوں نے امیر کی پرورش کی ہے، اس کے باوجود وہ امیر کو زیادہ سرزنش نہیں کرتیں، صرف اپنی عزت کی خاطر......"

"عجیب کہانی ہے احسان۔"

"لیکن آپ اس داستان میں کیوں شامل ہوگئیں خاتون معاف کیجیے گا پہلے میں کچھ اور سمجھا تھا۔"

"کیا......؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میری گستاخی معاف کردیجیے، پہلے وہ دونوں بوڑھے فرشتے بن کر امیر سے ملے اور انہوں نے انکشاف کیا کہ ظہورہ مصر میں وارد ہوگئی ہے، انہوں نے اخبار کی تصویر کے ذریعے آپ کی نشاندہی کر کے امیر کو مختلف حوالوں سے یقین دلایا کہ آپ ظہورہ ہیں اور امیر کا دور واپس آنے والا ہے۔ انہوں نے کچھ ایسی معلوماتی گفتگو کی کہ امیر ان سے بہت متاثر ہوئے اس

کے بعد آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہوا، میں امیر کا ایک مہرہ ہوں اور انہی کی زبان بولتا ہوں، میری کیا مجال تھی کہ میں امیر کی خواہش کے خلاف کچھ بول سکتا، انہوں نے آپ کو ظہورہ کہا میں نے اس کی تصدیق کی لیکن میرا خیال کچھ اور تھا؟"

وہ رکا تو میں نے پوچھا۔

"کیا خیال تھا تمہارا......؟"

"میں سمجھتا تھا کہ یہ ٹھگوں کا کوئی گروہ ہے جو تین افراد پر مشتمل ہے پہلے دو ٹھگوں نے امیر غیری کو اپنے سحر میں جکڑا۔ امیر اکثر اخبارات و رسائل میں اپنے بارے میں یہ انکشاف کرتے رہے ہیں کہ ان کا رابطہ قدیم روحوں سے ہے اور روحیں انہیں بتاتی ہیں کہ وہ زمانوخنہ اول ہیں۔ بالآخر مصر کی حکمرانی انہیں ملے گی، اور وہ قدیم دور واپس لے آئیں گے۔"

"اخبارات امیر کے یہ بیانات چھاپتے رہے ہیں۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں وہ جانتے تھے کہ دوسرے دن انہیں خرید کر دریائے نیل میں غرق کردیا جائے گا، اور کوئی ان کا پرسان حال نہ ہوگا، دولت کی طاقت کا اعتراف کون نہیں کرتا۔"

"خیر آگے کہو۔"

"میں نے سوچا تھا کہ آپ تینوں مل کر امیر سے دولت اینٹھنا چاہتے ہیں اور امیر کے خلاف کوئی بہت بڑا فراڈ ہونے جارہا ہے، لیکن اس وقت میرے ذہن کو جھٹکا لگا، جب آپ نے معبد کے دونوں ستونوں کو فرشتے کہہ کر انہیں مسمار کرنے کا حکم دیا اس کے بعد ان دونوں فرشتوں کی گرفتاری کے احکامات مجھے ملے اور پھر قید خانے میں آپ نے ان سے ملاقات کی میں معافی کا خواستگار ہوں کہ آپ کی ملاقات کے دوران آپ کے حکم پر میں وہاں سے ہٹ تو ضرور گیا تھا لیکن وہاں سے دور نہ گیا اور میں نے آپ لوگوں کی باتیں سنیں، ان سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ آپ ان لوگوں کی سازش میں شریک نہیں تھیں بلکہ انہوں نے

ایک نامعلوم مقصد کے تحت آپ کو بھی اس جال میں پھانسا ہے، مجھے شدید حیرت ہوئی، اس کے بعد میں نے آپ کے بارے میں خفیہ تحقیق کی اور میرے خیال کی تصدیق ہوگئی، اسی وقت سے میں مسلسل کوشاں تھا کہ کسی طرح آپ سے تنہا ملاقات کروں۔ یہ اتفاق ہے کہ خاتون زبونا نے غیر متوقع طور پر امیر کو طلب کرلیا اور مجھے یہ موقع مل گیا۔"

"اوہ میرے خدا کتنی الجھی ہوئی داستان ہے میری، احسان تم بھی انسان ہو کیا صرف اس غلامی ہی کو زندگی سمجھتے ہو تم......"

"نہیں خاتون۔"

"کیا انسانیت کے نام پر تم میری مدد نہیں کرسکتے؟"

"میں نے اسی جذبے کے تحت یہ خطرہ مول لیا ہے اور آپ کو ساری حقیقت بتادی ہے، لیکن کچھ باتیں میرے ذہن میں الجھن بنی ہوئی ہیں۔"

"مثلاً......؟"

"آپ نے یہ کیوں تسلیم کرلیا کہ آپ ظہورہ ہیں......؟"

"کیا کرتی میں کمزور ہوں، بے سہارا ہوں، کوئی مددگار نہیں ہے، میں اضطرات میں گھری ہوئی تھی، ہمت نہیں تھی مجھ میں ان حالات میں زندگی گزارنے کی، امیر کی ہاں میں ہاں ملا کر میں اس کا اعتماد حاصل کرنا چاہتی تھی اور...... اور موقع پا کر یہاں سے نکل بھاگنا چاہتی تھی۔"

"اب بھی آپ کا یہی ارادہ ہے؟"

"ہاں...... تمہارے سامنے یہ اعتراف کرتے ہوئے میں خطرہ نہیں محسوس کرتی اگر تم نے میرے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو...... پھر...... میں بھی تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔" میں نے کہا۔

"آپ کو اس کا حق حاصل ہوگا خاتون، میں بھلا آپ کے خلاف کیوں قدم اٹھاؤں گا لیکن یہاں سے بھاگ کر آپ کہاں جاتیں......؟"

"تمہارا کیا نام ہے......؟"

"جی......؟" میں اچھل پڑی۔

"کیا نام ہے تمہارا......؟"

"آپ مجھے ظہورہ کہہ کر پکارتے ہیں امیر......"

"ہاں لیکن اس سے پہلے بھی تو تمہارا کوئی نام تھا، ہم نے تمہیں ظہورہ کہہ کر پکارا۔ ظہورہ تمہیں اس لئے کہا گیا تھا کہ اس نام سے تمہیں اپنی تحویل میں لینے کا جواز پیدا کیا جائے۔ تم نے اس سے شدید انحراف کیا۔ اس سے پہلے تمہارا کیا نام تھا......؟"

"کیوں پوچھ رہے ہیں امیر......؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

"سخت الجھن میں ہوں، بہت پریشان ہوں میں، بہتر ہوگا اس وقت مجھے صرف جواب دو کوئی سوال نہ کرو مجھ سے...... بتاؤ تمہارا نام کیا تھا......؟"

"نشا دانش۔"

"تمہارا کوئی ماضی ہوگا، اتنی عمر ہے تمہاری کچھ تعلقات ہوں گے۔ رشتہ دار، ان کے ساتھ گزری ہوئی زندگی......"

"ہاں کیوں نہیں......؟"

"اس زندگی میں تمہیں کبھی یہ احساس ہوا کہ تم وہ نہیں ہو جو محسوس کرتی رہی ہو تم...... کوئی ایسی بات جس سے تم نے محسوس کیا ہو کہ تمہارا تعلق زمانہ قدم سے ہے۔"

"نہیں...... میں نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا۔" میں نے جواب دیا اور وہ سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا۔

"اور اب......؟"

"کیا بات ہے امیر، مجھے کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں مجھے یاد ہے تمہارے ساتھ زبردستی کی گئی ہے، مگر تم نے زمانہ قدیم کی زبان کہاں سے سیکھی۔ اچانک ہی تم نے خود کو ظہورہ تسلیم کرلیا، ایک بات بتاؤ...... کیا میرا ذہنی توازن خراب لگتا ہے تمہیں؟"

"آپ کی باتوں میں ربط نہیں ہے امیر۔ آپ واقعی بے حد پریشان لگتے ہیں۔"

"فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے مجھے یوں لگتا ہے جیسے کچھ ہے کوئی ایسی بات جو میری سمجھ میں نہیں آرہی، وہ دونوں...... سنو تم نے کہا تھا وہ جھوٹے فرشتے ہیں گویا وہ زمانہ قدیم میں تھے، وہ جھوٹے سہی، ہمارے دشمن سہی لیکن وہ ہماری اصلیت کے شناسا ہیں، وہ ہمارا ماضی جانتے ہیں۔" اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا پھر اٹھ گیا۔

"کہاں جارہے ہیں امیر......؟" میں نے پوچھا۔

"ممکن ہے میں دماغی مریض ہوں، ممکن ہے کوئی سازش کی گئی ہو میرے ساتھ۔ میں آؤں گا کچھ دیر کے بعد تمہارے پاس۔" وہ اٹھا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ میں منہ پھاڑتے دروازے دیکھتی رہ گئی البتہ مجھے فوراً احساس ہوا تھا کہ اس میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس نے اسے خود پر غور کرنے پر مجبور کردیا ہے پتہ نہیں یہ میرے حق میں اچھا ہوگا یا خراب......

بہت دیر گزر گئی وہ واپس نہیں آیا۔ میں انتظار کرتی رہی یہاں تک کہ کئی گھنٹے گزر گئے تب میں خود ہی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی عظیمہ اور لالہ بدستور موجود تھیں۔

"امیر کہاں ہیں؟"

"شاید کمرہ طعام میں گئے ہیں۔"

"ہوں۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ گئی، میرے دل میں شدید تجسس جاگا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی، کمرہ طعام خالی تھا ایک ملازم میز سجا رہا تھا۔

"امیر نہیں آئے......؟"

"نہیں...... شاید نہ آئیں آپ کے لئے کھانا لگادوں......؟"

"اپنے ملک کے سفارت خانے میں وہاں سب کچھ بتا کر حکومت سے مدد مانگتی اور پھر...... اپنے وطن واپس چلی جاتی۔"

احسان سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔

"میں آج بھی اپنے آقا کا وفادار ہوں، لیکن میں آپ کی مدد بھی کرنا چاہتا ہوں کیا آپ میری مدد قبول کریں گی۔؟"

"کیا مدد کرسکتے ہو تم میری......؟"

"وہی جو آپ چاہتی ہیں، میں خود آپ کو آپ کے ملک کے سفارت خانے تک پہنچا کر آؤں گا۔ لیکن میں یہ نہیں چاہوں گا کہ میرے آقا پر آپ کے اغوا کا الزام عائد ہو، آپ کو علم ہے کہ وہ پاگل پن میں مبتلا ہیں اور سب کچھ عالم دیوانگی میں کررہے ہیں، میں انہیں بھی بچانا چاہتا ہوں اس کے علاوہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ میں خود پھنس جاؤں۔ امیر غیری کو اگر یہ علم ہوجائے گا کہ میں نے آپ کی مدد کی ہے تو پھر میرا زندہ رہنا مشکل ہوگا آپ کو میری پوزیشن کا اندازہ ہو رہا ہے......؟"

"ہاں......!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تین تین ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں مجھ پر، ایک بے بس خاتون کی مدد، اپنے آپ کو قانون کے شکنجے سے بچانا اور اپنے آپ کو آقا کے عتاب سے بچانا...... چنانچہ میں ایک خواہش کرنا چاہتا ہوں۔"

"بتاؤ۔"

"چند روز توقف فرمالیں، مجھ پر اعتماد کرلیں کوئی ایسی ترکیب نکالوں گا کہ یہ سب کچھ باآسانی ہوجائے۔"

"مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے احسان...... ظاہر ہے یہاں میرے نگران تم ہو، تمہیں دھوکا دے کر ہی یہاں سے نکلتی اب تم ہی مدد پر آمادہ ہو تو پھر ٹھیک ہے تمہاری ہدایت کے بغیر میں کچھ نہیں کروں گی۔"

"اوہ...... میں اس وقت کو مبارک سمجھتا ہوں بہت سی مشکلات کا حل دیا ہے ان لمحات نے۔ اب آپ آرام کریں آپ جو چاہتی ہیں وہی ہوگا۔ بہت جلد...... یقیناً بہت جلد۔"

"شکریہ احسان...... خدا تمہیں اس نیکی کا اجر دے گا۔" میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ گئی۔

امیر غیری تیسرے دن واپس آگیا، مجھے اس کی آمد کی اطلاع دی گئی، امیر مجھ سے فوراً ملنے نہیں آیا۔ اس ملاقات کے بعد احسان نے بھی مجھ سے کوئی ملاقات نہیں کی تھی، بلکہ وہ مجھے نظر تک نہیں آیا تھا، ظاہر ہے مصروف ہوگا اور پھر وہ اپنے منصوبے کے تحت مجھ سے قربت کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتا ہوگا۔ امیر غیری کی آمد کی اطلاع مجھے کوئی دس بجے دن کو ملی تھی لیکن شام چھ بجے تک امیر غیری مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ پھر سوا چھ بجے کے قریب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا ایک نگاہ میں اس کا چہرہ کچھ بدلا بدلا سا محسوس ہوا۔ دروازے پر رک کر وہ مجھے کچھ دیر عجیب سے انداز میں گھورتا رہا رہا تھا پھر دروازے سے ہٹ کر اس نے دروازہ بند کردیا۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ نہ جانے اس پر کیا بھوت سوار ہے۔ وہ مڑا اور الجھے الجھے قدموں سے چلتا ہوا ایک کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

"آپ اسکندریہ ہو آئے امیر؟" میں نے پوچھا۔

"...... ہاں!" وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔

"خیریت سے ہیں......؟"

"خیریت......؟ شاید نہیں......!"

"کیا بات ہے......؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا...... الجھ گیا ہوں، تم میری الجھن میں کوئی مدد کرسکتی ہو، اچانک ہی یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔"

"کوئی خاص بات ہے......؟" میں نے متجسس لہجے میں پوچھا۔ اس نے جواب نہیں دیا بلکہ دیر تک ایک سنہری برتن پر نگاہ جمائے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”نہیں......احسان کہاں ہیں......؟“
”وہ محل میں موجود نہیں ہیں۔“
”امیر مجھے طلب کریں تو مجھے اطلاع دینا۔“ میں نے کہا اور واپس اپنے کمرے کی طرف چل پڑی، بڑی سنسنی سی محسوس ہو رہی تھی، رگیں کھنچی کھنچی لگ رہی تھیں، کمرے میں داخل ہو گئی اپنے بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی، کیا ہوا ہے آخر کیا ہوا ہے، کیا اس شخص کو ہوش آ رہا ہے، کیا وہ اس دماغی دورے سے آزاد ہو رہا ہے، جس کے زیر اثر یہ خود کو زمانو خنہ سمجھنے لگا تھا، اسکندریہ میں اسے کسی اور ذہنی حادثے سے دوچار ہونا پڑا ہے کیا، اگر ایسا ہو گیا تو مجھ پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے...... بہت غور کیا، میرے حق میں ہر مشکل سے آزاد ہو جاؤں گی، پھر نہ فرار کی ضرورت رہے گی، نہ احسان کی مدد کی، ہاں بس ایک خطرہ دامن گیر تھا اگر وہ کسی تصدیق کے لئے وسکن ڈیزل اور عدنان شائی کے پاس گیا تو وہ اسے کسی اور ہی جال میں جکڑنے کی کوشش نہ کریں۔ میرے اور ان کے درمیان اب باقاعدہ دشمنی تھی اور وہ میرے خلاف ہر سازش کر سکتے تھے۔ سب کچھ ہو سکتا ہے، ہر جگہ سے کچھ بھی ہو سکتا ہے، کسی بھی سلسلے میں آخری فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

بہت دیر گزر گئی عظیمہ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔

”کھانا کھا لیجیے عالیہ، بہت وقت ہو گیا ہے۔“
”امیر نے کھانا کھا لیا......؟“
”ہمیں نہیں معلوم۔“
”لے آؤ۔“ میں نے کہا۔

کچھ دیر کے بعد عظیمہ نے کھانا لگا دیا۔ ہلکا پھلکا کھانا کھایا ان دونوں خود غرض لڑکیوں کو پہلے ہی آزما لیا تھا ان سے کوئی بات کرنا بے معنی تھا چنانچہ میں نے انہیں گھاس نہیں ڈالی، کھانے کے بعد تھوڑی دیر تک سامنے والے کوریڈور میں ٹہلتی رہی۔ یہ خیال بھی تھا کہ کوئی نظر آ جائے غیری یا احسان، لیکن خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اکتا کر اندر آئی لباس تبدیل کیا اور مسہری پر لیٹ گئی سوچوں کے بھنور پڑنے لگے۔ امیر مجھ سے بالکل غیر متعلق ہو گیا ہے، اس کے انداز میں کیفیت بھی نہیں تھی، پہلے اس کی نگاہ مجھ پر پڑتی تھی محبت پاش ہوتی تھی، لیکن آج وہ خود میں کھویا ہوا تھا، اس نے ایک بار بھی غور سے مجھے نہیں دیکھا تھا، اونہہ...... وہ بھاڑ میں جائے بس مجھے یہاں سے نکال دے...... خدا کرے وہ ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آ جائے اگر وہ مجھ پر قناعت کرے تو اسی سے عسکری کے بارے میں بات کروں گی۔ اس سے کہوں گی کہ میرا ایک ساتھی بھی ہے وہ بے چارہ میری تلاش میں سرگرداں ہے اور حکومت مصر کا مجرم بن گیا ہے اسے بھی میرے ساتھ یہاں سے نکال دے۔ عسکری سے اب مجھے واقعی ہمدردی تھی۔ یہ تسلیم کر لیا تھا میں نے کہ وہ میرے معاملے میں سچا ہے باقی معاملات اپنی جگہ وطن پہنچ کر بھی اس سے قطع تعلق نہیں کروں گی بلکہ اس سے کہوں گی کہ میرے لئے ہی سہی وہ مشل سے شادی کر لے، میں کسی کی محبت پر نہیں ڈال ڈا سکتی۔ سب کچھ اپنی جگہ لیکن مشل کا اس پر حق ہے۔ بس ایسی ہی باتیں سوچتی رہی۔

پھر آنکھوں میں نیند کی دھندلاہٹیں ابھرنے لگیں۔ تیز روشنی بند کرنے کو جی چاہا، ان دونوں خادماؤں کو آواز دینے کے جائے میں خود اٹھی اور میں نے تیز روشنی گل کر کے مدھم روشنی والا بلب جلا دیا۔ واپس پلٹی تھی کہ فرش پر کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ مدھم مدھم رنگین روشنیاں، چونک کر اس چیز کے قریب پہنچ گئی مدھم بلب کی روشنی میں بھی وہ خنجر نظر آ گیا تھا جو فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس چمکدار برہنہ خنجر کو اٹھا لیا اور اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

یہ یہاں کہاں سے آیا، انتہائی قیمتی خنجر تھا، جس کے دستے پر ننھے ننھے ہیرے جڑے ہوئے تھے اور روشنی کی یہ کرنیں انہی ہیروں سے اٹھ رہی تھیں۔ میں حیرانی سے اس خنجر کو دیکھنے لگی، کس کا ہو سکتا ہے اس سے پہلے تو یہاں موجود نہیں تھا اور پھر اتنا قیمتی اور نفیس خنجر......

اچانک ہی خیال آیا کہ یہ امیر غیری ہی کا ہو سکتا ہے۔ اسی کرسی کے پاس پڑا ہوا تھا جہاں امیر اس وقت آ کر میرے پاس بیٹھا تھا۔ یقینی طور پر اپنے الجھاؤ میں وہ اس کی جانب توجہ نہیں دے سکا کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی جس پر حیرت ہوتی، میں تھوڑی دیر تک اس کی بناوٹ کا جائزہ لیتی رہی۔ دستے کو مٹھی میں لے کر بھی دیکھا تھا۔ ”پتہ نہیں یہ خنجر کسی پر استعمال بھی ہوا ہے یا بس یونہی دکھاوے کے طور پر ہے۔ بہرحال کل دن میں عظیمہ اور لالہ سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کروں گی اور پھر امیر کو واپس کر دوں گی۔“

خنجر ایک خوب صورت منقش میز پر رکھ دیا۔ میں بستر پر آ کر لیٹی اور ماضی کی سوچوں کو ذہن میں بسا کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اور اس کوشش میں، میں جلد ہی کامیاب ہو گئی تھی۔

ذہن خوابوں سے آزاد رہے تو نیند کا لطف آ جاتا ہے لیکن بعض خواب بھی اتنے دلکش ہوتے ہیں کہ انسان ان کی آرزو کرے۔ ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل ان خوابوں سے ہو جاتی ہے، تاہم میرے دل میں کسی خواب کو دیکھنے کی آرزو بھی نہیں تھی...... سوتی رہی اور رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب اچانک ایک دہشت ناک چیخ میرے کانوں میں گونجی تو میں چونک پڑی۔

نیم خوابیدہ ذہن کچھ سوچ تو نہ سکا لیکن اچانک ہی میرے سینے پر ایک زوردار ضرب لگی اور میرے حلق سے بے اختیار آواز نکل گئی۔ ابھی اس ضرب سے نہیں سنبھلی تھی کہ میرے گھٹنوں پر دوسری ضرب لگی اور پھر کسی کا ہاتھ میرے پیٹ پر آ پڑا۔ کسی نے زور سے میرے لباس کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ اب میں پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔ کوئی میرے قریب موجود تھا، میری مسہری پر تھا اور مجھ پر حملہ آور تھا، میرے حلق سے دہشت آمیز چیخیں نکلنے لگیں، اور میں نے پوری قوت سے خود آ پڑنے والے بوجھ کو دور دھکیلا اور مسہری سے نیچے چھلانگ لگا دی، میرا حلق چیخنے کی مشین بنا ہوا تھا۔ بے تکے انداز میں مسہری سے نیچے چھلانگ لگائی تھی، اس لئے پاؤں اپنے ہی لباس میں الجھ گئے اور میں دھڑام سے نیچے گر گئی، اگر نہایت موٹا قالین نہ بچھا ہوتا تو خوب زور سے چوٹ لگتی، اٹھنے کی کوشش کی تو پاؤں پھر الجھ گئے، چیخیں مسلسل نکل رہی تھیں، فوراً ہی دروازہ کھلا عظیمہ اور لالہ دھڑ دھڑاتی ہوئی اندر داخل ہو گئیں۔ وہ بھی شاید سوتے سے جاگ کر آئی تھیں اس لئے بدحواس تھیں، مجھ سے آ ٹکرائیں اور پھر خود بھی چیخنے لگیں حواس کچھ اس بری طرح معطل ہو گئے تھے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی گم ہو گئی تھی پھر انہیں ہی ہوش آیا عظیمہ نے جلدی سے تیز روشنی جلائی۔ اور میں اس وحشت خیز منظر کو دیکھنے لگی پھر اچانک ہی اس کے حلق سے بھی ایک سماعت شکن دل خراش چیخ بلند ہوئی اور وہ چکرانے لگی اس کے منہ سے چیخ کے ساتھ الفاظ بھی نکل رہے تھے۔

”ق......ق ت...... قتل......خون......خون امیر غیری کا خون ہو گیا۔ خون ہو گیا......“

وہ بے تحاشہ سنبھل کر باہر کی جانب بھاگی، دروازے سے دھاڑ سے ٹکرائی اور دروازہ کھل گیا وہ باہر نکل گئی ادھر لالہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری مسہری کی جانب دیکھ رہی تھی۔ میں نے نہ جانے کس طرح اپنے آپ کو سنبھالا اور پلٹ کر مسہری کی جانب دیکھا اور اس کے بعد میرے بدن پر شدید تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی میں نے اپنی صاف و شفاف مسہری کی چادر کو خون سے رنگین دیکھا اور وہ ہوشربا منظر بھی جس نے نہ جانے کس طرح میرے حواس قائم رہنے دائے، ورنہ مجھے پاگل ہو جانا چاہئے تھا۔

امیر غیری شب خوابی کے لباس میں ملبوس میری مسہری پر مڑا تڑا پڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے میں دستے تک پیوست خنجر صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے اعضاء اب بھی متحرک تھے لیکن بس ان میں ہلکی سی پھڑپھڑاہٹ تھی جیسی جان نکلتے وقت ہوا کرتی ہے۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں، دونوں ہاتھ مڑ گئے تھے، چہرہ بے حد بھیانک

ہوگیا تھا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے بدن کی یہ پھڑپھڑاہٹ بھی ختم ہوگئی، یقینی طور پر صرف چند لمحے قبل یہ خنجر اس کے سینے میں پیوست کیا گیا تھا اور یہ وہی تھا جس نے شدید تکلیف کے عالم میں میرے سینے پر ہاتھ مارا تھا۔ اور اس کے بعد اس کا شدت تکلیف سے تڑپتا ہوا جسم بار بار میرے جسم سے ٹکرایا تھا۔ غالباً اب اس کی مشکل آسان ہوگئی تھی۔ وہ دم توڑ چکا تھا اور ساکت تھا۔ عظیمہ کی چیخیں باہر سنائی دے رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی مختلف آوازیں ...... جبکہ لالہ جو خود بھی الجھ کر نیچے گری تھی، اپنی جگہ ساکت سینے پر ہاتھ باندھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے در و دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ میں چکراتی ہوئی ایک دیوار سے جا لگی عظیمہ کے ساتھ آس پاس موجود چند ملازم دوڑتے ہوئے آئے اور پھر خود بھی امیر کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش کو دیکھ کر چیخنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا محل روشن ہوگیا، چاروں طرف سے آوازیں ابھرنے لگیں اور اس کے بعد لاتعداد افراد میرے کمرے میں گھس آئے، میں پتھرا گئی تھی اور اپنی جگہ دیوار سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا سچی بات یہ ہے کہ پوری طرح سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا۔

کچھ ہی دیر گزری کہ احسان اندر داخل ہوگیا۔ اس نے اندر موجود لوگوں کو دیکھا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"تم سب یہاں کیوں آمرے، باہر نکلو...... میں کہتا ہوں باہر نکلو تم سب......" بہت سے لوگ کان دبائے دروازے سے باہر نکل گئے تھے۔

احسان نے مسہری کے قریب پہنچ کر امیر غیری کی لاش کو دیکھا پھر گلوگیر لہجے میں بولا۔

"...... آقا قتل کر دیے گئے ...... میرے مالک کو ہلاک کر دیا گیا۔ عظیمہ، لالہ کہاں مر گئیں تم......" دونوں لڑکیاں برے حال اندر آگئیں۔

"غبون کہاں ہے؟" احسان پھر دھاڑا۔

"میں باہر موجود ہوں سالار۔" باہر سے آواز آئی۔

"اندر آؤ......!" احسان نے کہا اور محل کا ایک اور منتظم اندر آگیا۔

"امیر قتل ہوگئے ہیں پولیس کمشنر کو فون کر کے خبر دو۔"

"جی سالار۔"

"اور سنو! فوراً ہی خاتون زیونا کو اس سانحہ کی اطلاع کرو۔"

"جی سالار۔"

"کیا جی جی کر رہے ہو، جلدی جاؤ پہلے کمشنر کو فون کر کے خبر دو اور پھر خاتون زیونا کو......"

غبون باہر نکل گیا۔ اس دوران احسان نے ایک بار بھی مجھ پر نظر نہیں ڈالی تھی مجھ میں تو نہ ہلنے جلنے کی سکت تھی اور نہ بولنے کی ...... یہ سب کچھ مجھے ایک خواب ہی معلوم ہو رہا تھا۔ محل میں کہرام مچا ہوا تھا۔ اچانک ہی وفاداروں کو خیال آیا کہ امیر کی موت پر رونا بھی ضروری ہے چنانچہ باہر سے رونے کی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر ایسا شور و غوغا مچا کہ الامان الحفیظ۔

میرے پیروں کی جان نکلی جارہی تھی۔ پھر جب مجھ سے کھڑا نہ رہا جاسکا تو میں دیوار ہی کے سہارے اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ مراحل طے ہوتے رہے، میری ذہنی قوتیں واپس آتی رہی تھیں اور میں اب اس انتہائی سنگین صورت حال کو سمجھ رہی تھی۔ ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی تھی وہ یہ تھی کہ احسان نے ایک بار بھی مجھ سے نظر نہیں ملائی تھی۔ اس کے چہرے پر میرے لئے رحم کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اور یہ کیفیت اس کی اس گفتگو سے بالکل مختلف تھی جو اس نے مجھ سے کی تھی، کیا ہے یہ سب کچھ ناقابل یقین نہ سمجھ میں آنے والا۔

پھر ایک توانا اور ادھیڑ عمر شخص کمشنر کے لباس میں اندر داخل ہوگیا، اس کے ساتھ دو افراد اور تھے۔ احسان نے اسے دیکھ کر افسردگی سے کہا۔

"اوہ...... امیر غیری قتل کر دیے گئے۔"

پولیس کمشنر نے ایک نظر کمرے کے ماحول پر ڈالی، مجھے دیکھا، چند لمحات مجھے پر نگاہیں جمائے کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا مسہری کے قریب پہنچ گیا، ہاتھ لگائے بغیر اس نے امیر غیری کو قریب سے دیکھا۔ اور اس کے بعد احسان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"لاش اسی عالم میں پائی گئی ہے، کسی نے اس میں کوئی تبدیلی تو نہیں پیدا کی......؟"

"نہیں۔" احسان نے بھاری آواز میں جواب دیا۔

پولیس کمشنر نے اپنے ساتھ آنے والے دونوں افراد میں سے ایک سے کہا۔

"فوٹو گرافر کو اندر بلالو۔"

وہ شخص دروازے کی جانب بڑھ گیا اور غالباً فوٹو گرافر کو آواز دینے لگا۔ پولیس کمشنر نے کہا۔

"میں نے محل کے چاروں طرف ناکہ بندی کرادی ہے، فکر نہ کرنا احسان کوئی شخص باہر نکل کر نہیں جاسکے گا۔"

"اوہ...... شاید اس کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔" احسان نے مدہم لہجے میں کہا۔ پھر پولیس کمشنر میری جانب متوجہ ہوا اور بولا۔

"یہ خاتون کون ہیں......؟"

"اس کی تفصیل تمہیں بعد میں بتادی جائے گی کمشنر۔"

"کیا اسکندریہ میں خاتون زیونا کو اس بارے میں اطلاع دے دی گئی؟"

"ہاں...... انہیں ٹیلیفون کیا گیا ہے، غبون ابھی آکر مجھے بتائے گا کہ خاتون زیونا نے اس بارے میں کیا جواب دیا ہے۔"

کچھ دیر کے بعد فوٹو گرافر اندر آگیا اور اس نے کرسی پر پڑی ہوئی لاش کی مختلف زاویوں سے تصاویر بنانا شروع کر دیں۔ میں اب بھی ایک تماشائی کی مانند ان تمام مناظر کو دیکھ رہی تھی۔ ذہن کے پردوں سے عجیب عجیب خیالات ٹکرا رہے تھے اور یہ احساس پوری طرح ہو چکا تھا کہ میں ایک بار پھر کسی بہت بڑے جال میں گرفتار ہو چکی ہوں اور یہاں اس عمارت میں میرا کوئی بھی ہمدرد نہیں ہے، یقینی طور پر میری زندگی کا ایک اور مشکل دور شروع ہو چکا ہے دیکھیں اب اس سلسلے میں مزید کیا ہوتا ہے۔

فوٹو گرافر اپنا کام مکمل کر چکا۔ پھر احسان کی آواز ابھری۔

"غبون، غبون ...... کہاں مر گیا...... غبون۔" محل کا منتظم اندر آگیا۔ احسان بولا۔

"خاتون زیونا کو فون کیا......؟"

"جی سالار بڑی مشکل سے رابطہ قائم ہوا ہے۔"

"کیا بات ہوئی؟"

"عشان امیری نے کہا ہے کہ وہ قاہرہ آنے کی تیاری کر کے جلد از جلد پہنچ رہے ہیں۔ ان کے آنے سے قبل کوئی عمل نہ کیا جائے۔" احسان نے پولیس کمشنر کو دیکھا اور بولا۔

"خاتون زیونا کے آنے سے قبل کچھ کرنا مناسب نہ ہوگا۔"

"جیسا پسند کیا جائے، تاہم میری رائے ہے کہ لاش کو سنبھال لیا جائے تاکہ وہ اس کی کیفیت میں اکڑ نہ جائے۔ ہم تصاویر بنا چکے ہیں، آپ امیر کے مردہ جسم کو سنبھال کر سیدھا کر دیں بلکہ اپنی نگرانی میں ایسا کرائے دیتا ہوں۔ اجازت ہو تو اس خنجر کو امیر کے سینے سے نکال لیا جائے۔"

"پولیس بہتر سمجھتی ہے، خنجر کے دستے پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات محفوظ رکھے جائیں۔"

"ہاں یقیناً!" کمشنر نے کہا پھر دوسری کارروائیاں ہونے لگیں۔ لاش کو سیدھا کر کے لٹا دیا گیا، پولیس کمشنر بولا۔

"میں مزید کچھ لوگوں کو اطلاع کرنا ضروری سمجھتا ہوں، قتل کسی معمولی شخصیت کا نہیں ہے مصر کے بہت بڑے سرمایہ دار کو زندگی سے محروم کر دیا گیا ہے۔"

"آپ جو مناسب سمجھیں کرتے رہیں کمشنر، میں ذہنی طور پر معطل ہوں۔" احسان نے کہا۔

کمشنر باہر نکل گیا، کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ اندر آ گیا تھا۔

"پولیس کے اعلیٰ افسران پہنچ رہے ہیں آپ براہ کرام ان کے لئے ہدایات جاری کردیں۔"

"غضبون جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔" احسان نے کہا، پولیس کمشنر نے ایک بار پھر مجھے دیکھا اور احسان سے بولا۔

"یہ خاتون وہاں کیوں بیٹھی ہیں، ان کا تعارف نہیں کرایا آپ نے احسان۔"

"قاتل کو قاتل ہی کہنا مناسب ہے کمشنر اور کیا کہہ کر اس کا تعارف کراؤں۔ یہ میرے مالک کی قاتل ہے۔" احسان نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

احسان کے الفاظ ناقابل یقین تھے سماعت انہیں تسلیم نہیں کررہی تھی۔ اس نے کچھ اور کہا ہے ،ضرور اس نے کچھ اور کہا ہے...... وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ وہ مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرچکا ہے، وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے...... ایسی بات وہ نہیں کہہ سکتا...... وہ ہمدرد انسان ہے، لیکن اس کی آنکھوں سے جھانکنے والی نفرت ان الفاظ کی تصدیق کررہی تھی...... میں حیران نگاہوں سے احسان کو دیکھنے لگی۔ شاید کمشنر کو بھی اس کی سماعت نے دھوکا دیا تھا۔

"کیا کہا آپ نے مسٹر احسان......؟" کمشنر بولا۔

"یہ لڑکی میرے مالک کی قاتل ہے کمشنر...... افسوس امیر غیری اپنی نادانی کا شکار ہوگئے۔"

"لیکن......؟" کمشنر نے کہا۔

"آپ اس کی حالت نوٹ نہیں کررہے کمشنر، دیکھئے اسے، یہ بدنصیب ہے کہ اسے فرار کا راستہ نہیں مل سکا، امیر کی دلدوز چیخوں نے متعدد محافظوں کو فوراً یہاں پہنچادیا۔ ورنہ یہ ضرور نکل جاتی۔ اس کے علاوہ میں نے اسے اس کے ساتھیوں کی مدد نہ حاصل نہ ہونے دی۔ اسے یقین ہوگا کہ وہ پائیں باغ میں اس کے منتظر ہوں گے۔ شاید یہ اب بھی انہی کا انتظار کررہی ہے۔"

"آپ نے مجھے حیران کردیا ہے مسٹر احسان۔" کمشنر بولا۔

"کاش اپنے آقا کی موت کا انتقام لینے کا حق مجھے دے دیا جائے میں نے زندگی میں کسی چڑیا کو بھی نہیں مارا لیکن کمشنر، میں تین افراد کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔ کمشنر مجھے اس کی اجازت دے دیں۔" احسان کی آواز بھرا گئی کمشنر نے اس کے شانے پر تھپکی دے کر اسے خود پر قابو پانے کی تلقین کی۔

میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہورہی تھیں، سر اس بری طرح چکرا رہا تھا کہ میں بیٹھے بیٹھے جھومنے لگی تھی۔ کمشنر نے اپنے ایک ساتھی سے موبائل طلب کیا اور مدھم لہجے میں کسی سے باتیں کرنے لگا۔ پھر فون بند کرکے اس نے احسان سے کہا۔

"میں نے لیڈی پولیس فورس طلب کی ہے ،ویسے آپ سے درخواست ہے مسٹر احسان کہ اعلیٰ افسران کے سامنے اس طرح کی کوئی بات نہ کریں۔ کیا خیال ہے اس لڑکی کو کہیں اور منتقل کردیا جائے۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

"ہرگز نہیں...... بکواس کرتے ہو تم۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی بکواس مت کرو۔ تم سب......" میں نے اٹھنے کی کوشش کی، دیوار کا سہارا لیا لیکن کمبخت پاؤں بے جان تھے۔ وہ میرے بدن کا بوجھ سنبھالنے سے عاری تھے، میں گر پڑی۔ پولیس کمشنر نے پستول نکال کر مجھ پر تان لیا تھا۔

"خبردار...... ساکت رہو، ورنہ......"

اسی وقت غضبون دوڑتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

"اعلیٰ حکام آ گئے ہیں۔" کمشنر فوراً مستعد ہوگیا ۔پھر جلدی سے بولا۔

"اسے سنبھالے رکھو۔ میں ان لوگوں کا استقبال کرتا ہوں۔" وہ باہر نکل گیا۔

میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں، جو کچھ میں کرنا چاہتی تھی نہیں کرسکتی تھی، میرے اعصاب بالکل ساتھ چھوڑ گئے تھے، چند افراد اندر داخل ہوگئے، کمشنر نے کافی باتیں باہر ہی کرلی تھیں۔ یہاں داخل ہوکر نوواردوں نے صرف امیر غیری کی لاش دیکھی، اس کے ساتھ تصویریں بنوائیں۔ میری طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ ایک شخص نے کہا۔

"ملک ایک بہت بڑی شخصیت سے محروم ہوگیا۔"

"لاش کب اٹھوائیں گے کمشنر......؟"

"صبح سے پہلے ممکن نہیں ہے سر۔"

"کیوں؟"

"خاتون زیونا کی آمد ضروری ہے۔"

"وہ سرد خانے میں اسے دیکھ سکتی ہیں۔"

"انہوں نے درخواست کی ہے۔"

"خیر صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ آپ اپنی تحقیق کی رپورٹ جلد پیش کیجئے۔"

"میں بذات خود اس قتل کی تفتیش کروں گا۔"

"اپنی سابقہ روایات برقرار رکھیئے۔"

"پوری کوشش کروں گا جناب۔" پولیس کمشنر نے نیازمندی سے کہا۔ رسمی باتیں کرکے وہ لوگ چلے گئے، اس کے بعد پولیس کمشنر نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو باہر مستعد رہنے کی ہدایت کردی تھی، پھر وہ بولا۔

"میں نے اعلیٰ حکام سے اس کیس کی تفتیش خود کرنے کا وعدہ کیا ہے، اب آپ مجھے اس بارے میں مکمل تفصیل بتائیں مسٹر احسان۔"

"کمشنر، بڑے انوکھے انکشافات ہیں، کاش آقا غیری ایک بار سنجیدگی سے میری سن لیتے، میری باتوں کو مان لیتے، لیکن آپ کو شاید ان کے بارے میں علم ہو۔"

"کس بات کا علم......؟" کمشنر نے پوچھا۔

"امیر غیری ایک عجیب سی ذہنی فتور کا شکار تھے۔ عام حالات میں آپ کو علم ہے کہ وہ اپنا کاروبار نہایت خوش اسلوبی سے سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کی دماغی کیفیت نارمل تھی لیکن وہ خود کو زمانہ قدیم کا فرعون سمجھتے تھے...... فرعون زمانوختہ......!"

"اوہ...... ہاں مجھے یاد آیا، کسی نے مجھ سے تذکرہ کیا تھا، ایک بار کسی پارٹی میں ہمیں سیکورٹی کے انتظامات کرنے تھے تو میرے کسی ساتھی نے امیر کے بارے میں ازراہ تمسخر مجھے بتایا تھا کہ دیکھو، وہ زمانہ قدیم کا فرعون ہے اور غالباً یہی نام لیا تھا شاید زمانوختہ۔"

"جی...... یہ بات امیر کے ذہن میں گھر کرگئی تھی۔"

"یعنی پوری سنجیدگی سے؟"

"بالکل سنجیدگی سے۔ انہوں نے بار بار اخبارات اور رسائل کو انٹرویو بھی دیئے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے زر کثیر صرف کرکے ایک زیر زمین معبد تک بنوایا تھا۔ جہاں انہوں نے قدیم مصر کا ماحول پیدا کیا تھا۔ ہم تو غلام ہیں آقا کی ہدایت تھی کہ معبد کی بات کہیں باہر نہ جائے مگر...... یہ ان کی زندگی کی بات ہے۔ اپنے اس جنون کے ہاتھوں وہ زندگی ہار بیٹھے۔ اب کیا چھپایا جائے۔"

"اوہ مائی گاڈ...... وہ اس قدر سنجیدہ تھے۔"

"اتنے سنجیدہ کہ بالآخر مر گئے۔"

"آپ براہ کرم پوری بات بتایئے۔" کمشنر نے کہا۔

"میرا دل غم سے پھٹ رہا ہے جناب۔ میں نے تو پوری زندگی ان کے قدموں میں گزاری ہے۔ آقا کی اس دیوانگی سے مجھے ہمیشہ یہی خوف دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں کوئی جرائم پیشہ گروہ ان کی طرف متوجہ نہ ہوجائے اور ان کی اس دیوانگی سے فائدہ اٹھا کر انہیں مالی زک نہ پہنچائے۔ بالآخر یہی ہوا، اس لڑکی کا گروہ تین افراد پر مشتمل ہے۔"

"خوب، باقی افراد کہاں ہیں؟"

"اس کے دونوں ساتھی میری قید میں ہیں، لیکن

مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ آج کوئی بھیانک ارادہ رکھتی ہے، میں نے تو انہیں بس مشتبہ حالت میں محل کے ایک گوشے سے گرفتار کیا ہے۔ محل کی سیکورٹی کے انتظامات میرے سپرد ہیں میرا ارادہ تھا کہ صبح کو آقا سے ان کے بارے میں بات کروں گا۔"

"بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟" کمشنر نے کہا۔

"دو معمر افراد ...... جن میں سے ایک لنگڑا ہے، عجیب سا حلیہ بنا کر محل میں داخل ہوئے اور میرے آقا سے ملے۔ انہوں نے خود کو فرشتوں کے نام سے روشناس کرایا اور مصر قدیم کے بارے میں ایسی شاندار معلومات کا مظاہرہ کیا کہ امیر غیری ششدر رہ گئے۔ انہوں نے امیر غیری کو زمانوختہ تسلیم کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ ظہورہ قاہرہ میں آچکی ہے امیر کو فوراً اسے حاصل کر لینا چاہئے اور بھی بہت سی باتیں انہوں نے امیر سے کہیں اور وہ پوری طرح ان کی گرفت میں آگئے۔ پھر یہ لڑکی یہاں پہنچ گئی اور اس نے بقیہ کسر پوری کر دی لیکن مجھے ان تینوں پر شبہ تھا۔ اس کے دو ساتھی یہاں آتے رہتے تھے اور امیر غیری سے عجیب عجیب باتیں کرتے رہتے تھے۔

رات کو وہ مشتبہ انداز میں محل میں داخل ہوئے محافظوں نے انہیں دیکھ لیا، اتنی رات گئے وہ اس سے قبل کبھی نہیں آئے تھے اور پھر وہ بھی چوروں کی طرح۔ چنانچہ محافظوں نے انہیں پکڑ لیا اور مجھے اطلاع دی۔ میں نے ان سے ان کی اس وقت آمد کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ امیر سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔

امیر اس وقت گہری نیند سو رہے تھے میں نے ان سے کہا کہ صبح کو امیر ہی ان کے بارے میں فیصلہ کریں گے، وہ چوروں کی طرح محل میں داخل ہوئے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی اس طرح آمد کی تفتیش کئے بغیر انہیں نہ جانے دیں۔ انہوں نے خوب واویلا کیا، اسی وقت امیر سے ملاقات پر زور دیا لیکن میں نے انہیں قید خانے میں پہنچا دیا۔ آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ امیر کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"کیا وہ لوگ تمہاری تحویل میں ہیں؟"

"ہمارا قید خانہ بہت مضبوط ہے۔" احسان نے کہا، میرا حلق خشک ہو رہا تھا، کوشش کے باوجود منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ احسان نے جس ذہانت سے یہ کہانی گھڑی تھی اس پر میں عش عش کر رہی تھی، ایسا خوبصورت جال پھینکا تھا اس نے کہ نکلنا ممکن نہیں تھا، گویا اس نے پہلے مجھ سے جو چکنی چپڑی باتیں کی تھیں وہ فریب پر مبنی تھی اور اس کے بعد...... مگر پھر یہ قتل، امیر غیری کو کس نے قتل کیا ہے، کیا احسان نے ......؟ اور اب...... اب کمشنر کو معلوم ہوگا کہ میں ایک مفرور ہوں جس کی تلاش کے لئے پولیس سرگرداں ہے تو یہ کیس مکمل ہو جائے گا، جہنم میں جائے جو ہوتا ہے ہو جائے گا، میرے کچھ کہنے سے کیا ہوگا، احسان بالکل محفوظ ہے کمشنر اس کے سامنے بھلا میری کیا مانے گا۔

"یہ خنجر اس لڑکی کا ہے؟" کمشنر نے پوچھا۔

"نہیں ...... امیر کا ہے، انہی کی خنجر سے انہیں ہلاک کیا گیا۔ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔"

"ہوں......" کمشنر نے گہری سانس لے کر مجھے دیکھا پھر احسان سے بولا۔

"آج رات یہ فرار ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے اپنا ٹارگٹ حاصل کر لیا ہے۔"

"ہاں یقیناً۔" وہ متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر کرسی اور مسہری کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک وہ مسہری کے پیچھے پہنچا اور اس نے عقب میں ہاتھ ڈال کر کچھ باہر کھینچ لیا۔ سرخ کپڑے کی ایک پوٹلی تھی، اس نے اسے کھولا اور اس میں سے کرنیں پھوٹ پڑیں۔ پھر وہ کمشنر کی طرف دوڑا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"ہیرے، زیورات، لاکھوں پونڈ کی مالیت کے زیورات۔" احسان نے سنگین لہجے میں کہا۔

"یہ وہ قیمتی نوادرات ہیں جو امیر انتہائی خفیہ رکھتے تھے۔ خصوصاً یہ ہیرے۔"

"گویا ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔" کمشنر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

میں بھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، اب سب کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔

مجھے احسان جیسے چالاک آدمی نے پھنسایا ہے خنجر کا اس طرح پڑے ملنا اور پھر اس خنجر سے قتل...... اف...... اس نے خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ لاش کے سینے سے خنجر اس طرح کھینچا جائے کہ اس سے انگلیوں کے نشانات ضائع نہ ہوں، اور یہ نشانات میری انگلیوں کے ہوں گے کیونکہ خنجر میں نے اٹھا رکھا تھا...... جواہرات کی یہ پوٹلی بھی میرا جرم مکمل کرنے کے لئے رکھی گئی تھی، یہ گہری سازش معلوم ہوتی تھی بہت بڑی سازش امیر کا میرے بستر پر پائے جانا جبکہ میں نے کبھی ایسی کوئی برائی نہیں کی تھی اسے میرے بستر پر ہی قتل کیا گیا تھا، میں نے اس کی لاش تڑپتے دیکھی تھی، سارا عمل مکمل تھا احسان اتنی نے کوئی پہلو کمزور نہیں چھوڑا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب کیا کروں۔ ابھی تو کمشنر کو یہ بھی نہیں معلوم کہ میں ایک مفرور لڑکی ہوں، بے کار ہے کچھ کہنا بے کار ہے۔ سوائے اس کے کہ وقت کا انتظار کروں۔

کمشنر نے چونکہ اس بڑے آدمی کے کیس کی تفتیش اپنے ذمہ لی تھی اس لئے اس نے باقی رات وہیں گزاری، اسے خاتون زبونا کا انتظار تھا، کوئی سوا سات بجے صبح خاتون زبونا اسکندریہ سے قاہرہ پہنچیں، عمر رسیدہ لیکن نہایت حسین نقوش کی مالک تھیں، اگر ان کا ماضی موجودہ شکل میں تصور کیا جاتا تو ان میں مصر کی ساحرہ قلوپطرہ کے نقوش پائے جاتے تھے، تقریباً ہم شکل نوجوان ان کے ساتھ تھے۔ یقیناً یہ عثمان اور فیصل امیری تھے۔ سب کے چہرے غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ خاتون زبونا نے امیر غیری کی لاش دیکھی اور بری طرح سسک پڑی۔ عثمان اور فیصل کے سر بھی جھکے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے دل میں خیال ابھرا سا اٹھا۔ جی چاہا کہ خاتون زبونا کو بتا دوں کہ قاتل کون ہے لیکن ہمت نہ ہو سکی۔ کمشنر نے اظہار ہمدردی کیا اور لاش اٹھانے کی اجازت طلب کی۔

"ہمیں اب اس بے جان وجود کا کیا کرنا ہے کمشنر لیکن میں اس کے قاتل چاہتی ہوں۔ میری آرزو ہے کہ ان قاتلوں کو میرے حوالے کر دیا جائے، پولیس انہیں بھول جائے۔"

نہ جانے کہاں سے میرے اندر جرأت ابھر آئی۔ میں سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ان تمام لوگوں نے مجھے امیر غیری کی قاتل قرار دیا ہے خاتون زبونا۔ میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔ مجھے اپنی تحویل میں لے لیں اور اپنی وہ آرزو پوری کر لیں جو آپ کے دل میں ہے، آپ اپنی اس خواہش سے کیوں محروم ہیں۔"

سب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ دونوں نوجوانوں میں سے ایک نے کہا۔

"یہ کون ہے کمشنر؟"

"یہ سچ ہے مسٹر فیصل، یہی لڑکی امیر کی قاتل ہے، لیکن ابھی ہمیں اس کے بارے میں تفتیش کرنی ہے۔"

"مگر یہ کون ہے؟" خاتون زبونا نے پوچھا۔

"یہ اس سے پوچھنا ہے ہمیں۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ اسی نے میرے بھتیجے کو قتل کیا ہے؟" خاتون زبونا نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

"یہ سچ نہیں ہے، یہ بالکل جھوٹ ہے، لیکن یہ لوگ اسے سچ ثابت کر دیں گے، اصل قاتل کو میں جانتی ہوں۔ آپ یقین کریں صرف میں آپ کو اصل قاتل کا چہرہ دکھا سکتی ہوں۔ بشرطیکہ آپ اس کا چہرہ دیکھنا چاہیں، دوسری صورت میں آپ بھی ان کی باتوں پر یقین کر لیں۔ انہوں نے مجھے بہت مضبوط جال میں پھانسا ہے۔"

"ہر مجرم خود کو بے گناہ کہتا ہے، یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ ہے۔ مسٹر احسان

اب مجھے اجازت دیں۔ میں اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔" کمشنر نے کہا۔

"اوکے کمشنر۔ اس تعاون کا شکریہ!"

زنانہ پولیس آچکی تھی مجھے اس کی تحویل میں دے دیا گیا اور وہ مجھے ایک بند گاڑی میں لے کر چل پڑی۔ میں نے اب اپنے ذہن کو فکر سے آزاد کرلیا تھا۔ فکر کرنے سے ہوگا بھی کیا۔ میرے بس میں کچھ ہوتا تو کرتی، غالباً وہ پولیس ہیڈ کوارٹر کی عمارت تھی۔ مختلف راستوں سے گزار کر مجھے ایک لاک اپ نما کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ بڑے سے کمرے کے آدھے حصے میں کٹہرا بنا ہوا تھا۔ سامنے کے حصے میں چند میزیں لگی ہوئی تھیں، جن پر چند عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے کام کررہے تھے، لاک اپ میں ایک سنگل بستر اور دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں بستر پر جا بیٹھی۔ سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی، دونوں ہاتھوں پر چہرہ رکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور اونگھنے لگی، نہ جانے اس طرح کتنی دیر گزرگئی، پھر لاک اپ کا دروازہ کھول کر ایک لیڈی کانسٹیبل اندر داخل ہوگئی، ناشتہ لائی تھی، اس نے ناشتہ میرے سامنے رکھ دیا، میں نے چائے کی طلب محسوس کی اور ایک پیالی چائے اپنے لئے تیار کرلی، پھر کوئی ایک گھنٹے کے بعد چند لوگ اندر آئے، کچھ فوٹو تھے کچھ اور ٹیکنیشن تھے، میرے کئی پوز بنائے گئے اس کے بعد فنگر پرنٹس لئے گئے، اور وہ لوگ خاموشی سے اپنا کام کرکے چلے گئے۔

کوئی تین بجے کمرہ خالی ہوگیا اور میں بستر پر دراز ہوگئی سارا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی گہری نیند سوگئی پھر کسی نے جھنجھوڑ کر اٹھایا، رات ہوچکی تھی کمرے میں بلب جل رہا تھا۔ مجھے جگانے والی ایک لیڈی کانسٹیبل ہی تھی۔

"ساڑھے نو بجے ہیں، اب جاگ جاؤ۔" اس نے کہا اور میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میرے ساتھ آؤ۔ تمہیں یقیناً بھوک لگی ہوگی۔"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔"

"آؤ پلیز۔ مجھے میری ڈیوٹی سرانجام دینے دو......!" لیڈی کانسٹیبل نے نرم لہجے میں کہا، میں اٹھ کھڑی ہوئی، وہ مجھے اس کمرے سے نکال کر ایک راہداری میں لائی، پھر واش روم لے گئی، وہاں سے مجھے ایک اور کمرے لے جایا گیا جہاں چھوٹی سی میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔

"مجھے واقعی بھوک نہیں لگی۔"

"تمہارا کچھ نہ کھانا کوئی مدافعتی عمل نہ ہوگا آئندہ جو کچھ بھی ہوگا تمہیں اس کے لئے تیار رہنا چاہئے، اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کے لئے زندگی کی ضرورتوں کو پوری کرنا ضروری ہیں۔ کھانا کھالو۔"

"کھانے کے لئے مجبور کیا جائے گا؟"

"دیکھو ضد نہ کرو، میری بات مان لو۔" لیڈی کانسٹیبل نے کسی قدر پریشانی سے کہا اور مجھے ہنسی آگئی، چند لقمے زہر مار کئے اور اسے مطمئن کردیا، ہاں کھانے کے بعد جو کافی ملی وہ زیادہ قابل توجہ تھی، لیکن ابھی میں کافی ختم بھی نہیں کرپائی تھی کہ چند افراد کمرے میں داخل ہوگئے۔

"کیا آپ فارغ ہوچکی ہیں میڈم......؟"

"جی فرمائیے......" میں نے کہا۔

"آیئے ہمارے ساتھ......!"

میں بقیہ کافی چھوڑ کر اٹھ گئی اور ان کے ساتھ چل پڑی۔ اس وقت بھی میں پرسکون تھی۔ اس بار مجھے کافی بڑے کمرے میں لایا گیا تھا۔ یہاں بہت سے افراد مختلف میزوں پر کام کررہے تھے، ایک گوشے میں نیم دائرے کی میز لگی ہوئی تھی، اس کے سامنے صرف ایک کرسی رکھی تھی، میز کے پیچھے تین کرسیاں تھیں، جن میں سے ایک پر پولیس کمشنر بیٹھا ہوا تھا، باقی دونوں کرسیوں پر بھی دو افراد بیٹھے ہوئے تھے، لیکن ان کے چہرے میرے لئے اجنبی تھے۔ سامنے کی کرسی میرے لئے تھی، میں بیٹھ گئی، تینوں میرا جائزہ لے رہے تھے۔

(جاری ہے)

پراسرار موت

ساجدہ راجا۔ ہنڈواں سرگودھا

پورے گائوں پر اچانک رات کے اندھیرے میں موت مسلط ہوگئی، گائوں کے قریبی جنگل میں جو بھی جاتا اس کی خون آلود مسخ شدہ لاش ملتی، کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر وجہ کیا ہے مگر پھر ایک دلدوز واقعہ نے......

یہ کہانی اپنے پڑھنے والوں کو اچنبھے میں ڈال دے گی کیا یہ حقیقت ہے؟ اس کا ثبوت کہانی میں موجود ہے

ضلع مدراس میں گڑا اجنی نام کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جس کے قریب بانسوں کا جنگل دور دور تک پھیلا ہوا ہے، اس کے قریب تل دیدی ندی بہتی ہے اور یہ ندی جنوب مغرب کی طرف پندرہ میل کے فاصلے پر دریائے کاویدی میں مل جاتی ہے، اس کے وشمال حصے میں ایک اور چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں بہت کم آبادی پائی جاتی ہے لوگ زیادہ تر جھونپڑیوں میں رہتے ہیں یا پھر پتھروں کے مکان تعمیر کرکے۔ تل دیدی کے شمال میں تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر گولاموتی ندی گندالام میں مل جاتی ہے ان تینوں کو پہاڑوں نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ جن پر بانسوں کا جنگل واقع ہے اس جنگل میں بہت سے جانور پائے جاتے ہیں لیکن زیادہ تعداد ہاتھیوں کی ہوتی ہے۔

پورن اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، عمر اٹھارہ

سال کے لگ بھگ تھی بہت تیز طرار اور ذہین تھا اور جنگل میں دور دور تک نکل جاتا اس کے والدین اس کے لئے بہت پریشان رہتے لیکن وہ اپنی مستی میں گم سیر کو نکل جاتا، اس کی رہائش بھی دریائے کاویدی کے شمال میں پائے جانے والے قصبے میں تھی۔

اس دن بھی پورن بانسوں کے جنگل میں کافی دور تک نکل آیا لیکن جب واپس جانے لگا تو راستہ بھٹک گیا بہت پریشان ہوا لیکن پریشانی سے کیا ہوتا تھا اس نے اپنی ہمت کو بحال رکھا اندازے سے چلتا ہوا ایک طرف کو بڑھنے لگا چلتے چلتے ہمت جواب دینے لگی راستہ نہ ملا بھلا میلوں تک پھیلے بانسوں کے جنگل میں راستہ ڈھونڈنا اتنا آسان کہاں ہوسکتا ہے قصبہ تو نہیں لیکن پہاڑوں کے قریب ندی نظر آگئی پیاس چمک اٹھی جلدی سے بڑھ کر پانی پیا۔ پانی پیتے پیتے اس کو عجیب سا احساس ہوا اس احساس کے تحت اس نے جلدی سے پیچھے مڑکر دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تھوڑی دیر بعد اس کی چیخیں قرب وجوار ہلا گئیں لیکن وہاں کون مدد کرنے والا تھا۔؟

خون آلود لاش وہیں پڑی رہی اور رات چھا گئی......!

پورن کے ماں باپ بہت زیادہ پریشان تھے کیونکہ رات ہوچکی تھی لیکن وہ واپس نہ آیا تھا آخر پورن کا باپ چند آدمیوں کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف روانہ ہوا ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور لالٹین تھے وہ جنگل میں بہت آگے تک گئے لیکن بے سود آخرکار پورن کی تلاش کا کام صبح پر رکھا گیا اور وہ واپس ہولئے۔

سارا قصبہ میٹھی نیند کی آغوش میں تھا لیکن پورن بدنصیب کے والدین کو بھلا نیند کہاں آسکتی تھی۔ اکلوتا جوان بیٹا گھر سے غائب تھا اور ایسے علاقے میں جہاں موت کا ڈر ابھی پتہ نہ چلے کہ کب دبے پاؤں آجائے۔

صبح سویرے پورن کا باپ چند آدمیوں کو لے کر جنگل کی طرف روانہ ہوا نادانستہ طور پر ان کا رخ اسی ندی کی طرف ہوگیا اور پھر انہیں وہاں پورن کی خون آلود لاش نظر آگئی۔ پورن کا والد صدمے سے وہیں ڈھے گیا وہ لوگ بڑی مشکل سے اسے اور پورن کی لاش کو واپس قصبے میں لائے۔

پورن کی ماں نیم پاگل ہوگئی باپ بالکل خاموش ہوکر رہ گیا لیکن کوئی کیا کرسکتا تھا سب کو ان کا دکھ تھا لیکن ان کے بس میں اس دکھ کی کوئی دوا نہ تھی۔

وقت چند دن آگے گزرا...... سکون رہا لیکن دو لوگ پھر اسی موت کا شکار ہوگئے ان کی بھی خون آلود لیکن سلامت لاشیں قصبے میں لائی گئیں کوئی ان کی موت کی وجہ معلوم نہ کرسکا......! لوگوں کے دلوں میں خوف بس گیا لیکن جب چند دن سکون رہا تو پھر وہی پرانی روٹین لوٹ آئی لوگ بے دھڑک ہوکر جنگل کا رخ کرنے لگے اور روزمرہ کے معمولات سرانجام دینے لگے۔

ایک دن قصبے کا حکیم ایک خاص قسم کی جڑی بوٹی کی تلاش میں جنگل کی طرف روانہ ہوا سارا دن ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ بوٹی شام سے کچھ دیر پہلے ہی اسے ملی وہ بوٹی لے کر واپس آنے ہی والا تھا کہ اک تیز چنگھاڑ نے اس کا دل دہلا دیا اسے لگا کہ کوئی ہاتھی قریب ہی ہے، وہ جلدی سے بھاگ کر قریبی پہاڑی پر چڑھ گیا اور ایک چٹان کی اوٹ سے اس طرف دیکھنے لگا جس طرف سے ہاتھی کی چنگھاڑ سنائی دی تھی تھوڑی دیر بعد بانسوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر ایک نہایت جسیم ہاتھی سامنے آگیا اتنا بڑا ہاتھی اس نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا ہاتھی بہت غصے میں لگ رہا تھا سونڈ کو مسلسل دائیں بائیں حرکت دے رہا تھا کبھی ادھر دوڑتا تو کبھی ادھر......

حکیم کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا اگر وہ بروقت عقلمندی کا مظاہرہ کرکے اس پہاڑی پر آکر نہ چھپتا تو اب تک ہاتھی اس کا قیمہ کرچکا ہوتا کئی بانسوں کے پودوں کو اس نے غصے میں اکھاڑ پھینکا تھا جو چیز بھی سامنے آتی اسے تہس نہس کرتا چلا جاتا، اس کی زوردار چنگھاڑیں قرب وجوار کو لرزا رہی تھیں۔ "یقیناً یہ ہاتھی پاگل ہوچکا ہے اور ہو نہ ہو جنگل میں ہونے والی

اموات کا یہی ذمہ دار ہے کیونکہ اگر کوئی اور درندہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارتا تو یقیناً اس کا گوشت لازمی کھاتا اور خون بھی چاٹتا۔ لیکن ہاتھی صرف جاندار کو ہلاک کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔" اس حکیم نے سوچا۔

وہ رات اس نے کسی نہ کسی طرح ڈرتے ڈرتے گزار دی اور صبح کا اجالا پھیلتے ہی وہ واپس دوڑا آیا۔ راستے میں وہ بہت خوف زدہ بھی رہا تھا کہ کہیں ہاتھی کہیں سے آنہ جائے لیکن خیر ہوئی وہ خیریت سے قصبے میں پہنچ گیا اور اس نے سب کو ہاتھی کے پاگل ہونے کی خبر دی۔

گاؤں کے لوگوں نے بغیر کسی دلیل کے اس بات کو سچ مان لیا کیونکہ وہ سینکڑوں میل پھیلا ہوا جنگل جو ہر قسم کے درندوں سے بھرا پڑا تھا اس میں کسی درندے کا پاگل ہونا عام سی بات تھی۔ وہ لوگ خاموش ہوگئے وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے وہ انیسویں صدی کا دور تھا اور وہ قصبہ بالکل جنگل کنارے ہونے کی وجہ سے شہری سہولیات سے نابلد تھا ہاں یہ ہوا کہ لوگوں نے جنگل میں بہت دور جانا چھوڑ دیا ان کے پاس آتشیں اسلحہ بھی نہیں تھا، بس چند ایک ہتھیار تھے جو مقامی سطح پر تیار کئے گئے تھے۔ ایسے میں گاؤں والے پاگل ہاتھی سے مقابلہ کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے اس لئے وہ خاموش ہوکر بیٹھ گئے۔

کچھ عرصہ سکون سے گزرا پھر ایک دن ایک میاں بیوی اس قصبے میں آئے، وہ دونوں بہت امیر کبیر لگ رہے تھے۔ ان کے پاس ایک کار بھی تھی جسے ایک اور آدمی ڈرائیو کررہا تھا۔ جو یقیناً ان کا ڈرائیور تھا۔ وہ لوگ جنگل میں جانا چاہتے تھے اس آدمی کو شکار کا بہت شوق تھا اور اس کی بیوی بھی ایڈونچر کو پسند کرتی تھی اس لئے وہ یہاں کے دشوار گزار سفر کے لئے تیار ہوئی تھی جنگل میں وہ دونوں ایک مقامی آدمی کے ساتھ ہی جاتے، ڈرائیور وہیں قصبے میں ٹھہر کر ان کا انتظار کرتا۔

قصبے کے لوگوں نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ بہر صورت جنگل میں جانا چاہتے تھے۔ قصبے والوں نے انہیں جنگل میں ہونے والی اموات کے بارے میں بھی بتایا اور اس ہاتھی کے بارے میں بھی کہ وہ مکمل طور پر پاگل ہوچکا ہے اور جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا لیکن ان کا کہنا تھا کہ "اول ہوسکتا ہے کہ وہ ہاتھی کسی اور طرف چلا گیا ہو اور دوسرا اگر ہاتھی موجود بھی ہوا تو ان کے پاس اسلحہ وغیرہ تھا اور وہ اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کرکے آئے ہیں۔" وہ نہیں جانتے تھے کہ جب موت آتی ہے تو سب تدبیریں اور حفاظتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

بہرحال گاؤں والے خاموش ہوگئے، وہ لوگ ایک رات گاؤں میں ٹھہر کر، اور اپنے ڈرائیور کو گاؤں میں ٹھہرانے کے لئے معقول معاوضے پر ایک مقامی آدمی کو بھی ساتھ لے گئے۔ پہلے تو وہ آدمی کسی صورت ساتھ جانے کو تیار نہ تھا لیکن جب انہوں نے اسے اچھے پیسوں کی پیشکش کی تو وہ تیار ہوگیا۔ دولت کسے بری لگتی ہے اسی دولت کی خاطر تو لوگ موت کے کنویں میں چھلانگ لگانے سے بھی باز نہیں آتے مرگئے تو ٹھیک بچ جانے کی صورت میں زندگی بھر کے عیش۔

صبح سویرے وہ لوگ روانہ ہوگئے ان کے پاس اسلحہ کے علاوہ کھانے پینے کا بھی مکمل سامان تھا، اس کے علاوہ ہر قسم کی ضرورت کی چیزیں بھی تھیں لیکن وہ سامان اتنا بھی نہیں تھا کہ انہیں اٹھا کر چلنے میں دشواری ہو۔ سارا دن چلنے کے بعد سرشام ہی انہوں نے ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔ خیمے اس لئے نہیں لگائے کیونکہ موسم خاصا خوشگوار تھا اور ٹھنڈی ہوا فرحت کا احساس دلا رہی تھی۔ ویسے بھی صبح کو انہوں نے یہاں نہیں ٹھہرنا تھا شکار تو محض بہانہ تھا حقیقتاً وہ لوگ اس دشوار گزار جنگل کی سیر کے لئے آئے تھے۔ وہ عورت بہت پرجوش تھی اسے جنگل کی زندگی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ لیکن شاید اس نے جنگل میں رہنے والے درندوں کے بارے میں نہیں سوچا تھا کہ وہ کسی بھی وقت آسکتے ہیں اور رنگ میں بھنگ ڈال سکتے ہیں۔ بہرحال کھانے کے بعد وہ لوگ لیٹ گئے اور جلد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

رات کے کسی پہر اس مقامی آدمی جسے وہ بطور

گائیڈ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ اس جگہ سے تھوڑی دور ایک درخت کی اوٹ میں چلا گیا چاند مکمل طور پر نکلا ہوا تھا اس لئے نزدیک نزدیک کا منظر خاصی حد تک واضح تھا۔ ابھی وہ فارغ ہوا ہی تھا کہ اس نے ایک تیز چنگھاڑ کی آواز سنی تو وہ لرز گیا آواز اسی طرف سے آئی تھی جہاں وہ میاں بیوی سوئے ہوئے تھے پھر عجیب اٹھا پٹخ کی آوازیں آنے لگی ساتھ ہی انسانی لرزہ خیز چیخوں کی بھی جو انہی میاں بیوی کی تھیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے درخت کی آڑ سے جھانک کر دیکھا اور اس کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہوگئیں ایک مضبوط تن و توش والا ہاتھی بہت غصے میں ان میاں بیوی کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا ان میاں بیوی کے منہ سے اذیت بھری چیخیں خارج ہو رہی تھیں ساتھ میں ہاتھی کی خوف ناک چنگھاڑیں دل دہلائے دے رہی تھیں۔

وہ آدمی ان میاں بیوی کے لئے تو کچھ نہیں کرسکتا تھا لیکن اپنی جان بچانے کے لئے تو بہت کچھ کرسکتا تھا، ہاتھی اس سے بہت دور نہیں تھا اور کسی وقت بھی ادھر آ کر اس کا حشر بھی ان دونوں جیسا کرسکتا تھا اس لئے اس نے وہاں سے دوڑ لگادی پودوں، خاردار جھاڑیوں سے الجھتا گرتا پڑتا وہ صبح ہونے تک کسی نہ کسی طرح اپنے گاؤں پہنچ گیا تھا، گاؤں والے اسے اتنی پریشانی میں بھاگتے آتے دیکھ کر بہت پریشان ہوئے انہوں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کردی اور ان میاں بیوی کے بارے میں پوچھا لیکن وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ کچھ نہ بول پایا اور گر کر بے ہوش ہوگیا۔

گاؤں والوں کو یقین ہوگیا کہ ضرور کوئی بڑی بات ہے۔ وہ اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے سب سے زیادہ پریشانی اس ڈرائیور کو تھی چند گھنٹوں بعد وہ ہوش میں آیا۔ اور اس نے لوگوں کو سب کچھ بتادیا۔ ہاتھی کے آنے سے خود کا رفع حاجت کے لئے جانے تک اور پھر ان میاں بیوی کی خون آلود لاشیں دیکھنے کے بعد وہاں سے بھاگنے تک۔

سب لوگ سکتے کی کیفیت میں تھے اور سب سے زیادہ بری حالت اس ڈرائیور کی تھی جو ان میاں بیوی کے ساتھ آیا تھا اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ جب کچھ دیر بعد سب صدمے کی کیفیت سے نکلے تو ان کو لاشوں کی فکر ہوئی ڈرائیور ابھی جنگل میں جانے اور لاشوں کو لانے پر بضد تھا لیکن گاؤں والے کشمکش میں تھے اور جنگل میں جانے سے ہچکچا رہے تھے انہیں اپنی زندگی کی فکر تھی لیکن جب ڈرائیور نے ضد کی اور کہا کہ اس کے پاس اعلیٰ درجے کی بندوق ہے جو ہاتھی کو پلک جھپکتے ہی مار سکتی ہے لوگ جانا تو نہیں چاہتے تھے لیکن پھر مجبور ہوگئے کچھ نہ کچھ انسانیت تو بہرحال ان میں موجود تھی وہ سب جنگل کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہ آدمی جس نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ بھی ساتھ تھا ان سب کو جگہ دکھانے کے لئے لیکن خوف اس کی آنکھوں میں صاف نظر آ رہا تھا۔

سہ پہر کو وہ وہاں پہنچے وہاں عجیب افراتفری کا عالم تھا سارا سامان بکھرا پڑا تھا کئی پودے اور چھوٹے درخت جڑوں سے اکھڑے پڑے تھے اور ان کے ساتھ ہی دونوں میاں بیوی کی کچلی ہوئی خون آلودہ لاشیں بھی......!

دوسری رات آسمان سیاہ گھنگھور گھٹاؤں سے اٹا ہوا تھا بادل اتنے زور سے گرج رہے تھے کہ دل اچھل کر حلق میں آ رہا تھا۔ بجلی کی کڑک اور اس کے ساتھ ہی تیز ہواؤں کا شور بھی ماحول کو بہت خوف ناک بنا رہے تھے سارے گاؤں والے گھروں میں دبکے پڑے تھے تیز ہوائیں جب جنگل میں لگے درختوں سے ٹکراتی تو بھیانک سا شور پیدا ہوتا سب لوگ لیٹے تو ہوئے تھے لیکن اس خطرناک موسم میں بھلا نیند کسے آتی......؟ پھر بارش شروع ہوگئی تو بارش اور ہواؤں کے شور نے ماحول کو خوفناکی کو دوچند کردیا۔

ایسے میں راجیش کو کوئی آواز سنائی دی اس نے اس کو اپنا وہم جانا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا اس نے ماں باپ کی طرف دیکھا وہ بادلوں کے ٹلنے کی

دعا کرتے کرتے نہ جانے کب سو گئے تھے واز پھر آئی اس بار ذرا واضح تھی۔ یہ اس کی لاڈلی بکری کی آواز تھی جو منائے جا رہی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا مسئلہ ہے؟

راجیش بستر سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا بارش کی تیز بوچھاڑ نے اسے ایک لمحے میں بھگو دیا سردی کی لہر نے اس کے وجود میں جھرجھری دوڑادی بکری گھر کے باہر بندھی ہوئی تھی۔ اس لئے اسے باہر جانا پڑا وہ ہمت کرکے آگے بڑھا اور گھر سے باہر آ گیا بکری کو دیکھا وہ اب آرام سے کھڑی تھی اور کوئی غیر معمولی بات نہ تھی وہ بہت حیران ہوا۔ شاید موسم کی وجہ سے وہ بے چین ہوتی ہو۔ راجیش یہ سوچتے ہوئے واپس پلٹا اور پھر خوف سے اپنی جگہ پر جم گیا، پھر چند منٹ بعد اس کی چیخوں نے پورے گاؤں کو گھروں سے باہر آنے پر مجبور کردیا۔

جب سب لوگ اس جگہ پہنچے تو راجیش آخری سانس لے رہا تھا۔ خوف اس کی آنکھوں کی ڈھیلوں میں جم چکا تھا۔ وہ کچھ بتانے کی کوشش میں موت کی آغوش میں جا سویا۔

لوگوں نے اسے بھی ہاتھی کی کارستانی قرار دیا اب تو سب لوگوں کو بہت فکر ہوئی یہ خبر کسی طرح شہر پہنچائی گئی اور حکومت نے اس کا نوٹس لے لیا اور ایک ماہر شکاری کو اس علاقے کی طرف بھیج دیا۔ چند دن کی مسلسل کوششوں کے بعد اس شکاری نے ہاتھی کو تو ختم کردیا لیکن پھر اس کی اپنی بھی خون آلود لاش بھی جنگل میں پائی گئی ہاتھی کے مردہ جسم سے کچھ فاصلے پر۔

لوگوں نے یہی سمجھا کہ جب ہاتھی کو گولی لگی ہوگی تو وہ غصے میں آ گیا ہوگا، اور کسی طرح شکاری کو ہلاک کرنے کے بعد خود بھی مر گیا ہوگا۔

بہرحال لوگ بہت خوش ہوئے کہ آدم خور ہاتھی سے نجات مل گئی وہ مردہ لوگوں کو کھاتا تو نہیں تھا لیکن ان کو موت کے منہ میں تو پہنچاتا تو تھا۔

پورا مہینہ خیریت سے گزر گیا لوگوں کا خوف بھی کم ہوتے ہوتے ختم ہوگیا اور وہ بے دھڑک جنگل کا رخ کرنے لگے ان کی اور ان کے پالتو جانوروں کی زندگی کا دارومدار ہی جنگل پر تھا۔

ایک مہینے کے بعد ان اموات کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا گاؤں کے تین لوگ پھر موت کے بھینٹ چڑھ گئے ان کا حشر بھی پہلے جیسے لوگوں جیسا ہوا تھا سب لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ اب وہ یہ ماننے کو کسی طور تیار نہ تھے کہ یہ کسی جانور کا کام ہوسکتا ہے اسے کسی اور مخلوق کی کارستانی قرار دینے لگے خبر جتنے منہ اتنی باتیں لوگ جنگل میں جانا مکمل طور پر چھوڑ چکے تھے۔ ان سب میں سراسیمگی پھیل چکی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ جنگل میں جانا چھوڑ دیں اور کوئی چارہ ان کے پاس نہیں تھا لیکن کب تک وہ جنگل سے دور رہتے کبھی کبھار کوئی بہت ضرورت کے تحت ادھر کا رخ کرتا اور کوئی خوش نصیب ہی واپس آپاتا۔

کچھ دن بعد اس علاقے میں ایک فاریسٹ آفیسر تعینات ہوکر آیا وہ بہت خوبصورت اور بہادر نوجوان تھا ہنس مکھ اور شیریں لب ولہجہ کی بدولت وہ گاؤں والوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا اس کی رہائش اسی گاؤں میں تھی کیونکہ جنگل کے پاس موجود ڈاک بنگلہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس میں رہائش اختیار کی جاسکتی ذرا سی بارش یا تیز ہوا اسے آسانی سے گرا سکتی تھی اس لئے وہ گاؤں میں ہی ایک مکان میں ٹھہر گیا جہاں ایک بوڑھا پہلے سے ہی رہتا تھا۔

اس آفیسر کا نام راج کمار تھا، سب اسے راج صاحب کہہ کر پکارتے تھے اسے بھی گاؤں کے لوگوں کی جنگل میں ہونے والی اموات کا پتہ چل گیا تھا بلکہ اسے یہاں تعینات بھی اسی لئے کیا گیا تھا کہ وہ کھوج لگائے کہ یہ اموات کس کارن ہو رہی ہیں؟

پاگل ہاتھی کا قصہ بھی اس کے علم میں تھا اس لئے وہ پوری طرح اس بات کا کھوج لگانے کے لئے مستعد تھا اس کی ایک پختہ عادت تھی کہ وہ ہر روز ڈائری میں دن بھر کے واقعات درج کیا کرتا تھا اور اس میں کبھی ناغہ نہیں آیا تھا وہ ڈائری ہر وقت اس کے کوٹ کی جیب میں

رہا کرتی تھی اس کے ساتھ ایک آدمی بھی آیا تھا جو اس کے تمام کام سرانجام دیا کرتا تھا کھانا پکانے سے لے کر کپڑے دھونے تک کے تمام کام وہ بھی خاصا چاق چوبند آدمی تھا ادھیڑ عمر تھا لیکن بہت زیادہ نڈر اور دلیر......

وہ دن بھی معمول کے مطابق شروع ہوا تھا تمام لوگ معمولات زندگی سرانجام دے رہے تھے۔ جب راج کمار نے جنگل میں جانے کا کہہ کر ان سب کو خوف زدہ کردیا وہ اسے کسی صورت جنگل میں جانے نہیں دینا چاہتے تھے لیکن راج نے سب کو یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ اگر وہ جنگل میں نہیں جائے گا تو پھر اس چیز کا سراغ کون لگائے گا......؟

گاؤں والے راج کے لئے بہت فکر مند تھے کیونکہ انہیں اس ہنس مکھ نوجوان سے انسیت ہوگئی تھی اور وہ اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے، وہ ادھیڑ عمر آدمی جو دیال کہلاتا تھا بھی اس کے ساتھ تھا، وہ ہر طرح کے سازوسامان سے لیس تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں جنگل میں کتنے دن لگیں گے راج ہر صورت کھوج لگا کر واپس آنا چاہتا تھا اور دیال ہر قدم پر اس کے ساتھ تھا۔

دو دن کے سفر کے بعد وہ جنگل کے خاصے اندرونی حصے میں آگئے تھے اس رات بھی کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں لیٹ گئے، کچھ دیر تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر دونوں کو نیند نے آلیا...... رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب کسی عجیب سے احساس سے راج کی آنکھ کھلی اور پھر وہ اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔

صبح کے وقت جب دیال بیدار ہوا تو راج اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا اس نے سمجھا کہ وہ کسی ضرورت کے تحت ہی اٹھ کر گیا ہوگا لیکن پھر بہت دیر ہوگئی راج واپس نہ آیا تو اسے پریشانی نے گھیر لیا، وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور راج کو تلاش کرنے لگا ساتھ ساتھ وہ اسے آوازیں بھی دیتا جارہا تھا لیکن آگے سے کوئی جواب نہ ملا۔

دن گزرتا گیا وہ راج کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے پاگل ہورہا تھا پھر رات بھی گزر گئی دوسرا دن بھی لیکن راج کا ہلکا سا نشان بھی نہ ملا آخر کار وہ مایوس و دلبرداشتہ واپس گاؤں لوٹ آیا ساری صورتحال جاننے کے بعد گاؤں والے بھی کافی دکھی ہوگئے انہیں راج سے خصوصی لگاؤ تھا اور راج کی پراسرار گمشدگی نے انہیں دکھی کردیا تھا پہلے تو انہوں نے سوچا کہ راج بھی اسی پراسرار موت کا شکار ہوگیا ہے۔

لیکن پھر خود ہی انہوں نے اس خیال کی نفی کردی کہ اگر ایسا ہوتا تو کہیں نہ کہیں تو لاش کا نام ونشان ملتا آخر گاؤں والوں نے سوچا کہ وہ سب مل کر جائیں گے اور راج کو تلاش کریں گے دوسرے دن وہ سب مل کر جنگل گئے سارا دن جنگل کی خاک چھاننے کے باوجود انہیں کوئی سراغ نہ ملا اور وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ آئے دیال دکھی سا شہر واپس چلا گیا اسے اعلیٰ حکام کو اس واقعہ کی اطلاع بھی دینی تھی۔

☆......☆......☆

وہ ساکت سا اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا جو چہرے سے تو بہت خوف ناک تھی لیکن اس کا جسم پرکشش سڈول اور خوبصورت تھا لیکن راج کو اس کے جسم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو ساکت نظروں سے اس کے خوف ناک چہرے کو دیکھے جارہا تھا۔ جو ایسا لگ رہا تھا جیسے جلنے کے بعد چہرے کی کھال مکمل طور پر اتر گئی ہو اور پھر نئی کھال پیدا نہ ہو پائی ہو۔ لیکن اس کے ہونٹ اتنے سرخ تھے کہ یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ ابھی خون کو منہ لگا کر آئی ہو اور وہ خون ابھی اس کے ہونٹوں سے ٹپک پڑے اس کی خوف ناک آنکھوں میں اک عجیب سی چمک تھی اور وہ پیار بھری نگاہوں سے راج کو تکے جارہی تھی۔ راج جب مکمل حواس میں لوٹا تو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم......تم کون ہو......؟ مجھے کہاں لے کر آئی ہو......؟" راج نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی کے سرخ ہونٹوں پر اک مسکراہٹ نمودار ہوئی جس نے اسکے چہرے کو مزید خوف ناک بنادیا۔ "میں جو بھی ہوں اسے چھوڑو تم مجھے بہت اچھے لگے ہو، میں نے کبھی کسی آدم زاد پر ترس نہیں کھایا لیکن میں تمہیں کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ تمہاری پیاری شکل دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں تمہیں مارتے ہوئے افسوس ہونے لگا اور پھر میں تمہیں مارنے کی بجائے اپنے ٹھکانے پر لے آئی جو میرا عارضی ٹھکانہ ہے اب میں کبھی بھی تمہیں خود سے جدا نہیں ہونے دوں گی، ہر وقت تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گی حتیٰ کہ اس وقت بھی جب میں اپنے مستقل ٹھکانے پر چلی جاؤں گی اب تم میرے قریب آجاؤ تاکہ میں تمہیں پیار کرسکوں۔" یہ کہہ کر اس لڑکی نے راج کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا، اس کے چہرے پر خوف ودہشت کی لہر صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

"دیکھو......تم جو کوئی بھی ہو میرے قریب مت آنا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" راج کو اس کا چہرہ دیکھ کر کراہیت ہورہی تھی، تا پیار کرتا......؟

کچھ دیر تو وہ راج کی طرف غصیلی نظروں سے تکتی رہی پھر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ وہ ایک کشادہ غار تھا جس میں دن کی روشنی مکمل طور پر داخل ہورہی تھی راج نے گہرا سانس لے کر خود کو نارمل کیا پھر دیوار سے ٹیک لگائی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہورہا تھا وہ بالکل کسی ڈراؤنی فلم کی مانند محسوس ہورہا تھا۔

اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ غار میں اکیلا ہے اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا یہاں سے بھاگنے کا، وہ جلدی سے اٹھا اور باہر کی طرف قدم بڑھائے لیکن یہ دیکھ کر اس کی مایوسی حد کو پہنچ گئی کہ وہ لڑکی غار کے باہر ہی موجود تھی اور کسی نادیدہ نقطے کی طرف نظر جمائے کھڑی تھی کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ وہی بھیانک چہرے والی لڑکی ہے پیچھے سے دیکھنے پر وہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی لمبے سیاہ بال کولہوں کو چھو رہے تھے سفید لباس ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا وہ ہاتھ باندھے سامنے میلوں پھیلے گھنے جنگل پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

ایک لمحے کو تو راج بھی شش وپنج میں پڑ گیا کہ یہ وہی لڑکی ہے یا کوئی اور......؟

اچانک اس لڑکی نے گردن گھما کر راج کی طرف دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے وہ سو فیصد وہی تھی۔

راج شکستہ قدموں سے غار میں لوٹ آیا پھر اسے ڈائری کا خیال آیا۔ اس نے پاکٹ سے ڈائری نکالی اور اب تک پیش آنے والے تمام واقعات اس میں درج کرنے لگا، اس کے بعد وہ لیٹ گیا اور آئندہ پیش آنے والے واقعات پر غور کرنے لگا، اسے اس لڑکی کی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اس سے کیا چاہتی ہے؟

اگر وہ اس سے کوئی غلط تعلق قائم کرنا چاہتی ہے تو وہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ وہ کسی اور مخلوق سے تعلق رکھتی ہے تو کوئی آدم زاد کیسے اس کی خواہش پوری کرسکتا تھا؟

بہر حال جو بھی تھا راج کو مکمل حواس میں رہ کر اس صورتحال کو قابو کرنا تھا......

دیال نے واپس جاکر اعلیٰ حکام کو اس واقعہ کی اطلاع دی تھی جس کے نتیجے میں ایک ٹیم ترتیب دی گئی تھی جس کے ذریعے راج کو تلاش کیا جانا تھا۔ وہ ٹیم گئی، ایک ہفتہ تک جنگلوں میں پھرتی رہی لیکن راج کو نہ ملنا تھا نہ ملا وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے اور رپورٹ پیش کردی۔ اب کیا ہوسکتا تھا اعلیٰ حکام نے بھی مایوس ہو کر چپ سادھ لی۔

گاؤں والے کافی عرصہ دلبرداشتہ رہے پھر آہستہ آہستہ اپنے معمولات پر واپس آتے گئے۔ ایک حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ جب سے راج غائب ہوا تھا اس دن سے کوئی موت نہیں ہوئی تھی پورا مہینہ ہونے والا تھا، اس لئے جھجکتے ہوئے ہی سہی لیکن گاؤں والوں نے پھر جنگل میں جانا شروع کردیا بہت دن ہوگئے لیکن کچھ نہ ہوا گاؤں والوں کی جھجک ختم ہوچکی تھی اس لئے وہ جنگل میں کافی آگے تک جانے لگے انہیں یہی لگ رہا تھا کہ جو بھی ان موت کا ذمہ دار تھا یقیناً راج نے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا اور بدقسمتی سے خود

بھی موت کے منہ میں چلا گیا ہوگا۔

انہی دنوں گاؤں کا ایک آدمی جنگل میں بہت آگے تک چلا گیا اپنا کام ختم کرکے جب وہ واپس لوٹ رہا تھا۔ اس کی نظر ایک براؤن جلد والی ڈائری پر پڑی اس نے جلدی سے وہ اٹھالی۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ اس ڈائری کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہو۔ بہرحال وہ گاؤں آیا اس نے سب کو وہ ڈائری دکھائی تو سب نے تصدیق کردی کہ یہ راج صاحب کی ڈائری ہے، بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھی آگئے، انہیں راج کی موت کا یقین ہو چلا تھا کیونکہ وہ ڈائری ہر وقت ہر حالت میں اس کے ہمراہ ہوتی تھی، اب اس کا جنگل میں یوں ملنا کسی اور ہی بات کی طرف اشارہ کررہا تھا۔

بہرحال دوسرے دن انہوں نے وہ ڈائری شہری حکام کے پاس بھجوادی اس ڈائری کو پڑھنے کے بعد ایک بالکل نئی صورتحال سامنے آئی جس نے سب کو انگشت بدنداں کردیا...... ساری حقیقت بتانے کے بعد لکھا ستمبر 1874ء

میں نہیں جانتا کہ یہ لڑکی مجھ سے کیا چاہتی ہے، مجھے نہ دن کا پتہ ہے نہ رات کا۔ بس اندازے سے تاریخ لکھی ہے کیونکہ جس رات یہ پراسرار لڑکی مجھے اپنے ساتھ لائی تھی اس وقت ستمبر کی 2 تاریخ تھی، اب میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آج کیا تاریخ ہے۔ ہاں اتنا مجھے یقین ہے کہ یہ ستمبر کا ہی مہینہ ہے میں سخت الجھن میں ہوں، اس لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھ کر خوف اور کراہیت محسوس ہوتی ہے لیکن اس کا جسم اتنا تراشیدہ اور خوبصورت ہے کہ بندہ ساکت سا اسے تکتا ہی رہے۔

پہلے دن اس نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اسے پیار کروں لیکن میں نے انکار کردیا، وہ مایوس اور غصے میں اٹھ کر چلی گئی، اب وہ ہر روز مجھے مجبور کرتی ہے لیکن میرے انکار کے باوجود وہ مجھے کچھ نہیں کہتی۔ نہ جانے کیا بات ہے؟

اکتوبر 1874ء

مجھے یقین ہے کہ مجھے اس قید میں مہینہ گزر چکا ہے، ویسے دیکھا جائے تو یہ صدیاں محسوس ہوتی ہیں میں اب ہر روز کے واقعات ڈائری میں درج نہیں کرسکتا، میری مجبوری ہے لیکن ایک بات جو مجھے اچانک ہی معلوم ہوئی کہ گاؤں یا جنگل میں ہونے والی ساری پراسرار اموات اسی پراسرار لڑکی نے ہی کی ہیں لیکن جب سے اس نے مجھے قید کیا ہے ان اموات کو ترک کردیا ہے یہ بات اس نے خود مجھے بتائی ہے اور یہ بھی کہ وہ اس انسانی دنیا میں رہتے رہتے تھک چکی ہے، اب یہ واپس اپنی دنیا میں جانا چاہتی ہے لیکن اکیلے نہیں بلکہ مجھے بھی ساتھ لے کر میں بہت خوف زدہ ہوں لیکن چپ ہوں۔"

پھر کچھ خالی صفحات تھے اس کے بعد پھر تحریر تھی۔

"میں اس لڑکی کی بہت منتیں کرچکا ہوں کہ وہ مجھے واپس انسانی دنیا میں جانے دے لیکن وہ نہیں مانتی، بقول اس کے کہ وہ میرے بنا اب نہیں رہ سکتی آج کل میں وہ اپنی دنیا میں چلی جائے گی مجھے ساتھ لے کر میں آنے والے وقت سے لرزیدہ ہوں کہ نہ جانے میرا انجام کیا ہو......؟ میں اب کبھی اپنی دنیا میں جاسکوں گا کہ نہیں؟ پتہ نہیں مجھے دوبارہ انسانوں کو دیکھنا نصیب ہوتا ہے کہ نہیں؟

آہ...... بھگوان نے کتنی گھٹنائیوں میں ڈال دیا۔ میں بے بس ہوں کچھ نہیں کرسکتا وہ مجھے ہر حال میں لیکر جائے گی میں آج کل میں......؟ اپنے محکمے کا سب سے دلیر اور ذہین آفیسر اس پراسرار لڑکی کے آگے بے بس ہے!!

اس کے بعد ڈائری مکمل طور پر خالی تھی نہ جانے راج کمار پر کیا بیتی؟ کیا وہ لڑکی اسے اپنے ساتھ لے گئی کہ نہیں......؟ اگر نہ لے کر جاتی تو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طرف سے راج کی کچھ تو خبر آتی اور پھر یہ ڈائری......؟ نہ جانے کس طرح جنگل میں گری؟ آگے کی اوپر والا جانے اتنا ضرور ہوا کہ جنگل میں ہونے والی ان پراسرار اموات کا سلسلہ مکمل طور پر ختم ہوگیا۔

شراب اجل

سید محمود حسن۔حیدر آباد

کمرے میں موجود شراب پیتا نوجوان اچانک ہوا میں معلق ہوا، وہ الٹا لٹک گیا اور پھر اس کی فلک شگاف دلدوز چیخیں فضا میں منتشر ہونے لگیں، وہ ہوا میں کیسے معلق ہوا، یہ جاننے کے لئے اس کہانی میں......

بچھرے ہوئے جناتوں کی لرزہ براندام دل دہلاتا ہوا تا...... قابل یقین خونی شاخسانہ

اختر علی ایک سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک کے عہدے پر فائز تھا، وہ ایک عیاش طبع آدمی تھا۔ شراب نوشی اس کا محبوب مشغلہ تھا، وہ جوا بھی کھیلتا تھا کیونکہ وہ ایک ایسی سیٹ پر تھا جہاں پیسوں کی ریل پیل تھی رشوت کا مال لینا اسے بہت بھاتا تھا، اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری رہتی تھیں حالانکہ اختر علی کی عمر 42 سال سے اوپر ہو چکی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو ابھی تک نوجوان ہی خیال کرتا تھا، وہ ٹھٹھہ کا رہائشی تھا۔ لیکن ایک شکایت کی بنیاد پر اس کی پوسٹنگ بدین میں کردی گئی تھی۔ یہاں کئی قدیم عمارتیں تھیں جن میں سے ایک ایسی ہی عمارت میں اختر علی کا آفس بھی تھا۔

جب اختر علی کی پوسٹنگ یہاں پر ہوئی تو اسے بتایا گیا کہ اس عمارت میں ایک کمرہ ایسا ہے جو کہ بہت طویل عرصے سے بند پڑا ہوا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل

ایک انگریز آفیسر نے اس کمرے میں شراب نوشی کی تھی تو اسے دوسرے ہی دن اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔

بقول آفس ملازمین کے اس کمرے میں کچھ نیک بزرگ جنات رہتے ہیں جو کہ نشہ کرنے والوں سے سخت نفرت کرتے ہیں اور نشہ کرنے والوں کو کڑی سزا بھی دیتے ہیں۔

ابھی ایک سال پہلے ہی کی بات بات تھی جب رات میں ڈیوٹی پر موجود چوکیدار نے چرس کی سگریٹ پینے کی کوشش کی تو اسے ان نادیدہ مخلوق کے عتاب کا شکار ہونا پڑا تھا۔

واقعہ یوں ہوا کہ رات میں ڈیوٹی کے دوران وہ اپنی کرسی پر بیٹھا تھا اس کی ڈیوٹی کا آج پہلا ہی دن تھا یہاں پر دو چوکیدار ہوتے تھے ایک دن میں جبکہ دوسرا رات میں اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتا تھا اس نے اسی پراسرار کمرے کے پاس اپنی کرسی رکھی اور چرس بھری سگریٹ سلگالی۔ اس نے ابھی دو کش ہی لگائے تھے کہ اسے ایسا لگا کہ کسی نے اسے اٹھا کر زمین سے بلند کردیا ہو اور پھر کسی ان دیکھی طاقت نے اسے الٹا لٹکا دیا۔

چرس بھری سگریٹ اس کے ہاتھ سے نیچے گر چکی تھی اس نے اپنی رائفل کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن رائفل ہوا میں تیرتی ہوئی اس سے دور چلی گی اسے نامعلوم طاقت نے زمین سے اب 5 فٹ اونچا بلند کردیا تھا۔ پھر ایک زوردار ہنٹر اس کی کمر پر پڑا اور پھر تو ہنٹروں کی بارش ہوگئی۔ اب وہ بری طرح چیخ رہا تھا "ارے بچاؤ...... بچاؤ۔"

پھر ایک آواز گونجی۔" اب نشہ کرے گا تو یہاں پر۔"

"نہیں ...... نہیں۔ میری توبہ میرے باپ کی توبہ مجھے معاف کردو۔"

سیکورٹی چوکیدار چیخیں مارتا ہوا بولا۔"اب زندگی بھر نشہ نہیں کروں گا میں کان پکڑتا ہوں۔ اب کبھی نشہ نہیں کروں گا۔"

چوکیدار اب نامعلوم طاقت کی جانب سے ہنٹر کھا کھا کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اور جب اسے ہوش آیا تو سیدھا اپنے گھر کی طرف دوڑ لگادی۔ اسے ایک ہفتے تک بخار رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنا ٹرانسفر اور کسی آفس میں کرالیا تھا۔

وہ ایک پرانی ایک منزلہ عمارت تھی جس کی چھت پر چار کمرے تھے ایک تو وہی پراسرار کمرہ تھا دوسرا کمرہ سینئر کلرک امام بخش کے استعمال میں تھا تیسرا کمرہ پرانے ریکارڈ اور فائلوں سے بھرا ہوتا تھا جبکہ چوتھا کمرہ ان کے لئے تھا جو ٹرانسفر ہو کر آتے تھے اور ان کا کوئی معقول رہائش کا انتظام نہیں ہوتا تھا تو وہ رہائش کے انتظام تک اسی کمرے میں عارضی رہائش اختیار کرتے تھے۔

حالانکہ امام بخش کا کمرہ اس پراسرار کمرے کے برابر میں واقع تھا لیکن امام بخش نے بھی اس کمرے میں چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اسے اکثر رات کو آفس میں دیر بھی ہوجاتی تھی اور خود اس نے اپنے کانوں سے اس پراسرار کمرے میں سے ٹائپنگ مشین کی آواز کو سنا تھا اور کبھی کرسی گھسیٹنے کی آواز آتی، تو کبھی کئی لوگوں کی باتیں کرنے کی۔

لیکن امام بخش ان آوازوں کا عادی ہو چکا تھا اور کبھی اس نادیدہ مخلوق کے معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا۔

اختر علی سے پہلے ایک شخص رسول بخش آیا تو اسے چوتھے کمرے میں ٹھہرادیا گیا، امام بخش نے پراسرار کمرے کی ساری تفصیل بتادی کہ "بابا بھول کر بھی اس کمرے میں نہیں جانا اور نہ ہی اس کمرے کے سامنے بیٹھ کر کوئی نازیبا حرکت کرنا اور وہ بھی رات کے وقت۔"

رسول بخش جوان تھا اور ویسے بھی جوانی دیوانی ہوتی ہے اکثر جوانوں کو کسی عمر رسیدہ کی نصیحت اور تنبیہ بری لگتی ہے۔ سو رسول بخش کو بھی امام بخش کی

ساری باتیں فضول لگی، امام بخش کے سمجھانے پر وہ طنزیہ ہنسی ہنسا اور بولا۔"امام بخش! دنیا چاند پر پہنچ گئی اور تم لوگ ابھی بھی دقیانوسی، بھوت، چڑیل، روحیں اور جنات کے چکر میں پڑے ہو، بابا اس قسم کی یہ تمام باتیں گھڑی ہوئی ہیں ان باتوں کا حقیقت سے دور دور تک کا کوئی بھی واسطہ نہیں اور تم دیکھنا میں یہ ثابت کردوں گا کہ یہ کمرہ اور اس کی پراسرار باتیں بالکل من گھڑت ہیں۔

بابا رات کے وقت اس عمارت میں ایک چوکیدار ہوتا ہے اور اب میں رہوں گا، میں انسان ہوں، میں منہ آنکھ اور کان پر پٹی باندھ کر تو رہنے سے رہا خاموشی سے کمرے میں بیٹھ کر رات تو کٹنے سے رہی میں ویسے بھی موج مستی والا آدمی ہوں، کھانا پینا اور رات کو حسین بنانا میں جانتا ہوں، مجھے اپنی فکر خود کرنی ہے، کسی کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں اس کمرے کے بابت ڈر و خوف اور پراسراریت کے پیش نظر ایک کونے میں دم دبا کر بیٹھ جاؤں۔ امام بخش تم اپنے کام سے کام رکھو اور ہاں اگر ایک مہربانی کرسکتے ہو تو، جلد از جلد میرے لئے کوئی کرائے کا چھوٹا موٹا مکان تلاش کردو۔ اب آئندہ مجھ سے ایسی باتیں کرکے مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کرنا۔" اور یہ بول کر رسول بخش طنزیہ ہنسی ہنستا ہوا اپنی کرسی پر جاکر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن صبح کے وقت امام بخش نے ناشتے سے چوکیدار سے معلوم کیا کہ رسول بخش کی رات کی مصروفیات کیسی ہیں تو چوکیدار بولا۔" بابا جی کیا! یہ صاحب تو بڑے کھانے پینے والے ہیں سگریٹ پر سگریٹ اور پھر پینے والی بوتل بھی لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور اول فول بکتے ہوئے وقت گزارتے ہیں۔ مجھ سے پانی منگایا اور جب میں پانی لے کر گیا تو دہل گیا پراسرار کمرے سے عجیب وغریب آوازیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کسی درندے کی غراہٹیں بھی سنائی دے رہی تھیں جسے سن کر میرا تو برا

بھجوا سکوں۔"

پانی ہوگیا اور میں جلدی سے نیچے بھاگا۔

یہ سن کر امام بخش نے چوکیدار کو تو چلتا کیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے بولا۔ "اللہ سائیں ہم سب پر اپنا رحم کرنا۔" اور پھر جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

تیسرا دن لوگوں کے لئے خونی ثابت ہوا جب لوگ دفتر میں آئے تو دیکھا کہ رسول بخش کی لاش دفتر سے باہر پڑی تھی، گردن کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی بلکہ دونوں ہاتھ اور پاؤں کی ہڈیاں بھی چورا چورا ہو چکی تھیں، آنکھیں اپنے حلقوں سے بالکل باہر کو ابلی پڑی تھیں۔ اب دفتر والے سوائے افسوس کے اور کر بھی کیا کر سکتے تھے۔ اس رات دفتر کا چوکیدار بھی باعث طبیعت خراب اچانک چھٹی لے کر جا چکا تھا۔

جب لوگ اوپر گئے تو دیکھا کہ پراسرار کمرے کے سامنے پانی کا جگ، سگریٹ کا پیکٹ، شراب کی چھوٹی بوتل پڑی تھی اور یہی چیزیں جو کہ پراسرار کمرے میں موجود جنات کو پسند نہ تھیں اور رسول بخش کی موت واقع ہوگئی۔

اختر علی کی جب اس آفس میں پوسٹنگ ہوئی تو اس نے ان سب باتوں کو مذاق سمجھا اور کہا۔ "بابا میں تو اگر ڈیلی شراب نہ پیوں تو مجھے سکون ہی نہیں ملتا اور میں کسی جن یا بھوت چڑیل کو نہیں مانتا اور اگر مجھے موقع ملا تو میں اسی کمرے میں بیٹھ کر شراب پیوں گا۔"

"سائیں آپ اپنے گھر پر جو کرنا ہو کریں لیکن یہاں کوئی ایسا ویسا کام نہیں کرنا۔" امام بخش نے اختر علی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اختر علی ایک ضدی طبیعت اور دوسروں کو نیچا دکھانے کی فطرت رکھنے والا شخص تھا۔

اور پھر ایک موقع اختر علی کو مل ہی گیا جب اسے آفس سپرنٹنڈنٹ نے بلا کر کہا کہ "ہیڈ آفس کو رپورٹ بھجوانی ہے اور صرف 3 دن کا وقت ملا ہے، آپ رات کو آفس میں رک کر سارا کام مکمل کر لیں، اگر یہاں پر ڈر لگتا ہے تو فائلیں گھر پر لے جائیں مجھے جلد از جلد کام مکمل کر کے رپورٹ دیں تاکہ میں ہیڈ آفس کو رپورٹ

"نہیں سر کوئی مسئلہ نہیں ہے میں آفس میں رک کر ہی اپنا کام مکمل کروں گا۔"

"لیکن اس پراسرار کمرے کی طرف تم نہیں جانا، اس کے بارے میں کئی سچی باتیں مشہور ہیں، رسول بخش اور پھر چوکیدار والا واقعہ بھی تم نے سن ہی لیا ہوگا۔"

"سر! یہ سب فضول باتیں ہیں، میں ان پر یقین نہیں رکھتا مجھے بس آپ اس کمرے کی چابی دلوا دیں، میں اسی کمرے میں بیٹھ کر آفس کا کام کروں گا۔"

آفس سپرنٹنڈنٹ نے اختر علی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ نہیں مانا اور پھر اس کمرے کی چابی جو کہ امام بخش کے پاس ہوتی تھی اس نے حاصل کر لی۔

اختر علی چونکہ رات کو شراب نوشی کا عادی تھا شراب کی بوتل وہ اپنے بیگ میں رکھ کر پہلے ہی لے آیا تھا۔

اختر علی نے آفس کا کام رات 12 بجے تک اپنے ہی کمرے میں بیٹھ کر کیا، اس کے بعد اس نے اپنی شراب کی بوتل اٹھائی اور پراسرار کمرے کا تالا کھولا، کمرے کا دروازہ ایک عجیب سی چرچراہٹ کے سات کھل گیا، کمرے میں 3 کرسیاں پڑی تھیں ایک عدد بڑی ٹیبل، ایک ٹائپنگ مشین، ایک پرانی الماری۔

اختر علی چونکہ کام کا بڑا حصہ نمٹا چکا تھا اور اب وہ صرف اس کمرے میں رات گزارنے اور شراب نوشی کی نیت سے داخل ہوا تھا وہ کرسی پر آرام سے بیٹھ گیا، اس نے شراب کی بوتل میز پر رکھی اور گلاس میں شراب ڈالنے کے لئے بوتل کھولنے لگا۔

کہ اچانک اسے ایسا لگا کہ بوتل اپنی جگہ سے سرک رہی ہو، لیکن اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور کہنے لگا۔ "یہ میرا وہم ہے۔" اور پھر اس نے اچانک بوتل کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

آدھی بوتل اس نے گلاس میں انڈیلی اور شراب پینا شروع کر دی پھر اس نے اسی طرح

پوری بوتل ختم کر دی اور پھر قہقہہ مار کر ہنسا۔ "کوئی نہیں ہے یہاں، جن وغیرہ سب فضول اور جھوٹ ہے۔ اگر ہے تو میرے سامنے آئے، میں نے تو اب شراب بھی پی لی ہے، مجھے کچھ کر کے دکھاؤ تو، میں مانوں، سب جھوٹ بولتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج سے بہت سال پہلے ایک انگریز مسٹر جونز یہاں شراب نوشی کی وجہ سے مر گیا تھا، میں تو ابھی تک زندہ ہوں۔" وہ بری طرح ہنس رہا تھا اور شراب کے نشے میں کمرے میں اچھل کود کر رہا تھا۔

اچانک کمرے میں دو افراد نمودار ہوئے وہ شکل وصورت میں عام انسانوں جیسے ہی دکھائی دے رہے تھے، ان کے سروں پر ٹوپیاں اور چہرے پر داڑھی، وہ دونوں اختر علی کے سامنے کھڑے تھے۔

"کون ہو تم لوگ؟" اختر علی حیران تھا کہ یہ نامعلوم افراد کہاں سے آگئے ہیں۔

"تم بہت یاد کر رہے تھے ناں ہمیں، اس لئے ہم ظاہر ہوگئے۔" دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ "یہ ہمارا کمرہ ہے، ہم مسلمان جن ہیں اور ہم کوئی نشہ نہیں کرتے۔ اور نہ ہی اپنے کمرے میں کسی کو نشہ کرنے دیتے ہیں اس کی سزا صرف اور صرف موت ہے۔"

اور پھر دونوں کے قد لمبے ہونا شروع ہوگئے یہاں تک کہ ان کے سر چھت سے لگ رہے تھے انہوں نے اختر علی کو ٹانگوں سے پکڑ کر الٹا لٹکا دیا اور پھر ایک جن نے نجانے کہاں سے ایک ہنٹر اٹھا لیا اور اختر علی کو ہنٹر سے مارنے لگا۔ اختر علی بری طرح چیخ رہا تھا لیکن وہ اس پر رحم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ لیکن پھر وہ مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہوگیا۔

جب صبح ہوئی تو اختر علی اس پراسرار کمرے سے باہر پڑا ہوا تھا۔

اختر علی جب ہوش میں آیا تو اس کو چپ سی لگی ہوئی تھی۔ اب صبح ہو چکی تھی، امام بخش اس کے قریب آیا اور کہنے لگا۔ "ہاں سائیں رات تو صحیح گزری ناں؟"

لیکن اختر بالکل گم صم تھا، اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی، وہ بدحواس ہو چکا تھا، خوف کے شکنجے میں جکڑ چکا تھا اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔

اس نے اپنا سفری بیگ اٹھایا اور بس اسٹاپ کی طرف دوڑ پڑا، وہ اب اپنے گھر ٹھٹھہ روانہ ہوگیا تھا، گھر پر پہنچتے ہی وہ بستر پر گر گیا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔

لیکن یہ کیا؟ وہی دونوں جن اس کے سامنے کھڑے تھے اور پھر انہوں نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ "تو کیا سمجھتا ہے کہ تو بچ جائے گا نہیں ہرگز نہیں۔" اور ایک مرتبہ پھر دونوں جنوں نے اسے الٹا لٹکا دیا اور ہنٹروں سے مارنا شروع کر دیا۔

اختر علی کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ اور پھر ایک جن نے آگے بڑھ کر اس کا گلا دبانا شروع کر دیا، اور دوسرے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، وہ اب چیخ بھی نہیں سکتا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں اختر علی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

اختر علی کے مرتے ہی دونوں جن وہاں سے غائب ہوگئے۔

آفس میں اختر علی کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، سب یہی کہہ رہے تھے کہ "یہ ہوا کیسے؟ وہ تو اچھا بھلا آدمی تھا، وہ ضرور اس پراسرار کمرے میں گیا ہوگا جو کہ اس مخلوق کو پسند نہیں آیا ہوگا۔"

امام بخش نے لوگوں کو بتایا کہ "میں نے اختر علی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا، لگتا ہے اس نے ان جنوں کے کمرے میں شراب پی ہوگی جس کی سزا اسے موت ملی ہے۔"

پھر لوگ جب پراسرار کمرے میں داخل ہوئے تو اس میں سے خالی شراب کی بوتل اور گلاس نے امام بخش کی بات کی تصدیق کر دی کہ اختر علی اپنی شراب نوشی کی عادت کی وجہ سے ان جنات کے عتاب کا شکار ہوا تھا۔

معصوم روحیں

عاصمہ رمضان۔ پنڈ دادنخان

جنگل میں موجود گڑھا سوکھے پتوں سے بھرا پڑا تھا کہ ایک معصوم کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام سے گڑھے میں جا گرا، اور پھر اس معصوم بچے کی دلدوز چیخیں سنائی دیں کیونکہ گڑھے میں......

حرص ولالچ اور طمع کے گرداب میں جنم لیتی ایک دل گرفتہ ......لہو لہو لرزیدہ کہانی

شام کے سرمئی سائے پام کے درختوں پر اتر کر لمبے سائے بنا رہے تھے، مینڈک کے ترانے اور جھینگروں کے شور نے ماحول کو عجیب بنا رکھا تھا، پوری وادی میں گہرے سکوت کا دور دورہ تھا۔ بارش کے بعد مٹی کی خوشبو بھی چار سو پھیلی ہوئی تھی، اونچی، نیچی پگڈنڈیوں پر آنکھوں کو لبھانے والی بے شمار ہری ہری گھاس اگی ہوئی تھی اور اس کے لمبے، ریشے ہوا کے دوش پر عجیب پر کیف منظر پیش کر رہے تھے۔ پگڈنڈیوں سے پرے کھیتوں کے کنارے خوبانی، آلوچے، آلو بخارے کے پیڑوں پر گلابی شگوفے پھوٹ رہے تھے، بکائن کے پھول اڑ اڑ کر اس کی راہوں میں بچھے جا رہے تھے۔ موسم سرد تھا اور ٹھنڈی ہوا اس نازک سی لڑکی کو ہراساں کیے دے رہی تھی۔ شام اب رات میں بدل چکی تھی، مگر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی اس لڑکی کی تلاش ختم نہیں ہو رہی تھی۔

"مناحل...... عرشان...... کہاں چلے گئے تم لوگ؟" وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر وہیں بیٹھ گئی، ابھی اسے اس حالت میں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔

"کچھ پتہ چلا؟" دوسری طرف اس کے والد کی آواز ابھری۔

"نن...... نہیں بابا۔" ہکلاتے ہوئے وہ دوبارہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوہ! مائی گاڈ...... ذرا سا کام نہیں ہوتا تم سے، میری ہی غلطی تھی جو تم پر اعتبار کیا انہیں تمہارے ساتھ بھیج دیا۔" اس کے والد "شفقت اعوان" سخت غصے کے عالم میں تھے اور پھر فون بند کر دیا گیا تھا۔ اب اس نازک سی لڑکی کے چہرے پر پھیلی پریشانی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ مدد طلب نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی کہ اسے اپنے سے کچھ ہی فاصلے پر کوئی ایک سائیکل سوار جاتا دکھائی دیا، وہ آوازیں دیتی ہوئی اندھا دھند اس کی سمت میں بھاگنے لگی۔ سائیکل سوار نے اپنی رفتار اب کافی کم کر دی تھی، اور حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا تھا۔

"بھائی! آپ نے یہاں دو بچوں کو دیکھا ہے؟ ایک کی عمر پانچ سال اور دوسرے کی بمشکل سات سال ہوگی۔ پلیز، میری مدد کریں۔" اب اس کا سانس چڑھ چکا تھا۔

سائیکل سوار نے کچھ دیر تک لڑکی کو بغور دیکھا۔ پھر بغیر جواب دیئے سائیکل آگے کی سمت بڑھا دی۔ لڑکی اسے آوازیں دیتی رہ گئی، مگر اس نے مڑ کر نہ دیکھا۔

☆......☆......☆

"اگر تم اسے ایک نظر دیکھ لو، تو کبھی مجھے پاگل نہ کہو۔" ہاشم، جو کافی دیر وائلن پر کوئی دھن ترتیب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب وائلن ایک طرف رکھ کر اپنے دوست عشارب کے پاس آ بیٹھا تھا۔

"پاگل تو میں تجھے کہوں گا! کیونکہ تجھے اس کا نام تک نہیں معلوم......" عشارب نے میز پر دھرا پاپ کارن سے بھرا باؤل ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔

"نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟ جان لیں گے نام بھی......" ہاشم ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔

"فر بھی! کاف تو...... فتا اونا چاہئے۔" عشارب کا منہ پاپ کارن سے لبالب بھرا ہونے کی وجہ سے الفاظ درست طریقے سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ مگر وہ اپنی عادت کے پیش نظر کھانے کے دوران ہی بولنے کا پابند تھا۔

"ابے کیا کہہ رہا ہے؟ پہلے پاپ کارن تو منہ سے نکال، یا انہیں اندر پیٹ میں اتار، تبھی مجھے کچھ سمجھ آئے گی۔" ہاشم اکتاتے ہوئے بولا۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ پھر بھی، نام تو پتہ ہونا چاہئے۔" عشارب نے جلدی جلدی تمام پاپ کارن نگل کر کہا تھا، کیونکہ وہ ہاشم کے غصے سے واقف تھا، ہاشم نے ابھی جواب دینے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کی والدہ "شارقہ بدر" اندر داخل ہوئیں۔

"ہاشم بیٹا! کراچی کی فلائٹ ٹھیک دو گھنٹے بعد کی ملی ہے، تم ذرا جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" شارقہ بدر نے کہا اور اپنی سرمئی ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے روم سے باہر نکل گئیں۔

"کراچی جا رہا ہے تو؟" عشارب نے پاپ کارن کا باؤل واپس میز پر رکھا۔

"ہاں یار! ماما کی کوئی پھوپھی ہیں، ان کی طبیعت بہت خراب ہے، انہی سے ملنے جانا ہے۔" ہاشم اٹھ کر الماری سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔

"یہ وہی پھوپھی تو نہیں ہیں جن کی بیٹی کی شادی میں تو کچھ عرصہ پہلے گیا تھا۔" عشارب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور اٹھ کر الماری سے کپڑے سلیکٹ کرنے میں ہاشم کی مدد کرنے لگا۔

"ہاں! مگر یہ میری نہیں، میری امی کی پھوپھی ہیں انڈر اسٹینڈ؟" ہاشم نے بالآخر ہلکے فیروزی رنگ کی شرٹ اور عشارب کی سلیکٹ کردہ جینز نکال لی۔

"ابے کوئی بھی ہو، وہ لڑکی تو تجھے شادی کی اسی

تقریب میں ملی تھی ناں...... میں بھی کہوں، یہ شارقہ آنٹی کی ہر بات سے انکار کرنے والا یہ نالائق بیٹا یکدم سے کیسے فرمانبردار بن کر اپنی مام کے ساتھ کراچی جا رہا ہے؟" عشارب نے الماری سے نکالی گئی ٹائی کو ہاشم کی گردن کے گرد کسی رسی کی طرح کستے ہوئے کہا۔ جس پر ہاشم نے مسکراتے ہوئے ٹائی کے بل گردن سے نکالے اور اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم میں چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ شیشے کے سامنے کھڑا اپنے گیلے بالوں میں برش کر رہا تھا۔ اپنی تیاری کو آخری ٹچ دینے کے لئے اس نے پرفیوم کا چھڑکاؤ کیا۔ جانچتی نظروں سے شیشے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے وہ ایک حسین خیال میں کھو سا گیا۔

رات میں اس پورے گھر کو تازہ پھولوں سے مہکا دیا گیا تھا، مختلف رنگوں کے برقی قمقمے اس منظر کو جنت نظیر بنا رہے تھے، بارات آچکی تھی اور دولہا کو سلامی دی جا رہی تھی۔ جدید طرز کا شلوار سوٹ پہنے لڑکوں کے ہجوم کے ساتھ وہ مسلسل تیز میوزک پر ڈانس کئے جا رہا تھا، تبھی ڈانس کرتے کرتے وہ اچانک پیچھے کو مڑا تو کوئی چیز چھناکے کے ساتھ ٹوٹی، تازہ گلابوں سے بھری شیشے کی نازک سی پلیٹ کرچی، کرچی ہو گئی تھی، اور پھول اس کے پیروں کے علاوہ نازک سی چپل پہنے کسی اور کے پیروں میں بھی بکھر سے گئے تھے۔ اس نے فوراً نگاہ اوپر کی طرف اٹھائی ہلکے فیروزی کی لانگ شرٹ اور چوڑی دار پاجامہ پہنے وہ کوئی آسمانی حور لگ رہی تھی۔ اس کے سیاہ لمبے بال شانوں پر بکھرے پڑے تھے، کشادہ پیشانی پر، کپڑوں سے ہم رنگ فیروزی رنگ کے موتی اور نگوں سے جڑی ماتھا پٹی پہن رکھی تھی۔ ماتھا پٹی کی باریک فیروزی لڑیاں اس کے ماتھے کے دونوں اطراف پھیلی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی بادامی آنکھیں میک اپ کے بغیر بھی غضب ڈھا رہی تھیں۔ سچے موتیوں کے جیسا اس کا معصوم روشن چہرہ چودھویں کا چاند لگ رہا تھا اور واقعی...... وہ اسی رات ہاشم کے لئے پورا چاند بن گئی تھی...... ایک مکمل چاند جس کے بغیر اس کی ذات ادھوری تھی۔

"ہاشم! میں کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ فلائٹ مس ہو جائے گی، بیٹا جلدی کرو۔" شارقہ بدر اس کے انتہائی قریب کھڑی اپنی جانب متوجہ کر رہی تھیں۔

"اوہ! سوری مام۔" ہاشم نے برش سنگھار میز پر رکھا۔

اور کچھ ہی دیر میں ان کی گاڑی لاہور ایئر پورٹ کی جانب رواں دواں تھی۔ جہاں سے انہوں نے کراچی کے لئے فلائٹ پکڑنا تھی اور پھر دونوں ماں بیٹے جہاز میں بیٹھ کر تھوڑی دیر میں مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔

"اور سنایئے پھوپھی جان...... سب خیریت ہے ناں؟"

شارقہ بدر نے بلیک کافی کا بڑا سا مگ تھامے ہوئے بولا۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے بیٹا، یوں لگتا ہے زندگی جیسے ختم ہونے کو ہے۔ شارقہ، مجھ سے ایک وعدہ کرو...... میرے بعد میری بچی کو تم سنبھالو گی۔" پھوپھی نحیف سی آواز میں بولیں۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟" شارقہ بدر اٹھ کر پھوپھی کے قریب آ گئیں۔ "رملہ کی فکر کیوں کر رہی ہیں آپ؟ اس کا اب اپنا گھر ہے...... سسرال ہے۔"

"نہیں! مجھے رملہ کی بہت فکر ہے۔" پھوپھی کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔

"آپ تسلی رکھیں، آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔" شارقہ بدر اٹھ کر سینٹر ٹیبل تک آ گئیں اور گلاس میں پانی انڈیلنے لگیں۔ پانی بھرا گلاس لے کر جب وہ پلٹیں تو پھوپھی اب سکون سے بیٹھی تھیں انہوں نے آگے بڑھ کر گلاس پھوپھی کے منہ سے لگایا تو یکدم گلاس ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پھوپھی کی گردن بے جان ہو کر ایک طرف کو لڑھک گئی تھی۔

اور پھر پورے گھر میں آہ و فغاں کی آوازیں گونجنے لگیں اور پھر چند گھنٹے میں کفن دفن سے سب فارغ ہو چکے تھے، شارقہ بدر نے رملہ کو اپنے پاس بٹھایا اور بولیں۔

"رملہ بیٹی! تمہیں زندگی میں کبھی بھی کوئی مسئلہ درپیش ہو تو مجھے مت بھولنا، پھوپھی تمہیں میرے حوالے کر کے گئی ہیں۔" شارقہ بدر نے اکیس سالہ رملہ کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

پھوپھی کا سوئم گزر چکا تھا اور تقریباً سبھی مہمان جا چکے تھے۔ شارقہ بدر بھی ہاشم کے ہمراہ جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ "ویسے میرے خیال میں تو آپ ہمارے ساتھ ہی چلیں، راستے میں ہم آپ کو آپ کے سسرال ڈراپ کر دیں گے، یہاں گزارے گئے پل آپ کو سوائے یادوں کی اذیت کے کچھ نہیں دیں گے۔" ہاشم نے بیگ گاڑی کی ڈگی میں رکھ کر کھٹاک سے ڈگی بند کی اور رملہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں...... رملہ، تم ہمارے ساتھ ہی چلو۔" شارقہ بدر نے رملہ کو بھی اپنے ساتھ ہی بیٹھا لیا اور گاڑی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ مختلف سڑکوں اور چھوٹی بڑی گلیوں سے گاڑی گزرتی جا رہی تھی ہاشم نے گیئر گھماتے ہوئے پوچھا۔

"مام! میرا خیال ہے، اس شاپنگ پلازہ کے پیچھے رملہ آپی کے سسرال والوں کا گھر ہے۔"

"ہاں بیٹا! مکان نمبر چوبیس ہے۔" شارقہ بدر نے شیشے سے باہر جھانکا۔ جبکہ رملہ گم صم سی بیٹھی خلاؤں میں گھورے جا رہی تھی، اسے ارد گرد کا کوئی ہوش نہ تھا۔

گاڑی ایک شاندار کوٹھی کے سامنے جا رکی تھی شارقہ بدر رملہ کو لے کر باہر نکلیں، ہاشم کے دو تین بار ہارن بجانے پر سیاہ دیوہیکل گیٹ کھلا تھا اور چوکیدار کے پیچھے ایک نوعمری لڑکی باہر آئی تھی، جس کے چہرے پر رملہ کو دیکھتے ہی مسکراہٹ در آئی تھی، اس نے اپنے لمبے سیاہ بالوں کی فرانسیسی طرز کی چوٹی کر رکھی تھی۔ چوٹی کے بلوں میں کہیں کہیں موتی جھلک رہے تھے اس نے آتے ہی شارقہ بدر کو خوش دلی سے سلام کیا جبکہ ہاشم کو بھی سلام کرتے ہوئے سرسری نگاہ ڈالی۔ مگر ہاشم نے نگاہیں ملائے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہاشم کا انداز خواتین سے بہت لیا دیا رہتا تھا۔ یہ تو بس اس سورج جیسی آنکھوں والی لڑکی کا کمال تھا، جس نے اپنے عکس کو ہاشم کی آنکھوں میں منجمد کر دیا تھا ورنہ ہاشم تو کسی لڑکی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ لڑکی رملہ کو لے کر اب گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھی جانے سے قبل اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا اور الوداعیہ انداز میں ہاتھ ہلایا۔

عین اسی لمحے گاڑی اسٹارٹ کرتے وقت ہاشم کی نظر سائیڈ مرر پر پڑی لمحے کے ہزاروں حصے میں اس کی آنکھوں کے سامنے فیروزی کپڑوں والی وہی لڑکی آ گئی، جس کی ہلکی فیروزی موتیوں سے جڑی ماتھے پر پٹی کی چمک نے آج اس کی آنکھیں چندھیا کر رکھی تھیں۔ وہ ایک دم سے یوں اسے مل سکتی تھی یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا، وہ کب کی رملہ کو لے کر اندر چلی گئی تھی مگر ہاشم یونہی دم سادھے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا شارقہ بدر نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"ہاشم! کہاں کھو گئے؟ گاڑی اسٹارٹ کرو۔"

"آں...... ہاں مام! کرتا ہوں۔" وہ جیسے چونک اٹھا۔ "ویسے مام! رملہ آپی کے ساتھ یہ لڑکی کون تھی؟" گیئر بدلتے ہوئے اس نے یونہی اپنی پسند کا موضوع چھیڑا۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ رملہ کی نند تھی۔ "چاندنی"۔" شارقہ بدر مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اچھا...... تو اس کا نام "چاندنی" ہے۔" ہاشم نے زیر لب مسکراتے ہوئے فرنٹ اسکرین سے باہر دیکھا تھا۔ جہاں آسمان پر شام کے پھیلتے اندھیروں میں چاند کی آمد، آمد تھی۔

☆......☆......☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، اس کے پورے جسم پر جگہ جگہ زخموں اور مار پیٹ کے نشانات تھے۔ وہ بال بکھرائے، نڈھال سی کمرے کے کونے میں دبکی بیٹھی تھی، سانس بھی اٹک اٹک کر آ رہی تھی۔

"اتنے بڑے نقصان کی ذمہ دار صرف تم ہو۔ اتنی آسانی سے جاں بخشی نہیں کی جائے گی

تمہاری۔" شفقت اعوان نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور گرجتے ہوئے کہا۔

"میں...... نہیں جانتی، وہ کہاں گئے ہیں۔" وہ اٹکتے ہوئے لرزیدہ آواز میں بولی۔

"بکواس بند کرو۔" شفقت اعوان نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔ وہ بل کھا کر بائیں جانب لڑھک گئی کچھ ہی دیر بعد دروازہ پھر سے بند ہو گیا تھا اور اسے ایک بار پھر کمرے میں قید کر دیا گیا تھا۔ شفقت اعوان اسے روتا بلکتا چھوڑ کر کمرے سے جا چکے تھے۔

گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں، اس کے رستے زخموں پر کوئی مرہم رکھنے والا بھی نہیں تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر شاید اس کے دماغ پر زیادہ چوٹ آئی تھی، لہٰذا چکرا کر گر پڑی۔ آنکھیں موند کر وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت سی تھی۔

وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ ایک ننھا منا ہاتھ اس کے ماتھے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ موم جیسا سفید نرم و نازک چھوٹا سا ہاتھ، جسے دیکھ کر ایک دم تھامنے کو جی چاہتا ہو، ننھا ہاتھ اب اس کی پیشانی پر موجود تھا اور دھیرے دھیرے اس کا زخم سہلا رہا تھا۔

حیرت انگیز طور پر ہاتھ کا لمس زخم کے جس حصے پر بھی پڑ رہا تھا، زخم وہاں سے مندمل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ابھی آنکھیں کھول کر ہوش کی وادی میں آنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ اتنے میں اسے اپنی پیشانی پر کسی ننھے منے ہونٹوں کا لمس بھی محسوس ہوا۔ ننھے سرد ہونٹ...... جو اس کی پیشانی کو چوم رہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو ایک بچی کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا، ماتھے کے زخم غائب ہونے کی وجہ سے اب وہ اپنے آپ کو کافی بہتر محسوس کر رہی تھی۔

"مناحل ...... تم یہاں کیسے؟" وہ پانچ سالہ مناحل سے مخاطب ہوئی، جواب میں مناحل سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی تھی اور بے تاثر نگاہوں سے اسے تکے جا رہی تھی۔

"مناحل! بھاگ جاؤ یہاں سے، تم یہاں واپس کیوں آ گئی ہو؟" وہ بازو پھیلائے ننھی مناحل کی جانب بڑھی جو اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر الٹے قدموں لوٹنے لگی تھی اور پھر اچانک ہوا میں معلق ہو کر جیسے تیرتی ہوئی کھلی کھڑکی سے باہر نکل گئی۔

وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکی مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ باہر کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا۔ املتاس کے گھنے پیڑ اندھیرے میں سر جھکائے کھڑے، بڑے بڑے بھوت لگ رہے تھے۔

"اتنی ننھی بچی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کہاں جا سکتی ہے؟ وہ مجھ سے کچھ بولی کیوں نہیں؟ کرشان کہاں ہے؟" سوالات کی شورش نے اس پر حملہ کیا اور وہ چکرا کر وہیں گر پڑی۔

تیز ہوا نے کھڑکی کے پٹ کھٹاک سے بند کر دیئے اور کمرہ تاریکی کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔

☆......☆......☆

"اس ذلیل عورت نے پچاس لاکھ کا نقصان کر دیا ہمارا۔ بہت لاڈلے بچے تھے وہ اپنے والدین کے، تاوان ادا کرنے میں ذرا تاخیر نہ کرتے۔" شفقت کو ابھی تک قلق تھا۔

"مگر باس! کیا وہ اپنے گھر پہنچ گئے؟" نظامت بندوق صاف کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں...... یہی تو مسئلہ ہے انہیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔" شفقت جبڑ کو جھولاتے ہوئے بولا۔

"ان چاروں بچوں کے جسمانی اعضاء اسمگل کر دیئے ہیں، باس ایک بہت بڑی رقم ملنے کی امید ہے۔" نظامت کی آنکھوں میں پیسے کا لالچ در آیا۔

"ہوں...... چاروں غریب ہی تھے ناں؟" شفقت اٹھ کر گلاس میں بیئر انڈیلنے لگے کانچ کا چھوٹا گلاس زرد مشروب سے لبالب بھر گیا تو دوسرا وہ نظامت کے لئے بھرنے لگا۔

"باس...... بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟ سو فیصد چاروں غریب بچے ہی تھے۔" نظامت کی آنکھوں میں

[...] گلاس دیکھ کر چمک سی ابھرنے لگی تھی۔

"اور امراء کے بچے...... ان کا کیا کرو گے؟"

[...]ت نے بھرا ہوا جام نظامت کے ہاتھوں میں تھمایا جسے [...] نے فوراً پکڑ لیا۔

"کرنا کیا ہے باس...... پہلے تاوان مانگیں گے [...] تاوان نہ دیا تو وہی حال کریں گے، جو غریب کے [...] کا ہوتا ہے، یعنی ہماری ہر حال میں پانچوں انگلیاں [...] میں ہی ہوں گی۔" یہ کہتے ہی نظامت غٹاغٹ [...] اپنے حلق سے نیچے اتارنے لگا۔

"ہوں...... تم نئے آئے ہو نظامت مگر تم [...]ے قوانین کو بہت پرکھ گئے ہو۔" شفقت نے اپنا [...]راب سے بھرا ہوا گلاس نظامت کے خالی گلاس سے ٹکرا [...]س کیا اور مکروہ ہنسی ہنستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ [...]ب اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ جہاں اس نے [...] جہاں سے بے خبر ہو جانا تھا۔

ادھر نظامت کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ [...]ٹے میں دھت ہو کر وہ فرش پر چاروں شانے چت گرا [...] تھا۔ اس کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی [...]یں اور وہ چندھی، چندھی آنکھوں سے کھڑکی سے [...] نظر آنے والے آسمان پر تارے گننے کی کوشش کر رہا تھا۔ [...] اثناء میں کمرے کی چھت پر ایک ہیولہ سا گردش [...] کرنے لگا، وہ ہیولہ کس کا تھا؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ [...] وہ ہیولہ ہولے ہولے دیوار پر سے سرکتا ہوا نیچے [...] آنے لگا۔ جہاں نظامت چت پڑا تھا۔ اب ہیولہ [...] نظر آ رہا تھا، وہ کسی بچے کا ہیولہ تھا جس کی عمر بمشکل [...] برس ہوگی، نظامت کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا [...] سے آنکھیں کھول دیں اور ہیولے کو دیکھ کر [...] گھبراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے کی فضا میں سکوت طاری [...] سردی کی شدت کو کم کرنے کے لئے کونے میں [...] روشن تھی جس میں الاؤ دہک رہا تھا۔

نظامت نے اپنی آنکھیں روشن الاؤ کے اردگرد [...] کے وجود کو تلاش کرنے میں مرکوز کر دیں۔ بالآخر [...] وہ ہیولہ وہاں نظر آ ہی گیا۔ وہ ایک بہت معصوم سا بچہ

تھا، جس نے سیاہ نیکر اور نیلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ سیاہ ننھے منے بوٹوں سے نکلتے ہوئے سفید موزوں نے اس کی آدھی ٹانگوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ سنہری رنگ کے گھنگھریالے بال اس کے ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ سرخ و سفید رنگ والے بچے نے اپنی نارنجی آنکھیں نظامت کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ خلاف توقع اب بچے کی آنکھوں میں وہ معصومیت نہ تھی جو عموماً اس عمر کے بچوں کی آنکھوں میں ہوا کرتی ہے۔

نظامت گنگ سا ہو کر بچے کی آنکھوں میں جھانکنے لگا انگیٹھی میں جلنے والا آگ کا الاؤ اب مزید بھڑکنے لگا تھا۔ اب بچے کا سایہ تاریک کمرے کی دیواروں پر ادھر، اُدھر نظر آنے لگا تھا، پھر بچہ اور وہ دونوں باہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے تھے، اتنے میں نظامت کے قدموں میں جنبش پیدا ہوئی۔ اس کا رخ انگیٹھی میں روشن الاؤ کی طرف تھا، نظامت کے قدم جوں، جوں الاؤ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ویسے ویسے الاؤ مزید تیزی سے بھڑکنے لگا تھا، پھر ایک پل عجیب کرب و اذیت کا تھا، جوں، جوں وہ انگیٹھی میں موجود الاؤ کے قریب ہوتا جارہا تھا۔ سرخ الاؤ کے بھڑکنے میں اتنی ہی شدت آتی جارہی تھی۔ جیسے وہ اسے اپنے اندر ضم کرنے کے لئے بے تاب ہو۔

اب آگ کے بھڑکنے کی آواز پورے کمرے میں سنی جاسکتی تھی۔ بچہ اپنی جگہ ہنوز کھڑا تھا اور بے تاثر نظروں سے نظامت کی پشت کو تکے جارہا تھا، جو اب انگیٹھی میں روشن الاؤ کے عین قریب پہنچ چکا تھا۔

دہکتی آگ بھڑک بھڑک کر نظامت کے قد کے برابر آرہی تھی۔ اب اس کا چہرہ آگ کی تپش سے سرخ ہو چلا تھا، اور پھر اچانک ایک دلدوز دلخراش منظر سامنے آیا، میکانکی انداز میں نظامت نے اپنا پیر آگے بڑھایا اور جلتی بھڑکتی انگیٹھی میں بالکل ایسے بیٹھ گیا جیسے کسی کرسی پر بیٹھا جاتا ہے۔

بھڑکتی آگ نے فوراً اس کے کپڑوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ اس کے سر سے اونچی ہوتی گئی۔ وہ آگ کے دریا میں ڈوب سا گیا تھا۔

"اوں......اوں......" آگ میں جلتے ہوئے اس کی بے بسی میں ڈوبی آواز ابھری فضاء میں انسانی گوشت جلنے کی بو رچ بس چکی تھی، اور یہی نہیں بلکہ فضا میں ہڈیاں چٹخنے کی آواز بھی دل گرفتہ تاثر پیدا کررہی تھی، کمرہ اس وقت کسی چھوٹے سے شمشان گھاٹ کا منظر پیش کررہا تھا۔ بھڑکتی آگ کے شعلوں کی روشنی میں، تاریک کمرے کے اندھیرے مدھم ہوتے جارہے تھے، اور ان میں بے شمار نادیدہ روحیں بین کرتی لگ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

پیلا انگرکھا، نیچے پاجامہ اور سر پر بڑا سا گوٹہ کناری سے بھرا پیلا دوپٹہ، سیاہ لمبے بالوں کا پراندہ دائیں شانے پر پڑا تھا۔ اس میں موتیا کے پھول اٹکائے گئے تھے کلائیوں میں بھر بھر کر زرد کانچ کی چوڑیاں تھیں اور ماتھے پہ موتیے کے پھول کا ننھا سا ٹیکا......سارے لوگ دلہن کو چھوڑ کر چاندنی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جو گیلی مہندی اور پھولوں سے بچی اٹھائے یہاں سے وہاں پھر رہی تھی۔

"ارے سنو تو...... واہ، آج تو ہماری بیگم کے پاس ہمارے لئے بالکل ٹائم نہیں ہے۔" سفید شلوار قمیض میں ملبوس، گلے میں پیلے رنگ کا پٹکا ڈالے ہاشم اس کے برابر میں آ کھڑا تھا ہاں......نہیں ہے ٹائم......انوری کی مہندی زیادہ ضروری ہے۔" چاندنی نے اپنی گردن موڑ کر کہا اور پراندہ جھٹک کر زیر لب مسکراتے ہوئے ایک طرف کو چل دی جبکہ ہاشم ہنستے ہوئے اپنی اس پوری کو جاتا دیکھتا رہا جو دو سال ہوئے اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی ماضی کی ایک یادگار شام اس کے ذہن میں سرشار سرگوشیاں کرنے لگی۔

"ول یو میری می......؟" ہاشم نے دونوں ہاتھ جیب میں ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آپ امی سے پوچھ لیں۔" اچانک اس سوال پر چاندنی گھبرا سی گئی اور جانے کے لئے پلٹی ہی تھی کہ ہاشم نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"شادی تو آپ ہی کو کرنی ہے ناں، جواب بھی آپ ہی بتا دیں۔"

"آپ امی سے پوچھ لیں۔" چاندنی نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ اور پھر کچھ ہی عرصے بعد وہ دونوں نکاح کے مقدس بندھن میں بندھ گئے وہ رات دونوں کی زندگی کی بڑی دلکش اور دل نشین رات تھی جب چاندنی مہرون لہنگے میں سجی سنوری ہاشم کے سامنے بیٹھی تھی اس وقت وہ آسمان سے اتری کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔

اسی اثناء میں ہاشم کے موبائل کی گھنٹی بجی اور وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا۔ موبائل پر بات کرنے کے بعد اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ گھبراہٹ اس کے چہرے پر صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ وہ تیزی سے ہجوم میں کھڑی چاندنی کی طرف بڑھا اور اس کے کان میں کچھ کہا، جسے سن کر چاندنی کے چہرے پر بھی ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔

"کیا ضرورت تھی آذر کو رملہ آپی کو طلاق دینے کی؟ اور اس پر ستم یہ کہ اپنی بہن کو بھی چھوڑ کر موصوف آسٹریلیا روانہ ہوگئے۔" ہاشم جلے بھنے انداز میں بولا۔

"آذر بھائی اس لئے آسٹریلیا گئے ہیں کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں تم اپنی بیوی کو اچھی طرح سنبھالوگے اور اس کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوگے۔" چاندنی نے لاڈ سے ہاشم کی ٹائی ناٹ درست کی۔ "میں سیریس ہوں چاندنی جانے رملہ آپی کس حال میں ہونگی؟ کہاں گئی ہونگی؟" ہاشم نے اپنا کوٹ اٹھایا اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر نکل گیا۔ چاندنی متوحش سی اس کو تکتی رہ گئی رملہ کے نام آنے والی مختلف فون کالز، گھٹیا قسم کے پیغامات نے آذر کو یہ اسٹیپ لینے پر مجبور کیا تھا۔ اسے طلاق دینے کے بعد وہ سیدھا آسٹریلیا جابسا تھا اور رملہ جیکے سے سب کی زندگیوں کو آذر کے شک پر صداقت کی مہر لگا گئی تھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے؟

☆......☆......☆

چاندنی دروازہ بند کر کے پلٹی اور کچن میں آ کر برتن دھونے لگی۔ برتن دھو کر وہ ریک میں رکھ ہی رہی تھی کہ ڈور بیل ہوئی۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک نہایت خوبصورت بچی کھڑی تھی۔ اس نے پنک فراک پہن رکھا تھا اور اپنے بالوں کو دو چھوٹی چھوٹی پونیوں سے مقید کر رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔

"آپ میرے ساتھ چلیں۔" بچی نے آنکھیں معصومیت سے جھپکتے ہوئے کہا۔ اس کی پلکیں بہت بڑی بڑی اور قدرے مڑی ہوئی تھیں۔

"پر کہاں......؟ کون ہو آپ بیٹا؟" چاندنی حیرت سے بولی۔

"آپ میرے ساتھ چلیں۔" بچی نے سرعت سے کہا اور چاندنی کے جواب کا انتظار کئے بغیر ایک سمت کو تیز تیز چلنے لگی۔

خزاں نے درختوں کے سارے پتے سڑک پر بکھیر رکھے تھے۔ بچی کے تیز تیز چلنے کی وجہ سے پتوں کی چرمراہٹ کی صدائیں بلند ہورہی تھیں۔

"اوکے...... میں چلتی ہوں۔" چاندنی نے دروازہ باہر سے لاک کیا اور تیزی سے بچی کے پیچھے چلنے لگی۔ بچی بہت تیزی سے چل رہی تھی چاندنی کو اس کا ساتھ دینا کافی مشکل لگ رہا تھا۔ "بیٹا آپ کہاں جارہی ہو؟ پلیز ذرا آہستہ چلو۔" چاندنی نے ہاتھ بڑھا کر بچی کو روکنا چاہا مگر چاندنی کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی اس کے چلتے قدم وہیں رک گئے اسے اپنے محسوسات پر یقین نہیں ہورہا تھا اس کا ہاتھ بچی کے آر پار گزر گیا جیسے وہ کوئی مادی وجود نہ رکھتی ہو تو آخر وہ بچی کیا تھی؟" یہ سوچ کر ہی چاندنی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اب بچی بھی آگے جا کر رک گئی تھی اور رخ پھیر کر چاندنی کو تکنے لگی تھی چاندنی کو رکتا دیکھ کر اس کو بڑی بڑی آنکھوں میں نمی سے تیرنے لگی تھی بے بسی اس کے

چہرے پر عیاں تھی۔
چاندنی کے ذہن میں جیسے جھماکہ سا ہوا اور اچانک ہی چاندنی نے الٹے قدموں دوڑ لگادی۔ تیز دوڑنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول رہا تھا گھر کے پاس پہنچ کر کانپتے ہاتھوں سے اس نے دروازے کا لاک کھولا اور اندر داخل ہو کر دروازہ مضبوطی سے بند کرلیا وہ وہیں دروازے کے ساتھ بیٹھتی چلی گی، ابھی اس کی حالت تھوڑی ہی سنبھلی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو سامنے اس کی چھوٹی بہن کھڑی تھی۔
"کیا ہوا آپی؟ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟" عروج نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ مگر چاندنی اب بے ہوش ہوچکی تھی۔

☆......☆......☆

"آنٹی پلیز! مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں۔ میری مما میرے بغیر نہیں سونے کی عادی...... پلیز مجھے جانے دیں۔" چوتھی جماعت کا ننھا سا طالب علم ہاتھ جوڑے اس کے آگے منت سماجت کر رہا تھا مگر وہ بے تاثر ہو کر اپنے سامنے پھیلے معصوم بچوں کے چھوٹے سے ہجوم کو دیکھ رہی تھی۔ ان کے گروہ نے چند ہی دن پہلے تفریحی ٹور پر جانے والی ایک اسکول وین کے بچوں کو اغوا کرلیا تھا۔ بچے بلک بلک کر رو رہے تھے۔
"آخر یہ کب تک چلے گا؟ میں کب تک یہ تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہوں گی؟" اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ باہر موسم خراب ہو رہا تھا۔ بجلی بار بار کڑک رہی تھی بچے ایک دوسرے سے بری طرح چمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ اس نے اپنے گالوں پر بہتی نمی کو ہتھیلی کی پشت سے پونچھا۔ جانے کیا سوچ اس کے ذہن میں آئی کہ وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے گروہ کی سرگرم رکن ہونے کے ناطے وہ اس تہہ خانے کے تمام خفیہ راستوں سے واقف تھی اس نے چوکنا ہو کر اپنے اردگرد دیکھا۔
بندوقیں ہاتھوں میں پکڑے، سیاہ ماسک چہروں پر چڑھائے اس کے ساتھی اونگھ رہے تھے اس نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر بچوں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور تمام بچوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک خاص سمت میں چلنے لگی۔ چونکہ اسکول وین کو ڈرائیور سمیت اغوا کیا گیا تھا ڈرائیور خاموشی سے بچوں کی قطار بنا کر انہیں اس کی تقلید میں چلنے لگا تھا۔
کچھ ہی دیر بعد بچے اپنے چہروں پر مسکراہٹیں سجائے اسے الوداع کہہ رہے تھے۔ ڈرائیور تیزی سے وین کو بھگا لے گیا تھا۔ وہ دلکش مسکراہٹ لبوں پر بکھیرے بچوں کو بائے بائے کر رہی تھی۔ وین اپنی منزل کو جانے کے لئے سڑک پر سرعت سے دوڑتی ہوئی جب نظروں سے غائب ہوگئی تو وہ گہرا سانس لیتے ہوئے جونہی مڑی تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ شفقت اعوان انگارہ برساتی آنکھوں کے ساتھ اس پر پستول تانے کھڑا تھا۔
"ذلیل...... کمینی...... تجھے اب کی بار معاف نہیں کیا جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے جونہی وہ ٹریگر دبانے لگا تو ایکدم اس کے کانپتے ہاتھوں سے پستول نیچے گر گیا کیونکہ خطرناک کئی ٹانگوں اور آنکھوں والے بڑے بڑے کیڑے اس کے پیروں پر چڑھ کر پورے جسم پر پھیل رہے تھے۔ ڈولتے جسم کے ساتھ جونہی اس نے بھاگنے کے لئے قدم بڑھائے تو اس کے جسم کو ایک خطرناک جھٹکا لگا اور وہ پتھرائی آنکھوں کے ساتھ وہیں زمین پر گر گیا اور تڑپتے ہوئے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی، جب وہ تڑپ رہا تھا تو اس کے عقب میں دو معصوم بچے صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس کھڑے تھے۔
"مناحل...... عرشان......" وہ بازو پھیلائے دیوانہ وار آگے بڑھی مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کے پھیلے بازو دونوں بچوں کے جسم کے آر پار ہوگئے تھے دونوں بچوں کی آنکھوں سے اب آنسو بہہ رہے تھے۔
"ہم مادی جسم سے آزاد ہوچکے ہیں رملہ آپی۔" معصوم سی بچی، جس کا نام غالباً مناحل تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
"رملہ......؟ میرا نام تو "ڈولی" ہے۔" وہ حیرت سے گویا ہوئی۔
"ڈولی" آپ کو ان لوگوں نے بنایا تھا آپ کی مکمل طور پر برین واشنگ کردی گئی ہے جس کی بدولت آپ اپنے سارے رشتے بھول چکی ہیں جس دن آپ اپنے شوہر کے گھر سے نکلی تھیں تو سامنے سے آنے والی گاڑی سے ٹکرا کر وہیں بے ہوش ہوگئی تھیں۔ اس گاڑی میں وہی شیطان صفت درندہ "شفقت اعوان" سوار تھا۔ پس انہوں نے اپنے مقصد کے لئے آپ کو استعمال کیا، آپ کے خونی رشتے آپ تک تھوڑی دیر تک پہنچنے ہی والے ہیں۔" عرشان نے سنسان سڑک کی طرف دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔
"پر...... تم دونوں اس رات کہاں چلے گئے تھے؟ میں نے تو تم دونوں کو بچانا چاہا تھا......؟ پھر تم دونوں مجھ سے چھپ کر کہاں چلے گئے تھے؟" اس کے سوالوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہ آرہا تھا۔
"جس رات آپ ہمیں اس تہہ خانے سے بھگا کر لائی تھیں اور شفقت اعوان کو اس بات کا علم ہونے پر کہ آپ ہم دونوں کو آزاد کرا کر لے گئی ہیں وہ اپنی گاڑی میں آپ کی گاڑی کے پیچھے آرہا تھا، اس کے شک کو خاک میں ملانے کے لئے آپ نے تھوڑی دیر کو گاڑی روک کر ہمیں درختوں کے پیچھے چھپادیا تھا آپ کی گاڑی کو رکے ہوئے دیکھ کر شفقت اعوان کی گاڑی جب آپ تک پہنچی اور مکمل تلاشی لینے کے بعد جب انہیں یہ یقین ہوگیا کہ اس معاملے میں آپ کا کوئی ہاتھ نہیں ہے تو وہ مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔
درختوں کے پیچھے ایک بہت بڑا کھائی نما گڑھا تھا۔ جو جنگلی پتوں سے بھرا پڑا تھا۔ مناحل کا پاؤں اچانک پھسلا اور وہ ایکدم گڑھے میں جاگری۔ اسے بچانے کی چاہ میں، میں بھی اسی گڑھے میں کود گیا۔ اس گڑھے میں بہت سے جنگلی سانپ تھے جنہوں نے ہماری آخری چیخ تک نہ نکلنے دی۔ وہ شاید آدم خور سانپ تھے ڈسنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہمارے جسموں سے گوشت بھی نوچنا شروع کردیا یوں رملہ آپی...... ہمارا بچاؤ ہماری موت کا سامان بن گیا۔
آپ ہمیں پاگلوں کی طرح آوازیں دیتی رہ گئیں اور ہم اگلے جہان کے باسی بن چکے تھے۔" اتنا کہہ کر عرشان خاموش ہوگیا۔ رملہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔
اچانک فضا میں گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور بریک کی آواز سنائی دی۔ چاندنی اور ہاشم نیچے اترے۔ چاندنی رملہ کے گلے لگ کر رونے لگی۔
"جانتی ہو رملہ؟ مجھے تمہارا پتہ اس ننھی سی پری مناحل نے دیا تھا۔ جب یہ تمہاری صورتحال بتانے کے لئے میرے گھر تک آگئی تھی اور اس وقت مجھے اس بچی سے خاصا ڈر بھی لگا تھا۔" چاندنی رملہ کے بال سہلاتے ہوئے بولی۔
"اچھا چلو! ہم اس منحوس جگہ سے نکلتے ہیں۔" ہاشم نے دونوں کو گاڑی میں بیٹھایا۔
"تمہیں پتہ ہے ہاشم؟ یہ بچی بار بار مجھے رملہ کے بارے میں آگاہ کرنے کی کوشش کرتی رہی کبھی کسی بچی کے روپ میں...... تو کبھی عروج بن کر......" جانتے ہو؟ عروج تو آٹھ سال سے انڈونیشیا میں مقیم ہے وہ تو یہاں کبھی آئی ہی نہیں......" چاندنی ہاشم کو تفصیل بتاتے ہوئے بولی جبکہ ہاشم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔
گاڑی اب سڑک پر دوڑنے لگی تھی بیک ویو مرر سے مناحل اور عرشان کی معصوم روحیں ہوا میں تحلیل ہوتی صاف نظر آرہی تھیں۔ رملہ نے خوف سے جھرجھری لے کر چاندنی کے عقب میں سر کرلیا تھا اور چاندنی نے اپنا نازک ہاتھ ہاشم کے ہاتھ پر رکھ کر اسے مضبوطی سے دبادیا۔

عشق ناگن

ایم الیاس

قسط نمبر:02

چاهت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جوکه پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی که دل کے هاتھوں مجبور اپنی خواهش کی تکمیل کے لئے بے شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے هوئے بھی خوشی محسوس کرتے هیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نهیں کرتے۔ یه حقیقت کهانی میں پوشیده هے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

پدما اس بات سے خوش ہو رہی تھی کہ اس کا جادو آکاش پر چل گیا۔

لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ محبت کے جادو پر دنیا کا کوئی بھی جادو نہیں چل سکتا تھا اور نہ چلا تھا۔

پدما دیکھتی رہ گئی۔ آکاش نے اپنا کٹورہ ہونٹوں سے لگالیا۔ اس کا منتر اور جادو محبت کے جادو کے آگے بے بس ہوگیا۔ آکاش ایک ہی سانس میں سارا دودھ پی گیا تھا۔

دوسرے لمحے وہ دونوں ہم آغوش ہوکر موت کی میٹھی نیند سو گئے۔

پدما ان دونوں کے سامنے کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف پرواز کرتی ہوئی آکاش کی آتما سے کہا۔

"آکاش......! تم نے عورت کا عشق دیکھا...... لیکن ایک ناگن کا عشق نہیں دیکھا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ اس دن جب تم دوسرا جنم لوگے...... چاہے ایک صدی کے بعد...... دو صدی کے بعد...... میرے دل میں حسرت رہ گئی تھی کہ میں تم پر مہربان ہوجاؤں...... تمہارے اگلے جنم میں اسے پوری کروں گی...... نیلم نے میری یہ خواہش پوری ہونے نہیں دی اور نہ تم نے میرے ارمان پورے کئے۔ میرے سینے میں محبت کی آگ بھڑکتی رہے گی۔

☆......☆......☆

ایک صدی کے بعد آکاش نے دوسرا جنم لیا۔ اتفاق ہی تھا کہ نیلم کو بھی دوسرا جنم نصیب ہوا تھا۔

یہ ایک نیا اور جدید دور تھا۔ ایک صدی میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ وقت تیزی سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ وقت جو کبھی رکتا نہیں...... کبھی تھمتا نہیں...... جو کسی کا نہیں ہوتا ہے۔

بنگال کی سرزمین پر ہر قسم کا جادو آج اور اب بھی موجود تھا۔ سانپوں کی دنیا بھی تھی۔ ان کے علامت بھی تھے۔ دیوتا ناگن بھی تھے...... ناگن مہارانیاں تھیں...... راج کمار تھے...... راج کماریاں تھیں۔ اژدھے تھے...... یہ بڑی خوف ناک اور خطرناک دنیا تھی۔ یہاں حسن و عشق بھی تھا...... حسد و رقابت بھی تھی...... یہ صدیوں سے آباد تھی۔ اس میں ہر قسم کے سانپ اور ان کی نسلیں بھی تھیں...... ان کی یہ دنیا جو صدیوں سے آباد تھی شہروں اور بستیوں سے بہت دور گھنے اور خوفناک جنگلوں سے دور اور ان میں بھی آباد

تھی۔ اس لئے ان موذی جانوروں نے بسالی تھی وہ انسان سے بہت ڈرتے بھی تھے۔ ان کے نزدیک انسان نہ بہت خطرناک بلکہ طاقت ور بھی تھا۔ انسان کے پاس ایسا مہلک ہتھیار جو تھا وہ ذہانت تھی...... ان کی اس ذہانت کے آگے ان جانوروں کا جادو بے بس اور بے اثر ہو جاتا تھا۔ انسان اپنی ذہانت سے فتح پالیتا تھا۔ اس لئے وہ انسانوں کی دنیا کا کم رخ کرتے تھے۔

نئے جنم میں آکاش نے رام دیال کے ہاں جنم لیا تھا جو ایک درمیانہ طبقے کے فرد تھے۔ وہ ایک پرائمری اسکول میں ماسٹر تھے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ آکاش ایک قابل ترین انسان بنے۔ وہ اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن اس کے اخراجات اٹھانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کی تنخواہ ہی کیا تھی۔ وہ دو ایک ٹیوشن سے گھر اور آکاش کے تعلیمی اخراجات اٹھاتے تھے۔ ان کی ساری توجہ آکاش کی تعلیم پر تھی۔ اس لئے اسے ایک اچھے اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ آکاش ان کی ایک ہی اولاد تھی۔

آکاش کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کے پتا جی اس کے تابناک مستقبل کے لئے کوشاں ہیں۔ اس لئے اس کا وقت بھی تعلیم پر توجہ دینے پر صرف ہوتا تھا۔ اس نے اپنے پتا جی کی لاج رکھی تھی۔ وہ کالج میں پہنچنے تک ہر کلاس میں اول آتا رہا۔ میٹرک میں اس نے پورے صوبے میں ٹاپ کر کے اپنے پتا جی کا نام روشن کیا تھا اور اپنے آپ کو ایک ہونہار طالب علم بھی۔

سینٹ ایمرسن کالج میں بڑے اور مال دار گھرانے کے لڑکے لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ آکاش دوسرے جنم میں بھی پہلے جنم کی طرح خوب صورت، وجیہہ، دراز قد اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ تصوراتی محبوب کی طرح...... اعلیٰ گھرانوں، حسین اور نوجوان لڑکیاں جو کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھیں آکاش کی سحر انگیز شخصیت پر اس کی اسیر تھیں۔ راتوں کو سپنوں میں اسے دیکھتیں اور رات کی تنہائیوں میں اس سے باتیں کرتی تھیں۔ اس کی توجہ اور التفات کی طالب تھیں۔

اس کے ایک اشارے پر اس پر مہربان ہونے کے لئے بے چین ہوتی تھیں۔

ان لڑکیوں کا حسن، جوانی، جسمانی نشیب و فراز اور دولت و امارات بھی اسے متاثر نہ کر سکی تھی۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ یہاں تعلیم حاصل کرنے اور مستقبل بنانے اور اپنے محنت کش ماں باپ کی تمنائیں پوری کرنے آیا ہے۔ یہ تعلیم گاہ ہے۔ مکتب عشق نہیں ہے۔ اس لئے اس نے اپنے آپ کو عشق، محبت کے دلدل میں گرنے سے سختی سے روک کے رکھا تھا۔ آخر وہ نوجوان تھا۔ جوانی اس پر ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ کسی بھی حسین سے حسین لڑکی کا جادو چل نہ سکا تھا۔ اسے بخوبی احساس تھا کہ جب یہ لڑکیاں اسے دیکھتی ہیں تو ان کے سینے دھک سے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سرد آہوں کا غبار بھر جاتا ہے۔

لڑکیاں جب کینٹین میں خالی پریڈ ہونے پر یا کالج کے سبزہ زار کے کسی گوشے میں بیٹھتی تھیں تو کھل کر اور بے حجابانہ گفتگو کرتی تھیں۔ کیوں کہ وہ آپس میں بے تکلف ہمجولیاں ہوتی تھیں۔

"آکاش...... کیا پتھر کا بنا ہوا مجسمہ ہے؟ وہ دیکھنا تک پسند نہیں کرتا ہے۔"

"اس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے...... وہ مائل نہیں ہوتا ہے۔"

"ہم کوئی بدصورت اور بے کشش نہیں ہیں۔ بوڑھی نہیں ہیں...... دوسرے لڑکے ہم پر مرتے ہیں۔ ہمارے عشق میں پاگل ہیں۔ ایک اشارے کے منتظر ہوتے ہیں۔"

"میں اسے اب تک پچاس عدد پریم بھرے خط لکھ چکی ہوں...... اور اب بھی اس امید پر لکھتی رہتی ہوں کہ اس کا جواب ضرور آئے گا۔ دن ڈوب جاتا ہے تو نا امید ہو جاتی ہوں...... میں نے کئی مرتبہ کہا بلکہ ہر خط میں لکھتی ہوں تم جواب تو دو...... تم صرف اتنا لکھ دو کہ میں نفرت کرتا ہوں...... تم آئندہ خط مت لکھنا...... میں بالکل بھی برا نہیں مانوں گی۔ تمہاری نفرت بھی میرے لئے محبت سے کم نہیں ہوگی۔ تمہارا جواب میرے لئے سرمایہ محبت ہوگا۔"

کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب رات میں سونے کے لئے بستر پر دراز ہوئی ہوں تو تصور میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ وہ میرے من کے دروازے پر دستک دے رہا ہے...... میں اسے اپنے پاس محسوس کرتی ہوں...... پھر ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے کان میں محبت بھرا رس گھول رہا ہے...... اس کی سانسیں میرے چہرے کو جھلسا رہی ہوں۔ پھر جانتی ہو کیا ہوتا ہے؟

"کیا ہوتا ہے......؟ کیا بہک جاتی ہو؟"

"وہ کمینی...... حرافہ...... آجاتی ہے اور میرے رنگین، حسین اور دل کو برما دینے والے لمحات کو تاخت و تاراج کر دیتی ہے۔"

"کون کمینی...... حرافہ......؟"

"نیند...... وہ آکر مجھے دبوچ کر اپنی آغوش میں لے کر مجھے اس سے جدا کر دیتی ہے۔"

"ہم دونوں سپنوں کی دنیا میں محبت بھری وادی میں دور بہت دور چلے جاتے ہیں۔ میں اس سے اظہار محبت کرتی ہوں اور ہم دونوں جذباتی ہو جاتے ہیں...... وہ کوئی محبت بھرا گیت گاتا ہے تو میں ناچنے لگتی ہوں۔ اسے میرا رقص بہت پسند آتا ہے۔ جب ہم دونوں ندی کنارے بیٹھ جاتے ہیں اور وہ میری کمر میں ہاتھ ڈال کر قریب کر لیتا ہے اور دل دھڑک اٹھتا ہے...... سانسیں بے قابو ہونے لگتی ہیں۔ پھر جانتی ہو کیا ہوتا ہے؟

"کیا ہوتا ہے......؟"

"سہانا سپنا بکھر جاتا ہے...... الارم بجنے سے بیدار ہو جاتی ہوں...... گھڑی دیکھتی ہوں۔ کالج جانے کا وقت ہو رہا ہوتا ہے۔ بھابھی رسوئی سے پکارتی ہے۔ کیا آج کالج نہیں جانا ہے؟"

"لیکن میرے سپنے میں تو آکاش آکر التجا بھرے لہجے میں کہتا ہے...... میرا دل...... میری آتما...... میری محبت...... تو کالج کی تمام لڑکیوں میں سب سے حسین ہے...... دوسری تمام لڑکیاں تیرے سامنے چڑیلیں لگتی ہیں...... میں تجھ سے بیاہ کروں گا...... تجھے رانی بناؤں گا...... میں تیرا غلام ہوں۔"

اس کی سہیلیاں اس پر ٹوٹ پڑتیں...... "کمینی...... تو خود تو چڑیل ہے۔ ہمیں چڑیل کہتی ہے۔"

آکاش کے ہم جماعت اور دوسرے دوست اور طالب علم لڑکے اس بات پر حیران ہوتے تھے کہ آکاش لڑکیوں میں نہ تو کوئی دلچسپی لیتا ہے اور ان کی انجانی دعوت نگاہوں اور خود سپردگی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کی ساری توجہ اور دلچسپی صرف کتابوں سے ہوتی ہے۔ یہ کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اگر وہ آکاش جیسی سحر انگیز شخصیت کے مالک ہوتے تو خوب فائدہ اٹھاتے۔ کھلونوں سے جی بھر کے کھیلتے۔

بنگال کی سرزمین رومانی تھی۔ لڑکیاں عورتیں، لڑکے مرد بھی یہاں کی فضا اور ماحول میں نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں۔ آغاز جوانی میں بہک جاتے تھے۔ فنون لطیفہ ان کی کمزوری تھا۔ رقص و موسیقی اور آرٹ بچپن سے ہی ان کی دلچسپی کا باعث بن جاتے...... سر سنگیت ان کی آتما کی غذا تھی۔

ایک روز نیلم نے کالج میں داخلہ لے کر قدم رکھا تو اس کے غیر معمولی حسن نے صرف لڑکوں کو ہی نہیں بلکہ لڑکیوں کو بھی دیوانہ بنا دیا تھا۔ بے حد متاثر کیا تھا۔ انہیں ایسا لگا تھا کہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی دیوی ہے۔ آسمان کے کسی دیوتا نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔

نیلم نے ایک درمیانے گھر میں دوسرا جنم لیا تھا۔ اس کے پتا جی اناج کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اصل حسن تو تعلیم میں ہے...... نیلم کو بھی بچپن سے ہی تعلیم سے دلچسپی تھی۔ نیلم میں پندار حسن نہیں تھا۔ ہر کسی سے ہنس کر بات کر لیتی تھی۔ اس میں بڑی سادگی تھی۔ وہ کالج میں بڑی سادگی سے آتی تھی اور ہر لباس میں اس کا حسن غضب ڈھاتا اور مردوں پر بجلی بن کر گرتا تھا۔

کالج میں بڑے گھرانوں کے جو لڑکے آتے تھے انہوں نے نیلم سے قریب ہونے، دوستی کے بہانے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ نیلم سیدھی سادی لڑکی ضرور تھی لیکن بچی نہ تھی۔ وہ سب کچھ خوب سمجھتی تھی۔ اچھے برے کی تمیز تھی۔ کالج کی لڑکیوں اور ہم جماعتوں سے کھلے دل سے ملتی اور تعلیم میں دلچسپی لیتی تھی۔

جس روز نیلم نے کالج میں قدم رکھا تھا۔ آکاش اپنے چاچی کے ساتھ بیس دنوں کے لئے آسام کے شہر شیلانگ گیا ہوا تھا۔ وہاں اس کے چچا رہتے تھے۔ ان کا دیہانت ہوگیا تھا۔ وہ پرسہ کے لئے گئے تھے۔ بیس دنوں کے بعد وہ واپس ہوئے تھے۔ جس روز وہ کالج گیا تو اس نے نیلم کو دیکھا...... نیلم نے اسے دیکھا۔ نظریں کیا ملیں دل مل گئے۔ روحوں کا جیسے ملاپ ہوگیا۔ دونوں لمحوں تک خود فراموشی کی حالت میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوگئے۔ انہیں ایسا لگا تھا کہ وہ جنم جنم کے ساتھی ہیں۔

نیلم نے آکاش کی بڑی تعریف سنی تھی کہ وہ لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ہے اور نہ ہی ان سے اس نے کبھی کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ جب کہ کتنی ساری لڑکیاں اسے پانے کے لئے ہر قسم کے جتن کر چکی تھیں۔ اور کر بھی رہی تھیں۔ کالج میں لڑکے لڑکیوں کا رومانس عام تھا۔ وہ بھٹکتے اور انجانی راہوں پر دور تک چلے جاتے تھے۔ ان کی تعلیم سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی تھی جتنی ہونا چاہئے تھی۔

اس نے آکاش کو ویسا ہی پایا تھا جیسے سنا تھا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے میں غیر محسوس انداز سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ جب وہ دونوں اپنے ہاں راتوں کو سونے کے لئے بستر پر دراز پاتے تو ایسا محسوس کرتے تھے کہ وہ قریب ہیں۔ قرب محسوس ہورہا ہے۔ ذات کا جزو بن گئے ہیں۔

ایک روز پدما کو کوبرا مادہ نے بتایا۔

''بسنتی پورے میں نے شیلانگ جاتے ہوئے بسنتی پور میں ایک نوجوان کو دیکھا۔ وہ اتنا خوب صورت تھا جتنا ایک صدی پہلے اسی بسنتی پور میں تھا۔ اس کا نام آکاش تھا۔ اس نے دوسرا جنم اسی بستی میں لیا ہے۔ تم نے بڑی کوشش کی تھی کہ اسے نیلم سے جدا کردو۔ اس کا خون پی کر اسے بھی اپنی نسل بنادو۔ پھر اس کے ساتھ زندگی گزارو...... لیکن نیلم کی محبت نے تمہیں غالب آنے نہیں دیا۔ ان دونوں نے زہر کھا کر تمہارے سپنے چکنا چور کردیئے۔ مجھے نیلم کا نہیں پتا...... صرف آکاش کے بارے میں معلوم ہوا۔ چوں کہ میں بچوں کو جنم دینے والی تھی۔ اس لئے بسنتی پور میں ایک دن سے زیادہ رک نہ سکی اور یہاں چلی آئی۔

آکاش نے دوسرا جنم لے لیا ہے......؟'' پدما نے حیرت اور خوشی سے سنا۔ پھر وہ بسنتی پور چلی آئی۔

اس نے یہاں آکر آکاش کو دیکھا تو دل تھام لیا۔ ایک صدی سے وہ آکاش کے فراق کی آگ میں جل رہی تھی۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس ایک صدی میں اس نے کسی کو اپنایا نہیں تھا۔ صرف وقت گزاری کی تھی۔ اسے وہ محبت کا نام دیتی نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں جتنی بھی نسل کے سانپ آئے تھے وہ اس کا دل جیت نہ سکے تھے۔ اس کے پاس ایسا جادو اور شکتی تھی کہ وہ اس کے بل بوتے پر آکاش کو اپنا بنا کر اپنی دنیا میں لے جانے کا تہیہ کرلیا جاتا۔

لیکن وہ یہ دیکھ کر حسد و رقابت کی آگ میں جل گئی نیلم بھی جنم لے چکی تھی۔ وہ دونوں اس جنم میں صرف ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔ دونوں ایک کالج میں زیر تعلیم ہیں اور ہم جماعت بھی ہیں۔ یہ جلتی پر تیل گرادینے کے مترادف تھا۔ اور پھر نیلم آج بھی اتنی حسین اور پرکشش تھی جتنی ماضی میں تھی۔

اسے صرف آکاش کے چند قطرے خون کی ضرورت تھی۔ ماضی کی طرح...... تاکہ اسے اپنی نسل کا بنا کر اپنی دنیا میں لے جائے...... اسے اتنا آسان نہیں تھا تو اتنا مشکل بھی نہ تھا...... اس نے دیکھا۔ محسوس کیا۔ اور پھر کہا کہ آکاش پر کسی نوجوان اور حسین سے حسین تر لڑکی کا جادو چلتا نہیں تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ دیکھا تھا نہایت حسین اور خوب صورت کی لڑکیوں نے آکاش کو میلا کرنے اور اس پر مہربان ہونے کی کوشش کی لیکن آکاش نے بری طرح جھڑک دیا اور ان کے جمال کی گرفت سے نکل گیا۔ اس کی جگہ کوئی بھی کیسا ہی پارسا لڑکا یا مرد ہوتا تو اس سحر سے نکل نہیں پاتا۔

ماضی میں بھی آکاش اپنی بیوی نیلم کے سوا کسی اور عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ اس کے لئے حیرت کی بات بھی تھی کہ اپنے اس دوسرے جنم میں بھی وہ آج بھی ماضی کی طرح تھا۔

پدما نے سوچا کہ اسے جلد بازی اور عجلت سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ کالج کی لڑکیوں میں نیلم جیسی حسین، پرکشش اور ہیجان خیز لڑکی کوئی نہیں ہے۔ وہ اس سے کہیں حسین اور جاذبیت سے بھرپور بن کر آکاش پر جادو چلا سکتی ہے۔ وہ آکاش کو ایسا اسیر بنالے گی کہ جذبات کی رو اور افراتفری میں آکاش کے چند قطرے خون پی کر اور آکاش کے خون میں اپنا زہر سرایت کردے گی۔

ایک روز آکاش سہ پہر کے وقت موہن نگر جارہا تھا اس کے چاچی نے اسے ایک دوست کے پاس بھیجا تھا۔ بسنتی پور کے شمال میں اور ایک کوس کے فاصلے پر ایک جھیل تھی۔ جو گھنے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ اس جھیل پر اس کی بستی کی لڑکیاں عورتیں سخت گرمی میں نہانے اور کپڑے دھونے کے لئے آجاتی تھیں۔ وہ یہاں بڑی آزادی، سکون اور اطمینان سے نہاتی بھی تھیں۔ اس لئے مرد ایسے وقت وہاں سے گزرنے سے اجتناب کرتے تھے۔

وہ چلتے چلتے ٹھٹک کے رک گیا۔

اس نے جو کچھ دیکھا اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ نیلم جھیل میں بڑی آزادی، سکون اور اطمینان سے نہارہی تھی۔ اس کے سارے بدن پر ایک سنسنی بجلی کی رو کی طرح دوڑ گئی۔ اس نے کبھی نیلم کو اس بے حجابی کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ سوچنا تو درکنار تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

یہ نظارہ ایسا دلکش اور کیف و سرور لیا ہوا تھا کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوگیا۔ نیلم پانی سے نکل کر کنارے آکھڑی ہوئی اور فضا میں اپنی بانہیں پھیلادیں۔ پھر اس نے رسیلی آواز میں کہا۔

''آکاش! اس طرح مجھے کیا گھور رہے ہو...... آجاؤ...... ہم دونوں مل کر نہاتے ہیں...... یہاں ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہے...... ایسا سنہرا موقع پھر کبھی نصیب نہیں ہوگا۔''

آکاش ساکت و جامد اور بے حس سا کھڑا نیلم کو دیکھے جارہا تھا۔ نیلم کی دعوت نے اسے چونکا دیا۔ آخر وہ مرد تھا۔ برف کا تودہ نہیں تھا...... وہ سحر زدہ انداز میں اسے دیکھتا ہوا بڑھا۔ اسے ایک زبردست ٹھوکر لگی۔ یہ ایک بڑا سا پتھر تھا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ اس کے پیر کا انگوٹھا زخمی ہوگیا تھا۔ اس میں سے خون رس کر مٹی میں جذب ہورہا تھا۔ اسے ایک دم سے ہوش آگیا۔ درد کی ٹیس سی اٹھی۔

اس نے ایک دم سے چونک کر نیلم کو دیکھا جو کنارے سے اسے دانستہ نظروں سے دیکھتی ہوئی تھرکتی، لچکتی، اور لہراتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خود سپردگی کی سرکی تھی۔ پھر وہ تیزی سے پلٹا اور سڑک کی طرف لپک گیا۔ نیلم اسے آوازیں دیتی رہی۔ لیکن وہ رکا نہیں...... پھر وہ چند لمحوں میں نیلم کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

آکاش کو یقین نہیں آیا تھا کہ نیلم اس قدر بے حجاب ہوسکتی ہے...... اتنی گری ہوئی، گھٹیا...... آخر اس میں اور ایک بازاری عورت میں فرق ہی کیا رہا۔ اس کا نفرت اور غصے سے برا حال ہونے لگا۔

پدما اپنی شکست اور ذلت پر بری طرح جھن جھلاگئی۔ اس کا طلسم ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگیا تھا۔ اگر آکاش زخمی نہ ہوتا اور خون نہ بہتا تو اس کا جادو چل جاتا...... خون کا بہہ جانا اس نے پدما کا جادو بے اثر کردیا

تھا۔ اگر آکاش زخمی نہ ہوا ہوتا تو آج کامیابی اس کے قدم چوم لیتی۔

آکاش رات سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو اس کی نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جب سے نیلم کالج میں آئی تھی تب سے راتوں کو نیند اسے بڑی دیر سے آتی تھی۔ وہ رات دیر تک جاگتا اور چشم تصور میں نیلم کو دیکھتا اور اس سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ اسے نیلم سے دیوانگی کی حد تک محبت ہوگئی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ نیلم بھی اسے بے پناہ محبت کرنے لگی ہے۔ گو کہ زبان سے اقرار نہ ہوا تھا۔ لیکن زبان کے اقرار سے کیا۔ نگاہوں کی زبان نے تو اقرار کرلیا تھا۔ نگاہوں کی زبان جو کہتی تھی وہ ہونٹوں کی زبان گھنٹوں میں بھی حال دل نہیں کہہ سکتی تھی۔

آج اس کے دل میں نیلم کی محبت کی جگہ نفرت کسی سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ نیلم کا توبہ شکن جسم اسے غلاظت کے دلدل میں گرا نہ سکے تھے۔ ٹھوکر لگنے سے قبل وہ نیلم کو فطری حالت میں دیکھ کر خود پر قابو نہ پاسکا تھا اور سحر زدہ سا لپکا تھا کہ جذبات کی رو میں بہہ جائے۔ جانے اسے کیا ہوگیا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آسکی تھی کہ ٹھوکر لگتے ہی اسے کیسے ہوش آگیا۔ ورنہ وہ غلاظت کے دلدل میں گر جاتا۔ اور نیلم کے بجلی بھرے بدن کا فسوں صرف لمحہ میں اتر گیا تھا۔ یہ اسرار اور معمہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

اسے ایک طرف خوشی تھی کہ وہ آلودہ ہونے سے بچ گیا۔ دوسری طرف اسے اس بات کا دکھ تھا کہ نیلم نے ایسی حرکت کیوں کی؟...... نیلم نے محبت کو میلا کردیا تھا...... تاخت و تاراج کردیا تھا...... اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اس قدر گر بھی سکتی ہے؟ وہ اس کے خاندان کو جانتا تھا جو بڑا باعزت تھا۔

وہ ان سوچوں میں غرق تھا۔ آج چودھویں کا چاند آسمان کے صاف و شفاف سینے پر جگمگا رہا تھا۔ اس کی دودھیا چاندنی کا منجمد دریا پورے ماحول اور فضا پر چھایا ہوا تھا۔ چاند مسکراتا ہوا اس کے کمرے کی کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ اس کے کمرے میں دودھیا کرنیں بکھری ہوئی تھیں۔ پھر اس نے یک لخت محسوس کیا کہ سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک اسے معطر کررہی ہے...... پھر اس نے قرب میں ایک دہکتا آتش فشاں محسوس کیا۔ پھر اس نے ایک کیف لمس سا محسوس کیا جس میں بڑا گداز تھا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی بستر پر اس کے پہلو میں دراز ہے۔ پھر اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

اس نے دیکھا کہ نیلم اس کے پہلو میں دراز ہے اور اسے مستی بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

”نیلم......! تم......؟“ آکاش کو جیسے یقین نہ آیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ نیلم نے فوراً درمیان میں کہا۔

”مجھے دل پر اختیار نہ رہا تو میں...... من کے ہاتھوں بے بس ہوکر چلی آئی...... تم جانتے ہو کہ......“

آکاش نے فوراً ہی اس کی بات کاٹی اور تیز لہجے میں بولا۔

”اتنی دور سے اور اتنی رات گئے......؟“

”تم بڑے کٹھور ہو آکاش...... من بڑا پاپی ہوتا ہے...... جب ایک عورت محبت کے راستے پر قدم رکھتی ہے تو وہ کچھ نہیں دیکھتی ہے...... کسی بات کی چنتا اور پرواہ نہیں کرتی ہے۔“

”سنو نیلم......!“ آکاش نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔ ”آج سہ پہر تم نے کتنی نیچ اور گھٹیا حرکت کی...... ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوتے ہوئے...... ایسی حرکت شاید ایک بازاری عورت بھی نہیں کرسکتی...... میرے دل میں تمہارے لئے جو عزت اور محبت تھی اس واقعہ نے نفرت پیدا کردی...... اب تم میری نظروں میں دو کوڑی کی بھی نہیں رہی...... جاؤ...... نکل جاؤ...... میری نظروں کے سامنے سے دفع ہوجاؤ......“

”میری بات تو سنو آکاش......!“ اس نے آکاش کا ہاتھ تھام لیا جو اسے بستر سے گرادینا چاہتا تھا۔ ”جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اس میں میرا کوئی دوش نہیں ہے...... میں نردوش ہوں۔ سارا قصور تو میری منہ زور جوانی کا ہے...... تم ناراض نہ ہو۔ تمہارے دل میں سہ پہر کے واقعہ سے جو نفرت جنم لے چکی ہے...... جو غصہ آرہا ہے...... اسے تھوک دو...... دیکھو آج کی رات پونم کی رات ہے...... کتنی حسین ہے...... سہانی ہے...... آؤ...... ہم دونوں اس رات کو امر کرکے خوشی مناتے ہیں۔ دیکھو ایسی رات شاید ہی پھر کبھی آئے...... اور پھر میں تمہیں اتنا خوش......“

نیلم نے اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ آکاش نے اس کے ہاتھوں کی گرفت سے اپنے ہاتھ چھڑا لئے...... پھر اسے بستر پر سے اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ فرش پر گری اور لڑھکتی ہوئی چند قدم دور جا گری۔

اس کے سنبھلنے سے پہلے وہ ہڑبڑا کر بستر سے نکل آیا۔ اس کا خیال تھا کہ نیلم اپنی یہ بے عزتی اور تذلیل برداشت نہیں کرپائے گی۔ غضب ناک ہوجائے گی۔ اس سلوک پر نفرت اور غصے کا سلوک کرے گی۔

لیکن یہ دیکھ کر آکاش کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بجائے نفرت اور غصے کے وہ دل کش انداز سے مسکرا رہی ہے۔ وہ سنبھل کر دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنا ہاتھ لباس کی طرف بڑھایا تاکہ بے لباس کردے۔

الماری پر ایک اسپرے بوتل تھی، جس میں تیزاب بھرا ہوا تھا۔ اس لئے کہ کبھی بھی سانپ، ناگن یا ناگ وغیرہ گھس آئے تو اس پر تیزاب اسپرے کردیا جائے۔ اس طرح اس کے گھر والے ایک ڈیڑھ برس کے عرصہ میں دو تین سیاہ اور کوبرا سانپ کو بھگا چکے تھے اور مار بھی چکے تھے۔ آکاش نے بوتل اٹھالی اور کرخت لہجے میں کہا۔

”نیلم......! تمہارے جسم کا جادو مجھ پر چلنے سے رہا...... بہتر ہے تم اپنے گھر جاؤ...... اگر تم نے اپنے آپ کو بے لباس کردیا تو میں تم پر تیزاب کا اسپرے کردوں گا۔ اس اسپرے بوتل میں تیزاب بھرا ہوا ہے۔“

نیلم یہ سنتے ہی اس قدر دہشت زدہ ہوئی اور پھر خائف اور سراسیمہ ہوئی کہ کمرے سے تیر کی مانند نکل گئی۔

آکاش نے فوراً ہی لپک کر دروازہ بند کیا اور کھڑکی بھی...... کھڑکی اتنی بڑی تھی کہ دو آدمی بیک وقت اس راستے سے اندر آسکتے تھے۔ پھر وہ بستر پر آکر لیٹا تو اسے بڑا سکون اور اطمینان سا ملا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا کہ وہ آلودہ ہونے سے بچ گیا۔ اگر وہ غلاظت کے دلدل میں گر جاتا تو کتنی شرم کی بات ہوتی اور اس کے وجود پر کلنک کا ٹیکہ لگ جاتا۔ اپنی نظروں میں گر جاتا۔ ذلیل ہوجاتا۔

☆......☆......☆

پدما اپنے ٹھکانے پر آئی تو اس کا غصے سے برا حال تھا۔ آج اس نے جو آکاش پر وار کیا تھا وہ بھی خالی گیا تھا۔ ماضی میں بھی وہ ناکام ہوتی رہی تھی۔ اگر تیزاب سے بھری اسپرے بوتل نہ ہوتی آج وہ کامیاب ہوجاتی...... کیوں کہ اس نے اپنے آپ کو ایسا شعلہ بدن بنایا ہوا تھا کہ آکاش بچ نہ پاتا۔ وہ اسے اپنا جلوہ دکھا کر مسحور کردیتی۔ وہ اپنے مقصد اور منصوبے میں کامیاب ہوجاتی۔

”آکاش......!“ اس نے بڑے جذباتی لہجے میں چشم تصور میں اسے مخاطب کیا...... ”یہ کسی عورت کا نہیں بلکہ ایک ناگن کا عشق ہے...... ایک ایسی ناگن کا جو پراسرار قوتوں کی مالک ہے...... ہر قسم کا جادو جانتی ہے...... ہر قسم کا بہروپ بھر سکتی ہے...... میں تمہیں ایک صدی سے چاہتی ہوں۔ میں ناگ دیوتا سے آشیرواد لے کر آئی ہوں۔ میں نہ تو ناامید ہوئی ہوں اور نہ ہی میں نے حوصلہ ہارا ہے...... میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کرکے اپنا کر اپنی دنیا میں لے جاؤں گی۔ ہم صدیوں تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔“

پدما کو اس بات پر نہ صرف حیرت تھی بلکہ دکھ اور غصہ تھا کہ آکاش اس کے حسن کے جال میں نہیں آیا۔

اس نے نیلم کا بہروپ اس لئے بھرا تھا کہ وہ نیلم سے محبت کرتا تھا۔ ماضی میں جیسی محبت آج بھی کرتا تھا۔ ان کی محبت امر تھی۔ اور پھر وہ مرد تھا۔ کوئی پتھر نہیں تھا۔ مٹی کا تودہ نہیں تھا۔ مرد کی ذات کیسی ہی پوتر کیوں نہ ہو۔ عورت کا جسم اور حسن کی کرشمہ سازیاں ایسی ہوتی تھیں کہ مرد کا پیر پھسل جاتا تھا۔ وہ اب تک جانے کتنے مردوں کو اپنے بدن کے جادو کے جال میں جکڑ کر ان کا خون پینے کے لئے ان پر مہربان ہوئی اور انہیں ڈس لیا تھا۔ لیکن آکاش پر اس کے بدن اور خوبصورتی کا جادو نہیں چل سکا۔

پھر وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی کہ اسے کوئی اور تدبیر کرنا ہوگی۔ کیوں کہ آکاش کی محبت اور پارسائی کا جادو ایسا زبردست ہے کہ اس کا جادو، منتر اور پراسرار طاقت اور کوئی بھی بہروپ کام نہیں دیتا ہے۔

☆......☆......☆

آکاش نے کالج جاتے ہوئے فیصلہ کرلیا تھا کہ آج وہ نیلم کی خبر لے گا۔ آڑے ہاتھوں لے گا۔ بے عزت اور ذلیل کرے گا۔ یہ بات ناقابل فہم اور تعجب خیز اور صدمے کی بات تھی کہ کالج میں جو لڑکیاں زیر تعلیم تھیں وہ ایسے بھڑکیلے ملبوسات میں آتی تھیں کہ لڑکے اور سرراہ گزرنے والے مرد متوجہ ہوں۔ ان کے جسموں اور نشیب و فراز کی نمائش ہوتی تھی۔ انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی۔ پورے کالج میں صرف نیلم ایک واحد ایسی لڑکی تھی کہ اس کے لباس سے جسم ڈھکا چھپا رہتا تھا۔ وہ پورے آستینوں کا بلاؤز پہنتی تھی۔ اس کا گلا بھی فراز کی نمائش نہیں کرتا تھا۔ لیکن کل ایک ایسی لڑکی کا بہکنا، جانور کی حالت میں نظر آنا حیرت کی اور صدمے کی بھی بات تھی۔

آکاش کو کالج میں نیلم کہیں دکھائی نہیں دی۔ وہ سمجھ گیا کہ نیلم ذلت اور شرمساری کے باعث نہیں آئی۔ اسے شاید پچھتاوا ہوا ہے...... جب وہ لائبریری میں نوٹس تیار کرنے کی غرض سے گیا تو اس نے نیلم کو لکھنے کی بڑی سی میز پر بیٹھی ایک کتاب کی مدد سے نوٹس تیار کررہی ہے۔ اس وقت وہ صرف اکیلی تھی۔ ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ ان کا پریڈ بھی خالی تھا۔ ان کی ہم جماعت لڑکیاں لڑکے کینٹین اور لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔

آہٹ سن کر نیلم نے اپنا سر اٹھا کر دیکھا اور کسی انجانے خیال سے گلابی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ اس کی حیا آلود لانبی لانبی پلکیں اس کی بڑی بڑی خوب صورت سیاہ آنکھوں پر سایہ کیے ہوئی تھیں۔ نیلم اسے دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر اس نے آکاش کو بڑے مودبانہ انداز سے پرنام کیا۔

آکاش نے لمحہ بھر کے لئے سوچا کہ اس حسین چہرے کے پیچھے کیا مکروہ اور گھناؤنا چہرہ چھپا ہوا ہے۔ کوئی یقین نہیں کرسکتا اس نے نفرت حقارت اور غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے پرنام کا جواب نہیں دیا۔

نیلم آکاش کے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں میں نفرت و حقارت کو محسوس کرکے اس کے دل پر چابک سی لگی اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور سفید پڑتا چلا گیا۔ اس نے سوچا۔ ”آکاش صاحب کو کیا ہوگیا ہے......؟ وہ کل تک بالکل صحیح تھے۔ اس سے بہت کڑوی طرح ملے اور ایک نوٹس کے بارے میں گفتگو کرتے اور ٹپس بھی دیتے رہے۔ لیکن آج ان کا رویہ اس قدر سرد اور سفاک کیوں اور کس لئے......؟ اس سے کیا تصور ہوتا ہے۔“ اس سے رہا نہ گیا۔ وہ آکاش کے پاس جاکر بولی۔

”آکاش صاحب...... کیا مجھ سے ایسی حرکت اور کوئی غلطی سرزد ہوگئی جس سے آپ مجھ سے سخت ناراض لگتے ہیں۔ اگر مجھ سے نادانستگی میں کوئی غلطی ہوگئی ہے تو شما کردیجئے گا۔“

”جی ہاں......“ آکاش برافروختہ ہوگیا۔ ”مجھے آپ جیسی لڑکی سے ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی کہ ایسی نیچ، قبیح اور گھناؤنی حرکت کرسکتی ہیں...... آپ کے متعلق سوچ سوچ کر میں حیران ہوتا رہا۔ دکھ اور اذیت سے

ساری رات سو نہ سکا۔“

”کیا حرکت کی میں نے......؟“ نیلم ششدر ہوکر بولی۔

آکاش نے مختصر الفاظ میں کل کے سہ پہر کا اور رات کا واقعہ سنا دیا۔

”کیا......؟“ نیلم بھونچکی سی ہوگئی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس پر کوئی بجلی سی آگری ہو۔ وہ چند ساعتوں تک بت بنی رہی اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ پھر وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آکاش صاحب! کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ وہ میں ہوسکتی ہوں......؟ کیا معلوم وہ کوئی ایسی لڑکی ہو جس میں میری شباہت ہو جس نے مجھے رسوا کرنے اور آپ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو......“

”میں بھگوان کی سوگندھ کھانے کو تیار ہوں کہ وہ آپ ہی تھیں...... اتنی شباہت جیسے جڑواں ہوں...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... کیا آپ کی کوئی جڑواں بہن ہے......؟“ نیلم نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آپ جھوٹ مت بولیں۔ مجھے بے وقوف نہ بنائیں...... دھوکا نہ دیں۔“

”مجھے اس کی کیا ضرورت پڑی کہ میں جھوٹ بولوں۔“ نیلم کہنے لگی۔ ”میں کوئی بدچلن اور آوارہ لڑکی نہیں ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ کل میں اور نرملا میری کزن بھی ہے۔ دو پیریڈ پہلے گھر چلی گئیں۔ اس لئے کہ خاندان کی ایک لڑکی کی شادی بیاہ کی تقریب میں شرکت کرنے جانا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھاتے ہی دونوں گھر سے نکل گئے۔ راستے میں واپسی میں بس خراب ہوگئی تھی۔ جب ہم گھر پہنچے تو پو پھٹ رہی تھی...... میری بات کا یقین نہیں تو میرے والدین بلکہ نرملا اور اس کے گھر والوں سے دریافت کرلیں۔ بس ڈرائیور شیام بابو سے دریافت کرلیں جو آپ کے محلے میں رہتے ہیں۔ وہ سب جھوٹ بولنے سے رہے......“ نیلم نے ایسے ٹھوس ثبوت اور گواہ پیش کیے تھے وہ جھٹلانے سے رہا تھا۔

نیلم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو آکاش کا دل پسیج گیا۔ نیلم زردوش تھی۔ نیلم کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ تڑپ سا گیا۔ اس نے بے اختیار نیلم کو بازوؤں میں بھر کر سینے میں جذب کرلیا۔ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔

”نیلم......! تم جانتی ہو کہ کتنی لڑکیاں عورتیں میرے حصول کی دیوانی ہیں۔ میرے سپنے دیکھتی ہیں۔ ان میں سے کسی لڑکی نے تمہارا بہروپ بھرا ہوگا تاکہ مجھ پر مہربان ہوجائے اور تمہیں رسوا اور بدنام کردے...... تم مجھے معاف کردو نیلم......! میں صرف اور صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔ ہماری محبت پر آنچ نہیں آسکتی اور نہ ہی کوئی عورت مجھے آلودہ کردے...... آج سے ہم دونوں کو ہوشیار اور چوکنا رہنا ہوگا۔“

یہ کہہ کر آکاش نے اسے مطمئن کردیا۔

جب وہ سونے کے لئے رات کے وقت بستر پر دراز ہوا تو اس کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس نے بس کے ڈرائیور شیام بابو سے تصدیق کرلی تھی۔ وہ بس میں نیلم اور نرملا کے گھر والوں کو دو بجے دوپہر شادی کی تقریب میں لے گیا تھا۔ اس وقت واپسی ہوئی تھی جب پو پھٹ رہی تھی۔

آکاش کو اس بات کی حیرانی تھی کہ اس نے کبھی بھی بستی میں نیلم سے مشابہت رکھنے والی کوئی لڑکی یا عورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ کون لڑکی تھی......؟ اس کا کھوج لگانا چاہیے۔ اگر وہ آئی تو اس سے پریم جتا کر کسی نہ کسی حیلے بہانے سے معلوم کرلے گا کہ وہ کون ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟ پھر اسے ایک خیال آیا کہ کہیں یہ کسی ناٹک کمپنی کی تو نہیں ہے؟ اس کے اداکار ہر کسی بہروپ بھرنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ نظریں دھوکا کھا جاتی ہیں۔

وہ یہ سب کچھ سوچتے سوچتے گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ اس نے ایک عجیب و غریب سپنا دیکھا۔ ایک صدی قبل کا اس نے سپنا دیکھا۔ اس سپنے میں نیلم، پدمانا گن اور وہ تھا۔ پدمانا گن اس کے حصول کے لئے بہت سارے کھیل کھیل رہی تھی۔ نیلم اور اس نے پدما سے نجات پانے کے لئے زہر سے بھرا دودھ پی

لیا تھا تا کہ پرلوک میں ان کی آتمائیں شانتی سے رہیں۔

آکاش صبح بیدار ہونے کے بعد کالج جانے سے پہلے بستی کے ایک کاہن کے پاس گیا اور اس سے اپنا سپنا بیان کیا۔ کاہن نے ایک زائچہ بنانے کے بعد اسے بتایا کہاس نے جو سپنا دیکھا وہ واقعی ایک صدی قبل کا ہے۔ اور سچا سپنا ہے۔ پدما کے علم میں یہ بات آ گئی کہ تم اور نیلم دوسرا جنم لے چکے ہو۔ اس لئے وہ تمہارے حصول کے لئے آ چکی ہے۔ تالاب اور رات کے وقت وہ نیلم کے بہروپ میں آئی تھی تا کہ تمہارا خون پی کر اور اپنا خون تمہاری رگوں اور خون میں سرایت کر کے تمہیں سانپ اور اپنی نسل میں شامل کر لے۔ وہ جب تک تمہارا زہر نہیں چٹتی اس وقت تک اس کا کوئی منتر اور جادو تم پر نہیں چل سکے گا۔ پدما نہ صرف پراسرار قوتوں، ہر قسم کے جادو منتروں اور ہر جاندار کا بہروپ بھر سکتی ہے...... اب وہ ماضی سے کہیں خطرناک اور زہریلی ناگن بن گئی۔ اب وہ نیلم سے زیادہ تمہیں اپنانے کے لئے جتن کرے گی۔ لیکن نیلم کو پھر بھی ہوشیار اور محتاط رہنا ہوگا۔

آکاش کالج پہنچا تو اسی وقت نیلم بھی اسے دور سے آتی دکھائی دی۔ نیلم اس وقت بہت خوش اور سرشار سی دکھائی دیتی تھی۔ اس لئے کہ کل اس پر آشکارا ہوا تھا کہ آکاش اس سے سچے دل سے محبت کرتا ہے۔ ان دونوں نے اقرار محبت بھی کیا تھا۔ وہ ساری رات اس لئے نہیں سوئی تھی کہ اسے آکاش مل گیا تھا۔ اور آکاش کی غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ وہ آکاش کو دیکھ کر کسی دلہن کی طرح سرخ ہوئی جا رہی تھی۔

پیریڈ کے شروع ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ لڑکے لڑکیاں جو فرصت اوقات میں سبزہ زار یا کینٹین میں جاتے تھے۔ شاذ و نادر ہی اس وقت کوئی لائبریری جاتا تھا۔ آکاش نے اسے غیر محسوس انداز سے لائبریری میں ملنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ عقبی حصے سے لائبریری کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ نیلم اس کمرے میں جس میں کتابوں سے بھری الماریاں رکھی تھیں وہاں اس کی منتظر تھی۔

آکاش نے جب اسے رات کے سپنے اور کاہن کے بارے میں بتایا کہ ان دونوں کا یہ دوسرا جنم ہے۔ سو برس قبل پہلے جنم میں وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ انہی میں وہ دونوں ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ اس پر ایک ناگن عاشق ہو گئی۔ جب آکاش اسے ساری رام کہانی سنا چکا تو نیلم نے اسے بتایا کہ رات اس نے بھی یہی سپنا دیکھا تھا۔

آکاش نے اسے بتایا کہ ناگن پھر اس کے حصول کے لئے آ گئی ہے۔ دو دن پہلے جنگل پر اور رات کے وقت وہ اس کا بہروپ بھر کر آئی تھی تا کہ وہ بہک جائے اور اس سے فائدہ اٹھا کر اس کا خون پی کر اپنا زہر اس کے شریر میں سرایت کر دے۔

وہ دونوں خوشی سے جذباتی ہو گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد نیلم نے کہا۔

”آکاش......! ہم دونوں کا پریم سچا تھا...... ایشور نے ہم دونوں کو اسی لئے ایک صدی بعد دوسرا جنم دے کر ملا دیا۔ ایشور نے کتنی بڑی دیا کی...... ہمیں پدما ناگن سے ہوشیار رہنا ہوگا۔“

”تم چنتا نہ کرو نیلم!“ آکاش نے اسے دلاسا دیا، پہلے کی صدی اور آج کی صدی میں بڑا فرق ہے۔ میں ایسی تدبیر کروں گا کہ وہ مر جائے۔ کسی قیمت پر زندہ نہ بچ جائے۔“

”وہ میری بھی تو بدترین دشمن ہے۔“ نیلم نے فکرمندی سے کہا۔

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔“

”وہ کیا......؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”ہم دونوں شادی کر لیتے ہیں۔“ آکاش نے جواب دیا۔

”شادی......؟“ نیلم سرخ ہو گئی۔

وہ اتنی پیاری لگی کہ آکاش اپنے جذبات پر قابو

نہ پا سکا۔ اس نے بے اختیار اسے چوم لیا۔

”ہاں۔“ چند لمحوں کے بعد آکاش نے جواب دیا۔ ”اس کا یہی حل ہے اور اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”وہ یہ بات برداشت نہیں کرے گی۔ حسد و جلن اور رقابت سے واپس چلی جائے گی۔“ آکاش نے کہا۔

”کیا ہمارے گھر والے شادی کرنے پر تیار ہو جائیں گے؟“ نیلم نے لجاتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں نہیں......؟“ آکاش نے جواب دیا۔ ”تمہارے گھر والوں کو مجھ سے اچھا داماد...... اور ہمارے گھر والوں کو ایسی چاندی بہو ملنے سے رہی۔ اس دنیا میں ہم سے اچھا جوڑ کوئی نہیں ہو سکتا......“

”لیکن ہمارے گھر والے چاہتے ہیں کہ ہم اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔“ نیلم بولی۔

”ہاں......“ آکاش نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں یہ تجویز دوں گا کہ ہم دونوں شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم جاری رکھیں گے۔ کچھ دنوں بعد میں والدین کا موڈ دیکھ کر ان سے کہتا ہوں کہ وہ میرا رشتہ لے کر تمہارے ہاں جائیں۔ وہ خوشی خوشی تیار ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ تمہارے حسن کا چرچا ہر سو پھیلا ہوا ہے۔ میری ماں جی بھی تمہیں دیکھ چکی ہیں۔ مجھ سے کئی بار کہا ہے کہ میں بہو بناؤں گی تو صرف اور صرف نیلم کو......“

”کیا یہ بات کسی کو بتائی جائے کہ ہم دونوں کا یہ دوسرا جنم ہے۔ پہلے جنم میں ہم دونوں میاں بیوی تھے؟“ نیلم نے کہا۔

آکاش اس کی معصومانہ بات سن کر ہنس پڑا۔ پھر وہ پیار سے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

”یہ حماقت مت کرنا...... اس بات کا تمہارے گھر والے یقین کریں گے اور نہ میرے گھر والے...... یہ راز صرف ہم دونوں کے درمیان رہے گا...... کوئی اور سنے گا تو اس بات کا مذاق اڑائے گا۔ ہم دونوں مذاق بن جائیں گے...... اور پھر کوئی ضرورت نہیں کہ ہم کسی کو ہم راز بنائیں۔“

کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے ہیں۔ کالج میں ان کی محبت اور عشق کے چرچے ہونے لگے۔ کتنی ساری لڑکیوں کے سینوں پر حسد و رشک سے سانپ لوٹ گئے۔ وہ انگاروں پر لوٹنے لگیں۔ ان کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ ان میں ایک ہم جماعت مالنی تھی۔ وہ جتنی حسین تھی۔ اتنی ہی پرکشش بھی...... اسے اپنے حسن و شباب اور بدن کی رعنائیوں پر بڑا ناز و غرور تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ بہت سارے لڑکے اس کے دیوانے تھے۔ وہ ایک جاگیردار کی بیٹی تھی۔

اس نے آکاش پر بہت ڈورے ڈالے۔ لیکن اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایک روز اتفاق سے اس کی مڈ بھیڑ لائبریری میں آکاش سے ہو گئی۔ ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مالنی نے اس کے گلے میں اپنی مرمریں بانہیں حمائل کر کے اس کے چہرے پر جھک گئی۔ آکاش کے لئے اس کی یہ حرکت اچانک اور غیر متوقع تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مالنی جو ایک بڑے گھرانے کی لڑکی ہے اس سطح پر آ سکتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے اسے خیال آیا کہ کہیں پدما نے تو مالنی کا بہروپ نہ بھر رکھا ہو۔ جو بھی ہو وہ اپنے آپ کو من مانی کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے مالنی کی بانہوں سے اپنی گردن کو آزاد کیا اور اسے اتنی زور سے الگ کر کے ہٹایا کہ مالنی اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی وہ کرسیوں پر جا گری۔ اسے نہ صرف سر اور جسم پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ آکاش اسے بری طرح دھتکار دے گا۔ اس کی توہین کرے گا۔ لڑکے جو اس کے اشاروں پر اس کے قدموں میں کتوں کی طرح لوٹتے تھے لیکن آکاش اس کی بے عزتی کر گیا تھا۔

صرف مالنی ہی کو کیا بلکہ ہر کسی کے علم میں یہ بات تھی کہ آکاش اور نیلم ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ نیلم کالج کی سب سے حسین ترین لڑکی

تھی۔ اسے حسن بنگال کا خطاب بھی مل چکا تھا۔ اس کے باوجود مالنی اپنے آپ کو نہ صرف نیلم سے حسین بلکہ دنیا کی سب سے حسین لڑکی سمجھتی تھی۔ اس میں پندار حسن تھا۔

رات بہت دیر تک وہ سو نہ سکی۔ اس کے سینے میں نفرت، انتقام اور غصے کی آگ بھڑکتی رہی۔ صبح بیدار ہونے کے بعد وہ کالج نہیں گئی۔ دس بجے وہ نیلم کے ہاں پہنچی۔ گھر پر صرف نیلم کی ماں اکیلی تھی۔ وہ مالنی کو جانتی تھی۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے باپ کی بیٹی اس کے گھر پر کیوں اور کس لئے آئی ہے۔ نیلم کی ماں نے بڑے تپاک سے اسے لے جاکر بیٹھایا اور بولی۔

"آج آپ نے اتنی عزت کیسے بخشی......؟ مجھے سپنا لگ رہا ہے۔"

"میں اس لئے آئی ہوں کہ اس گھر کا بھلا چاہتی ہوں۔" مالنی نے جواب دیا۔ "آپ کو میری آمد اور گفتگو کا راز رکھنا ہوگا ورنہ آپ اور آپ کی بیٹی عزت سے محروم ہوجائیں گی۔"

نیلم کی ماں سرسوتی اس کی یہ بات سن کر بڑے زور سے چونکی۔ "آپ اطمینان رکھیں۔ میں کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔"

"نیلم سے بھی نہیں......" وہ کہنے لگیں۔ "آپ آکاش کو جانتی ہوں گی؟" نیلم کی ماں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "آکاش ایک نمبری اوباش قسم کا ہے۔ اس نے اپنی خوب صورتی اور مردانہ وجاہت سے فائدہ اٹھا کر اور معصوم لڑکیوں کو محبت کا فریب اور شادی کی آس دلا کر ان کی عزت داغ دار کرچکا ہے اور اب اس نے نیلم کو پھانس لیا ہے...... میں نے کل ان دونوں کو لائبریری کے ریڈنگ روم میں غلاظت میں دیکھا...... معلوم نہیں کب سے وہ نیلم سے دل بہلا رہا ہے...... بھگوان کے لئے نیلم کی اور خاندان کی عزت کا خیال کیجئے...... کوئی نتیجہ رونما ہوا تو آپ کسی کو شکل نہ دکھا سکیں گی۔"

"او بھگوان......!" نیلم کی ماں نے اپنا سر تھام لیا۔ "وہ کالج جاکر گل کھلا رہی ہے؟"

"آپ ایسا کریں اس کا کالج جانا کسی بہانے بند کرادیں۔" مالنی نے مشورہ دیا۔

"بیٹی......! تم نے مجھ پر جو دیا کیا ہے میں اسے ساری زندگی نہیں بھول سکتی......" نیلم کی ماں رو کر بولی۔

"آکاش بڑا ذلیل، کمینہ اور ہوس پرست ہے۔" مالنی نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ "ایک روز اس نے مجھے بھی کالج کی لائبریری میں تنہا پاکر دبوچ لیا۔ میں نے اس کی جوتی سے اس کی ایسی پٹائی کی کہ اس کے چہرے کا جغرافیہ بگڑ گیا۔ وہ دو دن تک کالج نہیں آیا...... اچھا میں اب چلتی ہوں۔"

مالنی اپنی نفرت، حقارت اور انتقام کی آگ ٹھنڈی کر آئی۔ دوسرے دن سے نیلم کا کالج آنا بند ہوگیا۔ صرف ایک آکاش ہی نہیں دوسرے لڑکے اور لڑکیاں بھی حیران تھیں۔ جب چار دن تک نیلم کالج نہیں آئی تو کالج کی ایک لڑکی نیلم کے ہاں جاکر خبر لائی کہ اس کی ماں نیلم کی شادی کرنے کا سوچ رہی ہے۔

ادھر مالنی اپنی کامیابی پر بہت خوش تھی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ اب آکاش کا جھکاؤ اس کی طرف ہوجائے گا۔ کیوں کہ کالج میں اب اس کی ہم پلہ لڑکی کوئی نہیں ہے۔ نیلم کے بجائے اس کا جادو آکاش پر چلے گا۔ اب وہ اسے جیت کر رہے گی۔ اس نے نیلم کا پتا ہی صاف کردیا ہے۔

مالنی کی یہ بھول تھی۔ آکاش کو جب اس بات کا علم ہوا کہ نیلم کی ماں باپ نیلم کی شادی کرنے والے ہیں اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس نے سوچا اپنے گھر والوں کو نیلم سے شادی کرنے پر آمادہ کرکے اپنا رشتہ جلد ہوسکے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نیلم کسی اور کی ہوجائے۔

اسے نہ صرف نیلم کی محبت بلکہ اس کے چھریرے بدن، دراز قامت...... کمر سے نیچے تک لہراتی سیاہ زلفوں نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس کی چھلکتی غزالی آنکھوں کی

گہرائیوں میں سدا ڈوبے رہنے کو دل کرتا تھا۔ سیبوں کی سرخی لئے رخسار اور اس کے ہونٹوں کے سلگتے ابھار کو دیکھ کر آکاش کے ہونٹوں کے گوشے کانپنے لگتے۔ کانوں کی لویں گرم ہونے لگتیں۔ سانسوں میں ایک عجب سی بے ربطی سی پیدا ہوجاتی۔ اس کے باوجود آکاش نے کبھی بھی اپنی سطح سے گرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ من مانیاں کرتا تو نیلم تعرض نہ کرتی وہ کیسے اور کیوں کر نیلم کو کسی اور کا ہوتا دیکھ پاتا۔

اس کے گھر والے ابھی اس کی شادی کے لئے شاید تیار نہ ہوتے اگر وہ یہ نہ کہتا کہ نیلم کے لئے رشتے آرہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی اور گھر کی بہو بن جائے...... اس کی ماں چوں کہ نیلم کو بہو بنانے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس لئے وہ آکاش کا رشتہ لے کر پہنچ گئی۔ نیلم کی ماں نے بیٹی کے کرتوت اس کے باپ کو نہیں بتائے تھے۔ اس نے اس لئے بھی آکاش کا رشتہ منظور کرلیا کہ اس نے نیلم کی عزت داغ دار کی ہوئی ہے۔ لہٰذا اس کا پاپ کسی اور کے سر کیوں تھوپا جائے۔

اس کی پہلی محبت اور پہلے جنم کی نیلم مل گئی۔ شب عروسی میں ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو یقین نہ آیا کہ سپنا ایک حقیقت بن سکتا ہے۔ ان کے جسموں اور سانسوں کی آویزش سے کیف و سرور اور نشاط کے رنگ لئے نئے رنگ قوس قزح کی طرح تھے۔ نیلم نے اس سے عہد لیا تھا کہ وہ پدماناگن کے سائے اور اس کے انتقام سے محفوظ رکھے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلے جنم کی طرح انہیں پھر خودکشی کرنا پڑے۔

ان دونوں کی شادی کی خبر مالنی کو ملی تو اسے یقین نہیں آیا۔ اس پر جیسے کوئی بجلی سی آگری۔ اس کے سارے سپنے چکنا چور ہوگئے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ نیلم کی ماں نے آکاش کا رشتہ کیسے قبول کرلیا اور شادی کردی۔ جبکہ وہ آکاش کے خلاف زہر بھر کے اور بہتان لگا کر آئی تھی۔ ایک روز نیلم کی ماں اسے سر راہ ملی تو اس نے نیلم کی ماں سے پوچھا۔ "تم نے ایک بدکار شخص کو اپنی بیٹی دے دی جس کا دامن پاپوں سے داغ دار ہے۔"

"اس لئے کہ دونوں ہی پاپی تھے۔ میں نے سوچا کہ "بیٹی کا پاپ کسی اور معصوم اور گناہ مرد کے سر کیوں تھوپوں...... اس لئے میں نے آکاش کا رشتہ منظور کرلیا۔ اگر تم آکاش کا اصل چہرہ نہ دکھاتیں تو میں آکاش کو بیٹی نہ دیتی۔"

شادی کے بعد ان کا سنہرا دیش اور خوب صورت اور رنگین دکھائی دینے لگا تھا۔ آکاش نے بھی اپنی تعلیم ترک کردی تھی۔ وہ اپنے ہی سنہرے بنگال میں شادی کی خوشیاں سیر و تفریح سے دوبالا کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ اونچے نیچے پہاڑوں اور سبزے سے لدی وادیوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ کبھی سبک خرام ندی یا دریا کے کنارے جاکر محبت بھری باتیں کرتے...... جذباتی ہوجاتے...... ماضی کی باتیں کرتے...... ان کا صدی قبل ماضی کبھی کبھی سپنوں میں نظر آتا تھا۔ وہ مسرور ہوتے تھے کہ دوسرے جنم میں ان کا ملاپ ہوگیا اور اپنے آپ کو پالیا۔ شادی کو دو ہفتے گزر گئے۔ انہیں پدماناگن دکھائی نہیں دی۔ ایک دن نیلم نے کہا۔

"تم نے سچ کہا تھا کہ پدماناگن ہماری شادی کے بعد مایوس اور نامراد ہوکر اپنی دنیا میں واپس چلی جائے گی...... بھگوان کرے وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے۔"

"ہاں......" آکاش نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "بھگوان سے میری پرارتھنا ہے کہ کبھی اس منحوس کی صورت دکھائی نہ دے۔ وہ وہیں غارت ہوجائے۔"

"پھر بھی نہ جانے کیوں میرے دل کو کبھی کبھی ایک انجانا سا خوف محسوس ہوتا ہے۔" وہ بولی۔ "کہیں وہ لوٹ نہ آئے۔"

"وہ کس لئے......؟ میں تو اب تمہارا ہوں اور آخری سانس تک رہوں گا۔"

"اس لئے کہ تم دنیا کے سب سے خوب صورت مرد ہو...... وہ تم پر مرمٹ چکی ہے۔"

"کاش......! میں اس قدر خوب صورت نہ

ہوتا۔'' آکاش بولا۔

پھر وہ دونوں گھر واپس جاتے ہوئے ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہوگئے تاکہ ڈوبتے سورج کا حسین منظر دیکھیں۔ وہ روز ہی حسین منظر دیکھ کر لوٹتے تھے۔ پھر ایک دم سے نیلم ہیجانی لہجے میں چیخی۔

''آکاش......! آکاش......! وہ دیکھو...... سانپ...... سانپ......''

آکاش کو نیلم کے چیخ مارنے پر بڑی حیرت ہوئی۔ بنگال کی سرزمین پر سانپوں کی بھرمار تھی۔ نیلم کو بچپن سے سانپ پکڑنے کی تربیت دی ہوئی تھی۔ وہ بچپن میں چھوٹے موٹے اور آغاز نوجوانی پر بڑے سانپ پکڑ کے پٹاریوں میں بند کردیتی تھی۔ بعض سیاح ایسے آتے تھے جو سانپوں کی خریداری میں دلچسپی لیتے تھے۔ نیلم کو اندازہ ہوجاتا تھا کہ کون سا سانپ زہریلا ہے...... خطرناک ہے...... کون سا بے ضرر ہے۔

آکاش نے سانپ کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ایک عام قسم کا سانپ لگا۔ لیکن دوسرے لمحے اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ کیوں کہ سانپ آدمی سے بہت ڈرتا ہے۔ انسانی بو سونگھتے ہی راہ فرار اختیار کرتے ہیں اور مقابلے پر آنے کی ہمت نہیں کرتے ہیں۔ لیکن یہ سانپ ڈٹ گیا تھا۔ اس کی سنہری رنگت چمک رہی تھی۔ نیلم دو ایک مرتبہ اس قسم کے سانپ پکڑ چکی تھی۔ اب وہ کیوں اور کس لئے اسے پکڑنے کے بجائے دہشت زدہ ہورہی تھی۔

آکاش نے اس سانپ کو پکڑنے کے لئے قدم بڑھایا تھا کہ اس نے آکاش کا بازو پکڑ کر اسے روک لی۔

''نہیں...... نہیں...... آکاش! اسے عام قسم کا سانپ مت سمجھو......'' وہ سراسیمگی سے بولی۔

''نہ صرف میں بلکہ تم بھی تو سانپوں کے بارے میں ہر قسم کی وسیع معلومات رکھتی ہو......''

اسے ذرا غور سے دیکھو...... یہ نر نہیں مادہ ہے...... مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ یہ پدما نہ ہو......''

''پدما......؟'' آکاش کو سارے بدن پر سنسنی سی محسوس ہوئی۔ اسے جیسے ہوش آگیا۔ ''نہیں...... یہ پدما نہیں...... تمہیں اس پر دھوکا ہورہا ہے۔''

''پدما کیوں نہیں ہوسکتی......'' نیلم پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ ''اس نے شاید ایک عام قسم کے سانپ کا بہروپ بھرا ہوا ہے کہ ہم دھوکا کھالیں۔''

آکاش کو ایک دم سے احساس ہوا کہ نیلم سچ بول رہی ہے۔

پھر اس نے زمین پر قریب پڑے ہوئے دو تین پتھر اٹھالئے...... نیلم نے بھی آکاش کی پیروی کی۔

نیلم نے فوراً ہی تاک کر اس کا نشانہ لیا۔ آکاش سے پہلے پتھر سانپ پر دے مارا۔ پتھر اس کی دم پر جالگا۔ آکاش نے بھی نشانہ لے کر پتھر دے مارا۔ لیکن اس کا نشانہ خطا ہوتا گیا۔

نیلم کا پتھر سانپ کی دم پر لگتے ہی سانپ نے راہ فرار اختیار کی۔ آکاش کو اس کے فرار ہوجانے کا بڑا افسوس ہوا۔ کیوں کہ سانپ نہایت خوب صورت تھا۔ اس کے اچھے پیسے مل سکتے تھے۔ اس نے آکاش کو تنبیہ بھی کی تھی کہ یہ پدما ہوسکتی ہے۔ اگر پدما ہوتی اور اس کے قابو میں آجاتی تو وہ اسی وقت پدما کا وجود دنیا سے مٹادیتا۔

آکاش نے اس جگہ خون دیکھا جہاں نیلم کے پتھر سے مادہ سانپ زخمی ہوئی تھی۔ اگر وہ زخمی نہ ہوتی تو وہ پلٹ کر حملہ کرتی۔ پتھر کی ضرب اس قدر کردی تھی کہ وہ مادہ زخمی ہوگئی تھی۔ درد اور تکلیف برداشت نہ کرسکی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ پدما واپس آگئی ہے۔'' نیلم نے کہا۔ ''وہ کسی بھی بہروپ میں آسکتی ہے۔ لہٰذا اب ہم دونوں کو ہوشیار ہوجانا چاہیے......''

آکاش نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بازو کے حلقہ میں لے کر چلنے لگا۔ اس لئے کہ نیلم خوف زدہ سی تھی اور سہمی سہمی ہوئی سی چاروں سمتوں اور جھاڑیوں میں دیکھتی چل رہی تھی۔ اسے خوف واندیشہ تھا کہ کہیں زخمی مادہ اچانک کسی سمت سے بدلہ لینے کے لئے حملہ

آور نہ ہوجائے۔ وہ جانتی تھی کہ زخمی مادہ بہت خطرناک دشمن بن جاتی ہے۔ اس وقت تک وہ چین سے نہیں بیٹھتی ہے جب تک انتقام لینے کی پیاس نہ بجھالے۔

''ہاں......'' آکاش نے سر ہلایا۔ ''ماضی میں اس پدما نے کس قدر ہمیں تنگ وہراساں کیا تھا۔ اگر ہم خودکشی نہ کرتے جاتے وہ ہمارا کیا حشر کرتی...... یہ سنہری سانپ نر ہو یا مادہ وہ بڑے موذی ہوتے ہیں......''

''میرے دیوتا!'' نیلم نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پیار بھرے لہجے میں بولی۔ ''آج دنیا بہت ترقی کرگئی ہے۔ ایسے ایسے مہلک اور خطرناک ایجاد ہوگئے ہیں کہ جس سے انسانوں کو تاخت وتاراج کردیا جارہا ہے...... انسان بزدل نہیں ہے...... کمزور نہیں ہے...... کیا ہم موذی جانور کا مقابلہ نہیں کرسکتے...... کیوں نہ تم دو پستول خریدلو۔ ایک مجھے دے دو اور دوسرا تم اپنے پاس رکھو۔ تاکہ اسے دیکھتے ہی گولی ماردی جائے۔''

''پستول خریدنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' آکاش نے جواب دیا۔ ''اصل بات نشانے کی ہے۔ نشانے کے لئے مشق کرنی پڑتی ہے۔ نشانہ خطا ہونے کی صورت میں لینے کے دینے پڑجائیں گے...... دیکھو نا...... بنگال میں جہاں بہت سارے لوگ سانپوں کے ڈسنے سے مرجاتے ہیں وہاں اس سے کہیں زیادہ مارے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں خوف زدہ اور گھبرانے کی ضرورت نہیں...... سینکڑوں لوگ آخر زندگی گزار رہے ہیں۔''

نیلم اور آکاش جاگ رہے تھے۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ دونوں رات بڑی دیر تک جاگتے رہے۔ محبت بھری باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان کی شادی کو صرف بارہ دن ہوئے تھے۔ اس لئے ہر رات ہنی مون کی پہلی رات ہوتی تھی۔ کمرے میں دودھیا رنگ کا زیرو بلب روشن تھا۔ جس کی روشنی تیز، صاف اور چاندنی کی طرح تھی۔ اس روشنی میں کمرے کی ہر چیز صاف نظر آتی تھی۔

نیلم کی نگاہ کھڑکی پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ کا سانپ کھڑکی کے راستے اندر آرہا ہے...... وہ بری طرح چونکی اور اس کے سارے بدن پر جھرجھری دوڑ گئی۔ نیلم کو یاد آیا کہ اس نے اس سیاہ سانپ کو کچھ دنوں پہلے تالاب پر پکڑا تھا۔ اس پر گیلے کپڑے ڈال دیئے تھے۔ یہ تالاب اس کے گھر کے عقب میں تھا۔ سانپ پر خشک یا گیلا کپڑا ڈالنے سے بے بس ہوجاتا تھا۔ وہ سانپ کو پکڑ کر جس حالت میں تھی گھر کی طرف لپکی تھی۔ اسے اس بات کی کوئی فکر اور پروا نہیں تھی کہ وہ جس حالت میں ہے کوئی دیکھ لے گا۔ اس وقت وہ اکیلی تالاب میں نہارہی تھی۔ اسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا اور نہ گھر میں اس کے ماں باپ موجود تھے۔ اس نے گودام کوٹھری میں جاکر جہاں اناج اور مویشیوں کے لئے چارہ رکھا جاتا تھا وہاں پٹاریاں بھی ہوتی تھیں۔ اس نے جو بہت سارے سانپ پکڑ رکھے تھے وہ سپیرے کو بیچ دیئے تھے۔ یہ سپیرا کلکتہ شہر لے جاکر فروخت کردیتا تھا۔ سانپ پکڑنا اور فروخت کرنا یہاں کے کچھ لوگوں کا ذریعہ معاش تھا۔ کوٹھری میں صرف یہی ایک سیاہ سانپ پٹاری میں تھا۔ لیکن وہ کیسے نکل گیا تھا؟ پھر اسے ایک پل کے ہزارویں حصے میں یہ خیال آیا کہ شاید پدما نے اس کوٹھری میں گھس کر اسے آزاد کردیا ہوگا کہ وہ اس کا بدلہ لے۔ اس لئے وہ کالا سانپ آیا تھا وہ مشتعل سا بھی ہورہا تھا۔

جب اس نے آکاش کو بتایا تو دونوں ہڑبڑا کر بستر سے نکل آئے۔ وہ سیاہ موذی سانپ کھڑکی سے اتر کر بے خوفی کی حالت میں ڈٹ گیا۔ یہ عام قسم کا سانپ نہیں تھا۔ اس وقت اس بات پر وہ حیران تھی کہ اس نے کیسے اس خطرناک سانپ کو پکڑ کر پٹاری میں بند کردیا۔ یہ وقت سوچنے کا نہیں تھا جان بچانے کا تھا۔

''نیلم......!'' آکاش نے نیلم کو گم صم سا دیکھ کر ہذیانی انداز میں کہا۔ ''ہوش کی دوا کرو...... جلدی سے پلنگ پر چڑھ کر سرہانے رکھی ہوئی اسپرے کی بوتل اٹھالو...... یہ تمہاری طرف آئے تو اس پر تیزاب کی پچکاری ماردو۔''

نیلم نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ غیر محسوس انداز سے پیچھے ہٹنے لگی تا کہ بستر پر چڑھ کر بائیں جانب رکھی میز پر تیزاب سے بھری اسپرے کی بوتل رکھی ہوئی ہے۔ یہ سیاہ سانپ نہ صرف خطرناک بلکہ چالاک بھی تھا۔ نیلم کو غیر محسوس انداز سے جنبش کرتے دیکھ کر اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس کے حملے سے بچنے کی کوشش کررہی ہے۔ وہ بڑی اضطرابی سے پھن لہرا لہرا کر غصے سے پھنکار مارنے لگا۔ وہ تیزی سے فاصلہ عبور کرنے لگا۔

آکاش کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ نیلم پر بجلی کی سی تیزی سے حملہ آور ہونے والا ہے۔ آکاش کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ اگر وہ غیر محسوس انداز سے جنبش بھی کرتا نیلم اس موذی کے حملے سے خود کو بچا نہیں پاتی اور نہ پل بھر کی مہلت بھی ملتی۔ وہ موذی جانور اس کی طرف بھی متوجہ تھا۔ اس لئے نیلم کو صرف لمحے بھر کی مہلت مل گئی تھی۔ وہ اس موذی پر نگاہ مرکوز کئے ہوئے تھا کہ اگر اس موذی نے اس پر حملہ کیا تو اس کی گردن برق رفتاری سے دبوچ لے۔

اس موذی سیاہ سانپ نے فوراً ہی پینترا بدلا۔ وہ بجائے نیلم کی طرف لپکتا وہ فرش پر لہرایا۔ نیلم ہذیانی لہجے میں چیخی۔ "آکاش؟ ہوشیار...... وہ تمہیں ڈسنے والا ہے۔"

نیلم نے دیکھ لیا تھا کہ وہ آکاش کو نشانہ بنانے والا ہے۔ آکاش نے محسوس کیا کہ وہ موذی اس کے پیروں کے درمیان سے ہوتا ہوا نیلم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے جسم کا لمس آکاش نے محسوس کیا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اسے موقع تھا کہ آکاش کو ڈس لے۔ اسے ڈسا نہیں تھا۔ اس کا رخ نیلم کی طرف تھا۔ جس سے صاف محسوس ہورہا تھا کہ وہ صرف اور نیلم کو ڈسنے کے درپے ہے۔ جیسے وہ نیلم کی موت کے لئے آیا ہے۔

چشم زدن میں جو کچھ ہوا آکاش تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ میز کے قریب پہنچ کر مشتعل ہو کر فرش پر پھن زور زور سے مارنے لگا۔ نیلم جیسے اپنے ہوش وحواس کھو چکی تھی۔ وہ مبہوت سی کھڑی اس سیاہ سانپ کو گھورے جارہی تھی۔ اس کا چہرہ ایک دم پھیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں میں دہشت منجمد سی ہوگئی تھی۔

آکاش کو ایسا لگا جیسے اس سیاہ سانپ نے نیلم پر کوئی منتر پھونک دیا ہو۔ وہ پوری قوت سے چیخا۔

"نیلم...... نیلم...... ہوش میں آؤ...... یہ تمہیں ڈسنے والا ہے...... کھڑی کیا سوچ رہی ہو؟"

نیلم کو آکاش کی آواز نے جیسے چونکا دیا۔ اسے جیسے مہلت مل گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی میز پر سے اسپرے کی بوتل اٹھائی جس میں آکاش نے تیزاب بھر رکھا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں اور بدحواسی سے اس موذی جانور کے جسم پر اسپرے کردیا۔

وہ زخمی ہو کر فرش پر تڑپا اور پھنکارا۔ نیلم اگر اس کے پورے جسم پر ٹھیک سے اسپرے کردیتی تو وہ موذی تڑپ تڑپ کر مرجاتا۔ اور اس کا وجود گل جاتا۔ چوں کہ صرف دھار پڑی تھی۔ اس لئے دو تین بل کھا کر تیزی سے جس راستے سے آیا تھا اس راستے سے نکل پڑا تھا۔ آکاش نے نیلم کے ہاتھ سے اسپرے کی بوتل لی۔ دروازہ کھول کر اس موذی کے تعاقب میں دوڑا تا کہ اسے تیزاب سے نہلادے اور اسے موت کی نیند سلادے۔

لیکن وہ آکاش کو کسی سمت دکھائی نہیں دیا۔ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوچکا تھا۔ طاقت ور ٹارچ بھی لے کر نکلا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اس کی تلاش سے باز نہیں آیا۔ اس نے قرب و جوار کا چپہ چپہ دیکھ لیا۔ اس کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ خاصی دیر تک تلاش کرنے کے بعد وہ گھر میں گھسا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ اس کے ہاتھوں بچ کر نکل گیا تھا۔

آکاش جب گھر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ نیلم اپنی جگہ ساکت وجامد اور بے حس وحرکت بیٹھی مورتی دکھائی دی۔ اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ چہرہ بے لہو تھا۔

اس کی آنکھیں کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ جس راستے سے سیاہ سانپ آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ موذی سانپ کوئی بدروح تھی جس نے نیلم پر سکتہ طاری کردیا۔

"نیلم...... وہ موذی جاچکا ہے۔" آکاش نے اس کے پاس جا کر کہا۔ "میں نے اسے بہت تلاش کیا۔ گھنی جھاڑیوں میں روپوش ہو کر شاید تڑپ تڑپ کر مرگیا ہے...... میں دن کی روشنی میں اسے تلاش کرتا ہوں۔ شاید وہ کہیں مرا ہوا مل جائے گا۔"

"نہیں...... نہیں...... وہ ہرگز سانپ نہیں تھا جسے میں نے پکڑ کر پٹاری میں بند کیا تھا۔" وہ چونک کر بولی۔ "میں حیران ہوں کہ وہ پٹاری سے کیسے نکل گیا؟ اس کے نکلنے کے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔"

"شاید اسے پدما نے تم سے بدلہ لینے کے لئے آزاد کیا ہوگا؟" آکاش نے خیال ظاہر کیا۔ "اس لئے کہ تم نے پدما کو زخمی کیا تھا۔"

"لیکن میں نے جس سانپ کو پکڑ کر پٹاری میں بند کیا وہ بے ضرر سا تھا۔ اس قدر خطرناک نہیں تھا۔ جیسے یہ سانپ تھا۔"

"یہ تم کس بنا پر کہہ رہی ہو......؟" آکاش نے کہا۔ "شاید تم نے اسے عجلت میں بند کرتے ہوئے غور سے نہیں دیکھا تھا۔"

"میں نے اس موذی سیاہ موذی سانپ میں ایک عجیب سی بات دیکھی تھی۔" نیلم نے حیرت اور خوف سے کہا۔ "وہ سانپ نہیں کوئی پراسرار بدروح دکھائی دی تھی...... اس کی آنکھوں میں ایسی خوف ناک چمک دیکھی جس نے مجھے لرزا دیا اور میری رگوں میں خون خشک کردیا...... اس نے مجھ پر جیسے کوئی جادو کردیا...... اگر تم شور نہ کرتے تو میں ہوش میں نہ آتی۔ اس نے ایک طرح مجھے مفلوج کردیا تھا...... میں شاید مرجاتی۔"

آکاش نے اسے اپنے بازوؤں میں بھرلیا۔ چند لمحوں کے بعد پھلوں کا رس لاکر پلایا جس سے نیلم کی حالت قدرے بہتر ہوئی۔ پھر ان دونوں نے کوٹھری میں جا کر وہ پٹاری کھول کر جس میں نیلم نے سیاہ سانپ کو بند کیا ہوا تھا۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی وہ کنڈلی مار کر سو رہا تھا۔ زخمی بھی دکھائی نہ دیا۔

"نہیں...... یہ وہ سیاہ سانپ نہیں ہے جو تم پر حملہ کرنے آیا تھا۔" آکاش نے پٹاری بند کرنے کے بعد کہا۔ "تم نے ایک بات محسوس کی...... پٹاری میں جو سانپ بند ہے اس کی لمبائی اور جسامت حملہ آور سانپ سے بہت کم ہے۔ وہ چھ فٹ لمبا تھا۔ اور پٹاری والا سانپ بمشکل چار فٹ ہوگا۔"

"تو پھر یہ سیاہ موذی سانپ کس لئے آیا تھا؟"

"پدما نے اسے تم سے بدلہ لینے کے لئے بھیجا تھا۔ اس لئے کہ تم نے پدما کو زخمی کردیا تھا۔"

"لیکن پدما بھی تو مجھ سے انتقام لینے آسکتی تھی؟"

"وہ چوں کہ شدید زخمی ہوگئی تھی...... درد اور تکلیف کی شدت سے اس کا برا حال ہوا ہوگا۔" آکاش بولا۔ "اس لئے اس نے اپنے ساتھی سانپ کو تم سے انتقام لینے کے لئے بھیج دیا۔"

"اب کیا ہوگا......؟" نیلم نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"پدما انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے۔" آکاش نے اس سے کہا۔ "چنتا کرنے اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں...... وہ کچھ دنوں تک ادھر آنے کی ہمت نہ کرے۔ کیوں کہ اس کے ساتھی سیاہ سانپ کا جو حشر کیا ہے وہ اس کے لئے ایک سبق ہے۔ لیکن ہمیں غافل اور بے پروا نہیں ہونا چاہئے...... ہماری یہ کوشش ہونا چاہئے کہ اگر وہ انتقام کے جنون میں مبتلا ہو کر آتی ہے تو اسے کسی صورت میں زندہ واپس جانے دینا نہیں چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ اب اگر وہ آتی ہے تو ہم اس پر قابو پالیں گے۔ لہٰذا تمہارے دل میں جو خوف بس گیا ہے اسے نکال پھینکو۔"

آکاش کے دلاسا دینے کے باوجود نیلم اپنی ذہنی ابتر حالت پر قابو نہ پاسکی تھی۔ پھر آکاش نے اس کی

بڑی دل جوئی کی اور جذباتی انداز سے اس کا خوف اور اندیشہ دور کیا تو پھر نیلم نے رسوئی میں ناشتہ اور دوپہر کا کھانا تیار کیا۔ پھر ان دونوں نے کھانا زہر مار کیا تھا۔ نیلم نے اس سے کہا۔

"مجھے اس بات کا بہت دکھ ہے اور خوف و دہشت اس لئے ہے کہ پدما اور سیاہ سانپ میرے ہاتھوں مرا کیوں نہیں۔ دونوں بچ گئے۔ میری نانی جو بد روحوں، بھتوں اور چڑیلوں کی کہانیاں سناتی تھیں۔ انہیں سانپوں کے متعلق اتنا کچھ معلوم تھا کہ شاید ہی کسی کو معلوم ہو...... انہوں نے مجھے سانپوں کے بارے میں اور ان کی پراسرار قوتوں کے بارے میں بہت ساری روایات بھی سنائی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ جب کبھی کسی سانپ نر یا مادہ سے سابقہ پڑے تو اسے مارنے کے فوراً بعد اس کی آنکھیں کچل دو یا اسے جلا کر بھسم کردو۔ اس لئے کہ سانپوں کی آنکھوں میں دم توڑتے سے اپنے قاتل کا عکس کسی کیمرے کی تصویر ثبت ہوجاتی ہے اور آنکھوں کو کچلا نہ جائے تو مردہ سانپ کا دوسرا ساتھی اس بے جان جسم کے قریب پہنچ جانے کے بعد اپنی آنکھوں میں قاتل کی شبیہ کو ذہن میں محفوظ کرکے انتقام لینے کے لئے نکل پڑتا ہے۔ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا تاوقتیکہ قاتل نہ مل جائے۔ قاتل کے مل جانے پر اسے ایسی بے رحمی سے ڈستا ہے کہ پانی تک نہ مانگے۔"

آکاش کو ان روایات کا علم تھا لیکن وہ ان پر کان اس لئے نہیں دھرتا تھا کہ جدید تعلیم، ماحول اور حالات نے اسے اوہام پرستی کے قریب پھٹکنے تک نہیں دیا تھا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ ایسی نیم پراسرار خوف ناک کہانیاں اور ماورائی روایات ماضی کی داستانیں ہیں جو زیب داستان کے لئے سینہ بہ سینہ صدیوں سے منتقل ہوتی آئی ہیں...... لیکن ایک صدی قبل کے جنم اور ایک صدی کے بعد دوسرے جنم میں نیلم کے ساتھ پیش آنے والے واقعات نے اسے سنجیدہ کردیا تھا۔

ماضی میں پدما ناگن اس کی خوب صورتی، وجاہت اور سحر انگیز شخصیت پر مرمٹی تھی۔ وہ اس سے عشق کرنے لگی تھی اور پھر دوسرے جنم میں اس کی زندگی میں قدم رکھ دیا تھا۔ پہلے جنم کی کہانی نے [illegible] تھا۔ اسے اس بات پر غصہ تھا کہ نیلم دوسرے جنم میں بھی آکاش کی پتنی ہے۔ اسے نیلم سے حسد اور رقابت ہوگئی تھی۔ وہ صرف اور صرف نیلم کی دشمن تھی۔ آکاش اسے اس وقت مل سکتا تھا جب نیلم موت کی بھینٹ چڑھ جائے۔

راج باڑی اس کی بستی سے دور نہ تھا۔ یہ ایک پرفضا مقام تھا۔ شملہ اور دارجلنگ سے کہیں خوب صورت اور پرفضا تھا۔ چوں کہ نیلم ہر وقت اداس کی سہمی اور دہشت زدہ سی رہتی تھی تو اس نے سوچا کہ نیلم کو راج باڑی لے جائے۔ ماحول، آب و ہوا کی تبدیلی اور نئے مناظر سے اس کا دل بہل جائے گا۔

سرما کی آمد آمد تھی۔ راتیں بڑی سرد تھیں۔ ہمالیہ کی خنک ہواؤں نے راج باڑی کو سرد تو کردیا تھا لیکن ماحول بڑا خواب ناک بنادیا تھا اور راتیں بڑی سہانی اور رنگین ہوگئی تھیں۔ صبح جب سورج طلوع ہوتا تو ایسا لگتا تھا کہ سونا لٹا رہی ہوں۔ یہاں بنگلے، کاٹیج اور موٹل سبھی خالی اور ویران پڑے تھے۔ پھر بھی دو ایک نو بیاہتا جوڑے ہنی مون منانے آئے تھے۔ یہاں اپریل سے سیزن شروع ہوتا تھا۔ جون جولائی میں یہاں بہار اور رنگینی اپنے شباب کی آخری منزل پر ہوتی تھی۔ نہ صرف اندرون ہندوستان بلکہ بنگال کے دور دراز کے علاقوں سے بھی آتے تھے۔ غیر ملکی سیاح بھی...... یوں تو ہندوستان اور بنگال اور آسام میں پرفضا اور حسین مقامات کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن راج باڑی کی خصوصیت یہاں مچھلی، مرغابی اور اس کے جنگلات میں ہرن کے شکار کی بہتات تھی۔ کالا ہرن بھی ہوتا تھا اس کی لذت کسی اور گوشت میں نہیں تھی۔ کالا ہرن کے شکار کی سخت ممانعت تھی۔ کسی نے شکار کیا تو اسے تین ماہ جیل کی ہوا کھانا پڑتی تھی اور دس ہزار روپے جرمانہ بھی ادا کرنا پڑتا۔

آکاش میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے دو امیر کبیر دوستوں کے ہمراہ آیا تھا۔ اس کے دوست لائے تھے۔ اس کے بس کی بات نہیں تھی یہاں کے اخراجات اٹھا سکے۔ سیزن کے وقت یہ مقام بہت مہنگا ترین بن جاتا تھا۔ کیوں کہ یہاں دولت مند افراد کی بہتات ہوتی تھی۔ اس نے یہاں ایسے ایسے سنسنی خیز مناظر دیکھے کہ یقین نہ آیا۔ اس کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں تھی کہ جو لڑکے لڑکیاں اور مرد عورتیں جو سیر و تفریح کی غرض سے آتے تھے...... ان میں سے جو صبح آکر شام چلے جاتے وہ ایسے گوشوں میں تنہائی سے فائدہ اٹھاتے تھے کہ اسے یقین نہ آتا تھا۔

وہاں وہ سیاح لڑکیوں عورتوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کی خوب صورتی، وجاہت اور سحر انگیز شخصیت نے بڑا متاثر کیا۔ وہ اس کے قرب کی دیوانی ہونے لگی تھیں۔ اسے سپنے دکھاتی تھیں۔ آلودہ کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ ان کی ہر دعوت کو ٹھکراتا رہا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

یہاں نیلم کے ساتھ آیا تو ایک کاٹیج انتہائی سستا معہ طعام کے ساتھ مل گیا تھا۔ صرف دو دن میں وہ نارمل اور تروتازہ ہوگئی تھی۔ اتفاق سے موسم اتنا سرد نہیں تھا۔ دھوپ میں تمازت بھی تھی۔

ایک روز ان دونوں نے مچھلی کا شکار کیا۔ جو مچھلی ہاتھ لگی وہ بیس سیر سے کہیں بڑی تھی۔ اسے کاٹیج لے آئے تاکہ اسے پکایا جائے۔ نیلم مچھلی لے کر صفائی کے خیال سے صحن کے نل کے نیچے بیٹھی تھی۔ اس نے جیسے ہی مچھلی کا پیٹ چاک کیا ایک زوردار چیخ ماری۔

"آکاش......! آکاش......! سانپ...... سانپ......"

وہ سیاہ سانپ جو اس پر حملہ آور ہوا تھا جس پر اس نے تیزاب کی پچکاری ماری تھی مچھلی کے پیٹ میں تھا وہ باہر نکل کر نیلم کو ڈسنا چاہتا تھا۔ نیلم کے چیخنے پر وہ فوراً ہی نالی میں گھس گیا۔

اس وقت آکاش رسوئی میں تھا۔ وہ نیلم کی چیخ سنتے ہی دوڑا ہوا آیا۔ اس نے دیکھا کہ نیلم تھر تھر کانپ رہی ہے۔ اس پر غشی سی طاری ہورہی ہے۔ آکاش نے اس کے پاس پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا اور پوچھا۔

"کہاں ہے سانپ......؟ کون سا سانپ......؟ کیسا سانپ......؟"

"وہی سیاہ سانپ جس نے مجھے ڈسنے کی کوشش کی تھی ہمارے ہاں......" نیلم نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ اس کے سینے میں سانسیں زیروزبر ہورہی تھیں۔ سرد موسم میں وہ پسینہ پسینہ ہوگئی تھی۔

"وہ سانپ...... یہاں کیسے آیا......؟" آکاش نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔ "کہاں چھپا ہوا تھا؟"

"مچھلی کے پیٹ میں تھا......" نیلم نے رک رک کر بتانا شروع کیا۔ "میں نے جیسے ہی اس کا پیٹ چاک کیا تاکہ آلائش نکال کر اس کے قتلے بناؤں...... وہ پیٹ میں کنڈل مارے بیٹھا تھا۔ فوراً ہی باہر نکل آیا...... میں نے چیخ ماری تو وہ نالی میں گھس کر چلا گیا...... یہ دیکھو...... میرا دل...... میرا سینہ کیسا دھڑک رہا ہے۔"

"کیا وہ بھی سانپ تھا......؟ کیا تمہیں یقین ہے؟" نیلم بولی۔ "اس کے جسم پر تیزاب نے جو آبلے ڈالے تھے۔ وہ تھے۔"

آکاش اسے سہارا دے کر خواب گاہ میں لے آیا۔ اسے پانی پلایا تب کہیں جاکر نیلم کی جان میں جان آئی۔

"واپس چلو آکاش......! بستر بوریا باندھو۔ میں یہاں ایک منٹ بھی رہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"ہاں...... ہم ابھی اور اسی وقت واپس چلتے ہیں۔" آکاش نے کہا۔ "پدما نے اسے تمہارے تعاقب میں یہاں بھیج دیا...... اور پھر وہ سیاہ سانپ بھی تم سے انتقام لینے پر تلا ہوا ہوگا۔ کیوں کہ تم نے اس کے جسم پر تیزاب کی پچکاری مار کر جھلسا دیا۔ یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں۔"

واپس گھر پہنچنے کے بعد نیلم نے قدرے سکون

اور اطمینان کا سانس لیا لیکن اس کے دل کو دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ مچھلی کے پیٹ میں سیاہ سانپ کا چھپا رہنا سمجھ میں نہ آیا۔ اس سے کہیں زیادہ پریشان تو آکاش تھا۔ اس لئے کہ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ پدما اس کے عشق کے جنون میں مبتلا ہے۔ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گی جب تک نیلم کی جان نہ لے لے۔

آکاش کو جو اندیشہ تھا وہی ہوا۔

جب وہ راج باڑی سے واپس آئے تو نیلم کو اپنے ماں باپ بہت یاد آئے تھے۔ جو کلکتہ میں جاکر بس گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد صرف ایک چھٹی آئی تھی پھر ان کی کوئی خیر خبر نیلم کو نہیں ملی تھی۔ جب کہ نیلم نے ماں کو دو تین چٹھیاں لکھی تھیں۔ اصل میں ان کی ماں اپنی بیٹی اور آکاش سے بدظن تھی۔ سخت نفرت کرنے لگی تھی۔ مالنی نے ان دونوں کے خلاف خوب کان بھرے تھے۔

ادھر آکاش کی ایک بڑی بہن تھی۔ اس کی شادی جس سے ہوئی تھی آکاش سات برس کا تھا۔ اس کے پتاجی ریٹائر ہوچکے تھے۔ وہ شام شیلانگ میں تھی۔ اس نے اپنے ماں باپ کو بلالیا تھا۔ بیٹی کے ہاں جاتے سے باپ اور ماں نے اس سے کہا تھا کہ وہ بہو کو لے کر آئے...... لیکن پدما نے زندگی اجیرن بنادی تھی۔ راج باڑی سے واپس آنے کے بعد آکاش نے اپنے ماں باپ اور دیدی کے ہاں کچھ دنوں کے لئے جانے کا پروگرام بنالیا تھا۔ اب وہ دونوں اپنے اپنے والدین سے محروم تھے۔ بڑا خلا سا محسوس کر رہے تھے۔

ایک روز آکاش سودا سلف لانے بازار گیا ہوا تھا۔ وہ گھر پر اکیلی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو نیلم نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو اس کی سہیلی اور ہم جماعت شاردا کھڑی نظر آئی۔ نیلم نے دروازہ کھول کر اسے اندر بلالیا۔

شاردا نہ صرف اس کی گہری سہیلی تھی بلکہ بے تکلف تھی۔ شاردا نے اندر داخل ہوتے ہی باہر کا دروازہ بند کیا تو نیلم نے حیرت سے کہا۔ "دروازہ بند کیوں کیا؟ تھوڑی دیر میں آکاش آنے والا ہے۔"

"اس لئے کہ تو اپنی جان نہ بچاسکے۔" شاردا نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب......؟" نیلم نے حیرت سے کہا۔

"میں کچھ سمجھی نہیں......"

"مطلب یہ کہ میں شاردا نہیں پدما ہوں۔" پدما نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ "میں شاردا کے بہروپ میں آئی ہوں...... اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔"

"وہ کس لئے......؟" نیلم ایک دم سے دہشت زدہ ہوگئی۔ اس کا چہرہ متغیر ہوگیا۔

"اس لئے کہ تجھے ڈس لوں اور آکاش کو اپنالوں۔" وہ نفرت سے بولی۔

"نہیں...... نہیں...... تم آکاش کو مجھ سے چھین نہیں سکتی...... وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"یہی تو رونا ہے......" وہ زہرناک لہجے میں بولی۔ "میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں...... میں اس سے ایک صدی پہلے محبت کرتی تھی...... تو بھی اس سے محبت کرتی تھی...... تم دونوں نے ایک صدی بعد جنم لیا۔ پھر سے تم دونوں میں ملاپ ہوگیا...... تم دونوں نے شادی کرلی...... لیکن تم نہیں جانتی کہ میں نے آکاش کے دوسرے جنم کا ایک صدی کیسا کرب ناک انتظار کیا...... اب میں تیری موت کے بعد آکاش کا خون پی کر اور اپنا خون اس میں سرایت کرکے اپنالوں گی...... وہ بھی سانپ بن جائے گا...... پھر ہم صدیوں تک ایک دوسرے کے رہیں گے۔"

"تم کبھی اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب نہیں ہوسکتی......" نیلم ہذیانی لہجے میں کہنے لگی۔ "اس لئے آکاش تم سے سخت نفرت کرتا ہے...... تم اس کا دل جیت نہیں سکتی......"

"میں ناگن ضرور ہوں۔" وہ کہنے لگی۔ "جب میں اسے ایک عورت کے بہروپ میں اپنی آغوش میں لے کر اپنے دانت اس کی گردن میں پیوست کردوں گی اور اپنا خون اس میں سرایت کردوں گی تو اس کی نفرت محبت میں بدل جائے گی۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتی ہوں...... جب کوئی ناگن عشق کرنے لگتی ہے تو وہ اپنے محبوب کو پاکر ہی دم لیتی ہے۔"

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" نیلم کا پارہ چڑھ گیا۔ "اچھا ہوا تم آگئیں۔ میں تمہیں موت کے گھاٹ اتار دوں گی...... تمہارا سر کچل دوں گی...... بھسم کردوں گی...... پھر تم کبھی بھی جنم نہ لے سکوگی۔"

نیلم فوراً ہی خواب گاہ کی طرف لپکی تاکہ اسپرے کی بوتل اٹھالے...... لیکن اس کی نوبت نہ آسکی۔ کیوں کہ اندھا دھند بھاگنے سے وہ لڑکھڑائی اور فرش پر گر پڑی۔

پدما جو اس کے تعاقب میں آرہی تھی۔ اس نے نیلم کو کوئی مہلت نہیں دی۔ وہ ناگن کے بہروپ میں آگئی...... پھر اس نے اپنا پھن اٹھا کر اس کی بانہہ میں دے مارا۔

☆......☆......☆

آکاش جب لوٹ کر آیا تو اس نے دروازہ کھلا ہوا دیکھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا اور پھر گھر میں ایک ہولناک سناٹا طاری تھا۔ اس کے ہاتھ سے سودا سلف والی ٹوکری چھوٹ کر گر پڑی۔ وہ دیوانہ وار "نیلم...... نیلم......" کہتا ہوا لپکا...... اس نے خواب گاہ کے باہر دہلیز پر نیلم کی لاش دیکھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہے۔ یہ غیر متوقع نہ تھا۔ نیلم بے جان پڑی تھی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔ سینہ شق ہونے لگا۔

وہ بہت دیر تک نیلم کی لاش سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا...... اسے اوپر سے نیچے تک چومتا رہا۔ اس کے پیروں پر سر رگڑتا رہا۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ نیلم اب زندہ نہیں ہوسکتی۔ اس کی آتما پرلوک میں جاچکی...... اس نے ایک ناگن کے خوف و دہشت اور اذیت سے نجات پالی۔

اس کے دل کے کسی کونے میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ وہ زہر پی لے۔ پھر جب وہ تیسرا جنم لے گا تو نیلم بھی جنم لے گی۔ وہ پرلوک میں دیوتاؤں سے التجا کرے گا ان دونوں کو تیسرا جنم دے دے۔

"نہیں...... نہیں......" وہ نفرت اور غصے سے پاگل ہوتا گیا۔

"کیا وہ نیلم کے دشمن اور قاتل کو اس طرح معاف کردے کہ وہ دندناتا پھرے......؟"

اس نے سختی سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ وہ نیلم کا انتقام لے گا...... صرف پدما سے ہی نہیں بلکہ اس موذی جانور کی نسل سے...... وہ تیزاب سے ایک ایک سانپ کو جھلسادے گا۔ تڑپا تڑپا کر مارے گا۔

جب پدما عورت بن کر اس سے ہم آغوش ہوگی تب وہ تیزاب کی اسپرے کی بوتل نکال کر اس کے چہرے پر اور سارے بدن پر تیزاب کا اسپرے برق رفتاری سے کردے گا۔

پدما کو تڑپا تڑپا کر مارنے سے اس کی آتما کو کتنی شانتی ملے گی۔ کتنی خوشی ہوگی......

پھر وہ اس کی آنکھیں بھی تیزاب سے جھلسادے گا۔ اس طرح کہ اس کا عکس اس کی آنکھوں میں نہ رہے...... کوئی بھی سانپ قاتل کو یعنی اسے جان نہ سکے۔

پھر پدما کا اس دنیا سے سدا کے لئے جنم ختم ہوجائے گا۔

اس کا جو مکان تھا وہ بستی سے ہٹ کر ویرانے میں تھا۔ قرب و جوار میں کوئی مکان نہ تھا۔ پاس پڑوس میں کھیت تھے۔ باغ تھا۔ درخت تھے...... جو مکانات تھے ان کے مکین خیر خبر نہیں لیتے تھے۔ ایک نفسا نفسی سی تھی۔ اگر وہ انہیں نیلم کی موت کی خبر دیتا تو وہ کوئی دلچسپی لیتے اور نہ غم میں، دکھ میں شریک ہوتے...... یہ عام سی بات تھی کہ لوگ سانپوں کے کاٹنے سے مرجاتے۔ نیلم کی رسومات اسے خود ہی انجام دینے تھے۔

پہلے تو اس نے سوچا کہ نیلم کی چتا کو نذر آتش

کردے۔ جانے کیوں اس کا دل نہ مانا۔ وہ نیلم کو جلتا ہوا دیکھ نہیں سکتا تھا۔ دیکھنا نہیں چاہتا تھا اس نے ناریل اور سپاری کے درمیان ایک قبر کھودی۔ اس نے ایک مسلمان گھرانے کے آدمی کی تدفین اس وقت دیکھی تھی جب وہ سولہ برس کا تھا۔ وہ شخص اس کے پتا جی کا دوست تھا۔ اس نے اسی طرح کھدائی کرکے قبر تیار کی۔ پھر اس نے نیلم کی سرد لاش اٹھا کر گڑھے میں دفن کردی۔ پھر پتھر رکھ کر مٹی ڈال دی۔ اس نے اس طرح ابھار رکھا کہ وہ جگہ قبر معلوم ہو۔ نیلم کی لاش قبر میں اتارتے وقت اور مٹی ڈالتے اور قبر تیار کرتے وقت روتا رہا تھا۔

پھر دوسرے دن وہ پدما کی تلاش میں نکلا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تیزاب سے بھری اسپرے کی بوتل تھی۔ اسے امید تھی کہ پدما میں کسی نہ کسی دن اس سے آمنا سامنا کرے گی۔ کسی لڑکی یا عورت کے بہروپ میں...... اس لئے اس پر ڈورے ڈال سکے...... اپنے عشق میں کرسکے۔ راتوں کو اس پر بڑی فیاضی سے مہربان ہوکر اس کا خون چوس لے اور اپنا اس کے خون میں اپنا زہر سرایت کردے تاکہ اسے اپنی نسل میں ڈھال دے۔

دن میں اس نے چار پانچ دنوں میں بہت سارے چھوٹے بڑے سانپوں کو تیزاب سے جھلسا جھلسا کر ماردیا۔ اس نے سانپ کے بچوں کو بھی بخشا نہیں تھا۔ اس لئے سانپ کا بچہ سنپولیا ہوتا ہے۔ کئی راستوں پر مرے اور جھلسے ہوئے سانپ دکھائی دیتے...... ایک دم سیاہ...... ان پر کوئلے کا دھوکا ہوتا تھا۔

وہ راتوں کو دیر تک جاگتے ہوئے پدما کا انتظار کرتا تھا۔ اسے توقع تھی کہ پدما آئے گی۔ ضرور آئے گی۔ کیوں کہ اب اس کے راستے کا بہت بڑا پتھر ہٹ گیا تھا۔ کوئی دیوار نہیں رہی تھی۔ رکاوٹ نہیں رہی تھی۔

ایک روز دن میں نیلم کی ہم جماعت اور سہیلی سپنا آئی تھی۔ جب آکاش نے اسے بتایا کہ نیلم کو ایک مادہ سانپ نے ڈس لیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بہت دیر تک روتی رہی۔ پھر بولی۔

"آکاش بھیا......! آپ کو راز کی ایک بات بتاؤں...... آپ کسی سے اور مالنی سے اس کا ذکر نہیں کریں گے؟"

"کیا راز کی بات ہے......؟" آکاش نے بے دلی سے سوچا۔

"مالنی بھی اور لڑکیوں کی طرح آپ کے عشق میں گرفتار تھی۔" وہ کہنے لگی۔ "ایک روز اس نے لائبریری میں آپ کو آلودہ کرنے کی کوشش کی تو آپ نے اسے دھتکارا تھا...... اس نے اپنی بڑی اہانت اور ذلت محسوس کی۔ اس نے آپ سے انتقام لینے کی ٹھانی...... اسے اس بات کی جلن تھی کہ نیلم آپ کو بہت چاہتی۔ اس کی محبت اور آپ کے حصول میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ جس روز آپ نے اسے جھڑک دیا تھا اس کے دوسرے دن وہ کالج نہیں آئی۔ نیلم کے گھر جاکر اس کی ماں کو یہ بتایا کہ آکاش ہوس پرست ہے۔ اس نے کالج کی لڑکیوں کو تباہ کیا اور نیلم کو بھی داغ دار کردیا ہے۔ وہ دونوں کسی ویرانے میں جاکر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ مالنی کا خیال تھا کہ اس کی ماں نیلم کو گھر بٹھالے گی اور مالنی کے لئے راستہ صاف ہوجائے گا۔ لیکن جب آپ کی نیلم سے شادی ہوگئی تو اسے یقین نہیں آیا۔ وہ اس کوشش میں تھی کہ نیلم کے چہرے پر تیزاب پھینک دے۔ اب وہ نیلم کی موت کی خبر سن کر بہت خوش ہوگی۔ جشن منائے گی۔"

نیلم کی موت کی دردناک خبر کالج میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ دو تین دن تک کالج کی لڑکیاں لڑکے پرسہ کرتے آتے رہے۔ انہیں واقعی نیلم کی موت سے بڑا صدمہ ہوا تھا۔ لڑکیوں کا یہ خیال تھا کہ آکاش اپنا غم دور کرنے کے لئے یقیناً کسی نہ کسی لڑکی کا ہاتھ تھام لے گا۔ جیون ساتھی ہی اس کا غم ہلکا کرسکتی ہے۔ دوسری طرف مالنی نے نیلم کی موت کی خوشی منائی تھی جس نے آکاش کو مزید دکھ، درد اور صدمے سے دوچار کردیا۔

سات دن کرب اور اذیت اور پدما کی تلاش اور انتظار میں گزر گئے۔ آٹھویں دن پونم کی رات تھی۔ وہ جاگ رہا تھا۔ اس نے مالنی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ آخر پدما مالنی کا روپ بھر کر آہی گئی ہے۔

اس نے انجان بن کر کہا۔ "مالنی......! تم کیوں آئی ہو......؟ میں ایک بدکردار شخص ہوں۔ تم یہ بات نیلم کی ماں سے کہہ چکی ہو...... رات کے اس سمے آتے تمہیں کوئی ڈر اور خوف محسوس نہیں ہورہا ہے کہ تم اپنی عزت سے محروم ہوکر جاؤ گی۔"

"محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہے۔" مالنی بولی۔ "میں تمہارے عشق میں پاگل ہوگئی تھی اس لئے میں نے تم دونوں پر تہمت لگائی تھی کہ نیلم کی ماں بدظن ہوجائے گی تم سے...... تم مجھے اپنے قدموں میں جگہ دے دو تاکہ میں نیلم کی جگہ لے لوں۔"

وہ سمجھ گیا تھا کہ پدما نے...... مالنی کا بہروپ بھرا ہوا ہے۔ یہ ایک سنہری موقع تھا پدما کو ختم کرنے کا...... اس نے جھپٹ کر مالنی کا گلا دبوچ لیا۔ آکاش کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ یہ نیلم کی قاتلہ تھی۔

"پدما......" آکاش نے کرخت لہجے میں کہا۔ "آخر تو میرے انتقام کا نشانہ بن سکے گی...... سچ سچ بتا...... تو مالنی نہیں...... پدما ہے ناں......؟"

"میں...... میں...... پدما نہیں ہوں...... یہ کون پدما ہے...... میں تو مالنی ہوں آکاش! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"پدما......! تو نے کیا مجھے احمق سمجھ رکھا ہے......؟ کیا تو نہیں جانتی کہ میں نے جان لیا ہے کہ تو مجھے ڈسنے آئی ہے۔" آکاش نے اسے فرش پر میز کے قریب گرادیا تاکہ اسپرے کی بوتل اٹھالے۔ آکاش کے اس طرز عمل نے مالنی کو دہشت زدہ کردیا تھا۔ مالنی نے آکاش کی آنکھوں میں خون آشام سائے دیکھے تو لہرائی، مچلی اور تڑپی۔ وہ کسی قیمت پر اس کی گردن چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنا منہ اس کے ہاتھ پر مار سکتی تھی۔ اس کا لباس اس کے بدن کو بے نیام کرنے لگا۔ اس وقت آکاش کو کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ میز کی طرف بڑھایا تاکہ اسپرے کی بوتل اٹھائے۔

اس کی گرفت کمزور پڑی اور وہ جو میز کی طرف متوجہ ہوا تو مالنی نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اسے دھکا دے کر ایک طرف گرانے میں کامیاب ہوگئی۔ پھر اس نے کمرے میں رکھا ہوا بیلچہ اٹھالیا۔

"آکاش......!" وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ "میں اپنا سب کچھ سونپنے آئی تھی...... لیکن تم جان سے مارنے پر تل گئے ہو...... میں پدما نہیں ہوں...... میں صرف اور صرف مالنی ہوں۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو......" آکاش غرایا۔ "تم پدما ہو...... پدما......"

مالنی نے بیلچہ ایک طرف پھینکا اور تیزی سے باہر نکلی۔ وہ سمجھ گیا کہ پدما خوف زدہ ہوکر بھاگ رہی ہے۔ وہ اس کی طرف لپکا۔ لیکن اس کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی فن کا تراشا ہوا سنگ مرمر کا مجسمہ ہو۔ مالنی کالج میں...... سب سے تیز دوڑنے والی لڑکی تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ سانپوں کی رفتار بھی تیز ہوتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد مالنی جب اپنے گھر کے عقبی راستے سے اندر گھسی تو اسے یقین آیا کہ یہ پدما نہیں تھی۔

وہ ہر روز صبح نیلم کی قبر پر جاتا تھا...... وہاں کھڑے بڑی دیر تک قبر سے باتیں کرتا تھا...... نیلم کی طرف مخاطب کرکے کہتا تھا۔

"نیلم......! میں بہت جلد تمہارے پاس آنے والا ہوں...... جب تک پدما سے انتقام نہ لے لوں۔"

آج جب وہ نیلم کی قبر پر پہنچا تو اچھل پڑا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ قبر کی مٹی باہر پڑی ہوئی تھی۔ کسی نے قبر کھود دی تھی۔ اس نے قبر کے پاس پہنچ کر جھانکا تو نیلم کی لاش قبر میں نہیں تھی۔

(جاری ہے)

خونی درخت

رضوان قیوم۔ راولپنڈی

دو نوجوان برگد کے درخت کے نیچے موجود تھے کہ اچانک درخت کی شاخیں چشم زدن میں اوپر سے نیچے کو آئیں اور دونوں نوجوانوں کو جکڑ کر اوپر لے گئیں نوجوانوں کی فلک شگاف چیخیں نکلیں اور پھر......

ناقابل یقین ایک ایسی کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو حیرت تحیر اچنبھے اور خوف میں مبتلا کر دے گی

اس دل چسپ پراسرار سچی کہانی کے راوی ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر راجہ نیاز ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کی حقیقت کو نہ صرف میں آج تک سمجھ سکا ہوں بلکہ جب میں ماضی کے بیتے اس واقعہ کو اپنے تصور میں لاتا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسا بھی ہو سکتا تھا۔

بقول راجہ نیاز کے یہ 1946ء کی بات ہے میں بریلی شہر کے علاقہ گھاٹ نگر کے تھانہ میں بحیثیت سپاہی ڈیوٹی دیا کرتا تھا۔ دراصل گھاٹ نگر کا پورا علاقہ روایتی وارداتوں یعنی چوری چکاری، منشیات فروشی، جوا، نوسر بازی، پورے شہر میں مشہور تھا۔ یہاں ہر قسم کے گھناؤنے جرائم کی سرپرستی کرنے والے مافیا کا راج تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان مافیا کے بڑے بڑے ڈان ہمارے تھانے میں آ کر بذات خود اچھا خاصہ نذرانہ دیا کرتے تھے اس لئے ہمارے تھانے میں جرائم کی کم ہی رجسٹر ہوئے تھے۔

میں ایک دن تھانہ میں نائٹ ڈیوٹی دے رہا تھا۔ ڈیوٹی بھی کیا تھی؟ بس یوں سمجھیں کہ ڈیوٹی کی رسم دی جا رہی تھی تھانیدار کرپان سنگھ تھانہ میں موجود نہ تھا جبکہ میں دوران ڈیوٹی اپنے چند سپاہی ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا خوش گپیوں میں مشغول تھا کہ ہمارے سامنے تھانے میں تین آدمی داخل ہوئے ان میں سے ایک بوڑھا اور دو نوجوان تھے ان تینوں میں سے بوڑھا بڑا گھبرایا، پریشان نظر آ رہا تھا جبکہ دونوں نوجوان نارمل نظر آ رہے تھے۔ اس بوڑھے نے ہمارے قریب آ کر بولے گھبرائے ہوئے الفاظ میں کہا کہ "وہ۔ وہ جی میرے بیٹے دیپک کو ایک بدمعاش لبھے نے شاید اغوا یا قتل کر دیا ہے۔"

اس بوڑھے کے منہ سے اغوا اور قتل کا لفظ سن کر ہم سارے سپاہی چونک کر اپنی جگہوں سے اٹھے۔ شامل خان سپاہی جو ہم سب سے سینئر تھا۔ اس نے اس بوڑھے سے کہا کہ۔ "چاچا جی، آرام سے بیٹھ کر اصل واقعہ بیان کرو۔"

وہ بوڑھا اتنا گھبرایا اور پریشان تھا کہ اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔

"ہاں اب بتلاؤ تمہارے بیٹے کو کیا ہوا؟" شامل خان نے اس سے پوچھا تو اس نے جواباً کہا۔ "میرے بیٹے دیپک کو اس کے قریبی دوست لبھے نے اغوا یا قتل کر دیا ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"وہ جی پرسوں میرے گھر میں میرے بیٹے کا گہرا لبھے آیا تھا اس نے دروازے پر آواز دے کر دیپک کو باہر بلایا اور پھر وہ دونوں نہ جانے کہاں چلے گئے اور ابھی تک میرا بیٹا واپس نہیں آیا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے بیٹے کو لبھے کے ساتھ گئے ہوئے تقریباً دو ہی دن ہوئے ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں اس شہر سے باہر گئے ہوں چاچا جی آپ پریشان نہ ہوں، ایک آدھ دن اور انتظار کر لو۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ ہمیں اس سلسلہ میں کیا کرنا چاہئے آپ فی الحال اطمینان سے اپنے گھر جائیں۔"

دو دن بعد وہی بوڑھا ہمراہ تین چار آدمیوں کے تھانہ میں دوبارہ آیا۔ اس مرتبہ وہ بوڑھا پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہی پریشان نظر آ رہا تھا اس وقت اتفاق سے تھانے میں کرپان سنگھ موجود تھا۔ تھانے میں آتے کے ساتھ ہی وہ بوڑھا ایک دلخراش آواز میں چلاتے ہوئے کرپان سنگھ کے قدموں پر گر کر کہنے لگا۔

"صاحب جی آپ کو واسطہ اپنی ماتا کا میرے بیٹے کا پتا چلائیں۔"

"کیا ہوا تمہارے بیٹے کو؟"

"وہ جی، جی۔" اپنی پریشانی میں وہ بوڑھا اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے پورے مکمل جملے تک نہیں نکل رہے تھے۔

کرپان سنگھ نے بوڑھے کے ساتھ آئے آدمی کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو بول ان بابا جی کا کیا مسئلہ ہے؟"

اس آدمی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تھانیدار صاحب! بابا جی کو شک ہے کہ ان کے بیٹے دیپک کو اس کے ایک دوست لبھے نے قتل یا اغوا کیا ہے۔"

"پر کیوں لبھے کو اس سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔" تھانیدار نے اس آدمی سے پوچھا۔

تھانیدار صاحب یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ لبھے نے بابا جی کے بیٹے کو کیوں قتل یا اغوا کیا ہے۔"

"اچھا یہ بتلاؤ دیپک اپنے گھر سے کب سے غائب ہے۔"

بوڑھے نے روتے ہوئے کہا۔ "تھانیدار صاحب اسے غائب ہوئے چار روز ہو گئے ہیں۔ وہ ابھی تک گھر نہیں آیا۔"

"یہ تم کس بنا پر لبھے پر شک کر رہے ہو؟"

"تھانیدار صاحب۔ آخری بار لبھے ہمارے گھر آیا تھا اور دیپک اسی کے ساتھ گیا تھا۔"

"بابا جی آپ مجھے اپنی رپورٹ لکھوائیں، میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں لازماً آپ کی درخواست پر کڑا ایکشن لوں گا۔" محرر نے کچی رپورٹ لکھ کر بوڑھے اور گواہوں سے انگوٹھے لگوائے۔ اس کے بعد تھانیدار نے ہم تین چار سپاہیوں کو لیا اور وہ ہم کو لے کر سیدھا لبھے کے گھر گیا۔ لبھا اپنے گھر میں بھی نہ ملا۔ بلکہ اس کے رشتہ دار اس گمشدگی کی وجہ سے انتہائی پریشان تھے بہرحال

کرپان سنگھ نے اردگرد پاس پڑوس سے لبھے کے کردار کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

محلے والوں نے کرپان سنگھ کو یہ بتلایا کہ لبھا اور دیپک دونوں نہ صرف گہرے دوست ہیں بلکہ یہ دونوں عادی چور بھی ہیں۔

یہ خبر ہمارے اور کرپان سنگھ کے لئے بہت حیران کن تھی۔ اس انکشاف کے بعد کرپان سنگھ نے تھانے میں آکر دیپک کے بوڑھے باپ پر چلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے تیرا بیٹا اور لبھا کسی چوری کی واردات کرنے کے بعد اپنی جانب سے چوری کئے گئے مال کو اڑانے شہر سے باہر گئے ہونگے۔ اور میرے خیال میں جب ان کی جیبیں رقم سے خالی ہوجائیں گی تو واپس آجائیں گے۔“

”نہیں نہیں تھانیدار صاحب مجھے پکا یقین ہے کہ لبھے نے میرے بیٹے کو جان سے مار دیا ہوگا۔“

”اچھا صاف صاف بتلاؤ کہ تمہارا بیٹا لوگوں کے گھر لبھے کے ساتھ مل کر ڈکیتیاں، چوریاں نہیں کرتا تھا۔“ تھانیدار کی بات سن کر دیپک کا باپ شرمندگی سے سر جھکا کر خاموش ہوگیا۔ اور پھر بولا ہاں، جی آپ صحیح کہتے ہیں۔

کرپان سنگھ نے اسے کہا۔ ”مجھے اس کے بارے میں بتلاؤ کہ دیپک کا اپنے علاقے میں کن کن نوجوانوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا یا پھر یارانہ تھا۔“

یہ سن کر دیپک کے باپ نے اپنے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس کے دو ہی گہرے دوست ہیں۔ ایک لبھا اور دوسرا انورا۔“

بقول تمہارے کہ لبھا چور ہے تو یہ انورا کیا کرتا ہے؟“ کرپان سنگھ نے پوچھا۔

”جی، وہ بھی کرتا ہے جو یہ دیپک اور لبھا کرتے ہیں۔“ کرپان سنگھ مسکرایا اور بولا۔ ”یعنی وہ اس کا چور بھائی ہے۔“ تھانے میں موجود سارے سپاہی ہنسنے لگے۔

”صاحب جی میرے بیٹے کی تلاش کے لئے کچھ او پائے کرو۔“

”اچھا کچھ کرتے ہیں۔ مثل سنگھ اور نریش جاؤ اور انورا کو پکڑ کر میرے سامنے پیش کرو۔“

آدھے گھنٹے بعد دونوں سپاہی انورا کو پکڑ کر لے آئے۔ تھانیدار نے اسے اپنے سامنے بیٹھایا اور اس پر نظریں مرکوز کر کے بولا۔ ”انورا میں تجھ سے جو سوال پوچھوں گا تو اس کا صحیح جواب دینا اور یاد رکھ اگر تو نے میرے سامنے اگر جھوٹ بولا تو میں تیری زبان پلاس سے کھینچ کر منہ سے باہر نکال دوں گا۔“ پھر کرپان سنگھ بولا۔

”تو یہ بتلا کہ تو نے آخری بار لبھا اور دیپک کو کہاں دیکھا تھا؟ اور وہ کب تجھ سے ملے تھے۔“

انورا نے جواب دیا۔ ”مجھ سے دیپک اور لبھا آخری بار 6 دن پہلے ملے تھے۔“

تھانیدار نے اس سے پھر رعب دار انداز میں پوچھا کہ ”مجھے یہ بتلا کہ ان کا آخر میں کیا پروگرام تھا۔“

”جی وہ بس مجھے ملے تھے مجھے یہ قطعی علم نہیں ہے کہ ان کا آئندہ کیا پروگرام تھا۔؟“

”یہ بات نہ ممکن ہے کہ تو ان دونوں کا گہرا دوست ہوتے ہوئے یہ معلوم بھی نہ ہو کہ وہ دونوں کہاں گئے ہیں۔“

”تم سگریٹ پیتے ہو؟“

”میں سگریٹ نہیں پیتا۔“

”بالکل بھی نہیں۔“ تھانیدار نے اس کے انتہائی قریب ہو کر پوچھا۔ ”ذرا اپنا منہ کھول۔“ انورا نے اپنا منہ کھولا تو کرپان سنگھ نے اسے اپنے روایاتی طنزیہ انداز میں کہا۔ تیرے دانت تو اتنے پیلے اور بدنما ہیں جنہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تو لازماً چرس بھرا سگریٹ پیتا ہے۔ مجھے آرام سے بتلا کہ تو سگریٹ پیتا ہے کہ نہیں۔“

”جی۔ جی ہاں پیتا ہوں، لیکن اس قسم کے سوال کرنے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟“

تھانیدار نے زوردار آواز میں کہا۔ ”تیری اتنی سی بات سے میں نے یہ بخوبی اندازہ لگالیا ہے کہ تو نہ صرف 100 فیصد جھوٹا انسان ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ تو لبھے

اور دیپک کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ وہ بولا۔

کرپان سنگھ نے اپنی جیب سے بیڑی نکالی اور اسے سلگا کر اپنے ہونٹوں میں دبانے کے بعد انورا کی جانب سرخ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ میں تجھے اب بھی موقع دے رہا ہوں کہ تو اب بھی مجھے یہ بتلا دے تو لبھا اور دیپک کے بارے میں مزید کیا جانتا ہے؟“

”تھانیدار صاحب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میں شریف انسان ہوں۔“

”اچھا شریف انسان میں تیرے اندر چھپا چپ کا روزہ توڑتا ہوں۔ تو ایسے نہیں مانے گا۔“ اس نے مجھے کہا۔ ”راجہ نیاز چلو اسے ڈرائنگ روم میں جا کر تھرڈ ڈگری لیول کی خاطر مدارت کرو۔“

”چل اوئے۔“ میں نے اسے گھسیٹ کر ڈرائنگ روم کی جانب لے جاتے ہوئے کہا۔

”تھانیدار صاحب آپ یقین کریں مجھے کچھ نہیں معلوم کہ لبھا اور دیپک کہاں ہیں وہ لرزتے ہوئے بولا۔

پھر اچانک دیپک کا باپ بولا۔ ”تھانیدار صاحب یہ تینوں اپنا زیادہ تر وقت اکٹھے چوری چکاری نشہ وشہ میں گزارہ کرتے تھے۔ یہ سب ایک دوسرے کے ہمزاد تھے۔“

”میں لبھا کے بارے میں کچھ نہیں۔“ جانتا وہ بولا۔

ڈرائنگ روم میں کرپان سنگھ نے انورا کو پولیس کے سخت ترین روایاتی انداز سے تشدد کا نشانہ بنایا انورا بھی بڑا ڈھیٹ قسم کا سخت جان انسان تھا۔ وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ ”میں ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کہاں اور کس ارادے سے گئے ہیں؟“

کرپان سنگھ سے شامل خان نے کہا۔ ”سر! لگتا ہے یہ واقعی سچ بول رہا ہے۔“

”لیکن میرا پولیس کی نوکری اور تھانیداری کا تجربہ کہہ رہا ہے کہ یہ ہم لوگوں سے کچھ چھپا رہا ہے۔“ کرپان سنگھ بولا۔

انورا پولیس کی مار سے معمولی زخمی اور نڈھال ہوگیا تھا اس کی ناک کے نتھنوں سے ہلکا ہلکا خون رسنے لگا تھا۔ مجھے اس کو دیکھ کر نہ جانے کیوں ترس آرہا تھا۔ لیکن یہ سب دیکھنا اور لوگوں پر ڈنڈے برسانا میری سرکاری مجبوری تھی۔

ڈرائنگ روم میں قبرستان کی طرح خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک توقف کے بعد تھانیدار نے انورا کو مخاطب کر کے کہا ”دیکھو مجھے اب بھی تیرے بارے میں یہ پکا شک ہے کہ تو کسی نہ کسی حوالہ سے لبھا اور دیپک کی گمشدگی میں ملوث ہے تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تو میرے عتاب سے بچنے کے لئے اب بھی بتلا دے کہ لبھا اور دیپک کہاں ہیں؟“

انورا تسلسل سے اپنا ہی کلمہ دہرائے جارہا تھا کہ وہ اس معاملہ میں بے قصور ہے اور کچھ نہیں جانتا۔

”اچھا! اب میں اس کی زبان سے حقیقت کھلوانے کے لئے فرقہ استعمال کرتا ہوں۔ فرقہ ایک ایسا خطرناک دیسی قسم کا اوزار تھا جو کہ لکڑی سے بنا ہوتا تھا۔ اور اس میں کالی سرخ مرچ کے لعاب میں ڈوبے ہوئے ببول کے کانٹے پیوست ہوتے تھے۔ اور اس فرقہ کو تھانہ میں عادی ڈھیٹ مجرموں کو ان کا جرم قبول کروانے کے لئے دوران ریمانڈ استعمال کیا جاتا تھا اس کی اذیت کوئی بڑے سے بڑا عادی مجرم بھی برداشت نہ کرپاتا تھا۔

تھانیدار کے حکم پر جب بھیانک شکل کا چوبی فرقہ لایا گیا تو اسے دیکھ کر انورا کے چہرے کا رنگ نہ صرف بدلنے لگا بلکہ خوف سے اس کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں امنڈنے لگیں۔ ”چل اوئے اسے پشت کے بل ننگا کر کے پٹھے پر لیٹا۔ تھانیدار بولا۔

انورا مزید بغیر سوچے سمجھے فوراً تھانیدار کے قدموں میں گر کر، گڑگڑانے لگا۔ ”خدا کے واسطے فرقہ میرے جسم پر نہ مارنا میں مرجاؤں گا۔“

تھانیدار نے دانت پیستے ہوئے اس سے کہا ”ہاں اگر تو حقیقت نہیں بتلائے گا تو واقعی میں تجھے آج ہمیشہ کے لئے مرے برابر کردوں گا۔“

"بتلاتا ہوسرکار! بتلاتا ہوں۔"

"ہاں اب آیا ہے نہ اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ ارے شامل خان تو کیا سمجھتا تھا کہ میں اس پر ظلم کررہا ہوں۔ میری تو چھٹی حس اور تجربہ کہہ رہا تھا کہ لازماً یہ لبھا اور دیپک کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔"

"اب تو آرام سے میرے سامنے بیٹھ کر پہلے چائے پی اور پھر مجھے وہ سب کچھ بتلا جو تو ان دونوں کے بارے میں جانتا ہے اور ہاں اب اگر تو نے مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کی تو یاد رکھ میں فرقہ کو تیرے جسم کا مستقل حصہ بنادوں گا۔" کرپان سنگھ سخت گیر انداز میں بولا۔

اس سے پہلے ہم انورا کو بے قصور اور کرپان سنگھ کو ظالم سمجھ رہے تھے لیکن جب انورا نے فرقہ کو دیکھ کر اپنی زبان کھولی تو اس لمحے ہم سارے سپاہی اس بات کے قائل ہوگئے کہ واقعی کرپان سنگھ ایک تجربہ کار تھانیدار ہے۔

انورا سے کرپان سنگھ نے کہا۔ "تو شروع سے مگر آہستہ آہستہ بتلا کہ لبھا اور دیپک اس وقت کہاں ہیں؟ اور تیرا اس معاملہ سے جڑا کیا کردار ہے۔؟" کرپان سنگھ اسے اپنے سامنے بیٹھا کر اپنے ہاتھوں میں پینسل کاغذ پکڑ کر اس کا بیان نوٹ کرنا شروع کردیا۔

انورا نے ابتدائی بیان میں ایسی عجیب وغریب اور ناقابل یقین پراسرار کہانی گھڑی جسے سن کر تھانیدار کرپان سنگھ پھر سے آگ بگولہ ہوگیا۔

اس نے انورا کو پھر سے شدید تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے کہا۔ "یہ سب کچھ مجھے خود ساختہ کہانی سنا رہا ہے اس سے لازماً تو میرا ذہن بے مقصد زاویے کی جانب موڑنا چاہ رہا ہے کرپان سنگھ نے انورا کے گالوں پر جلتی بیڑی لگاتے ہوئے کہا۔ "تو اتنا چالاک ہوشیار مجرم نہیں ہے جو تو مجھے اس قسم کی بے ڈھنگی نہ قابل یقین ڈراؤنی کہانی سنا کر مجھے یقین دلائے۔"

انورا نے اپنی کہانی یوں شروع کی۔ میں اور لبھا، دیپک اور میں مل کر مالدار لوگوں کے رہائشی علاقہ میں جا کر چوریاں چکاریاں کیا کرتے تھے ایک دن میرے پاس دیپک خود چل کر آیا تھا اس نے مجھ سے کہا کہ۔ "میری خبر کے مطابق ڈاکٹر ابھیشک نے اپنی بیٹی کی سگائی کے لئے 25 تولہ کے دو سونے کے سیٹ سنار بازار سے بنائے ہیں اور اس کی تجوری میں کافی روپیہ بھی موجود ہے۔ اس نے یہ بھی بتلایا تھا کہ اسے یہ اطلاع ڈاکٹر ابھیشک کے نوکر نے دی ہے۔" پھر میں نے لبھا سے اس واردات کو ڈالنے کے لئے بات کی تھی حالانکہ وہ دلی طور پر اس واردات کو ڈالنے سے کترا رہا تھا۔ لیکن میں نے اور دیپک نے اسے ذہنی طور پر تیار کیا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ اس واردات میں شریک رہے ہم تینوں نے طے کیا تھا کہ ڈاکٹر ابھیشک کے گھر سے لوٹے گئے مال کا حصہ ہم برابر تقسیم کریں گے جبکہ تینوں مل کر ڈاکٹر کے نوکر کو 150 روپے دیں گے۔

ڈاکٹر ابھیشک کے نوکر نے یہ کہا تھا کہ "جب تم لوگ ڈاکٹر کی کوٹھی کے پچھواڑے سے کود کر آؤ گے تو میں اس کمرے کا دروازہ کھول دوں گا۔"

ہم لوگوں نے واردات کی پلاننگ بڑی سوچ سمجھ کر کی تھی۔ واردات ڈالنے کے تقریباً دو گھنٹے پہلے میں نے لبھا کو دیپک کے گھر سے اسے بلانے کے لئے بھیجا کیونکہ دراصل دیپک ہی واردات کے لئے پستول اور خنجروں کا بندوبست کرتا تھا۔ اس نے یہ ہتھیار ایک جگہ سے لینے تھے۔ اور دیپک کو بلا کر لبھا لے آیا میں ان سے دور گلی کے کونے میں کھڑا تھا۔ اس کے بعد ہم تینوں نے پلان کے مطابق ڈاکٹر ابھیشک کے گھر میں اس کے نوکر کی مدد سے ڈکیتی ڈالی۔

ڈکیتی میں ہمیں ڈاکٹر کی تجوری سے تقریباً 35 تولہ سونا اور 700 روپے نقد ملا تھا۔ ہم نے ڈکیتی کے مال کی تقسیم کے دیگر معاملات شام کو طے کرنے تھے۔ ہم واردات کے بعد ابھی ڈاکٹر ابھیشک کی کوٹھی کی دیوار پھلانگ ہی رہے تھے کہ اتنے میں وہاں ڈاکٹر کا جوان بیٹا نہ جانے کیسے آگیا۔ یہ ہماری آخری لمحوں میں بڑی بدقسمتی ہوئی۔

اس نے چلا چلا کر کہا۔ "تم کون ہو؟" یہ سنتے ہی نے ہمیں لبھا نے اونچی آواز میں کہا۔ "بھاگو۔" تو ہم تینوں ڈاکٹر ابھیشک کی کوٹھی کے پچھواڑے کی دیوار پھلانگ کر دیوانہ وار سڑک کی جانب بھاگنے لگے۔

ڈاکٹر ابھیشک کے بیٹے کی زوردار آوازیں سن کر سامنے کوٹھی میں موجود چوکیدار بھی چوکنا ہوگیا تھا۔ اس نے بھی اپنی فلک شگاف آواز ماری۔ "رکو، رکو اگر تم نہیں رکے تو میں فائر کردوں گا۔"

دیپک نے ہم دونوں سے کہا۔ "بجلی کی طرح اپنے قدم دوڑتے ہوئے اس علاقہ سے باہر نکلنے کی کوشش کرو۔"

چوکیدار کوٹھی سے باہر نکل آیا تھا اس نے پستول سے ایک فائر داغا جو کہ لبھا کے قریب سے گزر گیا۔ دیپک نے بھی جواباً پستول سے فائر کیا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو چوکیدار زمین پر گرا۔ تڑپ رہا تھا۔

"یہ تو نے کیا کیا؟" میں نے چلاتے ہوئے کہا لبھا نے کہا قنافٹ داسی کے پرانے کھنڈروں کی جانب بھاگو۔ داسی کے پرانے کھنڈر دراصل ہندوؤں کی پرانی پوجا گھاٹ تھی۔ جہاں صدیوں پرانا ٹوٹا پھوٹا ویرانہ ایک مندر تھا۔

بحرحال ہم قنافٹ داسی کے کھنڈرات میں پہنچ گئے لبھا نے دیپک کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے۔ "الو کے پٹھے، عقل کے اندھے، تو نے چوکیدار کو گولی کیوں ماری یہ تو تو نے ہمیں پولیس کے چنگل میں پھنسوانے اور مروانے کے لئے بہت بڑا غلط کام کردیا۔"

میں نے اس موقع پر جو مناسب سمجھا وہی کام کیا دیپک بولا۔

ارے پاگل ہم نے ڈاکٹر ابھیشک کے گھر آرام سے چوری کی اور وہاں ہمیں کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ چل اگر ڈاکٹر کے بیٹے نے ہمیں دیکھ بھی لیا تھا تو کیا ہوا؟ وہ ہم تینوں کو جانتا نہ تھا۔ اگر ہم کسی طریقہ سے پکڑے بھی جاتے تو ہماری پولیس عدالتوں سے کسی نہ کسی طریقہ سے بچت ہوجاتی۔ لیکن اب تو نے اپنی زندگی کی یہ سب بڑی غلطی کی ہے کہ تو نے چوکیدار کو گولی ماردی۔ اب اس سے یہ ہوگا کہ علاقہ کی پولیس اس دوہری واردات کی تفتیش بڑی الستاگ اور سائنٹفک طور پر کرے گی خیر جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا اب تو مجھے بتلا کہ کرنا کیا ہے؟" میں نے کہا تو لبھا بولا۔ "اس وقت ہمارا اس لوٹے ہوئے مال سمیت آگے کہیں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔" اس نے مزید مشورہ دیا کہ "ہمیں فی الحال یہ لوٹا ہوا سامان اس کھنڈر میں کسی مناسب جگہ چھپا دیتے ہیں اور پھر نارمل حالت میں اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔"

پھر لبھا بولا چھپانے کے لئے کوئی جگہ تلاش کر۔" میں نے اور دیپک نے ان کھنڈرات کا بغور جائزہ لیا تو ہمیں ایک جگہ انتہائی گھنا دیو قامت قدیم بڑ کا درخت نظر آیا تو میں اور دیپک اس درخت کے قریب گئے اور دیکھا کہ اس ہزاروں سال پرانے درخت کی شاخیں نہ صرف دور دور تک پھیلی ہوئی تھی بلکہ اس کا تنا اتنے بڑے احاطے پر پھیلا ہوا تھا کہ اس کا گولائی میں رقبہ کم از کم 40 تا 50 فٹ تو ہوگا۔ یا شاید اس سے بھی زیادہ۔

دیپک بولا۔ "دیکھ درخت کے تنے تلے کے درمیان میں خلا ہے فی الحال سارا مال، سونا اور روپیہ اس خلاء میں چھپا دیتے ہیں۔"

ہم نے واپس آکر یہ بات لبھا کو بتلائی تو اسے ہماری یہ تجویز پسند آئی اس نے دیپک کو کہا کہ "تم دونوں اس درخت کے تنے میں خلا والی جگہ کو صاف کرکے اس میں یہ سونا اور روپیہ پھنسا دو۔"

"لبھا تو صحیح کہہ رہا ہے، آگے گلیوں، کوچوں میں لازماً اس دوہری واردات کی کھپ مچی ہوگی۔ اور وہاں پولیس والے مشکوکین کی جامعہ تلاشی بھی کررہے ہوں گے۔ چل جلدی سے سارا مال چھپا دیتے ہیں۔ اور پھر ہم اپنے کام میں لگ گئے ہم نے سوچا کہ درخت میں موجود خلاء کو مزید گہرا کردیتے ہیں اور اس کے لئے کچی اینٹیں خلاء میں مارنی شروع کردی۔

اچانک درخت کی اوپری جانب سے میرے سر پر گرم لعاب قسم کی کوئی چیز گری۔ میں سمجھا کہ یہ شاید درخت پر بیٹھے کسی پرندے نے بیٹ کی ہوگی۔ تھوڑی دیر بعد یہ ہوا کہ دوبارہ ایک بڑی خون کی بوند زمین پر آ کر گری میں اسے دیکھ کر دہل گیا۔ اور پھر اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا تو میری انگلیوں کی پوروں میں خون لگ گیا تھا میں نے جب درخت پر نظریں دوڑائیں تو وہاں میں نے دیکھا کہ درخت کی لٹکی ہوئی شاخیں ہمارے بہت قریب آ گئی تھیں۔ اور ان شاخوں کے آخری حصوں سے خون آلود لیس دار لعاب رس رہا تھا۔

میں نے بمشکل چلا کر کہا لبھا اور دیپک فوراً بھاگو "دیکھو خون سے لتھڑی ہوئی درخت کی شاخیں بڑے پراسرار طریقے سے ہمارے قریب آ رہی ہیں۔"

"ارے شاخیں ہی تو آ رہی ہیں کوئی پولیس تو نہیں آ رہی لبھا نے کچھ غصے اور کچھ طنزیہ انداز میں دیپک کی جانب دیکھ کر میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے دونوں کو پھر زور دے کر کہا کہ "تم ایک لمحے کے لئے پیچھے مڑ کر اپنی آنکھوں سے اس حقیقت کو دیکھ لو۔"

دونوں نے میری باتوں پر ذرا بھی توجہ نہ دی جبکہ دیپک نے درخت کی نچلی شاخوں کو ہماری جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے پاگلوں کی طرح چلا کر کہا لبھا بھاگ! انورا سچ کہتا ہے درخت کی شاخیں واقعی ہماری جانب بڑھ رہی تھیں۔"

لبھا نے گھبراہٹ میں اپنا کام چھوڑا اور دیپک کا ہاتھ پکڑ کر شاخوں سے دور جانے کی کوشش کی لیکن درخت کی شاخوں کی رفتار ان دونوں کے بھاگنے کی اسپیڈ سے کہیں زیادہ تھی درخت کی شاخوں نے دیپک اور دونوں کو بری طرح جکڑ لیا اور پھر ان شاخوں نے ان دونوں کو اٹھا کر درخت کے اوپر لے گئیں۔ وہ دونوں بڑی دلخراش چیخوں کے ساتھ۔ "مدد۔ مدد" کے لئے پکارتے رہے۔ لیکن درخت کی شاخیں اپنا بھیانک کام دکھلا چکی تھیں۔

ان شاخوں نے مجھے بھی اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن خوش قسمتی سے میں ان سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ اس لئے وہ شاخیں میرے قریب ضرور آئیں لیکن ان کا مجھے اپنی گرفت میں لینے کا بس نہیں چلا۔ وہ بلا آخر واپس چلی گئی۔"

☆......☆......☆

انورا نے اپنا جب یہ بیان مکمل کر لیا تو تھانیدار بھنا کر بولا۔ "تو بکواس کرتا ہے۔ یہ تو کیا مجھے کوئی سیدھی میرا دماغ خراب کرنے والی نہ قابل یقین بے معنی کہانی سنا رہا ہے چل جلدی بتا کہ دیپک اور لبھا کہاں ہے؟"

درمیان میں ایک سپاہی نے تھانیدار کو لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ "سر! میرا خیال ہے کہ اس نے لئے ہوئے مال کو ہڑپ کرنے کی لالچ میں دونوں کو مار دیا ہو۔"

"ہاں کلو رام تیری بات میں وزن ہے مجھے بھی یہی شک ہے کہ اس خبیث نے لبھا اور دیپک کو لئے ہوئے مال کے لالچ میں ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔ لا۔ اوئے فرقہ۔" کرپان سنگھ نے شامل خان کو کہا۔

میں نے شامل خان کو آہستگی سے کہا "یہ فرقہ اگر اس کمزور انورا کے جسم پر پڑا تو لازما اس کی تکلیف برداشت نہ کر پائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کہیں فارغ نہ ہو جائے۔" میں نے اسے یہ بھی کہا کہ کسی طرح اس جنونی تھانیدار کو ایک طرف لے جا کر یہ سمجھاؤ کہ انورا کو ویسے ہی ڈرا دھمکا کر بغیر فرقہ مارے اس سے مزید راز حاصل کر لے۔

شامل خان نے مجھ سے کہا کہ۔ "میں کرپان سنگھ کو یہ بات کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

شامل خان نے حالانکہ چپکے سے یہ بات کرپان سنگھ کے کان میں ڈالی تھی لیکن وہ الٹا شامل خان کے پیچھے پڑ گیا۔ اور کرخت آواز میں کہنے لگا تو نے یہ بات کی تو کیوں کی تم لوگ کھڑے ہو کر صرف وہ کرو جو میں کہتا ہوں۔" کرپان سنگھ نے ہماری ایک نہ سنی۔ اور اس نے انورا کے جسم پر فرقہ برسانے لگا تو انورا کی دلدوز چیخ

... تھانیدار صاحب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دیپک اور لبھا برگد کے درخت کی شاخوں نے اپنی گرفت میں لے کر سب سے اوپر لے جا کر شاید مار دیا ہے۔ میں سچ بول رہا ہوں۔"

کرپان سنگھ انورا کو ضرورت سے زیادہ جسمانی اذیت دے رہا تھا کہ اور وہ ہم سے نہ دیکھا گیا۔ شامل خان نے میری جانب کن انکھیوں سے دیکھا اور پھر ہم سب نے بھی یہ بات محسوس کی کہ انورا انتہائی تکلیف میں تھا اور اسے دیکھ کر یہ بھی لگ رہا تھا کہ وہ مرنے والا ہے۔

شروع میں تو کسی نے تھانیدار کو روکنے کی کوشش نہ کی لیکن جب شامل خان سے نہ رہا گیا تو اس نے آگے بڑھ کر کرپان سنگھ کا ہاتھ پکڑ لیا تو کرپان سنگھ نے انورا کو چھوڑا اور شامل خان کو ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "تیری یہ مجال کہ تو میرے سرکاری کام میں مداخلت کرے۔"

"یہ سرکاری کام نہیں ہے کرپان سنگھ کہ تم اس کو موت سے ہمکنار کرنے والا ظلم کر رہے ہو ہو۔"

"تو اپنی زبان بند رکھ۔" کرپان سنگھ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

شامل خان کے ساتھ ہم سپاہی بھی شامل ہو گئے بڑی مشکل سے ہم نے کرپان سنگھ کو راضی کیا کہ وہ انورا کو فی الحال چھوڑ دے۔

نڈھال انورا کو واپس تھانے کی کوٹھری میں لایا گیا۔

کرپان سنگھ نے انتہائی طیش میں آ کر شامل خان کو کہا۔ "اگر تجھے اس مجرم سے ہمدردی ہو رہی ہے تو پھر تو ہی اپنے طریقہ سے اس سے پوچھ کہ اصل معاملہ کیا ہے؟"

شامل خان نے کرپان سنگھ کو جواب دیا۔ "یہ معاملہ میرے سپرد کر دو۔"

"یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اس پر بغیر تشدد کے اصل حقیقت آپ کے سامنے لاؤں گا۔" کرپان سنگھ نے انورا کو شامل خان کے سپرد دو شرطوں کے تحت حوالہ کیا۔

پہلی شرط یہ تھی کہ اگر یہ بھاگ گیا تو ساری ذمہ داری اس کی ہوگی اور دوسری بات یہ ہے کہ مجھے تین روز کے اندر رزلٹ چاہئے۔"

شامل خان نے بڑے دھڑلے سے سینہ پھلا کر کرپان سنگھ سے کہا۔ "میں اگر تین روز کے اندر اس تھی کو نہ کھول پایا تو میرا نام شامل خان نہیں۔"

ادھر لبھا کے لواحقین بھی روتے پیٹتے تھانے میں پہنچے وہ بھی اپنے گھر سے فلاں تاریخ سے غائب ہے اور انہیں یہ شک ہے کہ اسے دیپک اور انورا نے قتل یا اغوا کیا ہے۔ بالکل اسی قسم کی کچی رپورٹ دیپک کے باپ نے انورا اور لبھا کے خلاف کٹوائی تھی۔

شامل خان کے لئے یہ مسئلہ کسی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اس نے سب سے پہلے انورا سے کہا۔" میں نے تجھ پر ترس کھا کر میں نے اپنی ذمہ داری پر ظالم کرپان سنگھ کے چنگل سے بچایا ہے۔ لیکن اب خدا کے واسطے مجھے ساری حقیقت بتلا دے۔"

انورا قسم کھا کر اپنی اسی بات پر اڑا رہا کہ لبھا اور دیپک کو برگد کے درخت کی لمبی شاخوں نے پہلے اپنی گرفت میں اچھی طرح لپیٹا اور وہ پھر ان دونوں کو اپنے درخت کے اوپری حصے پر لے گئی۔ بقول اس کے کہ شروع شروع میں ان دونوں کی دل دہلانے والی زوردار چیخیں آتی رہی اور پھر اچانک خاموشی چھا گئی۔

شامل خان اس کے بعد انورا کو ہتھکڑی پہنا کر ڈاکٹر ابھیشک کے گھر لے گیا وہاں اس کے بیٹے نے فوری طور پر انورا کو پہچان لیا۔ اسی دوران ڈاکٹر ابھیشک کے نوکر کو بھی گرفتار کر لیا تھا اس نے بھی اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا۔

دوسری جانب دیپک اور لبھا کے لواحقین نے شک کی بنا پر ایک ایف۔ آئی۔ آر انورا کے خلاف اندیشہ اغوا یا قتل کٹوا دی تھی۔ ایف۔ آئی۔ آر کے کٹنے کے بعد کرپان سنگھ نے قانونی طور پر انورا کے خلاف عدالت

سے جسمانی ریمانڈ حاصل کیا انورا پر چوری کے اندیشہ دوسرے قتل اغوا اور نہ جانے کتنے الزامات ڈالے گئے تھے کرپان سنگھ نے اس بار انورا کو دل کھول کر ہر طریقہ سے مارا کوٹا۔ لیکن وہ اپنی اس بات پر اڑا رہا کہ لبھا اور دیپک کو برگد کی شاخوں نے مارا ہے۔

ایک ایسا بھی وقت آیا کہ کرپان سنگھ جب اس کی زبان سے کوئی نیا انکشاف نہ اگلوا سکا تو اس نے اس برگد کے درخت کے معائنہ کا فیصلہ کیا وہ پولیس کے چند سپاہی اور انورا کو ساتھ لے کر اس درخت کے پاس گیا۔ وہاں لوگوں کا جم غفیر جمع ہو گیا تھا۔ ان میں زیادہ تر کٹر مذہبی ہندو تھے۔

کرپان سنگھ نے ان کٹر مذہبی ہندوؤں سے کہا ۔" مجھے اس درخت کی جڑوں اور اوپر شاخوں کا معائنہ کرنا ہے۔" تو انہوں نے کرپان سنگھ کو کہا۔" یہ برگد کا درخت ہمارے لئے انتہائی مقدس ہے ہم کسی صورت بھی اس کے مقدس کو پامال نہیں کر سکتے۔"

کرپان سنگھ نے جواب دیا۔" اس درخت کا معائنہ کرنا اس کی قانونی مجبوری ہے۔" تو ان مذہبی ہندوؤں نے وہاں مزاحمت کی۔ لہٰذا پولیس پارٹی بغیر کسی کارروائی کے واپس آ گئی۔

ادھر لبھا اور دیپک کے رشتہ دار عدالت اور پولیس میں بار بار درخواست پر درخواست دیئے جا رہے تھے۔

کرپان سنگھ پر ہر طرف سے بڑا پریشر تھا۔ وہ بھی اپنے تئیں انتہائی پریشان ہو گیا تھا وہ کس طرح برگد کے درخت کا معائنہ کرے۔ اس کے سامنے کئی مسائل تھے وہ درخت انتہائی لمبا پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بالکل اوپر تک جانا انتہائی مشکل تھا۔ اس کی لمبائی کم از کم 60/70 گز تو ہو گی اس درخت کا معائنہ کرنے کی کٹر ہندو اجازت نہ دے رہے تھے اور بھی کئی دیگر مسائل تھے درحقیقت یہ عجیب و غریب پراسرار سطح کا کیس کرپان سنگھ کے گلے پڑ گیا تھا۔

ایک دن اس نے پولیس پارٹی اتھارٹی کو خط لکھا کہ اسے اس برگد کے درخت کے معائنہ کی خاطر مزاحمتی کٹر ہندوؤں کے عتاب سے بچنے کے لئے مزید پولیس کی نفری فراہم کی جائے۔

کرپان سنگھ کو حکومت نے اضافی پولیس دے دی کرپان سنگھ ایک بھاری پولیس ٹیم کے ساتھ برگد کے درخت کے پاس پہنچا۔

کٹر مذہبی ہندو بھاری پولیس کی تعداد دیکھ کر ڈر گئے اس بار انہوں نے اپنا کوئی مزاحمتی ردعمل ظاہر نہ کیا۔

کرپان سنگھ نے دیوہیکل درخت کے طویل تنے کی آس پاس کی مٹی کھرچ کھرچ کر دیکھی وہ سرخی مائل تھی (خونی رنگت کی) اس کے بعد اس نے ایک مقامی جوان لڑکے کو کہا کہ وہ درخت کے بالکل اوپر تک جا کر دیکھے کہ وہاں کیا ہے؟ یہ سنتے ہی وہ لڑکا اس درخت پر چڑھنے لگا اور کافی اوپر تک جا پہنچا کہ اچانک وہ کسی پتھر کی مانند درخت سے دھڑام لڑھک کر نیچے گرا۔ اس کا منہ ٹوٹ گیا تھا وہ نیچے زمین پر گرتے ہی ساکت ہو گیا اس کے مرنے کے بعد تین روز تک خوف کے مارے کوئی شخص اس درخت کے قریب نہیں پھٹکا۔ اس دوران انورا نے کرپان سنگھ کو بتلایا کہ۔" لبھا نے ڈاکٹر ابھیشک کے گھر سے لوٹے ہوئے سونے کو دو جگہ اور روپوں کو تین جگہ تقسیم کیا تھا۔" کرپان سنگھ نے اس سے کہا کہ" ارے کیا وہ درخت روپے سونا بھی کھا گیا۔" تین روز بعد کرپان سنگھ پولیس کی بھاری نفری لے کر اس درخت کا معائنہ کرنے گیا وہاں اس نے ایک شخص کو یہ لالچ دیا کہ اگر اس درخت سے جتنا بھی روپیہ سونا مل گیا اس میں سے دس فیصد اسے بطور انعام ملے گا۔

وہ شخص کرپان سنگھ کی جانب سے اس پیشکش پر راضی ہو گیا اس نے بڑی باریک بینی سے اس درخت کی ایک ایک شاخ کو ٹٹولا۔ اسے وہاں ایک جگہ سے سونے کی پوٹلی اور کچھ روپے ملے اس نے اس کے بعد اس درخت کا پھر سے چپہ چپہ چھانا۔ لیکن اسے وہاں مزید کچھ نہ ملا۔ کرپان سنگھ نے اس سے کہا" تو درخت کے آخری سرے پر جا کر یہ دیکھ کہ وہاں کوئی خاص چیز ہے۔"

اس نے کہا۔" تھانیدار صاحب اس درخت کے آخری چھور پر ایک بہت بڑا ٹیڑھا سا خلا ہے۔"

اچھا اس درخت کا اچھی طرح معائنہ کر کہ یہاں چوروں کی جانب سے لوٹا گیا سونا، روپیہ تو نہیں پڑا ہوا۔"

اس شخص نے درخت کی شاخوں کا چپہ چپہ چھاننا شروع کر دیا۔ اسے دو جگہ سے علیحدہ علیحدہ 10/10 کے نوٹ ملے۔ (اس زمانہ میں 10 روپے آج کے 2000 روپے کے برابر تھے) کرپان سنگھ نے اسے کہا کہ" وہ اب نیچے آ جائے۔" لیکن وہ شخص اپنے لالچ میں اس درخت پر کافی دیر تک چڑھا رہا۔ تھانیدار نے اس شخص کو 5 روپے دے کر ٹال دیا۔ انورا کو دوبارہ تھانے میں لایا گیا کرپان سنگھ اسے بار بار نفسیاتی طور پر تشدد کر کے یہ زور دیتا رہا کہ وہ کسی طرح لبھا اور دیپک کے قتل یا اغوا کی اصلیت بتلا دے لیکن وہ بڑے وثوق سے قسم کھا کر یقین دلانے کی یہ کوشش کرتا رہا کہ ان دونوں کو واقعی برگد کے درخت کی شاخوں نے ہی مارا ہے اور لبھا نے لوٹے ہوئے سونے اور پیسوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

ایک بار کرپان سنگھ بذات خود ہم سپاہیوں کو لے کر مذکورہ درخت کے پاس گیا۔ اس نے وہاں کے مقامی لوگوں سے اس کی تاریخی حیثیت کا پتہ لگوا دیا۔ وہاں کے پرانے لوگوں نے اس امر کی تصدیق کی کہ برسوں پہلے رات کے وقت ایک ہندو پجاری کا لڑکا پراسرار طریقہ سے غائب ہوا تھا۔ اور اس کی لاش کا ایک حصہ اس درخت کی دیوہیکل شاخوں کے اوپر سے ملا تھا۔"

راوی نے اس کہانی کا دلچسپ موڑ بتلایا کہ ایک دن اتوار کے روز سرکاری چھٹی تھی میں علی الصبح کے وقت گہری نیند سویا ہوا تھا کہ اچانک میرے گھر میں تھانے کا سپاہی شامل خان بڑی پریشان کن حالت میں آیا اس نے مجھے اٹھا کر یہ بڑی بری خبر سنائی کہ تھانیدار کرپان سنگھ کی لاش برگد کے درخت کے پاس سے ملی ہے۔"

یہ خبر سن کر میرے پاؤں سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی میں نے شامل خان سے پوچھا۔" کرپان سنگھ اس درخت کے پاس کیسے پہنچا اور اسے کس نے قتل کیا۔؟"

اس نے بتلایا کہ" کرپان سنگھ نے جب انورا کے منہ سے یہ لفظ سنا کہ لبھا نے درخت کے تنے میں لوٹا ہوا سونا اور روپیہ چھپانے سے پہلے اس کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا تھا تو ہو سکتا ہے کہ اسے حاصل کرنے کا لالچ اس کے دل میں امنڈ آیا ہو۔

بقول راوی کے میں اور شامل خان جب وقوع پر پہنچے تو وہاں کرپان سنگھ کی لاش بری طرح مسخ حالت میں نظر آ رہی تھی جیسے اسے کسی بھاری بھرکم طاقتور شے سے بھینچ بھینچ کر مارا گیا ہو۔

پولیس کے کھوجیوں نے اس درخت کی آخری دیوہیکل ٹہنیوں کو دیکھا تو وہاں خون ٹپک رہا تھا اس منظر کو دیکھ کر لوگوں کے دل دہل گئے۔

وہاں ہمارے علاقہ کا ڈی ایس پی کاندھے شام ہماری آمد سے پہلے موجود تھا۔

ڈی ایس پی کاندھے شام نے اردگرد کے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی موقع کا عینی گواہ ہے یا وہ اس حادثہ کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ لوگوں کے درمیان سے ایک شخص انتہائی ڈرے ہوئے انداز میں ڈی ایس پی کے قریب آیا اور اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔" میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں...... کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" ڈی ایس پی نے کہا۔

تو اس شخص نے کہا۔" سرکار آج میں صبح جب اس درخت کی پوجا کے لئے آیا تو میں نے دور سے ایک پتھر کی آڑ میں چھپ کر یہ منظر دیکھا کہ تھانیدار صاحب ایک نوجوان شخص کو چاقوؤں کی مدد سے قتل کر رہے ہیں اور قتل ہونے والا نامعلوم نوجوان کہہ رہا۔" تھانیدار صاحب آپ میرے ساتھ دھوکہ کر رہے ہیں۔"

تھانیدار صاحب نے جواباً کہا۔" چل جا کر کام کر، یہ لے، میں نے بھی تیرے ساتھ مل کر مال تلاش کیا

ہے۔" پھر تھانیدار صاحب نے پے در پے حملہ کرکے اسے قتل کردیا قتل کرنے کے بعد وہ اس نوجوان کی لاش کو میرا خیال ہے ٹھکانے لگانے کا چاہ رہے تھے کہ اتنے میں درخت کی شاخیں بڑی تیزی سے دونوں کی جانب بڑھی اوران شاخوں نے زمین پر مردہ تھانیدار کے ہاتھوں قتل شدہ نوجوان کی لاش کو اٹھایا اور پھر جب تھانیدار صاحب بھاگنے لگے توان شاخوں نے بجلی کی مانند آگے لپک کر انہیں اپنے شکنجے میں جکڑ لیا اور پھران شاخوں نے تھانیدار صاحب کے جسم کو بھینچ بھینچ کر کچومر نکال دیا۔"

"تو اپنے ہوش حواس سے یہ بات کررہا ہے۔"

ڈی ایس پی صاحب نے اس سے یہ بات پوچھی۔ تو جواباً اس شخص نے کہا۔

"اگر میں جھوٹ بولوں تو مجھے بھگوان کی مار پڑے۔"

اس شخص کی گواہی کی روشنی میں ڈی ایس پی نے اس واردات کی مزید تصدیق کے لئے درخت پر چڑھنے کے لئے وہاں کھڑے لوگوں سے کہا کہ "تم میں سے کوئی ایسا باہمت شخص ہے جواس درخت پر چڑھ کر ہمیں اس واردارت کی مزید معلومات دے۔"

سچی بات ہے وہاں کھڑے کسی شخص نے بھی اس درخت پر چڑھنے کی حامی نہ بھری اور آہستہ آہستہ وہاں سے سب کھسک گئے۔

DSP کاندھے شام سر جھکائے اور پریشانی کی حالت میں ٹہلتے ہوئے کافی دیر تک کچھ سوچتے رہے اور پھر انہوں نے شامل خان اور مجھے اپنے پاس بلا کر یہ بات بڑی آہستگی سے کانوں میں کہی۔ "تم یہاں سے کافی دور جاکر کسی ہٹے کٹے مگر غریب مالیے نوجوان کو چرس کے جرم میں جامع تلاشی کرکے لے آؤ مجھے اس وقت اس قسم کے نوجوان کی بہت سخت ضرورت ہے۔

پھر ڈی ایس پی کے حکم کے مطابق ہم نے اس جگہ سے تھوڑی دور جاکر ایک غریب لڑکے کو روک لیا۔ شامل خان نے ایک چھوٹی سی چرس کی ڈلی چپکے سے اس کی جیب میں ڈال دی تھی ہم نے اسے نشہ آور شے رکھنے کے جرم میں دھرلیا۔ وہ بے چارہ واویلا ہی کرتا رہا کہ وہ بے قصور ہے۔

ہم اسے ڈی ایس پی کاندھے شام کے پاس لے آئے۔ شامل خان نے DSP سے کہا۔ "سر اسے ہم نے نشہ آور اشیار رکھنے کے جرم میں گرفتار کیا ہے۔" اور پھر اسے مصنوعی طور پر روایاتی سخت پولیس لہجہ میں گندی گالیاں دے کر خوب ڈرایا، دھمکایا۔ وہ بے چارہ DSP کے قدموں میں گر کے بے گناہی کا ثبوت دینے لگا۔ "میں ایک غریب مزدور ہوں یہ دیکھیں میرے پاس یہ کپڑوں پرابھی تک مٹی کے نشان لگے ہوئے ہیں اور میں تو سگریٹ تک نہیں پیتا۔"

دراصل اس غریب کو معلوم ہی نہیں تھا کہ DSP نے اسے کسی مقصد کے لئے یہاں بلایا ہے۔

"اچھا تجھے ایک شرط پر چھوڑیں گے۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

"وہ کیا؟" اس نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔

DSP نے کہا۔ "تو اس درخت کے آخری سرے پر چڑھ کر یہ دیکھ کے وہاں کیا نظر آرہا ہے؟"

"سر میں اس منحوس خونی درخت پر نہیں چڑھ سکتا، یہ درخت پہلے ہی کئی انسانوں کی جانیں لے چکا ہے۔"

شامل خان آگے بڑھا اور نرم لہجے میں بولا۔ "ڈی ایس پی صاحب کی بات مان لے اور اپنے اوپر پڑی مصیبت سے اپنی جان چھڑالے۔"

"مجھے جیل جانا منظور ہے لیکن میں اس خونی درخت پر چڑھ کر اپنی جان جوکھم میں نہیں ڈال سکتا۔" وہ بولا۔

ایک تو میں تیرے ساتھ ہمدردی کررہا ہوں کہ تو جیل جانے اور پولیس کی چھتروں سے بچ جائے۔ اور تو ہے کہ درخت پر چڑھنے کے لئے نخرے کررہا ہے۔"

"شامل خان اسے ڈرائنگ روم میں لے جاکر اس کے جسم کے تھرڈ ڈگری کی پولیس کٹائی کا ذائقہ چکھاؤ۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

وہ نوجوان ہم پولیس والوں کے ہاتھوں پھنسا ہوا تھا اس نے تھانے میں جاکر ہمارے ہاتھوں ذلیل ہونے

کے بجائے مجبوراً درخت پر چڑھنے کو ترجیح دی وہ درخت پر چڑھنے پر مان گیا وہ جب درخت پر چڑھا تو ڈی ایس پی نے اس سے پوچھا۔ "درخت کی شاخوں میں کیا نظر آرہا ہے؟"

اس لڑکے نے درخت کی شاخوں کو بغور دیکھنا شروع کردیا۔

اس نے نیچے کھڑے ڈی ایس پی سے کہا ان شاخوں کی اوپری رنگت سرخی مائل ہے اور جگہ جگہ گوشت کی بوٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ انسانی گوشت کے چھیچھڑے ہیں۔

"کیا کہا؟"

DSP نے حیرت انگیز انداز میں جیسے چلاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟"

"سر جی، میں سچ بول رہا ہوں۔ اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آرہا تو خود اوپر آکر دیکھ لیں۔"

"اگر ہم میں سے کسی کو درخت کے اوپر آنا ہوتا تو ہم تجھے یہاں کیوں لاتے؟"

جہاں وہ لڑکا کھڑا تھا اس کی اوپری شاخ سے کچھ زیادہ ہی خون رس رس کر نیچے گر رہا تھا۔ ڈی ایس پی نے اس لڑکے کو بارعب انداز میں کہا "اپنے سے ذرا اوپری شاخ پر جاکر دیکھ وہاں کیا ہے؟"

وہ لڑکا جب اوپری شاخ پر گیا تو اس نے خوف زدہ انداز میں ٹوٹے ہوئے لفظوں میں کہا۔ "سر یہاں کسی شخص کا کٹا ہوا دھڑ اور بازو پڑا ہوا ہے۔"

اس کی اس بات سے نیچے کھڑے سارے لوگ اور ہم سب کی گھگی بند ہوگئی۔ DSP کی زبان بھی پہلی بار خوف کے مارے عجیب ہوگئی خیر انہوں نے بڑے دھیمے الفاظ میں کہا۔ "تو اس کٹے ہوئے بازو کو نیچے پھینک۔"

وہ لڑکا بھی اپنے تئیں ڈرتے ڈرتے اس شاخ پر آگے بڑھا۔ اس نے درخت سے اس کٹے بازو کو جب نیچے پھینکا تو ہم سخت دل پولیس والوں کے دل بھی ایک لمحے کو لرزہ گئے۔

DSP نے مجھ سے کہا۔ آگے بڑھو اور اس بازو کو اٹھاؤ۔"

سچی بات ہے میرا تو اس بازو کو اٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ میں نے اسے زمین سے اٹھانے سے انکار کردیا تو DSP نے مجھے غصیلی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "تو نے میرے آرڈر کی عدولی کی ہے۔ میں تجھے (Suspend) کردوں گا۔"

"ڈی ایس پی صاحب اپنا غصہ تھوکیں چلیے میں آج کے حکم پر یہ کام کردیتا ہوں۔"

شامل خان نے میری خاطر زمین پر پڑے اس خون ٹپکتے ادھڑے ہاتھ کو اٹھالیا۔ ڈی ایس پی نے اسے بغور دیکھنا شروع کیا تو وہ خود ہی بولے۔ "دیکھو اس ہاتھ کے اردگرد شاخوں کے بھینچے کے نشانات واضح طور پر نظر آرہے ہیں اوراس پر شاخوں کے سبزی مائل نشانات بھی موجود ہیں۔ یہ آج قانونی طور پر واضح ہوگیا کہ قدیم درخت واقعی خونی ہے۔

"لڑکے اب تم نیچے آجاؤ" ڈی ایس پی نے کہا۔

"وہ نوجوان جیسے ہی اس درخت سے نیچے اترنے لگا تو ہم لوگوں نے بہت خوف ناک اور عجیب چیز محسوس کی کہ اس درخت کی اوپری شاخوں میں عجیب قسم کا ارتعاش پیدا ہوا۔ حالانکہ اس وقت ہوا بالکل بھی نہیں چل رہی تھی یہ ارتعاش اس بات کا ثبوت تھا کہ اس درخت کو کسی بات پر غصہ آرہا ہے۔ "نوجوان جلدی سے نیچے آ۔ چل جلدی کر۔" ہم سارے جو نیچے کھڑے تھے سب نے چلا چلا کر کہا۔

اب درخت کی شاخیں پہلے سے زیادہ تیزی سے نیچے آنے لگی تھیں ہم نے لڑکے کو مشورہ دیا کہ وہ درختوں کی شاخوں کو کراس کرکے نہ آئے بلکہ وہ اوپر سے نیچے چھلانگ لگادے۔

"اس نے چلا کر کہا کہ اس طرح کودنے سے تو میری ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جائیں گے۔"

"لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" میں نے آواز لگائی۔ "تو ہمت کرکے انتہائی تیزی سے نیچے آنے کی کوشش کر۔" خیر لڑکے نے اپنی جان بچانے کے

لئے واقعی بڑا رسک لے کر درخت کی شاخوں کو نیچے آنے کے لئے کراس کیا اور ہم نے نیچے سے یہ محسوس کیا کہ درخت کی شاخوں نے کچھ زیادہ ہی تیزی سے اس کی جانب بڑھنا شروع کردیا ہے تو اس نوجوان کو ہم نے چلا چلا کر کہا۔ ''تو اب لازماً نیچے کود اور یہ تیرا اپنی زندگی بچانے کا آخری موقع ہے۔''

اس نوجوان نے ہماری ہدایات پر عمل کیا وہ درخت کی تقریباً 20/15 فٹ بلندی سے نیچے زمین پر کود گیا وہ پیر کے بل کودا تھا وہ زمین پر گر کر فوری طور پر سکتے کے عالم میں بے ہوش ہوگیا تھا۔

اسے شامل خان اور دو سپاہیوں نے بڑی سرعت انگیزی سے وہاں سے اٹھا کر خونی شاخوں سے دور ہٹا کر اسے فوری طور پر قریبی اسپتال لے گئے خوش قسمتی سے اس نوجوان کی کوئی ہڈی وغیرہ نہیں ٹوٹی تھی اسے اسپتال ہی سے فارغ کردیا گیا DSP کاندھے شام نے اسے اپنی جیب سے 50 روپے دے کر اس سے معذرت اور معافی بھی مانگی تھی۔

بقول راوی کے اب اس پراسرار خونی برگد کے درخت کے بارے میں یہ بات سب پر واضح ہوگئی تھی کہ وہ واقعی خونی درخت ہے اس کے بعد انورا کا لبھا اور دیپک کے قتل اور اغوا میں کوئی ہاتھ نہیں یعنی وہ اس معاملہ میں بے قصور ہے اسے بعد میں عدالت نے چوری اسلحہ رکھنے اور دیگر الزامات کے ثابت ہونے کی بنا پر 3 ماہ کی سزا دی تھی۔

ڈی ایس پی نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ برگد کے اس درخت سرکاری طور پر انسانیت کا قاتل اور خونی تسلیم کرتے ہوئے اسے کٹوا دیا جائے تو بہتر ہے۔'' نیز اس کی یہ وضاحت بھی کی کہ اس خونی درخت کی وجہ سے اردگرد کی آبادی میں شدید خوف وہراس پیدا ہوگیا ہے۔''

چند روز بعد متعلقہ محکمے نے DSP کو یہ اجازت دے دی کہ اس درخت کو کٹوا دیا جائے، اب (ڈی ایس پی) کے سامنے یہ مسائل لاحق تھے کہ اتنے دیوہیکل درخت کو کیسے کاٹا جائے اور دوسری بات یہ کہ یہ درخت ہندوؤں کی نظر میں ان کا مقدس درخت ہے، کٹر مذہبی ہندو یہاں آ کر اپنی پوجا پاٹ کیا کرتے ہیں، خیر ڈی ایس پی نے بڑی مشکل سے اس درخت کو کاٹنے کے لئے بندے اکٹھے کئے جب انہوں نے آریاں، کلہاڑیاں رسیاں لے کر اس درخت کو کاٹنے کے لئے اس جگہ پہنچے تو وہاں پہلے سے ہی سیکڑوں کٹر مذہبی اور لڑاکا طبیعت کے حامل ہزاروں لوگ موجود تھے۔ ڈی ایس پی نے ان لوگوں سے کہا کہ انہیں سرکاری طور پر آرڈر ہے کہ اس خونی درخت کو جڑ سے کاٹ دیا جائے جبکہ دوسری جانب کٹر مذہبی ہندوؤں نے وہاں ڈی ایس پی کو سختی سے تنبیہ کی کہ اگر اس مقدس درخت کو کاٹا گیا تو یہاں شدید قسم کی مزاحمت کی جائے گی۔

ڈی ایس پی اپنی جگہ اڑے رہے کہ میں نے لوگوں کے اندر سرایت شدہ خوف اور ڈر کو ہر صورت میں نکالنا ہے اور اس خونی درخت کو جو کہ لوگوں کی جان سے کھیل رہا ہے اس کو ہر قیمت پر ہٹانا ہے۔''

کٹر مذہبی ہندوؤں نے پولیس پارٹی پر شدید پتھراؤ اور فائرنگ شروع کردی ڈی ایس پی نے بھی پولیس کو جوابی فائرنگ کا حکم دیا۔

الغرض دونوں جانب سے فائرنگ پتھراؤ کے نتیجہ میں 14 افراد مزید اپنی جان سے گئے اور متعدد زخمی بھی ہوئے۔

رات گئے ہیڈ آفس سے ڈی ایس پی کو حکم ہوا کہ مذکورہ درخت کو کاٹنے کا فیصلہ فی الحال موخر کیا جائے کیونکہ اس سے کٹر مذہبی لوگوں کے درمیان مزید غصہ بڑھے گا۔'' لہٰذا ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس درخت کو کاٹنے کا پروگرام ختم کردیا گیا لیکن برگد کے اس درخت کا نام خونی درخت پڑ گیا تھا لوگوں میں اس قدر خوف وہراس بیٹھ گیا تھا کہ لوگوں نے پوجا پاٹ کے لئے بھی اس درخت کے قریب جانا چھوڑ دیا بلکہ کوئی شخص بھول کر بھی وہاں نہیں جاتا تھا۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

خواب بن کر اس کی آنکھوں میں اتر جاتے ہیں ہم
بس میں ہوتا تو یہ بھی کر جاتے ہم
کتنے خوش تھے ہمیں چاہتا ہے وہ کتنا پاگل
اسی خوش فہمی میں اچھا تھا مرجاتے ہم
(شائستہ سحر...... راولپنڈی)

ہم سہل طلب کون سے ''فرہاد'' تھے لیکن
اس شہر میں تیرے، کوئی ہم سا بھی کہاں ہے؟
دیوانے ہیں، تم ہمیں مجبور نہ جانو......
مرجائیں گے، لیکن تمہیں آواز نہ دیں گے
(انتخاب: ساحل دعا بخاری...... بصیرپور)

جن کی وفا کے طلبگار ہوئے جاتے ہیں
آہستہ آہستہ وہ ہم سے بیزار ہوئے جاتے ہیں
میرے دل پہ جو نقش ہیں پھر سے نشاں کیسے
بھولے سے میرے دل میں بیدار ہوئے جاتے ہیں
(محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد)

ہم خوشبو کے سوداگر ہیں سودا سچا کرتے ہیں
جو گاہک پھول جیسا ہو ہم بن دامو بک جاتے ہیں
شہر وفا کے لوگوں تم حال بھلا کیا جانو گے
ہم دل کی چوٹ چھپاتے ہیں آنسو تک پی جاتے ہیں
(شرف الدین جیلانی...... ٹنڈو الہ یار)

رکتا بھی نہیں ٹھیک سے چلتا بھی نہیں ہے
یہ دل کہ تیرے بعد سنبھلتا بھی نہیں ہے
یہ شہر کسی آئینہ کردار بدن پر
الزام لگاتے ہوئے ڈرتا بھی نہیں ہے
(رضیہ عارف...... کراچی)

آج پھر ساون ٹوٹ کر برسا ہے
آج پھر کسی کے لہجے میں نمی ہے
پھر سے وحشت کے ہالے میں ہوں مقید
آج پھر یادوں کی محفل جمی ہے
(فرزانہ عابد...... لاہور)

ڈھونڈا کرو گے اک روز میرے خلوص کو نوری
سوجائیں گے جس دن ہم زمین اوڑھ کر
(غلام نبی نوری...... قصور)

پیار سے بڑھ کر نہیں دنیا میں کوئی روشنی
پی گئے یہ روشنی تو آئینہ ہوجاؤ گے
گفتگو میٹھی کرو ہر شخص سے جھک کر ملو
دشمنوں کے واسطے بھی دلربا ہوجاؤ گے
(بلقیس خان...... پشاور)

تیری ہستی سے تیری ذات سے خوشبو آئے
تو جو بولے تیری ہر بات سے خوشبو آئے
تو چنبیلی ہے کہ نرگس ہے کہ ہے رات کی رانی
تجھ کو چھولوں تو میرے ہاتھ سے خوشبو آئے
(احسان سحر...... میانوالی)

خوابوں کی دنیا بسانے والے کبھی حقیقت میں آ کر تو دیکھ
ٹوٹ کر بکھر جائیں گے شیشے کی طرح اک بار آ کر ہم کو تو دیکھ
(طارق عزیز...... کوٹھا کلاں)

ہنس ہنس کر آنکھ سے دریا بہا دیا
اب اس قدر بھی زندہ دلی نہیں چاہتا میں
(سنبل ماہین طہٰ...... سرگودھا)

میری قربت کا زمانہ تیری فرقت کا ملال
کسی صورت بھی بھلایا نہ گیا عید کے دن
پھر تصور میں دریچے تیری یادوں کے کھلے
پھر تیرے درد کا احساس ہوا عید کے دن
(جاوید خان...... پشاور)

تیری یادوں کے چراغوں کو جلایا ہر شام
تیری تصویر کو سینے سے لگایا ہر شام
مانگی ہے خدا سے تیرے ملنے کی دعا
بیٹھ کے تنہا ہاتھوں کو اٹھایا ہر شام
(مہہ جبین...... پشاور)

☆☆

آنکھوں میں سیلاب ہے پیارے اور ہے کیا
اجڑا اجڑا خواب ہے پیارے اور ہے کیا
نیند بکھر جاتی ہے ہر اک آہٹ پر
دل میرا بے تاب ہے پیارے اور ہے کیا
نفرت کی دیوار کھڑی ہے راہوں میں
پیار بہت نایاب ہے پیارے اور ہے کیا
آج بھی میری سوچ کے گہرے ساگر میں
کشتی اک غرقاب ہے پیارے اور ہے کیا
آج بھی رانا اپنا جیون شیشے کا
درد کا ایک ہی باب ہے پیارے اور ہے کیا
(قدیر رانا......راولپنڈی)

جو درد دیا تھا آپ نے خوشی سے
وہ تصور و خانہ بدل سکا کسی سے
جو تجھے مجرم کہوں عطا نہ ہو راحت مجھے
لگے آگ میری زباں کو جو میں گلہ کروں کسی سے
وہ پر نور راہیں وہ چراغ شام قربت
جنہیں تم بجھا گئے تھے وہ جلے نہیں کسی سے
نہ وہ بے قرار دل ہے نہ وہ دھڑکنیں ہیں باقی
میرا دل ٹھہر گیا آخر تیری بندہ پروری سے
نہ تم نے بتایا یہ کہ کہاں ہے دل کا ٹھکانہ
نہ ہم نے ہی جا کے پوچھا سر راہ گزر کسی سے
یہ پھولوں کے پہلو میں جو نمی ہے ابھی باقی
یہ وہی ہیں چار آنسو جو گرے تھے خوشی سے
یہ دل میرا کسی کے خیال سے دھڑکنے لگا جاوید
کوئی کہہ رہا ہے شاید تیری داستاں کسی سے
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

تجھے کیا ملا میری آنکھوں کو بنجر کرکے
میرے دل کو حسرت زدہ کھنڈر کرکے
مجھے علم ہے تو اب لوٹ کر نہ آئے گا

کیوں چلا گیا تو اس یقین کو میرا مقدر کرکے
یہ محبت وہ مسافت ہے جو ختم نہیں ہوتی
بکھر جاتا ہے انسان یہ سفر کرکے
وہ آج بھی مجھے تیری یاد دلاتی ہے
جس محبت کو تو نے چھوڑ دیا میری نظر کرکے
اس لمحے تو اشک جیسے لہو بن جاتے ہیں
تڑپ جاتا ہے دل تجھے یاد اس قدر کرکے
غم کے عالم میں تجھے کیسے صدا دوں میں
کاش تو لوٹ آئے میری زندگی میں سحر کرکے
(شائستہ سحر......راولپنڈی)

نہ وہ ملتا ہے نہ ملنے کا اشارہ کوئی
کیسے امید کا چمکے گا ستارہ کوئی
حد سے زیادہ نہ کسی سے محبت کرنا
جان لینا سدا جان سے پیارا کوئی
بے وفائی کے ستم تم کو سب آجاتے
کاش تم جیسا اگر ہوتا تمہارا کوئی
چاند سے جاگتے رہنے کا سبب پوچھا ہے
کیا کہیں ٹوٹ گیا خواب ہمارا کوئی
(انتخاب: وثیقہ زہرہ......فیض پور)

ہوا ہوگی، چراغوں کا اثر بھی مختلف ہوگا
نگاہوں میں اجالوں کا سفر بھی مختلف ہوگا
نئے انداز میں بکھریں گے اب کے پھول اشکوں کے
خبر کیا تھی، جو لوٹیں گے تو گھر بھی مختلف ہوگا
کچھ اپنے گاؤں کے حالات بھی بدلے ہوئے ہوں گے
وہ اپنی یاد کا تنہا شجر بھی مختلف ہوگا
سمٹ آئیں گے آنکھوں میں گلابوں کے نئے موسم
سو اب کی بار خوابوں کا نگر بھی مختلف ہوگا
در و دیوار عاطر پڑھ رہے ہیں بے قراری کو
ادھر یہ حال ہے تو پھر ادھر بھی مختلف ہوگا
(رانا حنیف عاطر......راولپنڈی)

چڑھتا ہوا جو پیار کا دریا اتر گیا
ترک تعلقات کے غم سے میں مر گیا

رکھا تھا اپنی جان سے بڑھ کر جسے عزیز
تنہائیوں کا زہر وہ جیون میں بھر گیا
رکھا ہوا ہے آج بھی دہلیز پر چراغ
آیا نہیں وہ لوٹ کر جانے کدھر گیا
چلنے کے باوجود بھی منزل نہ مل سکی
بے کار میری عمر رواں کا سفر گیا
بارش کے بعد بڑی دلنشیں لگی
رونے سے اس کا اور چہرہ نکھر گیا
دیکھا نہیں تھا میں نے کوئی زندگی میں دکھ
غم کی حکیم دھوپ سے چہرہ اتر گیا
(حکیم خان حکیم......کامل پور موسیٰ)

تم نہیں کرتے ملاقات چلو رہنے دو
یوں ہی کرنی تھی کوئی بات چلو رہنے دو
چاند آئے گا نہ تارے نہ تمہاری آہٹ
آج گزرے گی یونہی رات چلو رہنے دو
اب تمہیں کیسے بتاؤں کہ حقیقت کیا ہے
تم نہ سمجھو گے میری بات چلو رہنے دو
یوں بھی تو بھیک کی صورت نہیں مانگی جاتی
یہ محبت نہیں خیرات چلو رہنے دو
بے سبب کوئی بھی اجرا نہیں کرتا ایسے
اس کو کہتے ہیں مکافات چلو رہنے دو
جی میں آتا ہے کہ کچھ یاد کرا ہی ڈالوں
آج اس کی اوقات چلو رہنے دو
میں اگر سب کو بتا دوں واجد تو تماشا ہوگا
کیسے چھوڑا تھا میرا ہاتھ چلو رہنے دو
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی ......کراچی)

میں شاعر ہوتا تو ہجر کی شام لکھتا
تیرے نام محبت کے پیغام لکھتا
تیری آنکھوں کے سمندر میں ڈوب کر
تیری آنکھوں کا ساغر تمام لکھتا
جب کبھی تو میری آنکھوں کو چومتا
تیرے ہونٹوں کی حد کو جام لکھتا

اگر تیری بدنامی کا نہ ہوتا ڈر
محبت کی کہانی سر عام لکھتا
اگر اجازت دے دیتا میرا خدا رخشندہ
تو اپنی زندگی ساجد تیرے نام لکھتا
(ساجد جاوید......نارووال)

اب تو رات کو سونا دشوار ہوگیا
واپڈا کے چکر لگانا بے کار ہوگیا
تھکا ماندہ ابھی سویا ہی تھا بیچارہ
کہ لوڈشیڈنگ کے باعث وہ بیدار ہوگیا
کوسنے لگا وہ سابقہ حکومت والوں کو
اپنا بھلا وقت یاد کرکے بے قرار ہوگیا
کہ جب لوڈشیڈنگ کا نام و نشان نہ تھا
پریشانی میں گھرا کوئی انسان نہ تھا
خوشحالی کا دور دورہ تھا ملک میں چار سو
ایک دوسرے سے کوئی دست و گریباں نہ تھا
کریں کس سے شکایت واپڈا والوں کا
یہ ادارہ تو بہت طاقتور ہوگیا
لوڈشیڈنگ کے باعث غریب آدمی کا آج
دو وقت کی روٹی کھانا دشوار ہوگیا
ترس نہیں کھاتا یہ غریب عوام پر
بجلی کا محکمہ کند ذہن اور مردار ہوگیا
کرے کون مداوا ہمارے غم کا اب
یہ سوچ کر بندہ بیمار ہوگیا
کرکے ترجمانی عوام کے جذبات کی ابراہیم
تو خدا کی نظر رحمت کا حقدار ہوگیا
(محمد ابراہیم کھوکھر......جھمرہ ٹی)

کاٹی پوری رات تیرے ہجر کے غم میں
کیا کریں کہ نیند ہی نہ آئی تیرے ستم میں
کرتے تھے کس زمانے میں تجھ سے پیار کی باتیں
کہ گزاری میں نے زندگی اسی وہم میں
اب بھٹکتے ہیں تجھے پکار پکار کر دیوانہ بنے
کہ یہ ذلتیں بھی لکھی ہوئی تھیں میرے کرم میں

شاید کہ یہی سلوک ہوتا ہے عاشقوں کے ساتھ
پتھروں کے شہر میں بے وفاؤں کے بھرم میں
حساس کہ کیا یاد کریں بے وفا یار کو
اب درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہیں دل کے زخم میں
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈو الہ یار)

میں نے تجھ پر کتنا اعتبار کیا تھا
خود سے بھی زیادہ تجھے پیار کیا تھا
تیرے لیے ہی میں نے دل کو بیقرار کیا تھا
مگر تو نے دل کو میرے سوگوار کیا تھا
تو نے قدر ہی نہ کی میرے پیار کی صنم
پیار میں نے تجھ سے بے شمار کیا تھا
تیرے ہی سپنے سجائے تھے آنکھوں میں ہر گھڑی
مگر تو نے انہیں سپنوں کو داغ دار کیا تھا
تجھ سے ملنے کی ہر گھڑی آرزو کی تھی میں نے
مگر تو نے میری وفاؤں پہ نا اعتبار کیا تھا
تیرے لئے ہی سب سے ناتا توڑا تھا دلبر
مگر تو نے میری وفاؤں کو رسوا سر بازار کیا تھا
اب تجھ سے کیا گلہ کریں بے وفا صنم
پیار تو خود ہم نے ہی تجھ سے بے شمار کیا تھا
(صبا محمد اسلم......گوجرانوالہ)

ملا نہیں ہے جو ابھی اس کا خیال کیا کرنا
کھوگیا ہے جو اس کا ملال کیا کرنا
جو پاس ہے حاضر وقت یہ ہی کائنات کل
بے جا خواہش کرکے روح کو نڈھال کیا کرنا
وہ جسے وفا کا مطلب ہی نہیں پتا
اس شخص سے وفا کا سوال کیا کرنا
فراق و ہجر نے آخر بہت ہی جانا ہے جاناں
غم فراق اور انتظار وصال کیا کرنا
جو بھی ڈالے نگاہ بری ہی ڈالے
اتنی سندرتا پاکے اتنا حسن و جمال کیا کرنا
جب علم ہے کہ وہ آئے گا بنا کسی آہٹ
پھر اس کا انتظار ماہ و سال کیا کرنا

گزرتے ہیں جدھر سے لوگ راہ سے ہٹ جاتے ہیں آوارہ
اے عشق! تو نے اس سے اچھا حال کیا کرنا
محبت تو یوں بھی لافانی ہے بس
ہم نے بھلا اسے لازوال کیا کرنا
(ایس پی بسمل......ایبٹ آباد قلندر آباد)

دستکوں پر بھی نہ کھلتا تھا وہ در کیسا تھا
نام لکھا تھا جس پہ مرا وہ گھر کیسا تھا
سنگ پھینکا نہ کسی نے اسے مڑ کر دیکھا
جو ہری شاخ پہ ٹھہرا تھا وہ ثمر کیسا تھا
مطمئن پختہ مکانوں سے تو سب تھے لیکن
شہر میں موسم برسات کا ڈر کیسا تھا
اس طرف دیر سے وا تھا در خاور لیکن
وہ اندھیرا جو مسلط تھا ادھر کیسا تھا
جن کے سائے میں نہ ملتا تھا مسافر کو سکون
وہ گھنا پیڑ سر راہ گزر کیسا تھا
(عروج ماہین طہٰ......پنڈدادنخان)

وقت رخصت میں تیرا مجھ سے لپٹ جانا
پھر اچانک وہ ارادہ سا بدل جانا
وہ میرا پوچھنا کہ کیسے گزریں گے دن
روتے روتے اچانک میرا سنبھل جانا
وہ میرا پھر سے ملنے کی تمنا کرنا
اور ترا کہنا کہ مجھے بھول جانا
کیسے بھولوں گا میں وہ گزرے ہوئے پل
کبھی لڑنا جھگڑنا اور وہ تیرا منانا
تیری آغوش میں سر رکھ کر سوجانا
اور تیری آنکھوں کے سمندر میں کھوجانا
کیسے کہہ دوں یہ محبت نہیں کچھ اور ہے
تیرا چھپ چھپ کر دیکھنا اور نظریں چرانا
میں نہ کہتا تھا محبت دکھ دے گی نوری
تیرا کہنا کہ محبت ہی تو ہے جنت جانا
(انتخاب: سید اسد علی بخاری......قبط نورپور)
☆☆

ہر بستی اٹھا کے کچھ نہ ملا
تیرے کوچے میں آکے کچھ نہ ملا
در بدر ہی رہے ہمیشہ سے
زندگی مسکرا کے کچھ نہ ملا
درد فرقت کا پایا سرمایہ
تم کو اپنا بنا کے کچھ نہ ملا
اپنی پلکوں پہ ان کی محفل میں
آنسوؤں کو سجا کے کچھ نہ ملا
ان کے در پر تو آگیا رانا
پھر بھی سر کو جھکا کے کچھ نہ ملا
(قدیر رانا......راولپنڈی)

پی کے مے کتنی بے نیازی ہے
یہ نظر کی کرشمہ سازی ہے
کار عقبیٰ ہے خوب تر سودا
دنیا داری تو ایک بازی ہے
عاشقی کا چلن نہیں معلوم
تیرا برتاؤ امتیازی ہے
جس کے فردوس میں مثال نہیں
تیری آنکھوں کی پاکبازی ہے
اے قمر ایک ہے میرا کعبہ
دل تو مدت سے اک نمازی ہے
(چوہدری قمر جہاں علی پوری......ملتان)

ہم کنارے کھڑے سمندر کے
غم ڈبوتے ہیں روز اندر کے
جب بھی پہنچے قریب بستر کے
یاد آئے ستم ستمگر کے
ہمیں مٹی سے عشق ہے اپنا
گھر بناتے کیا سنگ مرمر کے
روشنیوں کے شہر کا سوچو
بجھ رہے ہیں چراغ ہر گھر کے
زرہ زرہ جو پل میں ہوجائیں
لیتے وعدے نہیں پل بھر کے
(رانا حنیف عاطر......راولپنڈی)

میری دعا ہے خدا کرے
ہر خوشی بن مانگے تجھے ملے
موسم ہو تیرے پسند کے
تیری شہرت کی ہوا چلے
نہ دکھ سے پڑے واسطہ تیرا
نہ کبھی تیرا دل جلے
سورج کرے تیری بندگی
چاند تیری پوجا کرے
پوری ہوں تیری حسرتیں
ہر قدم پہ ملے کامیابی تجھے "طہٰ"
(انوری رمضان......پنڈدادن خان)

تم تھے میرے ہم تھے تیرے
اب ہے اک دوسرے سے دور
جدائی کے لمحے ہیں یہاں
اور ہم ہیں چور، چور
تنہا راستہ ہے اور ہم ہیں
اپنا کوئی نہیں کتنے ہیں مجبور
چاہتیں جو تھیں تم سے میری
تم جو نہیں، ہم کتنے ہیں رنجور
جو زخم تم نے دیئے ہیں ہمیں
اب تو مرہم لگاؤ گے ضرور
(عثمان غنی......پشاور)

پاگل آنکھوں والی لڑکی
اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو
تھک جاؤ گی
کانچ سے نازک خواب تمہارے
ٹوٹ گئے تو
پچھتاؤ گی
سوچ کا سارا اجلا کندن
ضبط کی راکھ کا حصہ بن جائے گا
کچے پکے رشتوں کا ریشم کھل جائے گا
اور تم تھک جاؤ گی
(صبا رمضان......پنڈدادن خان)

آدمی اپنا خریدار بھی ہوسکتا ہے
راستہ عشق کا دشوار بھی ہوسکتا ہے
زندگی جان کے پیچھے جو پڑی ہے میرے
عاشقی سے میرا انکار بھی ہوسکتا ہے
بے طلب جس کی وہی آج مجھے مل جائے
وہ کوئی اور نہیں یار بھی ہوسکتا ہے
تو جسے جنگ سمجھ بیٹھا غلط فہمی میں
اے میری جان میرا پیار بھی ہوسکتا ہے
ڈھونڈنے جاتا ہے جس کو تو بڑی دور رضا
وہ خزانہ پس دیوار بھی ہوسکتا ہے
(نعیم رضا بھٹی......منڈی بہاؤالدین)

خواب کی وادیوں سے نکلا ہوا
چاند سو کر اٹھا آنکھ ملتا ہوا
ہاتھ پر دھوپ کی پتیاں رکھ گیا
کوئی پھولوں کی چادر بدلتا ہوا
شیش محلوں کے شیشوں سے ٹکرا گیا
پتھروں سے اترتا سنبھلتا ہوا
شام کو ہوگا سورج ہماری ہی طرح
کوئی سوکھا پیڑ جلتا ہوا
(سنبل ماہین طہٰ......سرگودھا)

کبھی کبھی تم نے یہ سوچا بھی ہو
کہ تمہیں کتنا چاہتے ہیں
تمہیں زندگی سے بڑھ کر
جو عزیز ہم نے جانا
سو کوئی سبب تو ہوگا
تمہیں روز شب کے دکھ میں
کبھی بھولنا بھی چاہیں
کبھی بھول ہم نہ پائیں
کہ یہ عہد زندگی ہے
جسے توڑنا بھی چاہیں
کبھی توڑ ہم نہ پائیں
(بلقیس خان......پشاور)
☆☆

خطرناک عفریت

شہزادہ چاندزیب عباسی-کراچی

اچانک برفیلی پہاڑی پر ایک بن مانس جیسی بلا نمودار ہوئی اس کی چنگھاڑ پورے علاقے کو دہلاگئی اور پھر اس نے ایک چھلانگ لگائی اور دو نوجوانوں کو اپنے آہنی ہاتھوں میں جکڑ کر چیر دیا۔

ایک عجیب وغریب خوفناک، دہشت ناک، ہولناک، حیرت ناک اور جسم پر لرزہ طاری کرتی کہانی

نصف شب کے وقت آمنہ اور ظفر خوفزدہ سے بچوں کے جھولے کے گرد بیٹھے تھے۔ جھولے میں ان کے دو تین ماہ کے جڑواں بچے آنے والے طوفان سے بےخبر سو رہے تھے۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے، انسان ہر قسم کے ڈر خوف اور پریشانی سے بےخبر ہوتا ہے۔ وہ گورداسپور کے ایک گاؤں کے رہائشی تھے۔ تیرہ اگست 1947ء کی رات تھی۔

چودہ اگست کا سورج طلوع ہونے میں چند ہی گھنٹے باقی تھے۔ قیام پاکستان کا اعلان ہو چکا تھا۔ انتہا پسند ہندو اور سکھ بلوائی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر نہتے مسلمانوں کا قتل عام کر رہے تھے، سکھوں کے مخصوص نعروں اور فائرنگ سے فضا گونج رہی تھی۔ فائرنگ اور نعروں کی آوازیں اب ان کے گھر کے قریب آتی جارہی تھیں۔

"آمنہ لگتا ہے بلوائی ہمارے گھر کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ یہاں پہنچ کر ہم سب کا خاتمہ کردیں ہمارا یہاں سے نکلنا بہتر ہوگا۔" ظفر نے ایک بچے کو اٹھایا اور آمنہ نے دوسرے بچے کو اٹھالیا اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھام لیا۔ جس میں زمینوں کے کاغذات کچھ رقم اور بچوں کے کچھ کپڑے تھے۔

وہ گھر کی پچھلی سمت سے باہر نکلے اور اندھیری رات میں ایک طرف بھاگنے لگے۔ اب ان کے عقب میں سکھوں کے نعرے اور فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ انہیں دیکھ لیا گیا تھا۔ "آمنہ اگر ہم دونوں میں سے کسی کو گولی لگی تو دوسرا نہیں رکے۔ تاکہ ہم میں سے کوئی تو زندہ بچے۔" بھاگتے بھاگتے ظفر نے کہا۔

"اندھیرے میں بھاگنے میں ایک ڈر یہ بھی تھا کہ ان میں سے کوئی ٹھوکر کھا کر گر نہ جائے اور ہوا بھی، ایک جگہ ظفر کو ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا۔ گرتے وقت اس نے پوری کوشش کی کہ بچے کو چوٹ نہ لگے، وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہا۔ وہ بمشکل اٹھا اور ایک طرف بھاگنے لگا۔ آمنہ دوسرے بچے کے ساتھ کافی دور تک نکل چکی تھی۔

اچانک ایک گولی ظفر کے بائیں پہلو میں آلگی اس کے حلق سے چیخ نکلی، اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے بائیں پہلو میں لوہے کی دہکتی سلاخ گھس گئی ہو۔ باوجود شدید تکلیف کے وہ رکا نہیں بلکہ بھاگتا رہا۔ بچے کی زندگی بچانے کا اس پر جنون سوار تھا۔ جس کی وجہ سے رکے بغیر بھاگتا رہا۔ آمنہ اس کی نگاہوں سے

اوجھل ہو چلی تھی۔ ظفر کے زخم سے خون تیزی سے رس رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے بالآخر اس کی ہمت جواب دے گئی تو وہ لڑکھڑاتا ہوا گر گیا۔ اس کے ذہن پر دھندسی چھاتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی آخری سانسوں میں دیکھا کہ وہ ایک بنگلے کے گیٹ کے سامنے گرا ہوا تھا۔ اور پھر اس کا ناطہ زندگی سے ٹوٹ گیا۔

بچہ اس کے سینے پر پڑا اپنے خاندان پر ٹوٹ پڑنے والی قیامت سے بے خبر ڈر رہا تھا کہ بنگلے کا دروازہ کھلا اور ایک جوان جوڑا گیٹ سے باہر نکلا، یہ تیس سالہ انجینئر راج اور اس کی پچیس سالہ پتنی رادھا تھی۔

رادھا بے خوابی کے مرض کا شکار تھی۔ وہ رات کو گھنٹوں برآمدے میں ٹہلنے کی عادی تھی، بچے کے رونے کی آواز سن کر اس نے راج کو جگایا اور باہر آ گئی۔ رادھا نے روتے ہوئے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ حیرت انگیز طور پر بچہ اس کے سینے سے لگتے ہی خاموش ہو گیا۔

راج زمین پر پڑے ظفر کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کے بائیں پہلو میں گولی لگی ہے۔ اور یہ اپنی زندگی سے محروم ہو چکا ہے۔" راج رادھا کے قریب آ کر بولا۔

اسی وقت بلوائیوں کے نعرے سن کر دونوں میاں بیوی تیزی سے اپنے گھر میں داخل ہو گئے اور بیرونی دروازہ مقفل کر کے بیڈ روم میں پہنچ گئے۔ "راج یہ بہت سندر ہے میں اسے اپنے بیٹے کی طرح پالوں گی۔" رادھا نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، یہ بچہ جس شخص کی لاش کے قریب سے ملا ہے۔ وہ میرے اندازے سے مسلمان تھا۔ اور بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو ہمارے لئے مشکل ہو جائے گی، راج نے کہا اور بچہ اس کی گود سے لے کر اس کا پاجامہ ہلکے سے نیچے سرکا کر دوبارہ رادھا کو دے دیا۔ اس کا شک درست نکلا بچے کی ختنہ ہوئی تھی۔

"راج ہماری شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں اور میڈیکل رپورٹس کے مطابق وہ اتنا کہتے ہی خاموش ہو گئی۔ اور راج اسے بے بسی سے دیکھنے لگا یہ ایک کڑا سچ تھا۔ میڈیکل رپورٹس کے مطابق رادھا میں کوئی کمی نہ تھی۔ کمی تھی تو صرف راج میں وہ باپ بننے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ یہ سب جاننے کے باوجود رادھا کی محبت اور وفا میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ راج برہمن تھا اور امیر کبیر گھرانے کی رادھا سے محبت کی شادی کی تھی۔ وہ ڈاکٹر تھا اور اپنے گھر والوں سے الگ تھلگ رادھا کے ساتھ یہاں رہائش پذیر تھا۔ "لیکن رادھا یہاں لوگوں کو ہم کیسے مطمئن کریں گے اور کسی نے اس بچے کو بے لباس دیکھ لیا تو ہماری بھی شامت آ جائے گی۔" راج نے اسے سمجھانا چاہا۔

"ہم یہ علاقہ چھوڑ دیں گے۔ کسی ایسی جگہ جائیں گے جہاں ہمیں کوئی جانتا ہی نہ ہو اور میں احتیاط برتوں گی۔ بچے کا لباس ہمیشہ تنہائی میں تبدیل کیا کروں گی۔" رادھا نے رسان سے کہا۔

انہوں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور بمبئی میں رہائش اختیار کر لی۔ بچے کا نام ارجن رکھ لیا گیا۔ یہ بہت ہی پیارا اور ذہین بچہ تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ پروان چڑھتا گیا۔ ارجن میں ایک عادت بچپن سے عجیب سی تھی وہ جس چیز کی طرف بھی دیکھتا، بغیر پلکیں جھپکائے کافی دیر تک دیکھتا رہتا۔ صبح سویرے بیدار ہو جاتا اور طلوع ہوتے ہوئے سورج کو بغیر پلکیں جھپکائے کافی دیر تک دیکھتا رہتا۔ راج اور رادھا کے منع کرنے کے باوجود وہ اپنی اس عادت سے باز نہ آیا۔ مڈل تک وہ کلاس میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرتا رہا۔

ان دنوں وہ میٹرک میں تھا کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس نے ارجن کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی کلاس میں بابر نام کا ایک مسلمان لڑکا تھا۔ جس سے اس کی دوستی تھی۔ بابر کے گھر میں کوئی تقریب تھی۔ جس میں شرکت کی اس نے ارجن کو دعوت دی۔ وہ دوسرے روز بابر کے گھر جا پہنچا۔ خاندان کے چھوٹے بڑے سبھی اس دعوت میں موجود تھے۔ ایک نومولود بچے کو ڈرائنگ روم میں لایا گیا۔ اور ایک ڈاکٹر نے اس بچے کی ختنہ کی۔ یہ

سب ارجن کے لئے حیرت انگیز تھا۔ بابر نے اس کے پوچھنے پر بتایا کہ مسلمان گھرانوں میں بچے کی پیدائش کے کچھ روز بعد کی ختنہ کر دی جاتی ہیں۔ ارجن کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس کے والدین ہندو تھے۔ پھر اس کی ختنہ کیوں کروائی گئی؟

یہ سوال اس نے گھر پہنچتے ہی جھجکتے ہوئے رادھا سے کیا۔ وہ سمجھ گئی بالآخر وہ وقت آ پہنچا ہے جس سے راج نے اسے کئی سال پہلے باخبر کیا تھا۔ "بیٹا تم پیدائشی اسی طرح ہو، بعض انسان پیدائشی بھی ایسے ہوتے ہیں۔" رادھا نے وضاحت کی، وہ اس کی وضاحت سے مطمئن ہوا یا نہیں لیکن اس کے رویے میں تبدیلی آ گئی۔ وہ اسکول سے گھر آتے ہی اپنے کمرے میں گھس جاتا اور صبح سویرے طلوع ہونے والے سورج کو دیکھنے کے لئے بالکونی میں آ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی بچپن کی یہ عادت اب پختہ ہو چکی تھی۔

وہ مندر میں کبھی کبھار ہی جاتا تھا۔ اس روز بھی وہ مندر میں پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر نکل ہی رہا تھا کہ سامنے سے آنے والے پجاری پر اس کی نظر پڑی جو ارجن ہی کی طرف دیکھتا ہوا آ رہا تھا۔ یہ گنجا سا ادھیڑ عمر کا پجاری تھا۔ ماتھے پر قشقہ اور گلے میں مختلف قسم کی مالائیں اور آنکھوں میں پراسرار چمک تھی۔ وہ ارجن کا راستہ روکے کھڑا تھا اور ارجن عادت کے مطابق پلکیں جھپکائے بغیر اس سے نظریں ملائے کھڑا تھا۔ "بالک ادھر آؤ میرے ساتھ کچھ سمے کے لئے۔" وہ ارجن کو مندر کے ایک کمرے میں لے گیا۔ "تم پہلے منش ہو جس نے مجھ سے نظریں ملائیں، میری طرف دیکھنا بھی عام منش کا کام نہیں، میرا گیان بتاتا ہے کہ تم کوئی عام منش نہیں، تمہاری آنکھوں میں کوئی خاص بات ہے۔ کیا تم نے خاص قسم کی مشقیں کی ہیں۔" پجاری نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ "نہیں مہاراج میں نے کوئی مشق نہیں کی، ہاں میری بچپن سے عادت ہے کہ میں نکلتے سورج کے وقت سورج کو کافی دیر تک پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا رہتا ہوں۔"

"سنو! بالک میں یہاں کا مہا پجاری رام پرشاد ہوں تم کچھ عرصہ بلاناغہ چند گھنٹوں کے لئے میرے پاس آؤ۔ اس میں تمہارا فائدہ بھی ہے۔ پرنتو تمہیں وچن دینا ہوگا کہ تم اپنی صلاحیتوں کو دھرم کے کام لاؤ گے۔"

ارجن رام پرشاد کے کہنے پر روزانہ بلاناغہ پجاری کے پاس جانے لگا۔ پہلے روز رام پرشاد اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ رات آٹھ بجے کے قریب ایک شمع روشن کی اور کمرے کا بلب آف کر دیا اور ارجن کو اسے بنا پلکیں جھپکائے بغیر دیکھنے کو کہا۔ یہ اس کے لئے کون سا مشکل کام تھا۔ وہ کئی ماہ تک رام پرشاد کی زیر نگرانی مختلف اقسام کی دشوار مشقوں پر ثابت قدم رہا۔

"مہاراج ان مشقوں سے کیا حاصل ہوگا؟" ایک روز اس نے رام پرشاد سے پوچھا۔

"ارجن اب تم عام انسان نہیں رہے۔ انسانی جسم میں ان گنت پراسرار صلاحیتیں پوشیدہ ہیں، انہیں ابھارنے اور ان پر عبور حاصل کرنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ انسان دنیا کے ہر جاندار سے زیادہ طاقتور ہے، یہی انسانی جسم میں پوشیدہ ان ہی صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت ہے۔ جس پر تم قابو پا چکے ہو۔ یہ سامنے میز پر جو چھوٹا سا پتھر پڑا ہے اسے غور سے دیکھو اور نظروں سے اٹھانے کی کوشش کرو، وہ چند لمحے ناقابل یقین نگاہوں سے رام پرشاد کو دیکھتا رہا پھر اس کی ہدایت پر عمل کیا، اگلا ہی لمحہ ناقابل یقین تھا میز پر رکھا شوپیس نما پتھر کو دیکھتے ہوئے اس نے نظروں سے اٹھانے کی کوشش کی پتھر میز سے اوپر فضا میں معلق ہو چکا تھا۔ وہ اپنی نظروں کو جس قدر اٹھاتا پتھر اس قدر بلند ہو جاتا۔

"تمہاری یہ آنکھیں تباہ کن ہتھیار ہیں۔ لیکن اب تم ہر وقت کالے رنگ کے چشمے پہنو گے۔ اور بلاضرورت اسے نہیں اتارو گے، ورنہ تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔" رام پرشاد نے تاکید کی۔

ان کٹھن مراحل سے گزرتے گزرتے وہ تعلیم بھی حاصل کرتا رہا۔ مارشل آرٹ کلب سے پہلے ہی

منسلک تھا ایک شوٹنگ کلب سے نشانہ بازی کی تربیت بھی حاصل کی اور پھر راج نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک مغربی ملک میں بھیج دیا۔

☆......☆......☆

حماد ایک خوبرو اور ذہین نوجوان تھا۔ قیام پاکستان کے وقت حادثاتی طور پر اپنے والد اور جڑواں بھائی سے بچھڑ چکا تھا۔ آمنہ بمشکل اس کی اور اپنی جان بچا پائی تھی۔ خوش قسمتی سے ایک ہجرت کرنے والا ایک قافلہ راستے میں مل گیا تھا۔ وہ قافلے کے ساتھ سرحد پار پہنچ گئی۔ وہ لوگ جہاں پہنچے تھے وہ پنجاب کا ایک ویران علاقہ تھا۔ صبح کی روشنی میں وہ قافلے کے ساتھ چلتی ہوئی آبادی میں پہنچ گئی۔ پاکستان کے دیہاتی لوگوں نے کھلے دل سے ان کا استقبال کیا۔ قسمت نے بھی ساتھ دیا۔ اسے کاغذات کی وجہ سے دیول نامی گاؤں میں اچھی خاصی زمین کی ملکیت مل گئی۔ یہ زرخیز زمین خیردین جیسے ایماندار اور محنتی مزارعے کی مدد سے جلد ہی لہلہاتے کھیتوں اور باغ میں تبدیل ہوگئی۔ حماد پرائمری اسکول سے ہوتے ہوئے سیکنڈری اسکول کے بعد شہر کے بہترین کالج میں پہنچ گیا۔ گاؤں دور ہونے کے باعث وہ ہاسٹل میں ہی رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والا ایک شریف اور بے ضرر نوجوان تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت پڑھائی میں ہی گزرتا تھا۔ وہ اپنے کلاس فیلوز میں کتابی کیڑے کے نام سے مشہور تھا۔

وہ پچھلے کچھ دنوں سے پریشان تھا۔ جیسے ہی وہ کلاس میں داخل ہوکر اپنے ڈیسک پر بیٹھتا۔ ایک گلاب کا تروتازہ پھول وہاں رکھا ہوا ملتا اور ساتھ ہی چاک سے ڈیسک پر لکھا ہوا ہوتا۔ ''آئی لو یو۔'' اس نے کافی کوشش کی یہ جاننے کی کہ یہ حرکت کس کی ہے؟ کئی بار کلاس میں سب سے پہلے پہنچا، اس کے باوجود پھول ڈیسک پر اس سے پہلے موجود ہوتا اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ یہ کسی لڑکی کی حرکت ہے پر وہ لڑکی کون ہے؟ یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

اس کی کلاس میں پانچ لڑکیاں تھیں، سب ہی خوب صورت اور شوخ وچنچل تھیں۔ فرخندہ ایڈووکیٹ حامد کی بیٹی تھی لیکن وہ نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ وہ حماد کے دوست اشعر سے پیار کرتی تھی۔ اور مہوش تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ مرحوم ملک افتخار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے والدین کا تین سال قبل کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوچکا تھا۔ پنجاب کے ایک گاؤں میں پھیلی کئی ایکڑ زمین ملک افتخار کے نام تھی۔ اس کے علاوہ شوگر مل اور گارمنٹس فیکٹری بھی انہی کی تھی۔ ملک افتخار کے انتقال کے بعد اس کی زمین و جائیداد اور کاروبار کی دیکھ بھال اس کا بھائی ملک ذوالفقار کررہا تھا۔ جو محنتی ہونے کے علاوہ ایماندار بھی تھا۔ اس کی بیوی رضیہ کا پچھلے سال ہی انتقال ہوچکا تھا۔ اس کا صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ رضوان جو مہوش سے دو سال بڑا تھا۔ وہ اسی کالج میں زیر تعلیم تھا۔ رضوان اپنے باپ کے بالکل برعکس تھا۔ کالج میں ایک لسانی تنظیم سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی بری عادات میں مبتلا تھا۔

مہوش انتہائی خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ مغرور ٹائپ لڑکی تھی۔ اس کی سب سے گہری دوست عائشہ عرف عاشی تھی جو اس کی طرح اپر کلاس سے تعلق رکھتی تھی۔ ارم کی انگیج منٹ ہوچکی تھی۔ اور فائزہ ڈی ایس پی پرویز کی بیٹی اور غصیلی طبیعت کی مالک تھی۔

حماد فارغ اوقات میں لائبریری میں چلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ لائبریری میں موجود ایک کتاب کا مطالعہ کررہا تھا کہ ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

حماد نے کتاب سے نظریں ہٹائیں اور حیرت سے اچھل پڑا، اس کے سامنے مہوش موجود تھی، وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ہیلو مسٹر کچھ بولو گے بھی یا یونہی ہونقوں کی طرح دیکھتے رہوگے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

اور حماد اس کی بے تکلفی پر دنگ رہ گیا۔

''پریشان لگ رہے ہو، کیا پرابلم ہے؟ کلاس فیلو ہونے کے ناطے مجھ سے شیئر کرسکتے ہو۔'' مہوش کی آنکھوں سے شرارت جھلک رہی تھی۔

حماد نے گھبرا کر ادھر ادھر نظر دوڑائی لائبریری میں کئی اسٹوڈنٹ تھے۔ جو ان کی طرف متوجہ نہ تھے۔

''نہ...... نہیں تو ایسی کوئی بات نہیں۔'' حماد ہکلا گیا۔

''کوئی بات تو ضرور ہے، میں نے سنا ہے تمہارے ڈیسک سے گلاب کے پھول مل رہے ہیں۔'''

مہوش نے سرگوشی میں کہا۔ ''اوہ...... ہاں...... مم...... میں خود پریشان ہوں سمجھ میں نہیں آتا وہ کون ہے اور کیا چاہتی ہے؟ میرے کلاس میں جانے سے پہلے پھول رکھنے کے ساتھ ساتھ ڈیسک پر لکھ جاتی ہے کہ......'' حماد نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ شرمیلا نوجوان تھا اس سے پہلے کسی لڑکی نے اس سے اس قدر بے تکلفی سے بات نہیں کی تھی، اس لئے گھبرا رہا تھا۔

''ڈیسک پر کیا لکھا ہوتا ہے؟'' مہوش نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''وہ...... وہ...... آئی...... لو...... یو۔''

''کیا مطلب میں تم سے پوچھ رہی ہوں، ڈیسک پر کیا لکھا ہوتا ہے اور تم مجھے بتانے کی کوشش کررہے ہو۔'' مہوش نے اگرچہ سخت لہجے میں کہا لیکن اس کی آنکھوں میں شرارت صاف نظر آرہی تھی جو حماد نگاہیں جھکی ہونے کی وجہ سے نہ دیکھ سکا اور گھبرا کر بولا۔

''میرے کہنے کا مقصد ہے آئی لو یو لکھا ہوتا ہے۔''

''تمہارا کیا اندازہ ہے وہ لڑکی کون ہوسکتی ہے؟'' مہوش نے پوچھا۔

''مجھے کیا پتہ۔'' وہ شرما گیا۔

''فرض کرو وہ لڑکی میں ہی ہوں تب تم کیا کہو گے؟''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' وہ گھبرا گیا۔

''کیوں نہیں ہوسکتا، کیا تم لڑکے نہیں یا میں خوب صورت لڑکی نہیں؟''

''یہ بات نہیں میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ تم بہت بڑے امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہو جبکہ میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔'' حماد نے نگاہیں اٹھا کر جواب دیا۔

''حماد یہ سچ ہے کہ وہ پھول میں ہی رکھتی تھی، میں تمہیں پسند کرتی ہوں، مجھ سے دوستی کروگے۔'' مہوش نے کہا۔

''سوچ لو مہوش تمہارا تعلق امیر گھرانے سے ہے، یہ نہ ہو کل تم پیچھے ہٹ جاؤ اور یہ دل لگی میرے دل کا روگ بن جائے۔'' حماد نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''چلو اٹھو سر ریاض کی کلاس کا وقت ہونے والا ہے تمہیں معلوم بھی ہے وہ کتنے سخت گیر ہیں۔'' مہوش نے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں ایک ساتھ کلاس میں داخل ہوئے تو بہت سی معنی خیز نگاہیں ان کی طرف اٹھیں۔ حماد اپنے ڈیسک پر اشعر کے قریب جا بیٹھا۔

اب حماد اور مہوش کالج میں اکثر ساتھ نظر آنے لگے۔ وہ ذہین طالب علم تھا، پڑھائی میں مہوش کی مدد کرنے لگا، اس روز وہ اپنی کلاس کی طرف جارہا تھا کہ ایک طرف سے ایک قدآور نوجوان اس کے راستے میں آگیا۔ وہ قہر آلود نگاہوں سے حماد کو گھورنے لگا۔ ''کیا بات ہے تم نے میرا راستہ کیوں روکا؟'' حماد نے پوچھا۔

''میرا نام رضوان ہے اور میں مہوش کا کزن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا منگیتر بھی ہوں، اگر آئندہ تو اس کے آس پاس بھی نظر آیا تو تیرا حشر خراب کردوں گا۔'' اس نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔

''یہی بات اگر تم مہوش سے خود کہو تو زیادہ بہتر ہے۔'' حماد نے ہمت کرکے کہا۔

جواب میں رضوان نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا اور بولا۔ ''مجھ سے زیادہ بک بک مت کر بلکہ جو کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سن۔ اس کے تھپڑ سے حماد کے گال میں گویا انگارے سے بھر گئے تھے، اس کے کان میں سنسناہٹ سی ہورہی تھی، دل تو اس کا بھی چاہ رہا تھا کہ مار مار کر رضوان کا حشر بگاڑ دے لیکن حماد لڑائی جھگڑائی سے دور رہنے والا لڑکا تھا۔ جب کہ رضوان غنڈا ٹائپ شخص تھا۔ اگر حماد اس پر ہاتھ اٹھاتا تو وہ مار مار کر

اس کا حشر خراب کردیتا۔

رضوان نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑلیا اور بولا۔ ”میری بات یاد رکھنا اب اگر تو مہوش کے قریب بھی نظر آیا تو وہ حشر کروں گا کہ تو تین چار مہینے تک چلنے کے قابل نہیں رہے گا۔“ اس نے حماد کا گریبان چھوڑتے ہوئے اس قدر زور سے جھٹکا دیا کہ حماد الٹ کر پیچھے جاگرا۔ گرنے سے چوٹیں تو آئی ہی تھیں لیکن اس سے بڑھ کر توہین کا احساس اسے مارے ڈال رہا تھا کیونکہ اس دوران کالج کے کئی لڑکے اور لڑکیاں وہاں جمع ہوگئے تھے لیکن ان میں سے کسی کی ہمت نہ تھی کہ بیچ بچاؤ کرتا حماد نے اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑے، کتابیں سمیٹیں اور کلاس کی طرف روانہ ہوگیا۔

کلاس آف ہونے کے بعد وہ لائبریری میں آبیٹھا اور ایک کتاب کا مطالعہ شروع کردیا، لائبریری میں اس وقت حماد کے علاوہ کوئی دوسرا اسٹوڈنٹ نہ تھا۔ کچھ دیر بعد مہوش اور عاشی بھی لائبریری میں آگئیں۔

”حماد رضوان نے جو سلوک تمہارے ساتھ کیا ہے مجھے اس کا افسوس ہے۔ مگر تم نے اس کا جواب کیوں نہیں دیا۔ تمہیں اس کا منہ توڑ دینا چاہئے تھا۔“ مہوش تیزی سے بولی۔

”میں لڑائی جھگڑے سے دور رہتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس کالج سے کچھ فاصلے پر شوتو کان کا مارشل آرٹ کلب ہے، میں اور عاشی دو سال سے وہاں پریکٹس کررہی ہیں تم بھی ایڈمیشن لے لو۔ اس معاشرے میں جینے کے لئے بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔“

”نہیں مہوش میں گاؤں سے یہاں پڑھنے آیا ہوں، میں دیگر فضولیات میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ یہ جھگڑا تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تم کہو تو میں گاؤں جاکر امی جان کو لے آؤں اور تمہارے گھر بھیجوں۔“

”وہ کس لئے؟“ مہوش چونکی۔

”بھئی تمہارا ہاتھ مانگنے کے لئے تاکہ تمہارے کزن سمیت کوئی بھی مجھ پر انگلی نہ اٹھا سکے۔ تم تو جانتی ہو میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔“

مہوش کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، پھر ہنس کر بولی۔ ”حماد سچ تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں عاشی نے مجھ سے پانچ ہزار کی شرط لگائی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ تم مجھ سمیت کسی لڑکی کو آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں۔ تب میں نے کہا کہ میں تم سے محبت کا اقرار کروا کر رہوں گی اور میں یہ شرط جیت گئی۔ سوری حماد امید ہے تم ہماری شرارت پر برا نہیں مناؤ گے۔“

”مہوش میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے بیچ منجدھار میں چھوڑ مت جانا یہ نہ ہو یہ دل لگی دل کا روگ بن جائے۔ مگر تم نے ایسا ہی کیا۔“ وہ اسے زخمی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ اور اٹھ کر لائبریری سے باہر نکل گیا۔

”اشعر مجھے اپنی موٹر سائیکل کی چابی دینا آج میرا سڑکوں پر گھومنے کا دل چاہ رہا ہے۔“ اس نے کوریڈور میں اشعر کو دیکھ کر کہا۔

”یہ لو موٹر سائیکل کی چابی پر تمہارا چہرہ بجھا بجھا سا کیوں ہے؟“

”یار مہوش نے میرے جذبات سے کھیلا ہے۔“

وہ دل شکستہ لہجے میں بولا۔ اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اسے بتایا کہ مہوش نے اس کے ساتھ کیا کیا۔

”تم پاگل تو نہیں ایک لڑکی کے لئے بچوں کی طرح رو رہے ہو، ان لڑکیوں نے تمہیں فول بنایا ہے۔ اپر کلاس کی لڑکیاں اکثر ایسی ہی ہوتی ہیں۔ تم بھی اسے خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔“ میں کافی دیر تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ پھر ایک پارک میں جا بیٹھا وہ رات دس بجے تک پارک میں بیٹھا رہا۔ موسم کے تیور بدل چکے تھے کچھ ہی دیر میں اچانک گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہوگئی۔ وہ پارک سے نکلا اور موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔

اچانک ایک تیز نسوانی آواز سنائی دی۔ میں ڈیڈی کو سب کچھ بتادوں گی، تم لوگوں کو اگر جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہ سڑوایا تو میرا نام فائزہ نہیں۔ تم نے

مجھے محبت کے نام پر دھوکہ دینے کے بعد اس درندے کے حوالے کردیا، میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔“

”حماد یہ سن کر سناٹے میں آگیا یہ اس کی کلاس فیلو فائزہ کی آواز تھی۔ جو کچھ فاصلے پر کھڑی ہائی روف سے نکل رہی تھی۔ ہائی روف کا دروازہ کھلا اور ساتھ ہی ایک ہولناک آواز فضا میں گونجی اور فائزہ کی دلدوز چیخ سنائی دی اور ایک شخص تڑپتی ہوئی فائزہ کو گھسیٹتا ہوا ہائی روف سے اترا۔

حماد ہائی روف سے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں کھڑا تھا۔ اس لئے اس پر قاتل کی نظر نہ پڑی۔ اسی وقت بجلی چمکی۔ وہ شخص فائزہ کو سڑک پر پھینک کر ہائی روف کی طرف بڑھا۔ آسمان سے چمکنے والی بجلی کی روشنی میں حماد نے دیکھا۔ وہ رضوان تھا جبکہ ڈرائیونگ سیٹ پر بڑی بڑی مونچھوں والا گرانڈیل شخص موجود تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ چکے تھے رضوان اس کی طرف لپکا، حماد کو خطرے کا احساس ہوا، خوش قسمتی سے موٹر سائیکل ایک ہی کک میں اسٹارٹ ہوگئی۔

دوسرا شخص ہائی روف سے اتر چکا تھا۔ ”دیکھو بھاگنے نہ پائے، یہ ہمارے چہرے دیکھ چکا ہے۔“ رضوان کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی، ساتھ ہی ایک فائر ہوا۔ گولی حماد کے قریب سے گزری، اس اثناء میں گرانڈیل شخص نے دوسرا فائر کیا، اس بار بھی وہ بال بال بچا۔

حماد نے موٹر سائیکل تیز رفتاری سے آگے بڑھادی۔ موٹر سائیکل چلاتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا۔ ہائی روف تیز رفتاری سے اس کے تعاقب میں آرہی تھی۔ اس کا فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جارہا تھا۔ اس دوران اس پر مزید دو فائر ہوئے، اس نے موٹر سائیکل کو موڑ کر خود کو بچانا چاہا اور سڑک پر موجود اسپیڈ بریکر پر تیز رفتاری سے دوڑتی موٹر سائیکل اس کے قابو سے باہر ہوگئی اور وہ موٹر سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑا، ہائی روف اس کے سر پر پہنچ چکی تھی وہ بمشکل اٹھا اور جان بچانے کے لئے بھاگنا چاہا مگر اب اسے دیر ہوچکی تھی۔ اس کا جسم ہائی روف سے ٹکرایا اور وہ چیختا ہوا ایک طرف گرا، ہائی روف اس کے جسم کو کچلتی ہوئی آگے جاکر رکی اور پھر ریوس میں اسے کچلتی ہوئی پیچھے آئی۔ اور پھر تیز رفتاری سے اس کے جسم کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس ویران سڑک پر اس کی موت کا تماشہ دیکھنے کے لئے کوئی ذی نفس موجود نہ تھا۔

آمنہ اپنا ایک بیٹا اور شوہر کئی سال پہلے کھو چکی تھی۔ دوسرا بیٹا ایک ویران سڑک پر مارا جاچکا تھا۔ حماد کی لاش ناقابل شناخت ہوچکی تھی۔ ہائی روف کے ٹائر اس کے سر پر سے گزرے تھے۔ آمنہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی۔ حماد کی موت کو حادثہ سمجھا گیا تھا۔ فائزہ کی لاش ایک پارک کے قریب سے ملی تھی، گولی اس کے سینے سے دل کے قریب لگی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ انکشاف ہوا کہ وہ حاملہ تھی اور قتل ہونے سے پہلے اسے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ فائزہ DSP پرویز کی بیٹی تھی پولیس کوشش کے باوجود بھی اس کے قاتلوں تک پہنچنے میں ناکام رہی۔

ادھر مہوش خود کو حماد کی موت کا ذمہ دار سمجھتی تھی۔ وہ اکثر رات کو خواب میں حماد کو خون میں لت پت دیکھتی جو اس سے کہتا۔ ”تم میری موت کی ذمہ دار ہو۔“

وہ اپنے گاؤں چلی گئی۔ مگر وہاں بھی اس کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

ملک ذوالفقار سے اپنی بھتیجی کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اس نے اسے مزید تعلیم کے لئے ملک سے باہر بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔ خود وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ ہوسکتا ہے ملک سے باہر جانے سے وہ ماضی کی پرچھائیوں سے پیچھا چھڑا سکے۔

یہ امریکہ کا اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا۔ اس میں دنیا بھر سے آئے ہوئے اسٹوڈنٹ تھے۔ اس کی روم میٹ جولی کا تعلق امریکہ ہی سے تھا جبکہ دوسری لڑکی گیتا انڈین تھی۔ وہ جلد ہی ان سے گھل مل گئی، اسے اس تعلیمی ادارے میں آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔

اس روز وہ جولی اور گیتا کے ساتھ کلاس روم کی طرف جارہی تھی کہ سامنے سے آتے ایک نوجوان پر

اس کی نظر پڑی۔ اس نے پینٹ اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر بلیک کلر کے گلاسز موجود تھے۔ وہ اسے دیکھ کر جہاں تھی وہیں تھم گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

سامنے سے آنے والا نوجوان حماد تھا۔ وہی قد و قامت وہی چہرہ حماد اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ ٹکٹکی باندھ کر دیوانوں کی طرح اسے دیکھتی رہی وہ بھی حیرت سے مہوش کو دیکھتا ہوا گزر گیا۔ "اے کیا ہوا ہوش میں آؤ؟" جولی نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے رواں انگلش میں کہا۔

"یہ حماد یہاں کیسے آگیا یہ تو؟" اس نے کلاس روم کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"کون حماد؟" جولی بولی۔

"یار وہی بلیک گلاسز والا یہ پاکستانی ہے میرا کلاس فیلو تھا۔ ایک حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں اب تک اس کی موت کا خود کو ذمہ دار سمجھتی ہوں۔"

"تم پاگل تو نہیں، یہ ارجن ہے میڈیکل سائنس کا اسٹوڈنٹ، اس کا تعلق انڈیا سے ہے۔" گیتا نے کہا۔

"مہوش کلاس روم میں پہنچ چکی تھی، مگر کلاس میں وہ ذہنی طور پر غیر حاضر رہی۔ سر رچرڈ نے کیا لیکچر دیا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ کلاس آف ہونے کے بعد وہ جولی اور گیتا کے ہمراہ باہر نکلی۔ "اب تک اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ سوچوں میں کھوئی ہوئی سامنے سے آنے والے ارجن سے ٹکرائی اور کتابیں ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئیں۔ وہ خود بھی گر پڑتی، اگر ارجن اسے سنبھال نہ لیتا۔ "محترمہ میں کوئی بھوت یا پریت نہیں نہ ہی میرے سر پر سینگ ہیں جو تم مجھے دیکھ کر اس قدر بدحواس ہو جاتی ہو۔" ارجن نے کہا اور وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کا لب ولہجہ اور بولنے کا انداز بھی حماد کی طرح تھا۔ وہ اس وقت بھی بلیک گلاسز پہنے ہوئے تھا۔ "سنبھالئے اپنی فرینڈ کو وہ استہزائیہ انداز میں کہتا ہوا آگے بڑھ چکا تھا۔

"کیا بات ہے مہوش تم اسے دیکھتے ہی کہیں کیوں ہو جاتی ہو؟" گیتا نے اسے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا۔

"یار اسے دیکھ کر مجھے حماد یاد آجاتا ہے۔ اس کی شکل وصورت اور بولنے کا انداز لب ولہجہ بھی بالکل اس کی طرح ہے۔ یقین جانو اگر حماد کی ماں بھی اسے دیکھے تو اسے حماد ہی سمجھے گی۔"

"وہ اپنے کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ امریکہ آنے کے بعد سے اسے کبھی حماد خواب میں نظر نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی اسے کسی قسم کا دورہ پڑا تھا۔ لیکن ارجن کو دیکھنے کے بعد سے وہ بے چین ہو چکی تھی۔ اس کا دل بے اختیار انہی کی طرف کھچا چلا جا رہا تھا۔ ایک ہی تعلیمی ادارے میں ہونے کی وجہ سے ان کا اکثر سامنا ہو ہی جاتا تھا۔ ارجن کو دیکھتے ہی وہ اپنے حواس کھو بیٹھتی تھی۔ ارجن خود حیران تھا کہ یہ لڑکی اسے دیکھ کر بدحواس کیوں ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی وہ خود بھی ذہنی طور پر پریشان تھا۔ اتنا تو وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ راج اور رادھا سے اس کا کوئی خون کا رشتہ نہیں۔ اس نے مندر جانا ترک کر دیا تھا۔ اپنی اس ذہنی الجھن کو اس نے اپنے کلاس فیلو زم سے شیئر کیا۔ جس نے اسے اسلامک سینٹر جانے کا مشورہ دیا۔ اب وہ اکثر اسلامک سینٹر چلا جاتا تھا۔

قاری عبدالحفیظ اسی اسلامک سینٹر میں ہوتے تھے اور دین اسلام کے بارے میں آگاہ کرتے رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی کتابیں پڑھنے کو بھی دے رہے تھے۔ وہ بے شناخت تھا اپنی شناخت چاہتا تھا لیکن اسلام قبول کرنے سے بھی ہچکچا رہا تھا۔ پچھلے دنوں راج کا انتقال ہو چکا تھا۔ جس کی خبر اسے مل چکی تھی۔ لیکن تعلیم مکمل کرنے سے پہلے اس کا جانا ناممکن تھا۔ اس روز وہ یونیورسٹی کی کینٹین میں بیٹھا تھا کہ مہوش اندر داخل ہوئی وہ اسی کی طرف آرہی تھی۔ "کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

"بیٹھ جاؤ۔" ارجن نے کہا اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔

"آپ حیران ہوں گے کہ میں آپ میں اس دلچسپی کیوں لے رہی ہوں، میرا تعلق پاکستان سے ہے اور میرا نام مہوش ہے، پاکستان میں حماد نامی ایک میرا کلاس فیلو تھا جو کہ ہو بہو آپ کا ہمشکل تھا حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کی آواز اور لب ولہجہ قد وقامت بالکل اسی کی طرح ہے۔ اس لئے اس روز آپ کو دیکھتے ہی میں ششدر رہ گئی تھی۔ وہ اسے بتانے لگی کس طرح اس نے حماد سے مذاق کیا اور وہ ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہو گیا، وہ اپنے آپ کو حماد کی موت کا ذمہ دار سمجھنے لگی تھی۔

ارجن اس کی روداد سنتا رہا۔ اور پھر سرد لہجے میں بولا۔ "مس مہوش اب میں اپنی شکل وصورت تو تبدیل کرنے سے رہا۔ میرا کوئی بھی مذہب نہیں ہے جبکہ تم مسلمان ہو اور پھر مجھے صنف نازک سے کوئی دلچسپی نہیں، امید ہے آئندہ آپ مجھ سے مل کر اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کریں گی۔"

مہوش شرمندہ سی اس کے سامنے سے اٹھ گئی اسے اس بداخلاق شخص پر غصہ آرہا تھا۔ اس کے بعد اس نے یہی کوشش کی کہ اس کا ارجن سے سامنا نہ ہو۔

ارجن کو کچھ ماہ بعد خبر ملی، رادھا کی حالت بہت خراب ہے۔ سی ٹی اسکین سے پتہ چلا تھا کہ اسے برین ٹیومر ہے۔ جو آخری اسٹیج پر ہے۔ وہ تڑپ اٹھا۔ وہ رادھا کی وجہ سے اس مقام پر پہنچا تھا وہ دوسرے روز انڈیا جانے والے جہاز پر سوار تھا، اس کے ہاتھوں میں ایک میگزین موجود تھا۔ جس کا وہ مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر اس وقت بھی بلیک کلر کے گلاسز موجود تھے۔ اس کے ساتھ والی نشست پر ایک انڈین لڑکی بیٹھی تھی۔ جس نے انتہائی نامناسب لباس زیب تن کر رکھا تھا، وہ انتہائی خوب صورت لڑکی تھی جدید فیشن کے لباس اور میک اپ کے لوازمات نے اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ وہ اس حسینہ کو نظر انداز کر کے مطالعے میں مصروف ہو چکا تھا۔ وہ حسینہ کچھ دیر تو پہلو بدلتی رہی پھر خود کلامی کے انداز میں بولی۔ "اتنی طویل فلائٹ مجھے بور کر دیتی ہے۔ لگتا ہے یہ جہاز اڑنے کے بجائے رینگ رہا ہے۔"

ارجن نے اس کی بات پر دھیان دیئے بغیر اپنی توجہ میگزین پر رکھی۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"ارجن نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

"اے مسٹر میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔"

"آ...... تم نے مجھ سے کچھ کہا۔" ارجن چونک کر بولا۔

"میں پوچھ رہی ہوں کہ تم کہاں جا رہے ہو سفر اگر طویل ہو تو ہم سفروں سے گفتگو میں اچھا وقت گزر جاتا ہے۔"

ارجن بولا۔ "میڈم یہ فلائٹ انڈیا جا رہی ہے، ظاہر ہے میں بھی انڈیا ہی جا رہا ہوں۔ اگر تم بور ہو رہی ہو تو سیٹ کھول کر سو سکتی ہو۔" ارجن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم اتنے اکھڑ مزاج کیوں ہو؟ کیا میں کوئی خوب صورت لڑکی نہیں۔"

"یہ سچ ہے کہ تم بہت ہی خوب صورت ہو لیکن غلط جگہ اپنا وقت برباد کر رہی ہو۔" وہ بدستور خشک لہجے میں بولا۔

"وہ لڑکی خواہ مخواہ اس کے گلے پڑ رہی تھی۔ یہی بات اسے کھٹک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ارجن اپنی سیٹ سے اٹھا اور باتھ روم کی طرف بڑھا لیکن وہاں پہلے سے کوئی موجود تھا۔ اس لئے وہ فوراً ہی واپس آگیا۔ اس کی آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ لڑکی نے اپنے ہینڈ بیگ سے کوئی چیز نکالی اور جھک کر اس کے بیگ میں ڈال دی۔

اچانک ارجن کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس وقت تک باتھ روم میں موجود شخص باہر آچکا تھا۔ ارجن باتھ روم جانے کے بجائے واپس اپنی سیٹ پر آگیا اور سیٹ کو دراز کر کے نیم دراز ہو گیا۔ لڑکی اونگھ رہی تھی۔ شاید اسے نیند آرہی تھی ارجن کا بیگ اوپر کے خانے میں رکھا تھا۔ اس نے اٹھ کر بیگ سے کمبل

نکالا اور اس کی آڑ میں اپنے بیگ میں اوپر رکھا ایک ڈبا نکال لیا۔ اس نے سیٹ پر بیٹھ کر کمبل کی آڑ میں وہ ڈبا کھولا اس میں ایک چھوٹا سا شوپیس تھا۔ لیکن ڈبے کا وزن اس شوپیس سے کہیں زیادہ تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اس ڈبے کی دہری تہہ ہے اس نے اوپری حصہ اٹھایا تو نیچے ایک پولی تھین تھیلی دکھائی دی۔ اس تھیلی میں سفید رنگ کا سفوف تھا وہ اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ ہیروئن ہے۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ لڑکی اس سے اتنی بے تکلف کیوں ہو رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ ہیروئن نکالنے میں کامیاب ہو جائے گا پھر وہ اس سے کسی بھی طریقے سے ڈبہ حاصل کر سکتی تھی۔ اگر وہ پکڑا جاتا تو وہ اس سے لاتعلقی اختیار کر لیتی۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔

اس نے سوچا باتھ روم میں جاکر اس تھیلی کو فلش میں پھینک دے۔ اس نے تھیلی نکالی ڈبے کو کمبل کے نیچے چھپایا اور خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا لگتا ہے آج سردی زیادہ ہے اس لئے بار بار سوسو آ رہی ہے۔ وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ باتھ روم میں جاکر تھیلی نکالی اس کا وزن بمشکل ڈھائی تین سو گرام تھا۔ لیکن اسے اندازہ تھا کہ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس کی قیمت لاکھوں روپے ہوگی۔ اس نے تھیلی فلش میں بہادی اور دوبارہ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

لڑکی بدستور سو رہی تھی۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور ڈبہ دوبارہ اپنے بیگ میں رکھ کر سیٹ پر نیم دراز ہو گیا پھر اسے بھی نیند آ گئی۔ اس کی آنکھ اس اعلان سے کھلی کہ طیارہ انڈین ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے والا ہے۔ لڑکی بھی اٹھ بیٹھی تھی۔ اس نے سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''کیسے ہو ہم وطن تم نے اب تک اپنا نام بھی نہیں بتایا چلو پہل میں ہی کرتی ہوں، میرا نام سریتا ہے۔''

''اور میں ارجن ہوں۔'' وہ بھی مسکرایا۔

''انڈیا میں کہاں ٹھہرو گے۔'' سریتا نے پوچھا۔

''اپنے گھر اور کہاں میری پیاری سی ماتاجی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ اپنا سیل نمبر تو دے دو۔'' سریتا بے تکلفی سے بولی اور ارجن نے منہ بناتے ہوئے اسے اپنا سیل نمبر بتایا۔

جہاز زمین کو چھو چکا تھا۔ اور پھر وہ آہستگی سے رک گیا۔ مسافر ایک ایک کرکے اترنے لگے۔ اس نے بھی اپنا ہینڈ بیگ سنبھالا اور کارگو سے آنے والے سامان سے اپنا بڑا بیگ لے کر امیگریشن اور کسٹم لاؤنج میں پہنچ گیا، سریتا کسٹم کاؤنٹر تک اس کے ساتھ تھی، کسٹم آفیسر نے اس کے سامان کا جائزہ لیا، ہینڈ بیگ کھول کر اس میں جھانکا، اچانک اس کی نظر اس خوب صورت ڈبے پر پڑی اس نے یہ ڈبہ نکال لیا اور پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' ارجن نے سریتا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو چکا تھا۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی ارجن ڈبے کی ملکیت سے انکار نہ کر دے ایسی صورت میں کسٹم آفیسر اس ڈبے کی باریک بینی سے تلاشی لیتا اور باآسانی خفیہ خانے تک رسائی پا لیتا۔

ارجن نے ڈبہ کھولا اور بولا۔ ''بہت خوب صورت شوپیس ہے۔'' اس نے شوپیس دوبارہ ڈبے میں رکھا اور بڑے بیگ کی تلاشی لینے کے بعد اسے کلیئر کر دیا۔

سریتا کے سامان کی تلاشی بھی ہو چکی تھی وہ دونوں چلتے ہوئے باہر نکلنے لگے۔ ''مس سریتا یہ ڈبا آپ ہی رکھ لیں یہ ویسے بھی آپ ہی کا ہے۔'' ارجن نے معنی خیز لہجے میں کہا اور سریتا حیران رہ گئی اب اس کی سمجھ میں آ چکا تھا کہ دوران سفر ارجن اسے ڈبہ رکھتے دیکھ چکا تھا، وہ ایئرپورٹ سے باہر نکل کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے گھر پر موجود تھا۔ خلاف توقع رادھا گھر پر ہی موجود تھی۔ ''کیسی ہو ماتاجی، میں نے تو سوچا تھا ہاسپٹل میں ہوں گی۔'' وہ رادھا سے گلے ملتے ہوئے بولا۔

''بیٹا میری زندگی کم ہے، جب مرنا ہی ہے تو سکون سے گھر پر مروں۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

''مریں آپ کے دشمن۔'' وہ اسے بانہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے کمرے میں آ گیا۔

''بیٹا مجھے برین ٹیومر ہے جو آخری اسٹیج پر ہے میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں آج تمہیں تمہاری زندگی کا ایک سچ بتا رہی ہوں۔ تمہیں میں نے اولاد سے بڑھ کر پالا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ تمہیں میں نے جنم نہیں دیا تمہارا تعلق کسی مسلمان گھرانے سے تھا۔

13 اگست 1947ء کو تقسیم ہندوستان سے ایک روز پہلے بلوائیوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ ہمارے گھر کے قریب سے ایک مسلمان شخص کی لاش ملی تو اس کے سینے پر تم لیٹے ہوئے تھے راج کے منع کرنے کے باوجود میں تمہیں گھر میں لے گئی۔'' وہ بولتے بولتے رکی۔

''آپ نے بے شک مجھے جنم نہیں دیا لیکن ایک ماں سے بھی بڑھ کر چاہا ہے۔'' وہ رادھا کے گلے لگ گیا۔

''سنو! ارجن میں نے تمام پراپرٹی بینک بیلنس سب کچھ تمہارے نام کر دیا ہے۔'' وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر دونوں نے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ رادھا کے سونے کے بعد ارجن اپنے کمرے میں آ گیا اسے نیند آ رہی تھی وہ بیڈ پر لیٹتے ہی سو گیا۔

اچانک اسے ایسا لگا جیسے اس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بج رہی ہوں، وہ کچھ دیر آنکھیں بند کئے لیٹا رہا پھر تنگ آ کر اٹھ بیٹھا، اس نے سیل فون اٹھا کر دیکھا چار مس کالز تھیں ایک بار پھر سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی، نمبر نامانوس تھا، اس نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو! ارجن میں سریتا بول رہی ہوں۔''

''تمہیں رات کے اس پہر ایسی کون سی تکلیف لاحق ہو گئی ہے جو بے وقت بول رہی ہو، میں ابھی تو سویا تھا۔'' وہ جھلا کر بولا۔

''زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو، ڈبے کے نچلے خانے میں جو پولی تھین کی تھیلی تھی وہ کہاں ہے؟'' دوسری طرف سے سریتا نے کہا۔

''کس ڈبے کی بات کر رہی ہو؟''

''میں اسی ڈبے کی بات کر رہی ہوں جو میں نے پلین میں تمہارے بیگ میں رکھا تھا، دیکھو ارجن اگر اپنی زندگی کی سلامتی چاہتے ہو تو وہ پولی تھین کی تھیلی میرے حوالے کر دو، جو تم نے اس ڈبے کے خفیہ خانے سے نکالی ہے۔'' دوسری طرف سے سریتا نے کہا۔

''تم نہ جانے کیا بکواس کر رہی ہو، میرے پاس کوئی تھیلی نہیں۔'' ارجن غرایا۔

''زیادہ چالاکی مت دکھاؤ تمہارا گھر ہماری نظروں میں ہے، ہم کسی بھی وقت تمہاری گردن دبوچ سکتے ہیں۔'' سریتا کسی زہریلی ناگن کی طرح پھنکاری۔

''ہم یہ ہم کون ہیں؟'' ارجن نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو میں اکیلی ہوں میرے ساتھ پورا نیٹ ورک ہے وہ لوگ اپنے مال کے سلسلے میں تم سے کوئی رعایت نہیں برتیں گے۔ تمہارے پاس اپنی جان بچانے کے لئے صرف دو گھنٹے کا وقت ہے۔''

''سریتا اب تم بھی میری بات کان کھول کر سن لو، میرے پاس تمہاری کوئی پولی تھین کی تھیلی نہیں آئندہ مجھے کال مت کرنا، تم اور تمہارا نیٹ ورک میرا جو بھی بگاڑ سکتے ہو بگاڑ لو۔'' ارجن نے غصے سے کہا اور موبائل فون آف کر دیا اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگا مگر ایک بار جاگنے کے بعد دوبارہ نیند ہی نہیں آ رہی تھی وہ پہلو پہ پہلو بدلنے لگا۔

کچھ دیر بعد کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی، شاید ماں جی ہوں گی اس نے یہ سوچتے ہوئے دروازہ کھول دیا دو آدمی اسے دھکیلتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے ان دونوں نے جینز پر ٹی شرٹس پہن رکھی تھیں اور چہروں پر خباثت ٹپک رہی تھی دونوں ہی تنومند تھے سب سے خطرناک بات ان کے ہاتھوں میں سائلنسر لگے پسٹل موجود تھے۔ ''کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟'' ارجن نے پوچھا۔

''ہم لوگ کون ہیں؟ اس بات کو چھوڑو ہاں وہ مال ہمارے حوالے کر دو جو تم نے سریتا سے لیا تھا'' ان میں سے ایک تنومند شخص بولا۔

"پہلے تم لوگ یہ بتاؤ تم اتنی آسانی سے میرے کمرے تک کیسے پہنچے، گیٹ پر چوکیدار موجود تھا اور دروازے بھی لاک تھے۔" ارجن نے پوچھا۔

"ہم لوگوں کے لئے چوکیدار کو کچھ گھنٹوں کے لئے سلانا مشکل نہیں وہ گیٹ کے قریب بے ہوش پڑا ہے اور ہر قسم کے تالے کھولنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" وہی شخص بولا۔ "اب بتاؤ ہمارا مال کہاں ہے؟"

"جب سریتا نے وہ ڈبہ میرے ہینڈ بیگ میں رکھا تو واش روم سے آتے ہوئے میں اسے دیکھ چکا تھا پھر میں نے چپکے سے اسے فلش میں بہا دیا کیونکہ اگر میں تمہاری ہیروئن کی وجہ سے پکڑا جاتا تو پھر کئی سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنے پڑتے، اب تم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ شرافت سے واپس لوٹ جاؤ۔"

ارجن نے اپنی آنکھوں سے بلیک گلاسز ہٹائے اور ایک تنومند شخص کی آنکھوں میں دیکھا۔ نظریں ملتے ہی اسے ایک جھٹکا سا لگا اور پسٹل ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا، دوسرا حیرت سے اپنے ساتھی کو دیکھنے لگا۔ ارجن نے میز پر رکھے شیشے کے گلاس پر نظریں جما دیں، گلاس فضا میں بلند ہوا اور اڑتا ہوا سا دوسرے شخص کے پسٹل والے ہاتھ سے ٹکرایا۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے بھی گر گیا۔ یہ ناقابل یقین منظر تھا۔

ارجن نیچے گرا ہوا پسٹل اٹھا چکا تھا، اس نے جس شخص کی آنکھوں میں جھانکا تھا وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے کھڑا تھا، اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ "اب تم دونوں مجھ سے کیسے بچو گے؟ اگر میں تمہیں یہیں گولی مار دوں تو مجھ پر کوئی بھی کیس نہیں بنے گا؟" وہ ہنسا۔

ان میں سے ایک بولا۔ "ہمارا باس ابھی اس کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک دراز قد ورزشی جسم کا مالک اندر داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں بھی لمبی نال والا سائلنسر لگا پسٹل موجود تھا اور چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ وہ آتے ہی درشت لہجے میں ان دونوں سے مخاطب ہوا۔ "اس نہتے شخص نے کیسے تم لوگوں سے پسٹل چھین لئے؟"

"یہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ غور سے دیکھو۔" ارجن نے کہا اور ایک طرف پڑی کرسی پر نظریں جما دیں، کرسی ہوا میں معلق ہوئی اور اڑتی ہوئی اس شخص کے ہاتھ سے جا ٹکرائی اور پسٹل اس کے ہاتھ سے بھی نکل گیا۔ "کیا تم جادو جانتے ہو؟" اس شخص نے پوچھا۔

"یہ جادو نہیں میری آنکھوں کی طاقت ہے اور میری آنکھوں میں دیکھنا بھی مت ورنہ تمہارے دماغ کو شدید ترین جھٹکا لگے گا، بہر حال اس بحث کو چھوڑو تمہارا مال میں فلیش میں بہا کر ضائع کر چکا ہوں، مجھے اندازہ ہے وہ مال لاکھوں کا تھا تم رقم بتاؤ میں تمہارا نقصان پورا کرنے کو تیار ہوں۔" ارجن نے گلاسز دوبارہ پہن لئے اور اپنے ہاتھ میں پکڑا پسٹل لے کر اس کی طرف پھینکا جسے دراز قد نے پکڑ لیا۔

"ایگری ینگ مین میرا نام پانڈے ہے۔ تمہاری حیرت انگیز صلاحیت نے مجھے حیران کر دیا ہے، رہی نقصان کی بات تو تمہاری دوستی پر یہ لاکھوں روپے قربان ہیں۔" اس نے پسٹل اپنے ہولسٹر میں رکھ لیا۔ "ارجن میرے پاس تمہارے لئے ایک پیشکش ہے کام بھی غیر قانونی نہیں کروڑوں روپے ملیں گے، جس میں میرا اور تمہارا حصہ ففٹی ففٹی ہوگا، کیا خیال ہے۔"

ارجن نے کہا۔ "پہلے کام بتاؤ۔"

"ہمارے پڑوسی ملک کے ایک برفانی پہاڑ میں کروڑوں کا سونے کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ یہ خزانہ اینٹوں کی شکل میں ہے۔ میرے پاس اس کا نقشہ بھی موجود ہے۔" پانڈے نے کہا۔

"جب تمہارے پاس نقشہ بھی موجود ہے تو تم خود اس خزانے کو حاصل کیوں نہیں کر لیتے، اس طرح سارا خزانہ صرف تمہارا ہوگا۔" ارجن نے استفسار کیا۔

"یہ اتنا بھی آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس خطے پر انگریزی کی حکومت تھی۔ کروڑوں کا سونا لے کر بینک کا عملہ جارہا تھا۔ گارڈز بھی موجود تھے کہ ان پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا، وہ ڈاکو پورے عملے کو قتل کرنے کے بعد خزانہ لے کر فرار ہو گئے۔ وہی خزانہ پاکستان کے اس برفانی پہاڑ میں پوشیدہ ہے آج سے پندرہ سال پہلے میرے چچا نے کوشش کی تھی وہ راجھستان کے راستے سے غیر قانونی طور پر پاکستانی حدود میں داخل ہوئے اور سیکورٹی فورسز کے ہاتھوں مارے گئے آج سے تین سال پہلے میرا بھائی موہن پاکستان گیا۔ اس کے ساتھ چار ساتھی بھی تھے جن میں سے ایک لڑکی تھی۔ وہ کامیابی سے اس پہاڑ تک جا پہنچے کچھ روز بعد مجھے مدھو کا فون آیا کافی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی اس کی بے ربط باتوں سے پتہ چلا کہ موہن سمیت اس کے سب ساتھی مارے جا چکے ہیں اور جس غار میں وہ کروڑوں کا خزانہ پوشیدہ ہے وہاں کوئی خوفناک بلا ہے جس نے سب کو مار ڈالا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ انسان سے مشابہ کوئی برفانی انسان ہے پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔ اور ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ میں نے اس کے بعد بھی چار مرتبہ پانچ پانچ افراد کے گروپ اس مشن پر بھیجے مگر ان کا بھی کوئی سراغ نہ ملا وہ سب پراسرار طور پر غائب ہو گئے۔ پانڈے نے کہا۔

"دیکھو پانڈے دولت کی میرے پاس کوئی کمی نہیں لیکن اس کام میں ایڈونچر ہے۔ اس لئے میں تمہارا ساتھ ضرور دوں گا۔ لیکن ابھی نہیں میری ماں کی حالت ٹھیک نہیں، ان کی طرف سے مطمئن ہوتے ہی میں تم سے رابطہ کروں گا۔" ارجن نے کہا اور پانڈے اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

مہوش پاکستانی ایئرپورٹ پر قدم رکھ چکی تھی، پچھلے ہفتے ہی سے اطلاع ملی تھی کہ پاکستان میں ڈاکوؤں نے اس کے گھر ڈکیتی کی واردات کے دوران مزاحمت پر اس کے چچا ملک ذوالفقار کو گولی ماردی تھی۔ ان کا باڈی گارڈ بھی مارا گیا تھا۔ اس کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ اس سانحے کی اطلاع سنتے ہی اس نے پاکستان آنے کی تیاری کر لی تھی۔ ایئرپورٹ پر اسے لینے کے لئے رضوان موجود تھا۔ "کیسی ہو مہوش۔" اس نے بیگ مہوش کے ہاتھوں سے لیا اور کار کی ڈگی میں رکھ دیا۔

"ٹھیک ہوں، انکل کے ساتھ یہ سانحہ کیسے پیش آیا؟" مہوش نے پوچھا۔

"اس روز میں کالج میں تھا کہ حویلی میں ڈاکو گھس گئے، ابو نے مزاحمت کی اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے، انہوں نے گارڈ اللہ بخش کو بھی قتل کر دیا۔" رضوان افسردہ لہجے میں بولا۔

مہوش نے اس کی طرف دیکھا نہ جانے اسے ایسے کیوں لگا کہ رضوان کی افسردگی مصنوعی ہے۔

کار تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی کچھ دیر بعد مہوش نے محسوس کیا کار ایک مختلف سڑک پر جا رہی ہے۔ "یہ تم کہاں جا رہے ہو؟" مہوش نے استفسار کیا۔

"خاموش بیٹھی رہو ورنہ یہیں گولی مار کر پھینک دوں گا اور میرا کام آسان ہو جائے گا۔" رضوان نے برقی سرعت سے پسٹل نکالا اور نال اس کے پہلو سے لگا دی۔

"رضوان یہ تم اچھا نہیں کر رہے۔" مہوش بولی۔

"اپنا منہ بند رکھو ورنہ گولی چلا دوں گا۔" وہ سفاک لہجے میں بولا۔

مہوش ہونٹ کاٹتے ہوئے گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔ گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک عمارت کے سامنے جا رکی رضوان نے ہارن بجایا گیٹ کی ذیلی کھڑکی سے کسی نے جھانکا اور گیٹ کھول دیا چلو اترو نیچے گاڑی کے اندر جاتے ہی رضوان نے اسے باہر دھکیلا، گیٹ کھولنے والا شخص بڑی بڑی مونچھوں والا گرانڈیل اور شکل وصورت سے غنڈا ٹائپ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل موجود تھی۔ وہ مہوش کو گن پوائنٹ پر لئے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوئے، اندر پولیس یونیفارم میں ایک گرانڈیل شخص موجود تھا، اس کے سامنے میز پر شراب کی بوتل اور شیشے کا گلاس پڑا تھا، بوتل نصف سے زائد خالی تھی۔ وہ ان کے آنے سے پہلے شراب نوشی میں

معروف تھا۔ ”ریاض یہ ہے میری کزن مہوش؟“ رضوان مہوش کو بیڈ کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا اور خود بھی صوفہ پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ رائفل بردار دروازے میں چوکنا کھڑا تھا۔

”اوہ! تو اس سے میرا تعارف بھی کروادے۔ چلو میں خود ہی اپنا تعارف کروادیتا ہوں۔“ روپ کی رانی ماڑا نام ایس ایچ او ریاض ہٹلر ہے، ماڑے کویاں کے لوگ ہٹلر کہوت ہیں۔ اور یہ سالا رضوان ماڑا جگری دوست ہے۔“ وہ نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

”اب میری بھی سنو! مہوش تمہیں کچھ ڈاکومنٹس پر سائن کرنے ہیں۔ جن کی رو سے تمہاری تمام دولت و جائیداد اور کاروبار کا مالک میں ہوں۔ اگر نہیں بھی کروگی تو بھی کوئی مسئلہ نہیں تمہارے مرنے کے بعد میں خود ہی تمہاری دولت و جائیداد کا مالک بن جاؤں گا، اتنا سوچ لو کہ میں نے اپنے باپ کا لحاظ نہیں کیا تو تمہارا کیا کروں گا۔ باپ بڑا ایماندار اور اصول پرست بنتا تھا۔ میری بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے ڈاکوؤں کا ڈرامہ کرکے اسے اور اللہ بخش کو اوپر پارسل کرنا پڑا۔“ رضوان خباثت سے ہنسا۔

”تم ایک بے ضمیر اور بے غیرت انسان ہو، تم تو جانوروں سے بھی بدتر ہو، جنہیں رشتوں کی بھی پہچان نہیں ہوتی، دولت کے لئے اپنے باپ کو مارنے کے بعد اب اپنی بہن کو بھی اس بے غیرت کے ٹھکانے پر لے آئے ہو۔“ مہوش نے غصے سے کہا۔

”رانی جتنا پھڑ پھڑانا ہے پھڑ پھڑا لو رات کو تم سے ملیں گے بریک کے بعد، ویسے بھی ہم مل بانٹ کر کھانے کے عادی ہیں۔ تمہیں اپنی کلاس فیلو فائزہ تو یاد ہوگی۔ ناں اسے رضوان نے محبت کے جال میں پھنسایا لیکن پریگنینٹ ہونے کے بعد اس نے شادی کے نام پر رضوان کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ رضوان اسے بہلا پھسلا کر یہاں لے آیا۔ یہاں ہم تینوں نے مل کر اس کی عزت کا انکاؤنٹر کیا۔ مگر پھر بھی ہم اسے زندہ چھوڑ دیتے پر اس بے وقوف نے راستے میں گاڑی سے اترتے وقت دھمکی دی کہ وہ ہمیں جیل میں بند کروادے گی اسے اپنے باپ کے ڈی ایس پی ہونے کا گھمنڈ تھا۔ مجبوراً ہم نے اسے بھی ماردیا۔“ ریاض ہٹلر نے کہا اور مہوش سناٹے میں آگئی۔

”نواب تم اس کا خیال رکھو، ہم دونوں کسی کام سے جارہے ہیں۔“ انہوں نے رائفل بردار سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

کچھ دیر بعد گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ مہوش سمجھ گئی کہ وہ دونوں جاچکے ہیں نواب نے کمرے سے باہر نکل کر دروازہ مقفل کردیا تھا مہوش بیڈ پر بیٹھ کر سوچنے لگی اس مصیبت سے کیسے نکلا جائے۔ اس کی عزت اور زندگی خطرے میں تھی۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا، بارہ ضرب پندرہ کے کمرے میں روشن دان کافی بلندی پر تھا۔ اس تک پہنچنا اس کے لئے مشکل تھا۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ جس کے باہر نواب نامی رائفل بردار چوکنا کھڑا تھا۔ کمرے کی واحد کھڑکی میں لوہے کی مضبوط سلاخیں تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا اس کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ رات نو بجے کے قریب کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی وحشت ناک صورت رائفل بردار اندر داخل ہوا۔ مہوش چونک کر بیڈ سے اتر کر کھڑی ہوگئی۔ نواب کی آنکھوں میں ناچتی ہوس صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ کردیا تھا۔ وہ رائفل کمرے کی دیوار سے ٹکرا کر نشے سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

”کڑی! ابھی ایس ایچ او کے آنے میں دیر ہے۔ جب تک تم حوالدار نواب کو خوش کردو، ویسے بھی راضی خوشی مان جاؤ تو اچھا ہے۔ ورنہ مجھے زبردستی کرنا پڑے گی، چیخنا چلانا بیکار ہے، یہ ہٹلر کا نجی ٹارچر سیل آبادی سے بہت دور ہے۔ ویسے بھی ہٹلر اور رضوان نے آکر تمہاری عزت کا انکاؤنٹر کرنا ہے تو پہل نواب کیوں نہ کرے۔“ وہ خباثت سے ہنستا ہوا اس کی طرف بڑھا اور ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا۔

مہوش نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور دائیں

ں کی ایڑی پر گھوم کر دوسرے پاؤں کی اپر پام سے ں کی کنپٹی پر کک ماری۔ اس کی نظروں کے سامنے تارے رقص کرنے لگے ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ پ سائیڈ کک اس کے سینے پر لگی وہ لڑکھڑاتا ہوا پشت موجود دیوار سے جا ٹکرایا۔ جیسے ہی اٹھا مہوش نے ہنگ کک ماری وہ دوبارہ گر پڑا۔ وہ جسے عام لڑکی سمجھ کر زیر کرنا چاہتا تھا وہ مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ تھی۔ ے سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ لاتیں اور گھونسے کہاں سے ر کیسے اس پر برس رہے ہیں وہ اسے زیر کرنے کے چکر ں کافی پٹ چکا تھا۔ اس کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ خالی ہاتھ اس لڑکی کو زیر کرنا ناممکن ہے تو وہ اپنی رائفل کی طرف بڑھا مگر اب ے دیر ہوچکی تھی اس کی پشت پر جمپ سائیڈ کک لگی وہ ہ کے بل گرا۔ مہوش پنجوں کے بل اچھلی اور اس پر چھلانگ لگادی۔ اس کی کہنی نواب کی ریڑھ کی ہڈی سے ٹکرائی۔ کہنی پر پورے بدن کا وزن تھا۔ وہ کربناک انداز میں چیخا اور تڑپنے لگا اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی، مہوش رائفل کی طرف لپکی اس نے پوری قوت ے رائفل کا دستہ نواب کے سر پر مارا وہ دلدوز انداز میں چیخا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔

مہوش نے رائفل اٹھائی اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اب اسے رضوان اور ریاض ہٹلر کے آنے سے پہلے یہاں سے نکلنا تھا۔ وہ کوریڈور ے ہوتی ہوئی باہر پہنچی۔ باہر ایک پولیس جیپ موجود تھی۔ رضوان اور ریاض ہٹلر کار پر گئے تھے خوش قسمتی ے چابی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے گیٹ کھولا جیپ اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے باہر نکل کر ایک طرف دوڑا دی۔ یہ ویران علاقہ تھا۔ دور دور تک آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ وہ ان سڑکوں سے بھی واقف نہ تھی۔ جیپ مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ اسے جیپ چلاتے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس نے سوچا اب تک رضوان اور ریاض ہٹلر اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکے ہوں گے اس کے ہاتھوں ایک پولیس اہلکار قتل ہوچکا تھا۔ بے شک اس نے اپنی عزت بچاتے ہوئے اسے مارا تھا۔ لیکن یہ اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ ہٹلر پولیس کی مدد سے اسے با آسانی تلاش کرسکتا تھا۔ اب اسے سب سے پہلے اس سرکاری جیپ سے نجات حاصل کرنا تھی۔ لیکن اس ویرانے میں جیپ سے اترنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے دور سے کسی آبادی کے آثار دکھائی دیئے یہ سڑک سے کافی فاصلے پر تھی۔

اچانک جیپ کو جھٹکا لگا اور وہ رک گئی۔ مہوش نے سرد آہ بھری اور جیپ سے اتر گئی۔ فیول ختم ہوچکا تھا۔ رائفل جیپ میں ہی چھوڑی اور سڑک سے اتر کر ایک طرف چلنے لگی، یہ ایک کچی سڑک تھی۔ وہ کافی دیر تک پیدل چلتی رہی مگر آبادی تک نہ پہنچی حالانکہ سڑک سے آبادی اتنی دور نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ اردگرد کوئی بورڈ بھی نہ تھا۔ جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ کس علاقے میں ہے۔ اس کا بھوک اور پیاس سے برا حال تھا کئی گھنٹوں سے نہ کچھ کھایا تھا اور نہ ہی پیا تھا، صبح کی سپیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ اب وہ آبادی کے قریب پہنچ چکی تھی۔

پہلا مکان سامنے آتے ہی اس نے بے تابی سے دروازے پر دستک دی۔ آرہا ہوں بھاری مردانہ آواز سنائی دی اور دروازہ کھلا اس کے سامنے ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے گھیرے دار شلوار پر بنیان پہن رکھی تھی سر کے بال سفید اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ ”بابا میری گاڑی سڑک پر خراب ہوگئی ہے راستہ بھٹک چکی ہوں کچھ دیر کے لئے پناہ چاہئے۔“ مہوش نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”اندر آجاؤ۔“ ادھیڑ عمر شخص نے کہا اور سائیڈ میں ہوگیا۔ مہوش اندر داخل ہوگئی۔ ایک طرف مٹی کے چولہے پر ادھیڑ عمر خاتون چائے بنارہی تھی یہ کچی اینٹوں کا بنا ہوا مکان تھا چھوٹا سا صحن اور برآمدے کے ساتھ دو کمرے تھے، برآمدے میں چارپائی بچھی ہوئی تھی وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ادھیڑ عمر شخص چارپائی کے قریب رکھے اسٹول پر جا بیٹھا۔ ”یہ میری دھرم پتنی ہے۔ پاروتی

اور میں جوگندر۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔ عورت کے ماتھے پر موجود تلک سے مہوش پہلے ہی اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ ہندو ہے۔

"بابا میرا نام مہوش ہے، یہ کون سا علاقہ ہے؟"

تم صحرا کے قریب موجود ہو پرنتو گھبراؤ مت میرا بیٹا آنند آنے والا ہے وہ آجائے پھر کچھ کرتے ہیں۔" اتنی دیر میں چائے تیار ہو چکی تھی۔ چائے کے ساتھ پراٹھے تھے۔ تینوں نے ناشتہ کیا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ ایک تیس سالہ شخص موٹر سائیکل گھسیٹتا ہوا اندر داخل ہوا۔ مہوش کو دیکھ کر چونکا۔ "آنند یہ لڑکی راستہ بھٹک کر یہاں پہنچ گئی ہے۔ کہتی ہے اس کی گاڑی سڑک پر خراب ہوگئی ہے۔ ناشتہ کرکے اس کے لئے کچھ کرو۔" جوگندر نے کہا اور آنند سر ہلاتا ہوا کمرے میں داخل ہوگیا۔ ناشتہ کرکے کچھ دیر بعد موٹر سائیکل پر گھر سے نکلا۔ اس کی واپسی تقریباً تین گھنٹے بعد ہوئی۔

"پتا جی میں اسے لے کر کشن کے گھر جارہا ہوں مجھے اور کشن کو ویسے بھی ایک کام کے سلسلے میں شہر جانا تھا۔ راستے میں اسے بھی چھوڑ دیں گے۔"

وہ مہوش کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر قریب ہی ایک دوسری آبادی میں لے گیا۔ یہاں بھی کچی اینٹوں کے بنے ہوئے مکانات اور جھونپڑے تھے۔ وہ جس مکان میں داخل ہوئے اس میں ایک دبلا پتلا چالیس سالہ شخص موجود تھا۔ گھر کے باہر ایک چوڑے ٹائر والی جیپ کھڑی تھی۔ یہ کشن ہے اس نے دبلے پتلے شخص کا تعارف کروایا۔ "کشن یہ وہ لڑکی ہے جسے شہر پہنچانا ہے۔"

کشن نے غور سے مہوش کو دیکھا۔ "تم بیٹھو ابھی تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔ لڑکی تم نے کہا تھا کہ سڑک پر تمہاری گاڑی خراب ہوگئی تھی میں جب شہر سے لوٹ رہا تھا تو وہاں ایک پولیس جیپ کھڑی تھی۔" آنند نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"میرے ڈیڈی پولیس آفیسر ہیں۔ یہ جیپ انہی کی ہے۔" مہوش نے سچ بولنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔

کچھ دیر بعد کشن اور آنند نے دو بڑے بڑے بیگ جیپ کی پچھلی نشست پر رکھے وہاں ایک کین بھی رکھا تھا۔ شاید اس میں فیول تھا۔ آنند نے موٹر سائیکل کشن کے گھر میں کھڑی کردی۔ مہوش پچھلی نشست پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اور جیپ تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ مہوش کا ارادہ شہر جاکر عاشی کے گھر جانے کا تھا پھر وہ ڈی ایس پی پرویز سے رابطہ کرکے اسے اصل بات بتا کر مدد کی درخواست کرتی۔

اچانک مہوش کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیپ اس سڑک پر نہیں جارہی جہاں اس نے جیپ کھڑی کی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ گھنٹے بعد اس کے خدشات درست نکلے۔ جیپ صحرائی علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ "یہ تم لوگ کہاں جارہے ہو؟" وہ چلائی تو کشن نے اپنی بیلٹ میں اڑسا پسٹل نکال لیا۔ خاموش بیٹھی رہو ورنہ تمہیں یہیں مار کر صحرا میں دفن کردوں گا۔" وہ سفاک لہجے میں بولا۔

"تم لوگ مجھے کہاں لے جارہے ہو؟" مہوش نے پوچھا۔

"گھبراؤ مت تمہیں پرستان کی سیر کرائیں گے۔ راستے میں تمہارا دل بھی بہلاتے رہیں گے۔" آنند نے شیطانی انداز سے قہقہہ لگایا۔

وہ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی، جیپ تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی اگر کشن کے پاس پسٹل نہ ہوتا تو وہ مزاحمت کرتی، اس کے اندازے کے مطابق آنند کے پاس بھی کوئی نہ کوئی ہتھیار پوشیدہ تھا۔ تپتی دھوپ میں صحرا میں جیپ کافی دیر سے چل رہی تھی، اسے پیاس لگ رہی تھی، "مجھے پیاس لگ رہی ہے،" آنند نے اپنے پاؤں کی طرف رکھے پلاسٹک کے کین سے ڈیش بورڈ سے نکالے گئے گلاس میں پانی انڈیلا اور اسے تھما دیا۔ مہوش پانی ایک ہی سانس میں پی گئی کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "جیپ کچھ دیر کے لئے روکنا۔"

"کیوں کیا تکلیف ہے؟" آنند غرایا اور مہوش بے بسی سے بولی۔ "مجھے فطری ضرورت پوری کرنی ہے۔" آنند نے جیپ ایک طرف روک دی۔

"کشن اسے لے جاؤ۔" وہ جیپ سے اتری، کشن بھی پسٹل تانے اس کے پیچھے اترا۔ "وہ سامنے ریت کا ٹیلا ہے۔ اس کے پیچھے چلی جائے اور فارغ ہو کر جلدی سے آؤ اور خیال رکھنا کسی قسم کی ہوشیاری مت دکھانا یہاں صحرا میں چاروں طرف ریت ہی ریت ہے اگر ہم سے بچ بھی گئی تو راستہ بھٹک کر پیاس سے مرجاؤں گی۔" وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی ٹیلے کے پیچھے چلی گئی۔ جب واپس آنے لگی تو اسے دیکھتے ہی کشن نے اطمینان کا سانس لیا اور پسٹل والا ہاتھ نیچے کرلیا۔ ادھر آنند جیپ میں بیٹھا شراب کی بوتل منہ سے لگائے گھونٹ بھر رہا تھا۔ وہ کشن کے قریب پہنچ چکی تھی۔ کشن کا پسٹل والا ہاتھ نیچے ہی تھا۔ وہ اسے عام لڑکی سمجھ کر اس سے غافل ہو چکا تھا۔ یہی غفلت اسے مہنگی پڑی۔ مہوش نے قریب آکر برق سرعت سے اس کی کنپٹی پر ایروکن پنچ رسید کیا کشن کا دماغ چکرا اٹھا۔ اس نے پسٹل والا ہاتھ سیدھا کیا ہی تھا کہ مہوش نے اس کی ٹانگوں کے بیچ اسٹریٹ کک رسید کی۔ وہ اوغ کی آواز نکالتا ہوا۔ رکوع کے بل جھک گیا۔ پسٹل اس کے ہاتھوں سے گر چکا تھا۔ جسے مہوش نے اٹھالیا اور لاک پن ہٹائی کشن کے نازک ترین مقام پر زوردار ضرب لگی تھی وہ اب تک تکلیف کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ ادھر آنند بساط کا رخ پلٹتے دیکھ چکا تھا اس نے اپنا پسٹل نکالنا چاہا مہوش نے پسٹل کا رخ اس کی طرف کرکے ٹریگر دبا دیا۔ گولی آنند کی گردن میں لگی وہ کربناک انداز میں چیخا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔

"اٹھو بے غیرت انسان۔" مہوش نے کشن کے سر پر ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا بمشکل اٹھا۔ "دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر پیچھے ہٹتے جاؤ اگر رکو گے تو گولی چلادوں گی اور اس صحرا میں آنند کی طرح تمہاری لاش بھی بے گور و کفن پڑی رہے گی۔"

"دیکھو لڑکی تم اجنبی ہو یہاں کے راستوں سے واقف نہیں اس جیپ کے بل بوتے پر اس صحرا سے نکلنا مشکل ہے۔ تم راستہ بھٹک جاؤ گی۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بولا۔ وہ دیکھ چکا تھا بظاہر بے ضرر نظر آنے والی یہ خطرناک لڑکی اس سے پسٹل چھین کر اس کے ساتھی کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہے۔

"تم میری فکر چھوڑو، میں جو کہہ رہی ہوں وہ کرو اور اپنی جان بچاؤ۔ ہری اپ، میں صرف تین تک گنوں گی، ایک...... دو، وہ اس کے دو تک گنتے ہی الٹے قدموں چلتی ہوئی جیپ تک پہنچی۔ اور کشن کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس نے آنند کی لاش کو گھسیٹ کر جیپ سے باہر پھینکا اور پچھلی نشستوں پر موجود دونوں بیگ بھی جیپ سے باہر پھینک کر کشن کی طرف دیکھا وہ ٹیلے کے قریب رک چکا تھا۔ "رکو مت۔" مہوش نے چلا کر کہا اور ہوائی فائر کیا تو وہ خوفزدہ ہو کر دوبارہ پیچھے ہٹنے لگا۔

مہوش نے جیپ سے ایک کپڑا اٹھایا، خون آلود سیٹ صاف کی اور جیپ اسٹارٹ کی اور ریورس کرکے واپس اسی راستے پر چلادی جس سے وہ آئے تھے۔ کشن چیختا چلاتا ہوا جیپ کے پیچھے دوڑا مگر اب یہ سب بیکار تھا۔ جیپ اس سے خاصے فاصلے پر جا چکی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد اس کے سامنے دو راستے آگئے ایک کچی سڑک دائیں طرف جارہی تھی اور دوسری بائیں طرف، اس نے جیپ روک کر کچھ دیر کے لئے سوچا اور پھر بائیں سمت والے راستے پر جیپ دوڑا دی۔ اسے اس راستے پر جیپ چلاتے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ مگر وہ اب تک ریگستان میں ہی تھی، اسے دھوپ کی شدت سے پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے جیپ روکی، پلاسٹک کین سے پانی پیا۔ ایک طرف لنچ بکس رکھا تھا۔ جس میں بھنا ہوا قیمہ اور چھ سات روٹیاں تھیں، بھوک اس قدر شدید تھی کہ وہ تین روٹیاں کھا گئی۔ کچھ دیر سستانے کے بعد جیپ دوبارہ چلادی۔

دوپہر ڈھل چکی تھی شام ہونے والی مگر کسی آبادی کے آثار اب تک دکھائی نہیں دیئے تھے اس نے

سوچا۔ ”میں راستہ بھٹک چکی ہوں۔“

یہ سوچ بہت ہی بھیانک تھی۔ اس تپتے صحرا میں راستہ بھٹکنے کا مطلب اذیت ناک موت تھا۔ پلاسٹک کے کین میں پانی بھی کم رہ گیا تھا۔ اندھیرا چھاتے ہی اس نے جیپ کی ہیڈ لائٹس آن کرلیں اور جیپ چلاتی رہی، رات آدھی سے زائد بیت چکی تھی اسے نیند آنے لگی، اس نے سر جھٹک کر نیند کو بھگانے کی کوشش کی اور گاڑی چلاتی رہی۔ رات کے پچھلے پہر نیند کی شدت سے اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور اس سے وہ غلطی سرزد ہوگئی جو نہیں ہونی چاہئے تھی۔ گاڑی کچی سڑک سے اتر کر صحرائی ریت میں دھنس چکی تھی، اس نے کافی کوشش کی کہ جیپ کو نکالے۔ مگر ناکام رہی اور نیچے اتر کر دھکا دے کر جیپ کو نکالنا چاہا مگر یہ اس جیسی نازک جسمانی لڑکی کے لئے ناممکن تھا۔ جیپ کے ٹائر صحرائی ریت میں پھنس چکے تھے۔ تھک ہار کر جیپ میں بیٹھی باقی ماندہ کھانا کھایا تھوڑا سا پانی پیا کین میں اب تین چار گلاس پانی بچا تھا۔ پسٹل لباس میں چھپایا۔ پانی کا کین ہاتھ میں تھام کر پیدل چلنے لگی، کافی دیر پیدل چلنے کے بعد وہ رک گئی۔ پیٹ بھر جانے کے بعد نیند کا غلبہ شدید ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھ سورج کی تپش سے کھلی۔ سورج مکمل نکل چکا تھا۔ دھوپ اس قدر شدید تھی کہ جسم میں سوئیاں سی چبھو رہی تھیں۔ شدید قسم کی پیاس لگ رہی تھی، چند گھونٹ پانی پیا اور پیدل چلنے لگی۔ وہ بنا رکے تین چار گھنٹے چلتی رہی، شدید پیاس کے باوجود اس نے پانی نہیں پیا اسے معلوم تھا کہ صحرا میں ایک گھونٹ پانی دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ قیمتی ہے۔ ایک جگہ رک کر پانی پیا اور پھر آگے بڑھی۔ شام کے قریب وہ تھکن سے نڈھال ہو چکی تھی۔ قدم من بھر کے ہو چکے تھے۔ وہ بے دم ہو کر گر پڑی، چند گھونٹ پانی پیا۔ اب کین میں بہت کم پانی رہ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر بے سدھ ریت پر پڑی رہی اور پھر اٹھ کر چلنے لگی۔

رات ہو چکی تھی، وہ بنا رکے چلتی رہی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد ایک ٹیلے پر چڑھ کر چاروں طرف نظر دوڑائی، کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ دکھائی دیئے وہ خوشی سے اچھل پڑی اور تیز رفتاری سے درختوں کی طرف چلنے لگی۔ چلتے چلتے رات کا پچھلا پہر گزر گیا۔ مگر وہ ہنوز درختوں کے جھنڈ سے دور تھی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد وہ بے دم ہو کر گر پڑی۔ اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ اسے ہوش آیا تو سورج نکل چکا تھا۔ بھوک کی شدت سے پیٹ میں چوہے اور ہاتھی دونوں دوڑ رہے تھے۔ پیاس سے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ اس نے کین میں موجود پانی کا آخری قطرہ تک حلق میں انڈیل دیا، اور ایک طرف چل دی۔ دھوپ اس قدر تیز تھی کہ اس کا لباس پسینے سے گیلا ہو چکا تھا۔ سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ لباس بدن سے اتار کر ایک طرف پھینک دے مگر فطری شرم وحیا آڑے آرہی تھی وہ چلتی رہی، چلتی رہی بالآخر لڑکھڑا کر گر پڑی، مسلسل پیدل چلنے سے پاؤں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اس نے ریت پر بیٹھ کر اپنے پاؤں دیکھے دونوں پاؤں کے تلے چھالوں سے بھرے ہوئے تھے۔ تپتی ریت میں چلنے سے چھالے پھٹ کر شدید تکلیف دے رہے تھے۔ کچھ دیر پڑے رہنے کے بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہی۔ اب تپتی دھوپ میں مزید چلنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ ”کیا وہ بے گوروکفن بے بسی سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گی۔“ یہ سوچتے ہی اس کے رگ وپے میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اگر ایک گھونٹ پانی بھی مل جاتا تب بھی وہ چل سکتی تھی۔ اچانک ایک خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اس نے پسینے میں تر اپنی قمیض اتاری اور گولا بنا کر اس پر اپنے لب رکھ دیئے، پھر وہ مطلوبہ چیز کو چوسنے لگی۔ اسے اپنے جسم کا پسینہ آب حیات محسوس ہوا، اس نے قمیض دوبارہ زیب تن کی اور اللہ کا نام لے کر قدم آگے بڑھا دیئے۔

چکراتے ذہن اور لڑکھڑاتے قدموں سے وہ بنا رکے چلتی رہی۔ دن ڈھل چکا تھا، پیاس کی شدت سے جان لبوں پر آچکی تھی مگر اب مزید چلنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ قریب ہی ایک ٹیلے پر چڑھ کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ کچھ دور درختوں کا جھنڈ دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ انسانی سائے متحرک نظر آرہے تھے۔ ”ہوسکتا ہے یہ بھی سراب ہو۔“ اس نے خود کلامی کی ذہن پر دھند سی چھا رہی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے لباس سے پسٹل نکالا اور پے درپے چند فائر کئے۔ صحرا فائر کی ہولناک آوازوں سے گونج اٹھا، وہ لہرا کر گری اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہوگئی۔ اسے ہوش آیا تو خود کو چارپائی پر پڑے پایا اس سے کچھ فاصلے پر ایک دوسری چارپائی بچھی ہوئی تھی جس پر ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر شخص پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کی ہم عمر پستہ قامت عورت بیٹھی تھی۔ یہ مٹی کا بنا ہوا کچا مکان تھا۔ بڑھیا کے ماتھے پر موجود تلک سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہندو ہے۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئی مہوش کے دونوں پاؤں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور جسم پر دوسرا لباس موجود تھا۔

”بیٹی چارپائی سے اتر نا مت تمہارے پاؤں بری طرح گھائل تھے حکیم سے پٹی کروائی تھی۔“ بوڑھے نے کہا۔

”اور میرے کپڑے۔“ مہوش نے پوچھا۔

”بہت میلے اور گندے تھے جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے۔ مالا نے تبدیل کئے ہیں۔“ بوڑھے نے بڑھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”بابا یہ کون سا علاقہ ہے؟؟“

”بیٹی یہ راجستھان ہے۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ مہوش سناٹے میں آگئی گویا وہ انڈیا میں موجود تھی۔

”پر تم کون ہو اور اس صحرا میں کیسے بھٹک رہی تھیں؟“ بوڑھے نے نرم لہجے میں پوچھا۔ مہوش کو وہ ہندو بوڑھا مخلص لگا، وہ اسے اپنی روداد سنانے لگی۔ ”کاجل کچھ لے آؤ اسے ہوش آگیا ہے۔“ مالا نے اس دوران کسی کو آواز لگائی۔ بوڑھا حیرانی سے اس کی روداد سنتا رہا۔

”بیٹی میرا نام گوپال ہے تم میری بیٹی کاجل کی طرح معصوم ہو، میں نہیں چاہتا تمہیں کوئی نقصان پہنچے ہر دھرم کے ماننے والوں میں اچھے برے ہوتے ہیں، یہاں کسی کو بھی مت بتانا کہ تم مسلمان ہو اور پاکستانی ہو، یہاں کے بہت سے انتہا پسند مسلمانوں خاص کر پاکستانیوں سے نفرت کرتے ہیں، یہاں کا تھانہ انچارج بھی مسلمانوں، خاص کر پاکستانیوں کا دشمن ہے اگر اسے تمہارے بارے میں پتہ چلا تو وہ تمہیں جاسوسی کے الزام میں گرفتار کرلے گا، میں سب کو یہی بتاؤں گا کہ تم ہندو ناری ہو، تم اپنا نام مالتی بتانا، جب تک تمہارے پاؤں کے زخم ٹھیک نہیں ہوتے تم یہیں رہو۔“ گوپال نے کہا۔

اس دوران اس کی بیٹی کاجل ناشتہ لے کر آچکی تھی، کاجل مہوش سے سال دو سال چھوٹی ہی لگ رہی تھی لیکن تھی بہت خوب صورت۔ ”پتا جی دیدی کا نام کیا ہے؟“ کاجل نے ناشتہ رکھتے ہوئے پوچھا اور مہوش کے برابر بیٹھ گئی۔ ”بیٹا اس کا شبھ نام مالتی ہے۔“ گوپال نے مسکرا کر کہا۔

”میں تو انہیں دیدی ہی کہوں گی میرا کوئی بہن بھائی نہیں ہے ناں۔“ کاجل نے معصومیت بھرے لہجے میں کہا اور مہوش مسکرا اٹھی، اسے یہ سادہ لوح مخلص لوگ اچھے لگے تھے چند دنوں میں اس کے پاؤں کے زخم ٹھیک ہوگئے۔

اسی روز ان کے گھر ایک پنڈت داخل ہوا، وہ کالا سیاہ قوی ہیکل اور ادھیڑ عمر تھا سر پر چٹیا اور ماتھے پر قشقہ موجود تھا گلے میں مختلف اقسام کی مالائیں تھیں۔ ”گوپال یہ ناری کون ہے؟“ وہ مہوش کو گھورتے ہوئے بولا۔

”مہاراج یہ مالتی ہے میرے دوست مکیش کی بیٹی، مجھ سے ملنے آرہے تھے کہ یہ راستہ بھٹک گئی۔“ گوپال نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

وہ چند لمحے خشمگیں نظروں سے گوپال اور مہوش کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”گوپال مجھے تمہاری باتوں پر وشواس نہیں ہو رہا، جاتے سمے تمہیں چتاؤنی دے رہا ہوں مجھ سے کچھ چھپانا مت ورنہ۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولتا ہوا باہر نکل گیا۔

”یہ کون تھے؟“ مہوش نے پوچھا۔

”یہ یہاں کے مندر کے بڑے پجاری ہیں کالی کے بھگت، مسلمانوں اور نچلی ذات والوں سے نفرت

کرتے ہیں۔ لگتا ہے انہیں تم پر شک ہوگیا ہے اگر ایسا ہے تو یہ بہت برا ہوا ہے تھانہ انچارج دیپک سے لے کر بڑے بڑے پولیس افسران ان کی بہت سنتے ہیں اب تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ میں تمہیں شہر اپنے دوست پردیپ کے پاس بھجوا دیتا ہوں، وہ بہت پیسے والا ہے، میرے بچپن کا دوست ہے اور میری سنتا بھی بہت ہے، وہ تمہیں کسی نہ کسی طرح تمہارے دیش بھجوا دے گا۔"

اسی روز شام کو اس نے گاؤں کے ایک ادھیڑ عمر شخص بھگوان داس کے ہمراہ اسے رخصت کردیا۔ بھگوان داس اسے لے کر خاموشی سے وہاں سے نکلا۔ رات دوسرے گاؤں میں بھگوان داس کے ایک رشتے دار کے گھر بسر کی۔ صبح وہاں سے روانہ ہوگئے، پردیپ کمار ایک ساٹھ سالہ صحت مند شخص تھا وہ اپنے محل نما گھر میں اپنی بیوی دو شادی شدہ بچوں اور ایک بیٹی سرسوتی کے ہمراہ رہتا تھا۔ گوپال نے اس کے نام ایک خط لکھ کر مہوش کو دیا تھا۔ گوپال کی ہدایت پر مہوش نے وہاں بھی اپنے آپ کو مالنی کے نام سے متعارف کروایا۔ سرسوتی سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہوچکی تھی۔ اسے وہاں رہتے ہوئے دو ماہ گزر چکے تھے۔

ایک روز سرسوتی نے اسے کہا۔ "مالنی مجھے مارکیٹ تک جانا ہے، میرے ساتھ چلو، تمہارا دل بھی بہل جائے گا اور میں بھی بور ہونے سے بچ جاؤں گی۔" گاڑی سرسوتی خود ڈرائیو کررہی تھی۔

ایک سپر مارکیٹ سے اس نے اپنے لئے کچھ کپڑے خریدے وہ مختلف قسم کے سامان کے تھیلوں سے لدی ہوئی اپنی گاڑی تک پہنچیں، سامان ڈگی میں رکھ کر گاڑی میں بیٹھنے لگیں۔ سرسوتی اچانک چونک گئی۔ "او شٹ کل رام بھیا کی شادی کی سالگرہ ہے اور میں گفٹ لینا بھول گئی، تم گاڑی میں بیٹھو میں ابھی آئی۔" وہ دوبارہ مارکیٹ میں داخل ہوگئی۔

مہوش اپنے خیالات میں کھوئی بیٹھی تھی کہ ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ "گاڑی سے باہر نکلو۔" اس نے آواز کی سمت دیکھا اور ششدر رہ گئی، کار کے قریب کشن کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل موجود تھا۔ جو کھڑکی کے کھلے شیشے سے اس نے مہوش کی کنپٹی سے لگا دیا تھا۔ تم نے کیا سمجھا میں صحرا میں مر کھپ جاؤں گا، خیر بمبئی میں تمہیں دیکھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی ہے، اب نیچے اترو، گلے شکوے بعد میں کرتے رہیں گے۔ اب اگر تم نے ذرا بھی دیر کی تو گولی چلا دوں گا۔ تم نے ویسے بھی میری نظروں کے سامنے آنند کا خون کیا تھا۔" وہ سفاک لہجے میں بولا۔

مہوش کار سے نیچے اتری، کشن نے پسٹل کوٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ "کسی قسم کی ہوشیاری مت دکھانا۔ میری انگلی ٹریگر پر ہے اور کوٹ کی جیب میں ہونے کے باوجود تمہیں نرکھ میں پہنچا سکتا ہوں۔" وہ غرایا، قریب ہی ایک وین کھڑی تھی۔ اس نے مہوش کو اندر دھکیلا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ اس کے پسٹل کی نال مہوش کے پہلو سے لگی ہوئی تھی۔ وہ مہوش کی طرف سے چوکنا تھا۔ کیونکہ وہ صحرا میں اس کے ہاتھوں زک اٹھا چکا تھا۔ "ہم تمہیں یہیں لانا چاہتے تھے، چلو اچھا ہوا تم خود ہی یہاں پہنچ گئی، لیکن اب تمہیں آنند کے خون کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔" وہ اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک گیس اسٹیشن پر رکا۔ یہاں کچھ گاڑیاں قطار میں لگی ہوئی تھیں، شاید اسے دور جانا تھا اور گاڑی میں فیول کم تھا۔ "ایک بار پھر وارننگ دے رہا ہوں کسی قسم کی ہوشیاری دکھانے یا چیخنے چلانے سے گریز کرنا ورنہ گولی چلا دوں گا۔" اس نے کہا اور باری آنے پر سروس بوائے سے کہا۔ "ٹینک فل کردو۔"

مہوش کی نظر ایک طرف گئی وہاں نئے ماڈل کی کرولا کھڑی تھی، ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کو دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، وہ حماد کا ہمشکل ارجن تھا جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عجیب اتفاق تھا تقدیر اسے بار بار ارجن کے قریب لا رہی تھی، اس نے ارجن کی طرف دیکھتے ہوئے صرف ہونٹ ہلا کر "ہیلپ"

کے انداز میں ہونٹوں کو حرکت دی، شاید وہ نہیں سمجھا تھا۔ مہوش نے تین چار بار ہونٹوں کو اس طرح حرکت دی گویا کہنا چاہتی ہو۔ ”ہیلپ“

کشن نے گاڑی آگے کی فیول ڈل چکا تھا۔ کشن نے پیسے سروس بوائے کو دیئے اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

کچھ دیر بعد مہوش نے سائیڈ مرر میں دیکھا کچھ فاصلے پر ارجن کی گاڑی اس کے تعاقب میں تھی، گویا وہ اس کا مدعا سمجھ چکا تھا کہ وہ اس سے مدد چاہتی ہے، وین کافی فاصلے پر آ کر سڑک سے اتر گئی۔ وہ ایک کچے راستے سے ہوتی ہوئی ایک عمارت کے دروازے پر جا رکی۔ تین چار بار مخصوص انداز سے ہارن بجا، پھر گیٹ سے منسلک ذیلی کھڑکی سے کسی نے جھانکا اور گیٹ کھل گیا۔ یہ ایک رائفل بردار شخص تھا، وین کے اندر داخل ہوتے ہی گیٹ بند ہو گیا۔ وہ اسے پسٹل کی زد میں لئے ہوئے گاڑی سے اترا۔ کچھ دیر بعد وہ اس عمارت کے ایک کمرے میں تھے۔ اس کمرے میں ایک ماڈرن لڑکی اور ایک شخص موجود تھے۔ ”باس یہی ہے وہ لڑکی جس نے صحرا میں آنند کا خون کیا تھا۔“ کشن نے کہا۔

”بہت خوب یہ تو بڑے کام کی لڑکی ہے جس نے تن تنہا تمہیں زیر کیا اور ہمارے لائق ترین کارندے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تم اسے عیاشی کی غرض سے لا رہے تھے۔ لیکن ہم اسے اپنی تنظیم میں جگہ دیں گے۔ لائق اور بہادر کارندوں کی مجھے سخت ضرورت ہے۔ کیوں لڑکی کرو گی ہمارے ساتھ کام۔“ باس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ابھی مہوش نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے کی طرف سے آہٹ ہوئی، انہوں نے مڑ کر دیکھا دروازے میں وہی رائفل بردار کھڑا تھا۔ جس نے گیٹ کھولا تھا، اس کے پیچھے ارجن تھا جس کے ہاتھوں میں اسی رائفل بردار کی رائفل تھی۔ جس کی نال اس کی کنپٹی سے لگی ہوئی تھی۔ اندر آتے ہی اس نے رائفل کی نال اس کی کنپٹی سے ہٹائی اور بولا۔ ”پانڈے تم یہاں؟“

”ہاں میں اور اسے تم جانتے ہی ہو یہ سریتا ہے اور جسے تم گن پوائنٹ پر لائے ہو یہ نارائن ہے اور دوسرا کشن ہے۔ لیکن تم نے میرے شیر سے رائفل کیسے چھینی۔“ پانڈے نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ میرے لئے کیا مشکل ہے۔“ ارجن نے کوٹ کی جیب سے بلیک گلاسز نکال کر آنکھوں پر پہنے اور رائفل نارائن کو تھما کر پانڈے کے قریب بیٹھ گیا۔ مہوش بدستور اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ جبکہ کشن اب تک مہوش پر پسٹل تانے کھڑا تھا۔ ”ارجن تم اس طرح ہمارے ٹھکانے پر کیوں داخل ہوئے۔“ پانڈے نے پوچھا۔

”میں مہوش کی وجہ سے تمہارے کارندے کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آیا تھا۔ پر یہ مہوش پر اس طرح پسٹل تانے کیوں کھڑا ہے۔“ ارجن نے حیرت سے کہا۔ ”یہ بہت خطرناک لڑکی ہے صحرا میں کشن کے ہاتھوں سے پسٹل چھین کر میرے دوسرے کارندے آنند کو قتل کر کے فرار ہو گئی تھی۔ پر تمہارا اس سے کیا سمبندھ ہے۔“ پانڈے نے پوچھا۔

”میرا اس سے بہت گہرا سمبندھ ہے تم یا تمہارے ساتھی اسے کچھ نہیں کہو گے۔“ ارجن نے کہا۔

”او کے مجھے کوئی اعتراض نہیں پر ہم نے جو پلان بنایا تھا سونے کے حصول کا اس کا کیا ہو گا؟“

”پھر تم نے دوبارہ مجھ سے رابطہ ہی نہیں کیا۔“ پانڈے نے کہا۔

”پانڈے میں جلد ہی تم سے رابطہ کروں گا میری ماتا جی کا پچھلے مہینے دیہانت ہو چکا ہے۔ چلو مہوش۔“ ارجن اٹھ کھڑا ہوا۔

”یار کچھ کھا پی تو لیتے پہلی بار ہمارے ٹھکانے پر آئے ہو اور خاطر تواضع کا موقع دیئے بغیر جا رہے ہو۔“ پانڈے نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”مجھے جلدی ہے۔“ ارجن بولا اور مہوش کے ہمراہ وہاں سے نکلا۔ اس کی کار عمارت سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور مہوش کے

بیٹھتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

”کیا تم بھی ان جرائم پیشہ افراد کے ساتھی ہو؟“ مہوش کے لہجے میں تاسف تھا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ ارجن نے اسے اپنی داستان حیات سنانے کے ساتھ ساتھ بتایا کہ کیسے اس کی پانڈے سے واقفیت ہوئی اور پھر پوچھا۔ ”تم یہاں کیسے پہنچیں۔“

مہوش نے بھی اسے اپنی روداد سنا ڈالی، تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ارجن کے شاندار قسم کے بنگلے پر موجود تھے ارجن نے ملازم کو کافی لانے کو کہا اور اس سے پوچھا۔ ”اب تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں اپنے وطن واپس جانا چاہتی ہوں، پلیز! میری ہیلپ کرو۔“

”دیکھو مہوش تمہارے پاس کسی قسم کے کاغذات نہیں، تم اگرچہ بھٹک کر انڈیا میں داخل ہوئی ہو لیکن تمہارا یہاں قیام غیر قانونی تصور کیا جائے گا، تم لیگل طریقے سے یہاں سے واپس نہیں جا سکتی اگر کسی بھی ایجنسی کو تمہاری یہاں موجودگی کی ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو ساری زندگی یہاں کی کسی جیل میں پڑی سڑتی رہو گی، اب رہ جاتا ہے غیر قانونی راستہ تو مجھے ویسے بھی پانڈے کے کام سے پاکستان جانا ہے، میں پانڈے سے بات کرتا ہوں وہ ضرور کوئی نہ کوئی راستہ نکال لے گا۔ کیونکہ وہ جرائم پیشہ شخص ہے اس کے روابط اسمگلروں سے ضرور ہوں گے۔“ ارجن نے کہا اس دوران ملازم کافی لا چکا تھا وہ کافی پیتے ہوئے ارجن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ارجن کو دیکھتے ہی اس کا دل بے اختیار کیوں دھڑکنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ارجن ہندو ہے اور ان دونوں کا ملاپ ناممکن ہے۔ وہ ہفتہ بھر ارجن کے گھر پر رہی۔ ارجن نے اس کے کہنے پر پردیپ کمار کے گھر جا کر بتا دیا تھا کہ مالنی اس کی رشتے دار ہے اور وہ اسے اپنے گھر لے گیا ہے۔ وہ بیچارے اس کی گمشدگی سے بہت پریشان تھے۔

ارجن نے پانڈے سے بات کر لی تھی ان کے درمیان طے پایا تھا کہ ارجن مہوش کے ساتھ راجستھان کے راستے بارڈر پار کرے گا اور اس کے پندرہ بیس دن بعد پانڈے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پاکستان پہنچ جائے گا۔ اس سلسلے میں پانڈے نے ایک اسمگلر اشوک کمار کے ساتھ معاملات طے کر لئے تھے۔

☆......☆......☆

اس قافلے میں سات افراد شامل تھے۔ جن میں سے دو مہوش اور ارجن تھے۔ یہ اسمگلروں کا قافلہ تھا۔ جن کے لئے انڈیا اور پاکستان کے درمیان سرحد عبور کرنا معمول کی بات تھی۔ اس قافلے میں ان کی شمولیت کا انتظام پانڈے نے کیا تھا۔ قافلے کو لیڈ کرنے والا اشوک صرف اتنا جانتا تھا کہ دونوں کو اپنے ساتھ پاکستان لے جانا ہے۔ اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مہوش مسلمان اور پاکستانی ہے۔ ایسا احتیاط کے پیش نظر کیا گیا تھا۔ اس کام کی ارجن نے بھاری رقم ادا کی تھی۔ اشوک اور اس کے ساتھی دوران سفر ان دونوں کے آرام اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھ رہے تھے۔ ان کا ابتدائی سفر ایک جیپ میں طے ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ پیدل چلنے لگے ان کے پاس سامان کے نام پر صرف ایک بیگ تھا جس میں ان دونوں کے کپڑے اور ضرورت کا چھوٹا موٹا سامان تھا۔ دوران سفر بھی ارجن نے گلاسز پہن رکھے تھے۔ ان کا سفر خاموشی سے کٹا۔ ایک جگہ رک کر انہوں نے کچھ وقت کے لئے قیام کیا اور ڈبوں میں بند خوراک سے اپنی بھوک مٹائی، کھانے کے بعد اشوک اور اس کے ساتھیوں کے درمیان شراب نوشی کا دور چلا۔ ارجن نے ان کی دعوت کے باوجود اس میں شرکت نہیں کی اسے شروع سے ہی ام الخبائث سے نفرت تھی۔ رات کے اندھیرے میں انہوں نے دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کیا۔ کچھ دیر بعد اشوک نے بتایا کہ وہ ڈینجر زون میں داخل ہو چکے ہیں اندھیرے میں اونٹوں پر ان کا سفر جاری تھا۔ کچھ دیر بعد اشوک نے بتایا کہ وہ پاکستانی علاقے میں قدم رکھ چکے ہیں۔ اچانک ہی وہاں ہلچل مچ گئی ان پر سرچ لائٹوں کی روشنی پڑنے لگی

اور للکارا گیا۔ "بھاگو۔" شوروغل کے دوران اشوک چیخا پھر وہاں عجیب افراتفری مچ گئی۔ ارجن کا اونٹ بھی دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔

ناتجربہ کاری کی وجہ سے اسے اونٹ پر جم کر بیٹھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہی کیفیت مہوش کی بھی تھی۔ انہیں ہر لحہ یہی خوف لاحق ہوجاتا تھا کہ وہ کسی بھی پل اونٹ سے گرجائیں گے، ان کا یہ اندیشہ اس صورت میں پورا ہوا کہ ایک فائر کی آواز گونجی، ایک انگارہ سا ارجن کے قریب سے گزرا۔ انہیں مزید فائروں کی آواز بھی سنائی دی۔ پے در پے فائرنگ ہورہی تھی۔ ان کے بھاگتے ہوئے اونٹ بھیانک انداز میں چیخ رہے تھے کچھ دور جانے کے بعد ارجن کے اونٹ نے اسے ہلاتے ہوئے ایک طرف پٹخ دیا۔ اسے یوں لگا جیسے آج اس کی زندگی کی آخری رات ہو۔ اس نے گرتے گرتے دیکھا مہوش بھی اونٹ سے گرچکی تھی۔ اشوک اور اس کے ساتھی شاید پہلے ہی حملے میں مارے جاچکے تھے۔ گرنے سے اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر گرنے سے اسے کوئی خاص چوٹ نہ لگی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ریت کے ٹیلے پر گرا تھا۔ مہوش خودرو جھاڑیوں کے ڈھیر پر گری تھی۔ اسے بھی کوئی خاص چوٹ نہ لگی تھی۔

وہ دوڑ کر آگے بڑھا اور مہوش کو اٹھالیا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا اسی وقت ایک تیز آواز سنائی دی۔ "ہالٹ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑے ہوجاؤ۔"

ارجن نے مڑ کر دیکھا ان سے کچھ فاصلے پر فوج کا ایک اہلکار ان کی طرف رائفل تانے کھڑا تھا۔ کچھ فاصلے پر اس کی جیپ تھی۔ جس میں کوئی موجود نہ تھا۔ ارجن نے اندازہ لگایا شاید وہ تنہا ہے۔ "اپنا منہ دوسری طرف کرکے ہاتھ سر پر رکھ لو۔" اہلکار نے دوبارہ حکم دیا۔ انہوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔

وہ پہلے مہوش کی طرف بڑھا اور محتاط انداز میں اس کی تلاشی لی۔ اور پھر ارجن کی طرف بڑھا۔ ارجن سوچنے لگا۔ وہ انڈین شہریت کا حامل تھا گرفتار ہونے کا مطلب جیل میں جانا تھا۔ اسے کسی طرح اس کی گرفت سے نکلنا تھا۔ اگر سرحدی سیکورٹی فورسز کے دیگر اہلکار بھی یہاں پہنچ جاتے تو اس کے لئے مشکل ہوجاتی اونٹ سے گرتے وقت وہ اپنے سامان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

ارجن کے گلاسز بھی گرچکے تھے۔ فوجی اہلکار اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے رائفل تھامنے کے ساتھ ساتھ اس کا جسم تھپتھپاتے ہوئے ٹانگوں کی طرف جھکا۔

ارجن برق سرعت سے مڑا اور رائفل پر ہاتھ ڈال دیا۔ فوجی اہلکار نے سنبھلنے کی کوشش کی اس کا گھٹنا پوری قوت سے اس کے سینے سے ٹکرایا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر ارجن کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ جسے اس نے اس پر تان لیا۔ "اب تم ہاتھ سر پر رکھ کر جیپ کی طرف چلو۔"

"یہ تم اچھا نہیں کررہے۔ میرے ساتھی یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ہیں۔ اہلکار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایسا کہتے وقت اس نے ارجن کی آنکھوں میں دیکھا۔ ارجن کے لئے یہ سنہری موقع تھا۔ اہلکار کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ "چلو اب جیپ کی طرف ارجن نے حکم دیا اور وہ خاموشی سے آگے چلنے لگا۔

ارجن اور مہوش اس کے پیچھے چل رہے تھے ایک جگہ ارجن کو زمین پر اپنے گلاسز پڑے دکھائی دیئے جسے اس نے اٹھالیا۔ فوجی اہلکار جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ دونوں جیپ کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔

"چلو اب جیپ چلاؤ۔" اس نے تیزی سے جیپ چلادی۔ آٹھ دس کلومیٹر کے فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے ارجن کے حکم پر جیپ روک دی۔ "اب تم جیپ سے اتر کر واپس بھاگو۔" ارجن نے رائفل کی نال سے اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔ وہ اہلکار جیپ سے اتر کر ایک طرف کھڑا ہوگیا ارجن نے جیپ چلادی۔

کافی دیر بعد درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب اس نے جیپ روکی۔ "چلو اترو زیادہ دیر اس جیپ میں سفر خطرناک ثابت ہوگا۔ ہم اس کی وجہ سے ٹریس ہوسکتے ہیں۔" ارجن نے کہا اور جیپ سے اتر گیا۔ وہ

چلتے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوچکے تھے۔ رائفل اب تک اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ وہ کافی دیر تک چلتے رہے اور صبح کے پہلے پہر میں سڑک پر جاپہنچے اچانک دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں وہ دونوں سڑک سے اتر کر ایک درخت کی آڑ میں چھپ گئے۔ یہ فوجیوں کی گاڑی تھی جو تیزی سے سڑک سے گزر گئی وہ اب درختوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ ارجن نے درخت کی آڑ سے دیکھا یہ پراڈو تھی۔ وہ رائفل وہیں پھینک کر سڑک پر آگئے ارجن نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ پراڈو ان سے کچھ فاصلے پر رکی۔ پراڈو پر تین افراد سوار تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بھاری جسامت کا شخص بیٹھا اس کے برابر والی سیٹ پر ایک دراز قد دیوہیکل شخص ہاتھوں میں کلاشنکوف لئے بیٹھا تھا۔ پچھلی نشست پر بیٹھے شخص نے ارجن اور مہوش کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ "ارے تم لوگوں کو کہاں تک جانا ہے بابا؟"

"ہمیں جانا تو شہر ہے لیکن آپ جہاں تک جارہے ہیں ہمیں لفٹ دے دیں۔ ارجن نے شائستہ لہجے میں کہا۔

"اپنے لباس اور حلیئے سے تم لوگ گوٹھ کے تو نہیں لگتے، خیر بیٹھو گاڑی میں وڈیرا حسن چانڈیو اور کسی کام نہ آئے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" پچھلی نشست پر بیٹھے شخص نے کہا اور ارجن مہوش کے ساتھ اس کے برابر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "میرا گھر اس گوٹھ سے کچھ فاصلے پر ہے تم لوگ وہاں چلو کچھ چائے پانی کے بعد میرے آدمی تمہیں شہر چھوڑ دیں گے۔" حسن چانڈیو نے کہا۔

"باتوں ہی باتوں سے معلوم ہوا یہ شخص اس گوٹھ کا وڈیرا ہے اور آگے بیٹھے ڈرائیور کا نام شاہنواز چانڈیو اور اس کے برابر بیٹھا مولا بخش اس کا باڈی گارڈ تھا۔ حسن چانڈیو وڈیرا عاشق چانڈیو کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کچھ دیر بعد پراڈو ایک شاندار قسم کے بنگلے کے سامنے رکی، گیٹ پر ایک رائفل بردار گارڈ چوکس کھڑا تھا۔ وہ جس کمرے میں پہنچے وہاں فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکئے لگے ہوئے تھے بیٹھو بابا میں تم لوگوں کے لئے چائے پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔ حسن چانڈیو کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی اس دوران ایک ادھیڑ عمر ملازمہ اندر داخل ہوئی اس نے اسٹیل کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ جس میں چائے بسکٹ اور خشک میوہ جات تھے۔

"اڑے بابا ہمارے مطلب کی چیز بھی بھیج دو۔" حسن چانڈیو معنی خیز انداز میں ہنسا ملازمہ سر ہلاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر بعد مولا بخش امپورٹڈ شراب کی بوتل اور شیشے کا گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوا اور خاموشی سے حسن چانڈیو کے آگے رکھ کر پلٹ گیا۔ "تم بھی پیو گے۔" اس نے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے ارجن کو پیش کش کی۔

"سوری میں شراب نہیں پیتا۔" ارجن نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"حیرت کی بات ہے میں نے تو سنا تھا شہری لوگ شراب پانی کی طرح پیتے ہیں اور ایک مزے کی بات تمہیں بتاؤں ابھی رات کو بارڈر پر اسمگلروں کا ایک گروہ سیکورٹی فورسز کی نظروں میں آگیا وارننگ دینے پر بھی وہ نہیں رکے ان میں سے کچھ مارے گئے اور ایک لڑکا اور لڑکی فوج کے ایک اہلکار کو یرغمال بنا کر فرار ہوگئے۔ وہ جاتے جاتے اس کی جیپ اور رائفل بھی ساتھ لے گئے، وہ جیپ گوٹھ سے کچھ فاصلے پر ملی تھی۔ ٹی وی چینلو پر لڑکے اور لڑکی کا حلیہ بھی بتایا گیا تھا۔ جو اتفاق سے تم دونوں سے ملتا جلتا ہے یہ دیہی علاقہ ہے یہاں اجنبی فوراً ہی نظروں میں آجاتے ہیں میں تمہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم لوگ ان اسمگلروں کے ساتھی ہو۔ اس کے باوجود میں تمہیں اپنے بنگلے پر لے آیا۔ خوش قسمتی سے بابا سائیں اور گھر والے شہر والے بنگلے پر گئے ہیں۔" وہ شراب کے گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

"ارجن سناٹے میں آگیا تو گویا یہ اوباش وڈیرا

ان کی اصلیت سے آگاہ ہو چکا ہے لیکن اب یہ کیا چاہتا ہے یہ سوچتے ہی اس نے کہا۔ ”آپ کسی طرح ہمیں شہر تک پہنچادیں۔“

”اڑے بابا اتنی جلدی بھی کیا ہے کچھ ہمیں بھی خاطر تواضع کا موقع دو، یہ لڑکی بہت خوب صورت ہے، اس کے حسن کو، وہ کیا بولتے ہیں خراج تحسین بھی تو دینا ہے۔“ وہ خباثت سے ہنسا گویا بلی تھیلے سے باہر آچکی تھی۔

”حسن چانڈیو یہ مت سمجھنا کہ ہم تمہارے گھر پر ہیں اور جو تم چاہو کر سکتے ہو۔ میں تم جیسوں کے مزاج درست کرنا اچھی طرح جانتا ہوں۔“ ارجن غصے سے کھڑا ہو گیا۔

”مولا بخش اڑے کدھر ہو بابا۔ وڈیرے نے ہولسٹر سے ریوالور نکالتے ہوئے آواز لگائی۔ وہ فوراً ہی چراغ کے جن کی طرح کلاشنکوف اٹھائے اندر داخل ہوا۔ ”میں اس لڑکی کو لے کر دوسرے کمرے میں جارہا ہوں، تم اس کا بندوبست کرو، چلو چوکری آگے لگو، اس نے مہوش کو پسٹل کی نال سے آگے دھکیلا، اور اسے لئے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”چلو بھئی تم بھی اوپر جانے کی تیاری کرلو۔ وڈیرا سائیں آرام سے دوسرے کمرے میں موج میلا کریں گے۔“ وہ کلاشنکوف اس کی طرف تانتے ہوئے بولا۔

ارجن نے آنکھوں سے گلاسز اتارے اور شراب کی بوتل پر نظریں جمادیں شراب کی بوتل فضا میں معلق ہوئی، مولا بخش حیرت اور خوف سے فضا میں معلق شراب کی بوتل کو دیکھ رہا تھا۔ جو فضا میں بلند ہو کر تیزی سے اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ ”بھھ...... بھوت......“ اس کے منہ سے نکلا خوف کی زیادتی سے وہ اپنے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف کو بھلا بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ شراب کی بوتل لگنے سے زخمی ہو چکا تھا۔ اسی دوران ارجن کی لات اس کے کلاشنکوف والے ہاتھ سے ٹکرائی اور کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ جسے ارجن نے اٹھالیا۔

اسی وقت دوسرے کمرے سے اٹھا چیخ کی آوازیں سنائی دیں ارجن مضطرب ہو گیا۔ پھر ایک چیخ سنائی دی۔ لیکن یہ چیخ مردانہ تھی۔ اب حیران ہونے کی باری مولا بخش کی تھی جبکہ ارجن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ بلاشبہ مارشل آرٹ کی ماہر مہوش نے خود کو زیر کرنے کے لئے وڈیرے کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔

”اپنا منہ دیوار کی طرف کرلو۔“ ارجن نے کلاشنکوف کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ وہ لہراتا ہوا گرا اور بے ہوش ہو گیا، اسی وقت کمرے کا دروزاہ کھلا اور وڈیرہ حسن چانڈیو خوف زدہ سا اندر داخل ہوا، اس کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی پشت پر مہوش موجود تھی۔ وڈیرا حسن کا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ جس کی نال اس کے سر سے لگی ہوئی تھی۔

”بڑے افسوس کی بات ہے ہٹے کٹے مرد ہو کر ایک لڑکی سے مار کھا گئے۔“ ارجن نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”مولا بخش کو بے ہوش دیکھ کر حسن چانڈیو کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے، ارجن نے گلاسز دوبارہ پہن لئے اور کلاشنکوف کا رخ اس کی طرف کردیا۔

کمرے کی طرف بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی، یہ شاہنواز اور دوسرا رائفل بردار گارڈ تھے۔ ”اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ تمہارے وڈیرے کو گولیوں سے چھلنی کردوں گا۔“ ارجن نے سفاک لہجے میں کہا تو انہوں نے حسن چانڈیو کو بے بسی سے دیکھتے ہوئے رائفلیں پھینک دیں۔ ”اب اپنا رخ دیوار کی طرف کرکے کھڑے ہو جاؤ۔“ ان کا منہ دیوار کی طرف ہوتے ہی ارجن نے ان دونوں کے سر پر باری باری کلاشنکوف کا دستہ مارا تو وہ دونوں بھی بے ہوش ہو گئے۔

”چلو مسٹر چانڈیو! اب اپنی گاڑی پر ہمیں شہر تک چھوڑ دو اور ہاں کسی قسم کی ہوشیاری مت دکھانا ورنہ تم جیسے بے ضمیر انسان کو مارتے ہوئے مجھے ذرا برابر بھی افسوس نہیں ہوگا۔“ ارجن نے یہ کہتے ہوئے اسے کمرے سے باہر دھکیلا۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی پراڈو میں موجود تھے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر چانڈیو بیٹھا تھا اس کے برابر والی نشست پر مہوش موجود تھی جبکہ عقبی نشست پر ارجن بیٹھا تھا۔ اس کا ریوالور وڈیرا حسن کے پہلو سے لگا ہوا تھا تقریباً دو کلومیٹر جانے کے بعد دور سے پولیس موبائل دکھائی دی، چھ سات پولیس اہلکار سڑک کے دونوں اطراف چوکس کھڑے تھے۔ ”اگر یہ تمہیں روکیں تو رک جانا مگر کسی قسم کی ہوشیاری مت دکھانا، میں گولی چلانے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کروں گا۔“ ارجن نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

”خیریت گزری انہیں روکا نہیں گیا۔ شاید پولیس اہلکار وڈیرا اور اس کی گاڑی کو پہچانتے تھے۔ انسپکٹر رینک کے آفیسر نے اسے اشارے سے سلام بھی کیا۔ جس کا جواب چانڈیو نے سر ہلا کر دیا۔ شہر پہنچ کر ارجن نے ریوالور سے گولیاں نکالیں اور خالی ریوالور اسے تھما کر خود نیچے اتر گیا۔ ”امید ہے آج کا سبق تمہارے لئے کافی ہوگا، آئندہ کبھی کسی عورت کی طرف گندی نظر سے نہیں دیکھنا۔ صرف نام کے نہیں کردار کے بھی مسلمان بنو۔“ ارجن نے کہا اور وڈیرا نے اسے غصے سے دیکھتے ہوئے گاڑی آگے بڑھادی۔

”اب تم نے کہاں جانا ہے، میں تمہیں کسی محفوظ جگہ پہنچا کر ہوٹل میں قیام کروں گا کچھ دنوں میں پانڈے بھی یہاں آجائے گا۔“ ارجن نے کہا۔

”میری ایک کلاس فیلو عاشی کا گھر یہاں سے کچھ فاصلے پر ہے، تم مجھے وہاں تک پہنچادو۔“ مہوش نے کہا اور ارجن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ٹیکسی میں سوار ہو کر مہوش نے ڈرائیور کو مطلوبہ جگہ چلنے کا کہا اور ٹیکسی چل پڑی، پیسے کی ارجن کو کوئی خاص فکر نہ تھی، اس نے انڈیا سے روانہ ہوتے وقت پانڈے کی مدد سے پاکستانی کرنسی حاصل کرلی تھی۔ ”تم اچھے انسان ہو میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ مہوش نے انگلش میں کہا شاید یہ احتیاط اس لئے تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور ان کی گفتگو سمجھ نہ سکے۔

”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا انسان وہی ہے جو دوسروں کے کام آئے۔“ ارجن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ٹیکسی اب شہر کی مصروف ترین سڑک سے گزر رہی تھی۔ اچانک مہوش چونک پڑی۔ ٹیکسی کے قریب سے پولیس موبائل گزر رہی تھی۔ ڈرائیور کے برابر انسپکٹر ریاض ہٹلر بیٹھا ہوا تھا اس کی نظر بھی مہوش پر پڑ چکی تھی۔ اس کے برابر بیٹھے ارجن کو دیکھ کر وہ چونکا اس کے چہرے پر حیرت اور پریشانی کے آثار نمایاں نظر آنے لگے، غالباً وہ بھی ارجن کو حماد سمجھ بیٹھا تھا۔ وہی حماد جو فائزہ کے قتل کا چشم دید گواہ تھا۔ جسے وہ اپنی ہائی روف تلے کچل کر ہلاک کر چکے تھے۔ ”اس ٹیکسی کو روکو۔“ وہ چیخا۔ پولیس موبائل کا ہوٹر بجا اور وہ ٹیکسی کے پیچھے چل پڑی، ٹیکسی رو کو مہوش گھبرا گئی۔ پولیس موبائل ان سے کچھ فاصلے پر تھی۔ ڈرائیور نے بریک پر پاؤں رکھ دیئے۔ ”کیا ہوا؟“ حیران و پریشان ارجن نے پوچھا۔ ”یہ باتوں کا وقت نہیں بھاگو راستے میں بتاتی ہوں۔“ وہ ٹیکسی سے اترتے ہوئے بولی۔ ارجن نے ایک نوٹ نکال کر ڈرائیور کی طرف پھینکا اور ٹیکسی سے باہر نکلا۔ مہوش ارجن کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف بھاگی۔

”تمہاری تو......“ ریاض ہٹلر نے گندی سی گالی دیتے ہوئے گولی چلائی، سڑک پر افراتفری مچ گئی تھی، گاڑیوں کے بریک چرچرائے، ریاض ہٹلر اور چار پولیس اہلکار موبائل سے اتر کر ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اس نے ایک اور ہوائی فائر کیا۔ اور مہوش کو رکنے کو کہا۔ فٹ پاتھ پر لوگوں کا ہجوم تھا اس لئے وہ ان پر براہ راست فائرنگ نہیں کرسکتا تھا۔ ”یہ پولیس والے ہمارا پیچھا کیوں کررہے ہیں؟ کیا مجھے پہچان لیا گیا ہے؟“ یہ فوجی اہلکار کا معاملہ تو نہیں۔“

”یہ ریاض ہٹلر ہے میرے کزن کا دوست شاید اس نے حوالدار کے قتل کی ایف آئی آر میرے نام درج کرلی ہوگی۔“ وہ بھاگتے ہوئے بولی وہ خوانچوں کو الٹتے لوگوں کو دھکیلتے تیزی سے فٹ پاتھ پر بھاگ رہے تھے، ریاض ہٹلر اور پولیس اہلکار کسی عفریت کی طرح ان کے پیچھے تھے۔ مہوش آگے کی طرف دوڑتے ہوئے موئی

عورت سے ٹکراتے ٹکراتے بچی، ان کے پیچھے بھاگنے والا ریاض ہٹلر موٹی سے ٹکرایا۔ اور موٹی نے اسے دبوچ لیا وہ تو بھاگ گیا تجھے نہیں چھوڑوں گی کم بختو اندھوں کی طرح کیوں بھاگتے ہو۔ ریاض ہٹلر نے اسے گالی دیتے ہوئے تھپڑ رسید کیا۔

دونوں دوڑتے ہوئے فٹ پاتھ سے اتر کر ایک گلی میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ دونوں مختلف گلیوں سے بھاگتے ہوئے ایک تنگ سی گلی میں پہنچے اور چند لمحوں کے لئے رکے ان کے رکنے کا سبب وہ مین ہول تھا جو اچانک ان کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ اس کھلے مین ہول میں اس لئے گرنے سے بچ گئے تھے کہ اللہ کے کسی نیک بندے نے اس پر ٹائر رکھ چھوڑا تھا۔

وہ آہستگی سے ان کے قریب سے گزرے۔ مہوش نے مڑ کر دیکھا۔ ریاض ہٹلر اور سپاہی دوڑتے ہوئے گلی میں داخل ہو چکے تھے۔ ارجن اور مہوش نے دائیں سمت جانے والی گلی میں دوڑ لگا دی۔ انسپکٹر ریاض ہٹلر اور سپاہی بھاگتے ہوئے گلی میں داخل ہوئے، ریاض ہٹلر کا پاؤں ایک کتے کی دم پر پڑا۔ کتے نے اس کی ٹانگ پکڑ لی عجیب افراتفری پھیل چکی تھی۔ سپاہی ارجن اور مہوش کو بھول کر ریاض ہٹلر کو کتے کے خونخوار جبڑوں سے چھڑانے میں لگ گئے۔

وہ دونوں مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ ریاض ہٹلر سے پیچھا چھوٹنے پر مہوش نے خدا کا شکر ادا کیا ارجن نے سڑک سے گزرنے والے ایک رکشہ کو ہاتھ دے کر روکا۔ تمہارے لئے اب بہتر یہی ہے کہ کچھ عرصہ اپنی دوست عاشی کے گھر روپوش رہو، یہ ہٹلر کا بچہ تمہاری جان چھوڑنے والا نہیں، ارجن نے انگلش میں کہا اور مہوش نے اثبات میں گردن ہلا دی، کچھ دیر بعد وہ عاشی کے گھر کے باہر موجود تھے اپنا خیال رکھنا ارجن نے کہا اور رکشہ ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ”اب کسی اچھے سے فائیو اسٹار ہوٹل میں چلو۔“ ارجن نے رکشہ ڈرائیور سے کہا۔ رکشہ عاشی کے گھر کے قریب سے گزرتا ہوا سڑک پر جا پہنچا۔ ٹریفک سگنل کی بتی سرخ ہوتے ہی رکشہ رک گیا۔ ارجن ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

اچانک وہ چونک پڑا۔ رکشہ کے قریب ہی ایک جدید ماڈل کی کار کھڑی تھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا نوجوان اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ارجن کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر پکارا۔ ”حماد تم؟“ نوجوان کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی دونوں تھے۔ اس سے پہلے اسے مہوش بھی بتا چکی تھی کہ وہ کسی حماد نامی نوجوان کا ہمشکل ہے۔ اب وہ نوجوان بھی اسے حماد کے نام سے پکار کر بلا رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ ”آج اصلیت جان ہی لے کہ یہ کیا چکر ہے۔“ اس کے علاوہ وہ پاکستان میں غیر قانونی طور پر داخل ہوا تھا۔ اس کے پاس یہاں کی آئیڈینٹیٹی نہیں تھی۔ اگر وہ خود کو حماد ہی ظاہر کرتا تو قانون سے بچ سکتا تھا۔ اس نے رکشہ ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور رکشہ سے اتر کر کار کی طرف بڑھا۔

نوجوان نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا سگنل کھل چکا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی نوجوان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ”تمہیں زندہ دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ تم مجھ سے موٹر سائیکل لے کر کالج سے نکلے۔ رات کو خبر ملی تمہارا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے۔ میں نے خود دیکھا تھا لاش ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ لاش کی جیب سے ملنے والی این آئی سی (NIC) اور لباس سے پتہ چلا کہ متوفی حماد ہے۔ تمہاری ماں سکتے میں تھی اب بھی سنا ہے گاؤں میں ہے لیکن ہوش کھو بیٹھی ہے۔ اور بہکی بہکی باتیں کرتی ہے۔“ وہ بولتا چلا گیا۔

”دیکھو مسٹر میں چاہوں تو جھوٹ بھی بول سکتا ہوں۔ مگر سچ یہ ہے کہ میں حماد نہیں اس کا ہمشکل ہوں، تم سے پہلے بھی مہوش نامی لڑکی مجھے حماد سمجھی تھی اب تم بھی یہی سمجھ رہے ہو۔“ ارجن نے سنجیدگی سے کہا۔

”ناممکن تمہاری شکل وصورت لب ولہجہ قد و قامت سب وہی ہے میں نہیں مانتا تم حماد ہی ہو، شاید تم یادداشت کھو بیٹھے ہو، میں نے اکثر فلموں میں دیکھا ہے، بلکہ کئی کہانیوں میں بھی پڑھا ہے۔ ہیرو حادثے کے بعد یادداشت کھو بیٹھتا ہے۔ ہو سکتا ہے حادثے سے پہلے تم نے کسی کو لفٹ دی ہو۔ اور زندہ بچ جانے کے بعد تم نے اپنے کپڑے اسے پہنا دیئے ہوں گے اور خود اس کے کپڑے پہن کر (NIC) اس کی جیب میں رکھ دیا ہوگا، یاد کرو، میں اشعر ہوں تمہارا دوست۔“ وہ بولتا چلا گیا۔

”مسٹر اشعر بچکانہ باتیں مت کرو، فلم، ناول، کہانی اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے، یہ سچ ہے کہ میں حماد نہیں، تم جا کہاں رہے ہو۔“ ارجن نے کہا۔

”اپنے گھر جا رہا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو۔“ اشعر نے جواب دیا۔

”نہیں ایسا کرو کسی اچھے سے ہوٹل میں چلو وہاں چائے پئیں گے، اور باتیں بھی کریں گے۔ مجھے بھی اس کہانی میں دلچسپی ہو گئی ہے، میں جاننا چاہتا ہوں کہ حماد کون تھا اور اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔“

کچھ دیر بعد وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں بیٹھے کافی پی رہے تھے اور اشعر اسے حماد کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔ ”یہ سب کچھ مجھے مہوش بتا چکی ہے تم صرف مجھے حماد کے گاؤں کا ایڈریس بتاؤ میں وہاں جاتا ہوں۔“ ارجن کافی کی چسکیاں لگاتا ہوا بولا۔

”مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ تم حماد نہیں لیکن فرض کرو اگر یہ سچ ہے اور تم حماد کے گاؤں جانا چاہتے ہو۔ تو اس کی ماں سے ضرور ملنا، ہو سکتا ہے تمہیں دیکھ کر وہ اپنے ہوش میں آ جائے اور اسے یہ مت بتانا کہ تم حماد نہیں ہو۔“ اشعر نے کہا۔

اور ارجن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اشعر نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا اس کی بیک سائیڈ پر حماد کے گاؤں کا ایڈریس لکھ کر ارجن کو دیا اور بولا۔ ”جب کبھی دوبارہ یہاں آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ارجن نے بھی اس کی تقلید کی۔ اشعر نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

ایک دوست کے لئے دوسرے دوست کا اس قدر پیار دیکھ کر ارجن متاثر ہو گیا۔ ”اگر تم حماد نہیں تو تمہارا نام کیا ہے؟“

”میرا نام سلیم ہے۔“ ارجن نے جھوٹ بولا۔ جھوٹ بولتے ہوئے اسے افسوس ضرور ہوا لیکن وہ اپنا اصل نام بتا کر اسے مشکوک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسی ہوٹل میں ایک روز کے لئے کمرہ لے لیا۔

دوسرے روز وہ ناشتے کے بعد ہوٹل سے باہر نکلا اور کرائے کی ایک کار سے حماد کے گاؤں جا پہنچا۔ وہ جس وقت گاؤں میں داخل ہوا سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ سب سے پہلے اس سے نوجوان ٹکرایا۔ جو چند بکریوں کو ہانکتا ہوا ایک طرف جا رہا تھا۔ ارجن پر نظر پڑتے ہی وہ ”بھوت بھوت“ کہتا ہوا ایک طرف بھاگا۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں دیہاتوں میں عموماً چھوٹی سی خبر پل بھر میں پھیل جاتی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد اس کا سامنا سامنے سے آنے والے چند افراد سے ہوا ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے، بارہ سالہ بکریاں چرانے والا لڑکا بھی ان کے ساتھ تھا وہ رہا بھوت، ارجن پر نظر پڑتے ہی وہ نوجوان پرجوش انداز میں چلایا اور وہ لوگ حیرت اور خوف سے ارجن کو دیکھنے لگے۔ ”چاچا جی میں حماد ہوں۔“ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص سے مخاطب ہوا۔

ادھیڑ عمر شخص آگے بڑھا اور ڈرتے ڈرتے اسے چھو کر دیکھنے لگا۔ ”ہاں یہ یہ حماد ہی ہے، روحوں کا ٹھوس وجود نہیں ہوتا۔ وہ ہیولے کی طرح ہوتی ہیں۔“ ادھیڑ عمر شخص مقامی زبان میں بولا۔

”پر تمہاری لاش کو خود ہم سب نے مل کر اس گاؤں میں دفنایا تھا۔“ ایک دوسرا شخص بولا۔ وہ کوئی اور تھا۔ ”آپ لوگوں نے دیکھا ہوگا، اس کا چہرہ حادثے کی وجہ سے ناقابل شناخت ہو چکا تھا۔ میرا شناختی کارڈ اس کے پاس تھا اس لئے اسے حماد سمجھ لیا گیا۔ ماں جی کہاں ہیں؟“ ارجن نے کہا۔ اشعر اسے بتا چکا تھا کہ حماد اپنی ماں کو ماں جی کہتا تھا۔ ”وہ تمہارے غم میں پاگل ہو چکی ہے۔ ہر وقت لال شاہ کے آستانے پر پڑی ان سے فریادیں کرتی رہتی ہے۔“ ادھیڑ عمر شخص بولا۔

"مجھے ماں جی کے پاس لے چلیں۔" ارجن نے کہا اور وہ اسے لے کر لال شاہ کے آستانے پر جا پہنچے۔ وہ برآمدے سے ہوتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے پر جا پہنچے۔ اندر سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ "بابا جی مجھے میرے بیٹے سے ملوادیں، میں برسوں پہلے اپنا ایک بیٹا کھو چکی تھی، اب دوسرا بیٹا نہیں کھونا چاہتی۔"

جواب میں بھاری بھرکم آواز بلند ہوئی، "آمنہ میں روز تم سے کہتا ہوں۔ "تمہارا بیٹا ضرور ملے گا۔ یہ ہر وقت آستانے پر پڑی لال شاہ سے یہی کچھ کہتی ہے اور بابا اسے تسلی دیتے ہیں۔" ایک دوسرا شخص بولا اور اپنی چپل اتار۔ ارجن نے بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے جوتے اتار لئے اور ان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

اندر ایک دراز قد بزرگ بیٹھے تھے ان سے کچھ فاصلے پر گھٹنوں میں سر دیئے وہ بوڑھی عورت اپنے وہی الفاظ دہرا رہی تھی۔ "لو آمنہ تمہارا برسوں پہلے بچھڑا بیٹا آ گیا۔" لال شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آمنہ نے سر اٹھایا بلیک گلاسز والے ارجن کو دیکھا اور اٹھ کر اس کی طرف دوڑی اور اسے گلے لگا کر رونے لگی۔ وہ روتی جا رہی تھی اور اسے چومتی جا رہی تھی۔ "حماد میرے بچے تو کہاں رہ گیا تھا۔" یہ جذباتی منظر دیکھ کر وہاں موجود افراد کی آنکھوں سے شدت جذبات سے آنسو چھلک اٹھے۔ خود ارجن کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔

آمنہ کا دل نہ چاہ رہا تھا کہ وہ اسے چھوڑے۔

"آمنہ بس بھی کرو بیٹے سے برسوں بعد ملی ہو، سارا پیار یہیں کرو گی کچھ گھر کے لئے بھی رہنے دو۔" لال شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور ارجن ان کے الفاظ پر چونک پڑا۔ مہوش اور اشعر کے کہنے کے مطابق حماد کی موت کو سال کے قریب ہو چکا تھا۔ جبکہ بابا کہہ رہے تھے کہ آمنہ برسوں بعد بیٹے سے ملی ہے۔ "سنو بیٹا کچھ روز بعد یہاں ضرور آنا۔" لال شاہ نے کہا۔ وہ آمنہ اور دیہاتیوں پر مشتمل قافلے کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ مکان مہینوں سے ویران رہنے کی وجہ سے گرد آلود ہو چکا تھا۔ ان مخلص لوگوں نے صفائی میں ارجن کی مدد کی۔ یہ گاؤں کے عام مکانوں کی طرح تھا۔ تین کمروں کے آگے جست کی چادروں سے برآمدہ بنا ہوا تھا۔

آمنہ رات بھر اس کے قریب بیٹھی اسے پیار کرتی رہی، ارجن نے اسے بھی وہی من گھڑت کہانی سنائی جو گاؤں والوں کو سنا چکا تھا۔ ایسا کرنا اس کی مجبوری تھی وہ ایک ماں کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ "ماں جی آپ بار بار بابا سے کہہ رہی تھیں کہ میرا ایک بیٹا پہلے ہی کھو چکا ہے وہ کیسے کھویا تھا؟" ارجن نے پوچھا۔

"بیٹا یہ کہانی میں تمہیں برسوں پہلے سنا چکی ہوں ہم انڈیا میں رہتے تھے۔ وہیں تم جڑواں بھائی پیدا ہوئے۔ تم دونوں بالکل ایک ہی جیسے تھے قیام پاکستان کا اعلان ہو چکا تھا۔ ہندو بلوائیوں اور سکھوں کے جتھوں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے۔ ہم جان بچانے کے لئے بھاگے، میں نے تمہیں اٹھا رکھا تھا اور تمہارے باپ نے تمہارے بھائی ارسلان کو اٹھا رکھا تھا۔ ہم پر حملہ ہوا اور تمہارا باپ اور بھائی ہم سے بچھڑ گئے، یہاں آنے کے بعد میں نے ان کا پتہ بھی کروایا، ان کی لاش ایک انجینئر کے بنگلے کے قریب سے ملی تھی۔" آمنہ کہانی سناتی چلی گئی۔

ارجن کے ذہن میں اس کی ماں سنائی ہوئی کہانی گونجنے لگی، اس نے بھی یہی بتایا تھا کہ اس کے بنگلے کے باہر سے ایک مسلمان کی لاش ملی تھی جس کے پاس نوزائیدہ ارجن ملا تھا۔ گویا ارجن آمنہ کا حقیقی بیٹا اور حماد کا جڑواں بھائی تھا۔ یہ سچ جانتے ہی وہ آمنہ سے لپٹ گیا۔ اب رونے کی باری ارجن کی تھی۔ وہ ایسا بیٹا تھا۔ جسے برسوں بعد حقیقی ماں کی آغوش نصیب ہوئی تھی۔ آمنہ نے اپنی گود میں پڑے ہوئے بیٹے کی پیشانی چومی اور اس کی آنکھوں سے چشمہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ "پہلے تو یہ چشمہ نہیں پہنتا تھا۔" وہ خود کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ارجن کی آنکھ کافی دیر بعد کھلی اس نے دیکھا اس کا سر اب تک آمنہ کی گود میں تھا۔ اور وہ اس کا سر سہلا رہی تھی۔ ماں کی ممتا بھی عجیب ہوتی ہے اولاد

کے سکھ چین کے لئے اپنی نیند چین آرام سب قربان کر دیتی ہے۔

ارجن اپنی ماں کا چہرہ تک رہا تھا کہ آمنہ کی نظریں ارجن کی آنکھوں پر پڑیں، اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ ادھر ارجن کو احساس ہو چکا تھا کہ اس کی آنکھوں پر گلاسز موجود نہیں، اس نے اٹھ کر جلدی سے ایک طرف رکھا چشمہ پہن لیا۔

"بیٹا تمہاری آنکھیں؟"

"ماں جی آنکھوں میں کچھ خرابی ہوگئی ہے، اس لئے تو ہر وقت چشمہ پہنے رکھتا ہوں۔" اس نے بہانہ بنایا لیکن آمنہ سوچ میں پڑ چکی تھی۔

حماد اور ارسلان دونوں جڑواں بھائی تھے۔ ان میں صرف ایک ہی فرق تھا حماد کی آنکھیں کالی تھیں جبکہ ارسلان کی آنکھیں براؤن تھیں۔ وہ بچپن ہی سے پلکیں نہیں جھپکاتا تھا اب ارجن کا نام ارسلان رکھ دیا گیا تھا۔

صبح ناشتہ ارجن نے خود بنایا۔ "چلو لال شاہ بابا کے پاس چلتے ہیں۔" آمنہ نے ناشتہ کرنے کے بعد کہا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں لال شاہ کے آستانے پر ان کے سامنے موجود تھے۔ آستانے پر ان سے پہلے بھی کچھ لوگ بیٹھے تھے جو باری باری لال شاہ کے سامنے جا رہے تھے بالآخر ان کا نمبر بھی آ گیا۔

"بابا میں الجھن میں ہوں اس کی آنکھیں؟" آمنہ نے اپنا مدعا بیان کرنا چاہا۔

لال شاہ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کیں پھر زیر لب کچھ پڑھا اور آنکھیں کھول کر ان دونوں پر پھونکا "تو تم اصلیت جان چکی ہو، میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ تمہارا بیٹا مل جائے گا۔ ہر انسان کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب انسان کا وقت پورا ہوتا ہے تو اسے جانا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں اللہ کی رضا میں خوش رہنا چاہئے۔ حماد کی زندگی اتنی ہی تھی۔ تمہارا ایک بیٹا دنیا سے چلا گیا اور اللہ نے تمہیں برسوں بعد بچھڑے ہوئے بیٹے سے ملا دیا، اللہ کا شکر ادا کرو اور ارسلان تم مسلمان ہو۔ مسلمان کے گھر پیدا ہوئے۔ ہندو کے گھر پرورش پائی۔ ہمیشہ صرف اللہ کے آگے سر جھکائے رہنا، اب تم لوگ جاؤ باہر دوسرے ضرورت مند موجود ہیں۔" لال شاہ نے کہا اور وہ دونوں ماں بیٹا باہر نکل گئے۔

ارسلان موبائل فون پر گیم کھیل رہا تھا کہ آمنہ نے آواز دی۔ "آؤ بیٹا کھانا کھالو۔" وہ اٹھ کر ماں کے قریب آ گیا آمنہ کی دیکھ بھال کے لئے اس نے گاؤں کی ایک بیوہ عورت کو کام پر رکھ لیا تھا۔ وہ دن میں اکثر کھانے پکانے کے علاوہ ان کے گھر کے دوسرے کام بھی کرتی تھی۔

ایک روز ارسلان بولا۔ "ماں جی مجھے دو روز کے لئے ایک ضروری کام سے شہر جانا ہے۔ جب تک شبانہ خالہ اور ان کا بیٹا تمہارے ساتھ رہیں گے۔" ارسلان نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا تم برسوں بعد ملے ہو میں اب تمہیں دور نہیں جانے دوں گی۔" آمنہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"ماں جی صرف دو روز کی بات ہے بہت ضروری کام ہے اور پھر وعدہ کرتا ہوں اس کے بعد کبھی بھی تم سے دور نہیں جاؤں گا۔" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا اور آمنہ نے اسے با دل نخواستہ اجازت دے دی۔

"دراصل اسے آج ہی پانڈے نے فون کیا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت پاکستان پہنچ چکا تھا۔ اور ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ارسلان دوسرے روز آمنہ سے رخصت ہو گیا۔ شام پانچ بجے وہ شہری حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ وہی شہر تھا جہاں اس نے مہوش کو اس کی دوست کے گھر چھوڑا تھا۔ ٹیکسی فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے پہنچ چکی تھی اس نے ڈرائیور کو کرائے کے پیسے دیئے اور جیسے ہی ٹیکسی سے اترا اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ وہ مڑا اور ششدر رہ گیا۔ اس کے سامنے ریاض ہٹلر موجود تھا۔ جس کے ہاتھ میں پکڑے پسٹل کا رخ اس کی طرف تھا۔ ایک

دوسرا شخص بھی اس کے قریب موجود تھا۔ اس نے بھی ریوالور اٹھا رکھا تھا۔ ''جی فرمایئے۔'' ارسلان نے ہمت کرکے پوچھا۔

''حماد ہم بہت دنوں سے تمہاری تلاش میں تھے، اب اتفاق سے ہاتھ میں آگئے ہو تو چلو تھانے تمہاری خاطر تواضع بھی ہو جائے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

''مگر کس جرم میں؟'' ارسلان نے استفسار کیا۔

''جرم بھی بتا دیں گے تھانے تو چلو۔'' اس روز تم نے ہمیں بہت بھگایا تھا اب کوئی ہوشیاری مت کرنا۔'' وہ اسے دھکیلتا ہوا ایک کار کی طرف بڑھا اور پچھلا دروازہ کھول کر ارسلان کو اندر دھکیل دیا۔ دوسرا شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ ریاض ہٹلر پچھلی نشست پر اس کے قریب جا بیٹھا، اس کے پسٹل کی نال بدستور ارسلان کے پہلو سے لگی ہوئی تھی۔

ریاض ہٹلر کی وردی کی وجہ سے وہاں موجود دوسرے افراد نے مداخلت نہیں کی اور دور سے تماشہ دیکھتے رہے۔ ''چل بھئی راجہ۔'' ریاض ہٹلر نے کہا اور راجہ نامی پولیس اہلکار نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ آدھے گھنٹے بعد کار ایک بنگلے کے سامنے رکی۔ ''تم تو کہہ رہے تھے مجھے پولیس اسٹیشن لے جا رہے ہو۔'' ارسلان نے پوچھا۔

''اسے بھی پولیس اسٹیشن ہی سمجھو، ہم خاص قسم کے ملزمان کو تفتیش کے لئے یہیں لاتے ہیں۔'' ریاض ہٹلر نے خباثت سے کہا۔ وہ اسے ایک کمرے میں لے آئے۔ اس کمرے میں کسی قسم کا ساز و سامان نہ تھا۔ صرف ایک لوہے کی کرسی تھی جو فرش میں فکس تھی۔ کمرے کی دیواروں پر مختلف اقسام کے ایذا رسانی کے آلات موجود تھے۔ چھت پر ایک روشن دان تھا۔ جو کافی بلندی پر تھا۔ یہ ہوا کی آمد و رفت کے لئے بنایا گیا تھا۔ ہٹلر کے اشارے پر راجہ نے ارسلان کو کرسی پر باندھ دیا۔ اسے رسی سے اس قدر مضبوطی سے باندھا گیا تھا کہ ہاتھ پیر ہلانا بھی ناممکن تھا۔ بلیک چشمہ اب تک اس کے چہرے پر موجود تھا، جس کی وجہ سے وہ اپنی آنکھوں کی مقناطیسی قوت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔

''آخر میرا جرم کیا ہے؟ کیا تم نے مجھے اس لڑکی کی وجہ سے پکڑا ہے۔'' ارسلان نے کہا۔ ''اتنے بھولے مت بنو، میں تو خود حیران ہوں کہ تم زندہ کیسے بچ گئے؟ ہم نے خود تمہیں اپنی گاڑی سے کچلا تھا۔ تم فائزہ کے قتل کے چشم دید گواہ تھے تمہیں مارنا ہماری مجبوری تھی۔ پر تم بچ کیسے گئے؟'' ریاض ہٹلر نے کہا اور ارسلان سارا معاملہ سمجھ گیا۔

حماد حادثے کا شکار نہیں ہوا تھا اسے قتل کیا گیا تھا اور ریاض ہٹلر نے اسے حماد سمجھ کر پکڑا تھا۔

''اب بتاؤ مہوش کہاں ہے۔'' اس نے زوردار تھپڑ ارسلان کے چہرے پر رسید کیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ ''مجھے تم نے ویسے بھی مار دینا ہے پھر ایک معصوم لڑکی کا پتہ تم جیسے درندوں کو کیوں بتاؤں۔'' ارسلان نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

''بتائیں گے تو تمہارے بڑے بھی بچے، یہاں آکر پتھر بھی بول پڑتے ہیں۔'' اس نے دیوار سے لٹکا ایک ہنٹر اتارا اور ارسلان کے جسم پر برسانے لگا۔ ارسلان کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

کسی کے جھنجھوڑنے پر اسے ہوش آیا۔ اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ وہ کمرے کے فرش پر پڑا تھا۔ سامنے ہی وہ ٹیکسی ڈرائیور کھڑا تھا۔ جس کی ٹیکسی پر وہ فائیو اسٹار ہوٹل گیا تھا اور ریاض ہٹلر کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔

''تت تم یہاں کیسے؟'' ارسلان نے کراہتے ہوئے پوچھا اور بمشکل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پورے بدن میں درد کی کٹیلی لہریں دوڑ رہی تھیں، جس رسی سے اسے باندھا گیا تھا وہ کرسی کے قریب پڑی تھی۔

''صاحب یہ وقت باتوں کا نہیں وہ درندے لوٹ آئے تو آپ کے ساتھ ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ تب ہی ارسلان کی نظر روشن دان سے لٹکتی رسی پر پڑی۔ گویا وہ ڈرائیور اس رسی کے ذریعے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ آپ میرے

کندھوں پر سوار ہو جاؤ۔ ٹیکسی ڈرائیور قدرے جھک کر کھڑا ہو گیا۔ ارسلان اس کے کندھے پر سوار ہو کر رسی کے ذریعے باآسانی روشن دان سے گزر کر چھت پر پہنچ گیا۔ ڈرائیور نے بھی بندر کی طرح اچک کر رسی پکڑی اور چھت پر پہنچ گیا۔ اور رسی باہر کھینچ لی۔ رسی کا دوسرا سرا چھت پر موجود پلر کے سریئے میں کنڈے کے ذریعے اٹکا ہوا تھا۔ وہ دونوں باری باری نیچے اترے ور احاطے کی دیوار پھلانگ کے باہر جا پہنچے۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ٹیکسی مکان سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے ٹیکسی اسپیڈ سے دوڑا دی۔

''ہم یہاں کیسے پہنچے اور جس مہارت سے تم اس کمرے میں داخل ہوئے وہ بھی عام آدمی کا کام نہیں۔'' ارسلان نے کہا۔

سر میرا نام وقاص ہے۔ بی اے کر چکا ہوں۔ ہمارے ملک میں نوکری میرٹ پر نہیں رشوت اور سفارش سے ملتی ہے۔ میرے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن تھی گھر کا چولہا جلانے کے لئے کرائے پر ٹیکسی لی اور چلانے لگا۔ اسی پولیس انسپکٹر ریاض ہٹلر نے میرے چھوٹے بھائی وقار کو ایک ناکردہ جرم میں گرفتار کر لیا اور اس کی رہائی کے عوض پچاس ہزار مانگے۔ نہ دینے پر اس قدر تشدد کیا کہ دوران تشدد اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ ماورائے عدالت قتل تھا۔ ہم غریب لوگ تھے، اس پولیس انسپکٹر کے خلاف ہماری کون سنتا۔ رو دھو کر چپ ہو گئے۔ فائیو اسٹار ہوٹل کے باہر آپ ٹیکسی سے اترے میں ٹیکسی اسٹارٹ کرکے جانے ہی والا تھا کہ ریاض ہٹلر کو دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے میرے مظلوم بھائی کا چہرہ گھوم گیا۔ میں کامیابی سے ان کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آ پہنچا۔ پھر کچھ دیر وہ لوگ گھر سے باہر نکلے میری ٹیکسی کی ڈگی میں رسی بروقت پڑی رہتی ہے۔ بعض اوقات مسافروں کا سامان ٹیکسی کی چھت پر باندھنا پڑتا ہے۔ دوران تعلیم اسکاؤٹس کی تربیت آج میرے کام آگئی۔'' وقاص نے اپنی روداد مکمل کی۔

''تم مجھے ہوٹل تک چھوڑ دو۔'' ارسلان نے آستین سے اپنے چہرے پر جما لہو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ظالموں نے اسے بہت بے دردی سے مارا تھا۔

''صاحب آپ آج میرے گھر رہو، ہوٹل میں جانا خطرے سے خالی نہیں۔'' وقاص نے کہا۔

وہ رات کو وقاص کے گھر پر رکا۔ وہ سیدھے سادے مخلص لوگ تھے۔ وقاص نے اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا اسے پہننے کو دیا۔ صبح ناشتہ کرکے ارسلان نے پانڈے کا نمبر ملایا اور ملاقات کے لئے ایک دوسرے ہوٹل میں ملنے کا وقت طے کیا۔ چند گھنٹوں بعد وہ ہوٹل کے کمرے میں پانڈے کے سامنے بیٹھا تھا۔ پانڈے کے ساتھ انڈیا سے۔ نارائن، کشن، سریتا، گووند آئے تھے۔ ارسلان کی آنکھوں پر حسب معمول بلیک چشمہ موجود تھا۔ جو آتے وقت اس نے بازار سے خریدے تھے۔ ''یہ تمہارے چہرے پر زخموں کے نشان کیسے آئے؟'' پانڈے چونکا۔

''کسی سے معمولی سی جھڑپ ہو گئی تھی مجھے دو روز کا وقت چاہئے ایک ضروری کام نمٹانا ہے دو روز بعد میں اسی ہوٹل میں آجاؤں گا۔'' ارسلان نے کہا۔

''ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' پانڈے نے جواب دیا۔

''اچھا تو پھر پرسوں ملیں گے۔'' ارسلان نے کہا اور اس سے رخصت ہو کر کمرے سے باہر نکلا۔

وقاص ہوٹل سے باہر اپنی ٹیکسی میں موجود تھا۔ وہ شام تک شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے رہے۔ انہیں رضوان کی تلاش تھی۔ وقاص مقامی تھا اس کی مدد سے وہ بہت سی قیمتی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ارسلان نے مارکیٹ سے کچھ ضروری چیزیں خریدیں، شام سات بجے وہ فارعہ اپارٹمنٹ کے اندر موجود تھے۔ سیکنڈ فلور پر ٹو یرو ون نمبر کا اپارٹمنٹ روبی نامی لڑکی کا تھا۔ روبی ماڈل گرل تھی۔ اور ان کی معلومات کے مطابق رضوان کی گرل فرینڈ ہونے کے

ساتھ ساتھ اس کی داشتہ بھی تھی۔ رضوان کی راتیں اکثر اسی کے فلیٹ پر گزرتی تھیں۔ فلیٹ اس وقت لاک تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت اس فلور پر کوئی بھی موجود نہ تھا۔

ارسلان ایک تار کی مدد سے دروازے کا لاک کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کافی کوشش کے بعد اسے کامیابی ہوئی۔ وہ دونوں جلدی سے اپارٹمنٹ میں داخل ہوگئے۔ ارسلان نے دروازہ دوبارہ لاک کر دیا۔ اب وہ اطمینان سے اپارٹمنٹ کا جائزہ لینے لگے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اپنے چہروں پر نقاب چڑھا دیئے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد انہیں محسوس ہوا۔ کوئی اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچ چکا ہے۔ وہ دونوں بیڈ روم میں جا گھسے۔ وقاص بیڈ کے نیچے گھس گیا۔ جب کہ ارسلان بیڈ روم کی دیواروں کے آگے لگے پردے کے پیچھے جا چھپا۔ روبی کے گنگنانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ گنگناتی ہوئی بیڈ روم میں داخل ہوگئی۔ نائٹ بلب آن کیا اور بیڈ پر دراز ہوگئی۔ وہ اب بھی گنگنا رہی تھی۔

اچانک روبی کے موبائل فون کی بیل بجی، روبی نے کال ریسیو کی۔ اس کی مترنم آواز سنائی دی۔ "ہاں رضوان میں اپارٹمنٹ میں ہوں۔" پھر قدرے توقف کے بعد اس کی آواز سنائی دی۔ "ہاں بھئی اس وقت تنہا ہی ہوں آ جاؤ میں ویٹ کر رہی ہوں۔"

ارسلان مسکرایا کیونکہ ان کا شکار خود چل کر آ رہا تھا۔ ورنہ ان کا ارادہ یہی تھا کہ روبی سے گن پوائنٹ پر رضوان کو بلوائے تقریباً آدھے گھنٹے بعد گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ روبی دروازے کی طرف بڑھی کچھ دیر بعد وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اب وہ تنہا نہیں تھی۔ رضوان اس کے ساتھ تھا۔ "ارے بابا صبر کرو۔" روبی کی کھلکھلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ آنے والے نے اسے بیڈ پر دھکیل دیا۔ پھر وہ خود بھی بیڈ پر چڑھ گیا۔ ارسلان نے پردے میں ہلکی سی جھری بنائی اور دیکھنے لگا۔

"تم جب سامنے آتی ہو تو صبر ہی نہیں ہوتا۔" ارسلان کی توقع سے پہلے کھیل خطرناک حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ دونوں بیڈ پر بے میاں تلوار پڑے ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے۔ ارسلان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ارسلان انتظار کرنے لگا کہ کب وہ دونوں انسانیت کے جامے میں آئیں۔ مگر ان کا انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ہی ساتھ فحش گفتگو کیے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہیجان خیز آوازیں آنا بند ہوگئیں۔

ارسلان نے پردے کی جھری سے جھانکا۔ روبی بیڈ پر چت پڑی تھی۔ دونوں کے لباس بیڈ سے نیچے قالین پر پڑے تھے۔ "اب تو کپڑے پہننے دو۔" روبی نے مخمور لہجے میں کہا۔

ارسلان نے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا اور بیلٹ میں اڑسا پسٹل نکال کر ہاتھوں میں لیا اور برق سرعت سے باہر نکلا۔ وقاص بھی بیڈ کے نیچے سے باہر نکل چکا تھا۔

مسلح نقاب پوشوں کو دیکھ کر دونوں عریاں وجود چونک اٹھے۔ روبی نے بیڈ کی چادر سے خود کو ڈھانپنے کی کوشش کی اور رضوان بیڈ کے قریب میز پر رکھے اپنے ریوالور کی طرف لپکا ارسلان کی فرنٹ کک اس کے سینے پر لگی وہ روبی پر جا گرا۔ وقاص نے میز پر پڑا اس کا ریوالور اٹھا لیا۔ "مسٹر رضوان مجھے معلوم ہے یہ فلیٹ مکمل طور پر ساؤنڈ پروف ہے۔ اس کے علاوہ میرے پسٹل پر سائلنسر موجود ہے۔ کوئی بھی غلط حرکت تم دونوں کو موت کے منہ میں دھکیل سکتی ہے۔" ارسلان سانپ کی طرح پھنکارا۔

"تم کون ہو اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟" رضوان نے پوچھا۔

"یہ بھی بتا دیں گے اتنی جلدی کیا ہے؟" ارسلان نے اطمینان سے کہا۔

"ہمیں کپڑے تو پہننے دو۔" رضوان گھگھیاتے ہوئے بولا۔

"جانور بغیر کپڑوں کے ہی رہتے ہیں، خیر پہن لو۔" ارسلان نے نیچے پڑے کپڑے ان کی طرف پھینکے جو انہوں نے جلدی جلدی پہنے اب وہ خوفزدہ نظروں سے ان دونوں نقاب پوشوں کو دیکھ رہے تھے جو بلائے ناگہانی کی طرح ان کے سر پر مسلط ہو چکے تھے لیکن وہ

کون تھے؟ اور کیا چاہتے تھے۔ یہ رضوان نہیں جانتا تھا۔

"اس فاحشہ کو کچھ دیر کے لئے سلا دو تاکہ ہم تعارف کا مرحلہ طے کر لیں اس کا ہمارے بارے میں جاننا اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔" ارسلان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"اے لڑکی بیڈ سے نیچے اترو۔" وقاص اس کا مطلب سمجھ کر غرایا۔

"پلیز! مجھے کچھ مت کہو۔" روبی خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"لڑکی جلدی سے بیڈ سے اترو ورنہ گولی مار دوں گا۔" ارسلان نے سفاک لہجے میں کہا اور روبی لرزتی کانپتی ہوئی بیڈ سے نیچے اتری۔ وقاص نے اپنی جیب سے کلوروفارم میں بھیگا رومال نکالا اور لڑکی کے ناک پر رکھ دیا۔ اس نے لڑکی کے بے ہوش ہوتے ہی اسے بیڈ کے نیچے دھکیل دیا۔ ارسلان نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔

"حماد تم زندہ ہو؟" رضوان کے منہ سے بے اختیار یہ جملہ نکلا۔

"ہاں میں زندہ ہوں۔ اب تم بھی زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنے اور ریاض ہٹلر کے کرتوت بتاتے جاؤ۔" ارسلان نے کہا اور وقاص کو اشارہ کیا۔

وقاص نے اپنی پشت پر بندھے بیگ سے کیمرہ نکالا یہ بہت ہائی میگا پکسل جدید ترین کیمرہ تھا۔ "ہاں تو مسٹر رضوان شروع ہو جاؤ اور بتاؤ تم لوگوں نے فائزہ کو کیوں قتل کیا اور حماد کو کیوں اور کس طرح قتل کیا۔" ارسلان نے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"تت تم تو زندہ ہو۔" رضوان نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میں حماد کا جڑواں بھائی ارسلان ہوں، اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو شروع ہو جاؤ، سچ بولو گے تو زندہ رہو گے میں صرف دس سیکنڈ انتظار کروں گا اگر تم نہیں بولے تو گولی چلا دوں گا اور تمہیں ایک دم نہیں ماروں گا، تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔"

رضوان خاموش رہا ارسلان نے گولی چلا دی۔ اس کی چلائی ہوئی گولی رضوان کے دائیں گھٹنے میں لگی وہ چیختا ہوا گرا اور تڑپنے لگا۔ رضوان دس سیکنڈ پھر گزر چکے ہیں جلدی بولو ورنہ دوسری گولی تمہارے دوسرے گھٹنے میں لگے گی۔ ارسلان غرایا اور رضوان نے بولنا شروع کر دیا۔ وقاص نے کیمرہ آن کر دیا۔

"فائزہ ہمارے کالج میں پڑھتی تھی۔ وہ ڈی ایس پی پرویز کی بیٹی تھی۔ اور مہوش کی دوست تھی میں نے اسے محبت کے جال میں پھنسایا، وہ اکثر میرے ساتھ گھومنے جاتی تھی۔ ایک روز میں اسے اپنے ایک دوست کے اپارٹمنٹ میں لے گیا اور اسے بے آبرو کر دیا۔ رونے دھونے پر اسے جھوٹی تسلی دی کہ میں اس سے شادی کروں گا۔ وہ میری باتوں میں آ گئی اور مجھ سے اکثر تنہائی میں ملنے لگی۔

ایک روز اس نے مجھے بتایا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ میں اس سے شادی کر لوں ورنہ وہ ڈی ایس پی پرویز کو سب کچھ بتا دے گی، میں اسے بہلا پھسلا کر اپنے دوست پولیس انسپکٹر ریاض ہٹلر کے بنگلے پر لے گیا۔ وہاں ہم نے اسے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا۔ ہم اسے مارنا نہیں چاہتے تھے مگر جیسے ہی اسے ایک پارک کے قریب ہائی روف سے اتارنے لگے اس نے دھمکی دی کہ وہ ہم سب کو بے نقاب کر دے گی۔

میں نے اسے گولی مار دی بدقسمتی سے اس وقت پارک کے قریب حماد موجود تھا۔ اس نے یہ قتل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اس پر فائرنگ کی مگر وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ تب ہم ہائی روف میں اس کا پیچھا کرنے لگے۔ ہائی روف ریاض ہٹلر چلا رہا تھا۔ ایک اسپیڈ بریکر پر حماد موٹر سائیکل کو سنبھال نہ سکا ریاض ہٹلر نے گاڑی اس پر چڑھا دی۔ اس نے تین چار بار پے در پے اس پر گاڑی چڑھائی اس کی لاش ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ پھر ہم وہاں سے بھاگ نکلے۔"

"مجھے معلوم ہوا ہے تم اور ریاض ہٹلر کوئی

غیر قانونی کام بھی کرتے ہو، وہ کیا ہے اور اس میں کون کون ملوث ہے؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''پولیس جب بھی ہیروئن، چرس، افیون یا اس قسم کی منشیات کے اسمگلروں کو گرفتار کرتی ہے ضبط ہونے والی منشیات کو ضائع کرنے کا حکم دیا جاتا ہے ریاض ہٹلر اپنے ساتھی پولیس اہلکاروں کی مدد سے وہ منشیات میرے حوالے کر دیتا ہے۔ جسے فروخت کرنے کے بعد ملنے والی رقم ہم تقسیم کر لیتے ہیں۔''

وہ پولیس کے دیگر کرپٹ اہلکاروں اور اپنے ساتھیوں کے نام بتاتا جا رہا تھا اور وقاص اس کی فلم بنا رہا تھا۔ فلم بناتے وقت اس کی کوشش تھی کہ اس فلم میں صرف رضوان ہی نظر آئے۔ ارسلان کی آواز وہ بعد میں ایڈیٹ کر لیتے۔ ارسلان کے اشارے پر اس نے کیمرہ آف کر دیا۔

رضوان خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ''اب تم لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے۔''

''اگر تم ہمارے کہنے پر چلتے رہے تو ہم یہ فلم لے کر خاموشی سے یہاں سے چلے جائیں گے، اب اپنے موبائل فون سے کال کر کے ریاض ہٹلر کو یہاں بلاؤ اس سے کہو کہ تم نے اس کے لئے کوئی نیا شکار پھنسایا ہے اور یاد رکھنا اگر تم نے اسے ہوشیار کرنے کی کوشش کی تو ہم تمہیں گولی مار کر یہاں سے نکل جائیں گے۔'' ارسلان نے کہا اور رضوان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے اپنے موبائل فون پر ریاض ہٹلر کا نمبر ملایا۔

''ہیلو ریاض کیسے ہو؟ ٹھیک ہوں خیریت تو ہے جو اس وقت کال کی ریاض ہٹلر کی آواز سنائی دی۔'' رضوان نے ارسلان کے اشارے پر موبائل فون کا اسپیکر کھول دیا تھا۔

''یار ایک نئی تتلی پھنسائی ہے بڑی زبردست چیز ہے۔ جلدی سے روبی کے فلیٹ پر آ جاؤ مل کر عیش کریں گے۔'' رضوان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے آتا ہوں۔ بوتل شوتل تو موجود ہے نا ں؟'' ریاض ہٹلر خباثت سے ہنسا۔

''وہ بھی ہے بس تم پہنچ جاؤ۔'' رضوان نے کہا اور ارسلان کے اشارے پر رابطہ منقطع کر دیا۔

''وقاص اب اسے باندھ دو۔'' ارسلان نے کہا اور وقاص نے اپنی پشت سے لٹکے اس بیگ سے نائلون کی رسی نکالی اور رضوان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے پھر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر چوڑا سا سلوشن ٹیپ اس کے منہ پر لپیٹا اور بیڈ پر ڈال دیا۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گئے ریاض ہٹلر آ گیا ہے۔ دونوں دبے قدموں دروازے پر پہنچے ارسلان نے آڑ میں چھپتے ہوئے دروازہ کھولا اور دروازے پر کھڑے ریاض ہٹلر کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر گریبان سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔ ریاض ہٹلر نے اپنے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا مگر اپنی طرف اٹھی پسٹل کی نال کو دیکھ کر رک گیا۔

ارسلان نے اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔ اور ایک زوردار گھونسہ اس کے جبڑے پر رسید کیا۔ ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ اس نے اس کی رانوں کے بیچ گھٹنے کا زوردار وار کیا۔ ریاض کراہتا ہوا رکوع کے بل جھکا۔ اس بار ارسلان نے اپنا گھٹنا اس کے چہرے پر مارا وہ الٹ کر گرا وقاص اپارٹمنٹ کا دروازہ بند کر چکا تھا۔ رضوان ریاض ہٹلر کے جسم پر لاتیں اور گھونسے برسا رہا تھا کچھ دیر بعد وہ حقیر کیچوے کی طرح فرش پر پڑا تھا۔ وقاص نے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے، پاؤں پر رسی مضبوطی سے باندھی۔ پھر ارسلان حرکت میں آیا اس نے رضوان کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے اور منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا باہر نکالا۔

''اب تو مجھے وعدے کے مطابق آزاد کر دو۔'' رضوان نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''ضرور کیوں نہیں؟'' ارسلان نے کہا اور ٹریگر دبا دیا۔ اس کے سائلنسر میں لگے پسٹل سے گولی نکلی اور رضوان کے سینے میں دل کے مقام میں پیوست ہو گئی۔ وہ بنا کوئی آواز نکالے جہنم رسید ہو گیا۔

روبی اب تک بیڈ کے نیچے بے ہوش پڑی تھی۔ ریاض ہٹلر خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ''یہ سب کچھ کر کے تم لوگ بچو گے نہیں۔'' ریاض ہٹلر نے خوفزدہ لہجے میں دھمکی دی۔

ارسلان نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور سلوشن ٹیپ لپیٹ دیا۔ ''وقاص اب اسے پیک کر دو۔'' ارسلان نے کہا اور وقاص نے اپنے بیگ سے ایک بڑا سا پلاسٹک بیگ نکالا انہوں نے ریاض ہٹلر کو بیگ میں گھسیٹ کر زپ بند کی۔ چہروں سے نقاب اتارے وقاص نے ریاض ہٹلر والا پلاسٹک بیگ اٹھایا اور اپارٹمنٹ سے باہر نکلے۔ احاطے میں ریاض ہٹلر کی نئے ماڈل کی کار کھڑی تھی۔ جس کی چابی وہ پہلے ہی ریاض ہٹلر کی جیب سے نکال چکے تھے۔ پلاسٹک بیگ کو گاڑی کی پچھلی نشست پر پھینک کر وہ کار میں بیٹھ گئے۔ گاڑی بیرونی گیٹ پر پہنچی چوکیدار کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

''دروازہ کھولو ریاض صاحب میڈم روبی کے فلیٹ میں ہیں ہمیں انہوں نے ضروری کام سے بھیجا ہے۔ ارسلان نے کہا اور چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی وقاص چلا رہا تھا۔ سڑک پر پہنچ کر ارسلان نے ریاض ہٹلر کو پلاسٹک بیگ سے باہر نکال دیا۔ گاڑی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی فلائی اوور پر چڑھ چکی تھی۔ وقاص نے ارسلان کی ہدایت پر لحہ بھر کے لئے گاڑی فلائی اوور کے حفاظتی جنگلے کے قریب روکی۔ ارسلان برقی سرعت سے اترا۔ ریاض ہٹلر کو اٹھا کر فلائی اوور سے نیچے رواں ٹریفک کے درمیان پھینک دیا۔ نصف شب کے قریب کا وقت تھا۔ اسے شاید ہی کسی نے دیکھا ہو اگر دیکھتا بھی تو بڑے شہروں میں لوگ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

ارسلان نے پل سے نیچے جھانک کر دیکھا اتنی بلندی سے گر کر بچنا ویسے بھی محال تھا۔ ریاض ہٹلر لوتھڑے کی صورت میں سڑک پر پڑا تھا، کئی گاڑیاں برق رفتاری سے اس کے وجود کو کچلتی گزر چکی تھیں جس نے ساری زندگی بے گناہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی، پھر بھلا اسے زمین پر امان کیوں ملتی۔

☆......☆......☆

وہ بلند و بالا برفانی پہاڑ تھا۔ وہ چھ افراد اس برفانی پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ وہ کوہ پیمائی کے مخصوص ساز و سامان سے لیس تھے۔ ان سب کی آنکھوں پر بلیک گلاسز موجود تھے۔ یہ افراد ارسلان، پانڈے، نارائن، سریتا، گوند اور کشن تھے۔ ان پانچوں نے اس بلند و بالا برفانی پہاڑ پر چڑھتے ہی ارسلان کی طرح گلاسز پہن لئے تھے۔ اس پر ارسلان نے حیرت کا اظہار کیا تو پانڈے نے وضاحت کی کہ یہاں بعض اوقات ہواؤں کے تیز جھکڑ چلتے ہیں۔ انہوں نے اس لئے احتیاطاً گلاسز پہنے ہیں۔ ان کے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ ملنے والے خزانے کا نصف ارسلان کا ہوگا اور بقایا نصف پانڈے کا ہوگا۔

پہاڑ پر رسے کی مدد سے چڑھتے چڑھتے ایک جگہ گہری کھائی بھی آئی جسے انہوں نے رسے کی مدد سے عبور کر لیا۔ اس جگہ سردی بہت زیادہ ہو رہی تھی۔ پانڈے کے پاس ایک جی پی ایس اور نقشہ بھی موجود تھا جس کی مدد سے وہ آگے بڑھ رہے تھے یہاں چاروں طرف برف ہی برف تھی کیونکہ یہاں بلندی دو ہزار آٹھ سو پچاس میٹر تھی۔ اس لئے سردی بہت زیادہ تھی ویسے

بھی اس برفانی پہاڑ پر جون جولائی میں بھی موسم سرد ہی رہتا ہے۔ اس وقت تو غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ انہوں نے ایک جگہ کیمپ لگایا اور خیمے نکال کر نصب کرلئے، بند ڈبوں میں موجود کھانے سے پیٹ بھرا جیسے جیسے سورج غروب ہوتا جارہا تھا سردی شدید ہوتی جارہی تھی، سریتا نے کافی تیار کی، کافی پینے کے بعد وہ اپنے اپنے خیموں میں گھس گئے۔

نارائن، ارسلان، پانڈے اور سریتا ایک خیمے میں اکٹھے تھے جبکہ دوسرے چھوٹے سائز کے خیمے میں جبکہ دوسرے خیمے میں کشن اور گوند تھے۔ وہ گہری نیند سو رہے تھے کہ ایک چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی ایک فائر بھی ہوا وہ جاگ اٹھے۔

فائر اور چیخ کی آواز گوند کے خیمے سے آئی ہے۔ پانڈے نے کمبل میں سے نکلتے ہوئے۔ انہوں نے خودکار رائفلیں نکالیں اور خیمے سے باہر نکلے سریتا نے سرچ لائٹ اٹھا رکھی تھی۔ ابھی وہ اپنے خیمے سے باہر نکلے ہی تھے کہ گوند اپنے خیمے سے نکل کر ان کی طرف اس طرح بھاگا۔ جیسے اس کے پیچھے کوئی عفریت لگا ہو۔

"کیا ہوا گوند! وہ فائر کس نے کیا تھا اور وہ انسانی چیخ کس کی تھی اور کشن کہاں ہے؟" پانڈے نے گوند سے پوچھا۔

"وہ اسنومین بہت لمبا اور جسیم ہے اس...... اس...... کا سارا جسم بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ...... وہ کشن کو اٹھا کر لے گیا۔ گولی میں نے چلائی تھی۔ مگر گولی لگنے کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگڑا۔" گوند نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ خوف سے اس کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔

وہ گوند کے خیمے میں داخل ہوئے زمین پر خون پڑا ہوا تھا۔ جو شاید گوند کے کہنے کے مطابق اسنومین کا تھا ایک طرف سے خیمہ پھٹا ہوا تھا۔ وہ خیمے سے باہر نکلے تو ششدر رہ گئے، ایک طرف برف میں بہت بڑے پاؤں کے نشان نظر آرہے تھے جسے گوند نے اسنومین کا نام دیا تھا۔ انہوں نے سرچ لائٹ کی روشنی میں غور سے پاؤں کے نشانوں کا جائزہ لیا۔ "یہ بڑے بڑے پیروں کے نشان انسانی نہیں ہوسکتے یہ کوئی بلا ہے۔" پانڈے نے کہا۔

وہ پاؤں کے نشان پر چلتے ہوئے کچھ آگے گئے ہی تھے کہ پانڈے نے کہا۔ "واپس چلو وہ بلا نہ جانے کہاں گئی، رات کے اندھیرے میں اس طرح اس کا پیچھا کرنے سے ہم کسی ناگہانی مصیبت میں بھی پھنس سکتے ہیں۔" وہ واپس خیمے میں لوٹ آئے۔ گوند بہت خوفزدہ تھا۔

پوری رات انہوں نے جاگ کر بسر کی، سریتا نے دو تین دفعہ کافی بنائی جبکہ ارسلان کلمہ پڑھ کر سوچکا تھا۔

صبح اسے پانڈے نے جھنجھوڑ کر اٹھایا وہ جوتے پہن کر خیمے سے باہر نکلے، رات کے کسی پہر برف باری ہوئی تھی۔ رات بھر ہونے والی برف نے اس بلا کے قدموں کے نشان مٹا ڈالے تھے۔ پانڈے نے آگ جلائی تھی۔ وہ آگ تاپنے لگے، ناشتہ کرکے انہوں نے سامان پیک کیا اور بیگ اٹھا کر آگے بڑھ گئے۔ "نہ جانے اس بلا نے کشن کا کیا حال کیا ہوگا؟" گوند خوفزدہ لہجے میں بولا۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ برفانی بلا کا کوئی وجود ہوگا، ہوسکتا ہے کوئی برفانی ریچھ ہو جسے تم نے انسان سمجھ لیا ہو۔" ارسلان نے کہا۔

"تمہارا خیال غلط ہے ریچھ اور انسان کے پاؤں کے نشان میں بہت فرق ہے، میں نے خود ان نشانوں کو دیکھا تھا بلاشبہ وہ پاؤں کے نشان انسانی تھے۔" پانڈے نے کہا۔ اس کے گلے سے ایک دوربین جھول رہی تھی۔ جس سے وہ وقفے وقفے سے آس پاس کے علاقے کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔

کچھ فاصلے پر بلندی پر اونچی اونچی چٹانیں تھیں۔ "وہ دیکھو برفانی انسان دور سے نظر آرہا ہے۔" پانڈے نے کہا۔ ارسلان اس کے قریب آیا۔ "مجھے بھی دکھاؤ وہ کہاں ہے؟"

"وہ دیکھو صحرائی چٹان کے بائیں سمت۔"

ارسلان کے جسم سنسنا اٹھا۔ اسے وہ برفانی بلا نما انسان نظر آہی گیا، وہ بڑا جسیم تھا۔ اس کا قد کم از کم نو فٹ تھا بڑا سا سر جسم پر گھنے سیاہ بال تھے۔ ان کی طرف اس بلا کی پشت تھی۔ اس لئے وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے۔

ارسلان کے بعد سریتا نے بھی اس بلا کو دیکھا۔ اچانک فائر کی آواز گونجی اور وہ غائب ہوگیا۔ وہ فائر گوند نے کیا تھا۔ "یہ حماقت تھی اب وہ غائب ہوگیا ہے۔" پانڈے اس پر گرج برس رہا تھا۔

"باس ہم یہاں خزانے کی تلاش میں آئے ہیں، اس بلا کو ڈھونڈنا ہمارا مقصد نہیں۔" گوند نے رسان سے کہا۔

"تم احمق ہو اس بلا کا خاتمہ کئے بغیر خزانہ حاصل کرنا ناممکن ہے اس سے پہلے بھی ہم نے یہاں ٹیمیں بھیجی تھیں جن کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ رات کو اس بلا نے کشن کو اٹھالیا۔ اگر ہم نے اس کا خاتمہ نہ کیا تو وہ ہم سب کو مار دے گی۔ ہوسکتا ہے یہ آدم خور بھی ہو۔" پانڈے کے الفاظ نے ان سب کو خوفزدہ کردیا۔

وہ تیزی سے چٹانوں کی طرف بڑھے، اب راستہ دشوار ہوچکا تھا۔ بعض جگہ تو انہیں چڑھنے کے لئے رسے پر ہاتھوں کا سہارا بھی لینا پڑا۔ ارسلان کے سوا وہ سب کوہ پیمائی میں مہارت رکھتے تھے۔

ارسلان اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے اس برفانی پہاڑ پر آنے کی حامی بھری تھی۔ ذرا سی غفلت انہیں موت کی وادی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل سکتی تھی۔ تین گھنٹوں میں وہ بمشکل دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرسکے تھے ایک بڑی سی چٹان پر پہنچ کر پانڈے نے دوربین سے آس پاس کا جائزہ لیا۔ پھر وہ کھانے کی تیاری کرنے لگے، اس کٹھن سفر نے ان کا ناشتہ ہضم کردیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد سب نے تھرماس سے کافی نکال کر پی اور پھر پانڈے اور اس کے ساتھی اپنا اسلحہ چیک کرنے لگے اور پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ پانڈے جی پی ایس کی مدد سے لوکیشن بھی چیک کرتا جارہا تھا۔

"پانڈے تھکن بہت زیادہ ہورہی ہے۔ کیوں نہ کچھ دیر آرام کرلیا جائے۔" ارسلان نے چلتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بات تو ٹھیک ہے لیکن وہ برفانی بلا ایک درندہ ہے جانوروں کے سونگھنے کی حس عموماً بہت تیز ہوتی ہے ممکن ہے وہ ہماری بو محسوس کرلے۔ اگر وہ ہماری بو محسوس کرکے قریب آیا، تو بچ نہیں سکے گا، ہمارے پاس جدید ہتھیار ہیں اور ہم علاقے میں اس کی موجودگی سے آگاہ ہوچکے ہیں۔" نارائن نے پانڈے کی بات کا جواب دیا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے اپنے آرام کے لئے ایک غار ڈھونڈ لیا یہ ایک چٹان کے اوپر ایک چھوٹا سا غار تھا جس کے آگے جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ وہ ڈرتے ڈرتے اس غار میں داخل ہوئے، ان کے خیال میں یہ غار اس برفانی بلا کا ٹھکانہ بھی ہوسکتا تھا۔ یہ غار کافی اونچا اور کافی چوڑا تھا اندر عجیب قسم کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک سریتا کے حلق سے چیخ نکلی...... وہ...... وہ، اس نے کانپتے ہوئے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ غار کے آخری سرے میں کسی انسان کی خونچکاں لاش پڑی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے لاش کے قریب پہنچے۔

پانڈے نے لاش کو سیدھا کیا۔ یہ کشن تھا۔ اس کی شہ رگ کٹی ہوئی تھی اور پورا سینہ چاک کیا گیا تھا۔ "یہ اسی درندے کا ٹھکانہ ہے باہر بھاگو۔" سریتا ہسٹریائی انداز میں چلائی اور وہ غار سے باہر نکل آئے۔

پانڈے نے دوربین کی مدد سے اردگرد کا جائزہ لیا پھر وہ وہاں سے آگے بڑھے۔ اب وہ اوپر چڑھ رہے تھے۔ ارسلان کو ایک جگہ ٹھوکر لگی تو وہ کھائی میں گرتے گرتے بچا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور ان کے ساتھ چلنے لگا۔ اچانک گوند کا پاؤں ایک گڑھے میں پڑا وہ چیختے ہوئے گر گیا۔ "کیا مسئلہ ہے تم ضرورت سے زیادہ خوفزدہ ہو، اب اگر تمہارے منہ سے کوئی آواز نکلی تو اٹھا کر کسی کھائی میں پھینک دوں گا۔" پانڈے نے مڑ کر غصے سے کہا۔

"میرا پاؤں مڑ گیا ہے۔ شاید موچ آگئی ہے اور شدید تکلیف ہورہی ہے۔" گوند کراہتے ہوئے بولا۔

"تم کچھ دیر کے لئے یہیں رکو اوپر چٹانوں کے پاس ایک ہموار جگہ نظر آرہی ہے ہم خیمے نصب کرلیں پھر نارائن اور ارجن آکر تمہیں لے جائیں گے۔" پانڈے نے کہا اور وہ اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے گوند

ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ سردی شدید تھی۔ لیکن سردی سے زیادہ وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس کے ساتھیوں کو گئے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ لیکن اب تک ان میں سے کوئی بھی لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے چلنا بھی محال تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے آس پاس موجود ہے۔ اسے کسی کے بھاری انداز میں سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ وہ سہم گیا۔ ''کک...... کون؟'' جواب میں ایک غراہٹ سنائی دی۔

اور ایک بالوں بھرا ہاتھ آ کر اس کے منہ پر جم گیا۔ اس کی چیخ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس بالوں بھرے ہاتھ کے ناخن درانتی کی طرح لمبے لمبے تھے گوند خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کے لئے زور لگانے لگا، اس عفریت کا دوسرا بالوں بھرا ہاتھ حرکت میں آیا اور درانتی کی طرح لمبے ناخن گوند کے گلے میں پیوست ہو گئے، وہ چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا اس درندے نے اسے چٹان پر لٹایا اور اپنے درانتی نما ناخنوں سے اس کا سینہ چاک کیا اور اندرونی اعضاء نکال کر چبانے لگا۔

چٹان سے اوپر کچھ فاصلے پر ایک ہموار جگہ پر خیمے نصب کر کے ارسلان اور نارائن جب اس مقام پر پہنچے جہاں وہ گوند کو چھوڑ کر گئے تھے تو خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے گوند کی کٹی پھٹی لاش چٹان پر پڑی تھی کچھ دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد وہ سب دوبارہ خیموں میں پہنچ گئے اور پانڈے کو اس سنگین صورتحال سے آگاہ کیا، انہوں نے اسی وقت خیمے اکھاڑے اور اس خطرناک مقام سے روانہ ہو گئے۔

''جی پی ایس کی لوکیشن کے مطابق وہ مقام قریب ہی ہے۔ جہاں خزانہ موجود ہے۔ نقشے کے مطابق یہ خزانہ کسی بڑے غار میں دفن ہے۔'' پانڈے نے کہا۔ جی پی ایس اور نقشے کی مدد سے دو گھنٹے بعد وہ اس غار کے دہانے کے سامنے موجود تھے۔ جس میں نقشہ کے مطابق خزانہ دفن تھا۔ غار کے دہانے پر جھاڑیاں تھیں، انہوں نے جھاڑیاں صاف کیں اور اندر قدم رکھا۔ غار میں عجیب قسم کی بساند اور بدبو تھی ان کا دل متلانے لگا، خود پر ضبط کرتے ہوئے وہ آگے بڑھے، کافی طویل غار تھا، اندر سردی زیادہ نہیں تھی، وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، اندھیرا ہوتا جا رہا تھا، پانڈے نے ٹارچ روشن کر لی ایک جگہ سریتا کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی، اور وہ کراہتی ہوئی گر پڑی پانڈے نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور ٹارچ کی روشنی میں دیکھا وہ جس چیز سے ٹھوکر کھا کر گری تھی وہ گوشت پوست سے محروم ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ خوف سے ان کے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی، وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے خوف زدہ ہو رہے تھے۔

ہر طرف جانوروں اور انسانی جسم کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔

''میرے خیال میں یہ اس بلا کا کوئی ٹھکانہ ہے۔'' سریتا خوف زدہ لہجے میں بولی۔ انہوں نے سریتا کی بات کی تردید نہ کی اس کا قیاس درست تھا، پانڈے اور نارائن نے رائفلیں نکال کر فائرنگ پوزیشن میں کر لی تھیں۔ سریتا اور ارسلان نے بھی پسٹل ہاتھوں میں لے لئے تھے نقشے کے مطابق یہ وہی غار تھا جہاں خزانہ دفن تھا اور یہی غار اس خطرناک برفانی بلا کا مسکن تھا جو اس برفانی پہاڑ پر قدم رکھنے والے لوگوں کا شکاری تھا۔

چلتے چلتے وہ ٹھٹک کر رک گئے انہیں اپنے سامنے ایک بھاری بھر کم بالوں بھرا وجود نظر آیا نیم تاریکی کی وجہ سے وہ بہت نمایاں نہیں تھا لیکن ٹارچ کی روشنی میں وہ جتنا بھی دکھائی دے رہا تھا ان کا دل دہلانے کے لئے کافی تھا۔ وہ جسامت میں عام انسان سے خاصا بڑا تھا۔ نو فٹ کے قریب قد، اس کے بڑے سے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی انگاروں کی طرح دہکتی آنکھیں تھیں جن سے درندگی جھلک رہی تھی۔ وہ انسان نہیں بلکہ بن مانس لگ رہا تھا۔

ارسلان نے اپنی آنکھوں سے گلاسز اتارے اور اس درندے سے نظر ملالیں، اس کی مقناطیسی آنکھوں سے اس درندے کا اشتعال کم ہونے لگا۔ وہ بھی ارسلان سے نظریں ملائے کھڑا تھا۔

ارسلان کی آنکھوں میں اس قدر برقی طاقت تھی کہ کوئی بھی جاندار چند سیکنڈ سے زائد اس سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا لیکن وہ بن مانس اطمینان سے اس سے نظریں ملائے کھڑا تھا۔

اسی وقت نارائن نے اضطراب میں آ کر ٹریگر دبا دیا۔ پے در پے کئی گولیاں اس بلا کے سینے میں لگیں، وہ ان گولیوں سے معمولی سا لڑکھڑایا اور چنگھاڑتے ہوئے ان کی طرف لپکا تو وہ مڑ کر بھاگے۔

نارائن کی چیخ سنائی دی اس خونی بلا نے نارائن کو دبوچ لیا تھا، اس نے برقی سرعت سے ان کی نظروں کے سامنے نارائن کے جسم کو اپنے درانتی نما ناخنوں سے ادھیڑ ڈالا۔ سریتا نے چیختے ہوئے پے در پے کئی فائر کئے۔ اس کے پسٹل سے نکلی گولیاں اس درندے کے جسم میں پیوست ہو گئیں، وہ نارائن کی لاش کو چھوڑ کر دوبارہ ان کے پیچھے بھاگا، درجنوں گولیاں لگنے سے اس بلا کے جسم سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ کسی عفریت کی طرح ان کے پیچھے تھا، بھاگتے بھاگتے سریتا کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گری جسے بن مانس نے دبوچ لیا اور لمحوں میں ادھیڑ کر رکھ دیا۔

پانڈے نے اپنی رائفل اس کی طرف کر کے پے در پے کئی فائر کئے۔ وہ سریتا کی لاش کو چھوڑ کر ان کے پیچھے بھاگا تو پانڈے جان بچانے کے لئے دوڑا جبکہ ارسلان اس کی طرف پسٹل تانے چٹان کی طرح اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا تھا، ارسلان نے نشانہ لے کر فائر کیا، اس کی گولی دوڑ کر آتے اس درندے کی پیشانی میں لگی تو اس کو پہلی بار زوردار جھٹکا لگا۔ وہ زور سے دھاڑا۔ ارسلان نے مزید فائر کئے لگاتار پانچ گولیاں اس بلا کے سر میں لگیں، اب وہ ڈگمگا رہا تھا۔ پانڈے بھی رک چکا تھا۔ اور اس بلا پر گولیاں برسا رہا تھا۔

بالآخر وہ خونی بلا چند لمحے ڈگمگانے کے بعد گری اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد ساکت ہو گئی، ارسلان کے پسٹل میں گولیاں ختم ہو چکی تھیں اس نے پسٹل ایک طرف پھینکا وہ چند لمحے کھڑے اس خطرناک بلا کے ساکت وجود کو دیکھتے رہے۔

پھر وہ لوگ نقشے کے مطابق آگے بڑھے کچھ آگے جا کر پانڈے رک گیا اور رائفل کی نال سے ایک جگہ نشان بنایا۔ ''نقشے کے مطابق خزانہ اس جگہ پوشیدہ ہے۔'' پانڈے نے کہا۔

''لیکن یہاں کھدائی کیسے ہوگی؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''میں اس کا انتظام بھی کر کے آیا ہوں، بڑے بیگ میں کدال اور بیلچہ دونوں موجود ہیں۔'' پانڈے نے کہا اور اس طرف چلا گیا جہاں اس درندے سے جان بچا کر بھاگتے وقت ان کے بیگ گرے تھے وہ بیگ سے کدال اور بیلچہ نکال لایا۔ انہوں نے کھدائی شروع کر دی پہلے ارسلان زمین کھودتا رہا جب وہ تھک گیا تو پانڈے نے کھدائی شروع کر دی۔ اس کے بعد پھر ارسلان کی باری آئی، اس طرح باری باری وہ کھدائی کرتے رہے، چھ گھنٹے کی کھدائی کے بعد وہ کافی بڑا گڑھا کھود چکے تھے۔ وہ تھکن سے چور چور ہو رہے تھے۔ ارسلان کی کدال کسی چیز سے ٹکرائی، وہ لکڑی کی مضبوط پیٹیاں تھیں۔ یہ دیکھ کر ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، کافی تگ و دو کے بعد کدال کی مدد سے ایک پیٹی کھولی تو اس میں سونے کی اینٹیں نظر آئیں، ہر ایک اینٹ کا وزن کم و بیش پانچ سو گرام (آدھا کلو) تھا، ہر پیٹی میں تقریباً دس کلو گرام سونا موجود تھا۔ کچھ دیر آرام کے بعد وہ پیٹیاں باہر نکالنے لگے وہ پچیس کے قریب پیٹیاں تھیں۔ ''ہم صرف دو افراد ہیں ان پچیس پیٹیوں کو کیسے لے جائیں گے؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''اس کا انتظام بھی میں نے کر رکھا ہے۔ جس ہوٹل میں تم مجھ سے ملے تھے اس ہوٹل کے کمرہ نمبر 306 اور 307 میں میرے چھ ساتھی مزید موجود ہیں، میں ان کی مدد سے یہ خزانہ یہاں سے نکال لوں گا۔''

پانڈے کے الفاظ سے ارسلان چونکا اور حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تم ٹھیک سمجھے میری یہ پلاننگ پہلے سے تھی، افسوس میرے قیمتی ساتھی مارے گئے اور ہاں اتنا

بتاتا چلوں کہ تمہاری یہ مقناطیسی آنکھیں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں، ان کے سحر سے بچنے کے لئے تو ہم سب نے گلاسز پہن رکھے تھے۔ پانڈے نے ہنستے ہوئے کہا۔

اور ارسلان کی طرف رائفل تان لی۔ ارسلان نے گہرا سانس لیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی سونے کی اینٹ ایک طرف رکھی اور اس پر نظریں جمادیں۔

''پانڈے تم میرے احسان کا اچھا بدلہ دے رہے ہو لیکن میں یہاں تنہا نہیں، مڑ کر دیکھو۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

ایک چال تھی پانڈے نے مڑ کر دیکھا، سونے کی اینٹ ارسلان کی آنکھوں کی برقی طاقت سے فضا میں بلند ہوئی اور اڑتی ہوئی پانڈے کے سر سے زوردار طریقے سے ٹکرائی تو پانڈے کی آنکھوں کے آگے ستارے سے رقص کر گئے کہ اچانک پانڈے نے بے اختیار ٹریگر دبادیا لیکن ارسلان اپنی جگہ چھوڑ کر اس پر جست لگا چکا تھا اس نے پانڈے سے رائفل جھپٹ لی اور پے در پے گئی فائرنگ کر کے اس دغاباز کو جہنم رسید کر دیا۔

☆......☆......☆

مہوش عاشی کے گھر پر رہ رہی تھی۔ اس کے والدین اپنی بیٹی ہی کی طرح اس کا خیال رکھ رہے تھے پھر ایک روز ٹی وی کی بریکنگ نیوز سے پتہ چلا کہ رضوان اور ریاض بٹلر کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ریاض بٹلر کی ناقابل شناخت لاش فلائی اوور سے گرنے اور گاڑیوں سے کچلے جانے سے لوتھڑے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ آئی جی پولیس کو ارجنٹ ڈاک کے ذریعے ایک فلم ملی تھی جس میں رضوان کی طرف سے کیا گیا اعتراف جرم ریکارڈ تھا۔ ریاض بٹلر کے جرائم میں شریک کرپٹ پولیس اہلکار گرفتار کر لئے گئے۔

اس واقعے کو چھ ماہ گزر چکے تھے۔ ارجن کی یاد آتے ہی مہوش کے دل میں کسک سی جاگ اٹھی تھی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی لیکن اس کا انتظار فضول تھا۔ وہ ہندو تھا، ان دونوں کا ملاپ ناممکن تھا۔

ایک روز گھر والے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے، عاشی کے ممی ڈیڈی بھی تھے، عاشی کی والدہ مہناز کہہ رہی تھیں۔ ''عاشی کی انگیجمنٹ ہو چکی ہے، تمہارے لئے بھی رشتہ آیا ہے لڑکا بہت ہی نیک اور سعادت مند ہے۔'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''سوچو مت بیٹی میری دلی خواہش ہے کہ تم دونوں بیٹیوں کو ایک ساتھ رخصت کر دوں۔'' انہوں نے کہا اور مہوش ان کے پرخلوص اصرار پر انکار نہ کر سکی۔

ایک مہینہ پر لگا کر اڑ گیا۔ شہر کے شاندار قسم کے شادی ہال سے دونوں دلہنیں رخصت ہوئیں۔ مہوش کو ایک سجے سجائے کمرے میں بٹھایا گیا۔ وہ گھونگھٹ کی آڑ میں سر جھکائے بیٹھی تھی کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر دروازہ بولٹ ہوا اور وہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اور مہوش کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ وہ نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے اس کی ٹھوڑی کو پکڑ کر اوپر کیا تو مہوش نے نظریں اٹھائیں اور ششدر رہ گئی۔ ''ارجن تم؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ارجن نہیں ارسلان، حماد کا جڑواں بھائی، اور سنو نئی نویلی دلہن اس بے تکلفی سے اپنے شوہر کا نام نہیں لیتی۔'' ارسلان نے شرارتی لہجے میں کہا تو وہ شرما گئی۔

''دراصل جان من قصہ کچھ اس طرح ہے وہ اپنی روداد سنانے لگا۔'' پانڈے کو جہنم رسید کرنے کے بعد میں جس قدر سونا اٹھا سکتا تھا بیگ میں ڈال کر وہاں سے نکل گیا۔ پہاڑ سے صحیح سلامت نکلنے کے بعد میں نے آئی جی پولیس کو اس خزانے اور پانڈے کے بچ جانے والے ساتھیوں کے بارے میں بتایا۔ پولیس نے فوری ایکشن لیا۔ پانڈے کے ساتھی ہوٹل سے گرفتار کر لئے گئے۔ خزانہ حکومتی تحویل میں لے لیا گیا۔ مجھے یہاں کی شہریت اور پچاس لاکھ انعام ملا۔ کچھ سونا بھی میرے پاس تھا۔ شہر میں ایک شاندار سا بنگلہ خریدا اور ماں جی کو عاشی کے گھر تمہارے رشتے کے لئے بھیجا، تمہیں سرپرائز دینے کی غرض سے میرے کہنے پر تم سے چھپایا گیا کہ تمہارا شوہر کل کا ارجن اور آج کا ارسلان ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور لائٹ آف کر دی۔